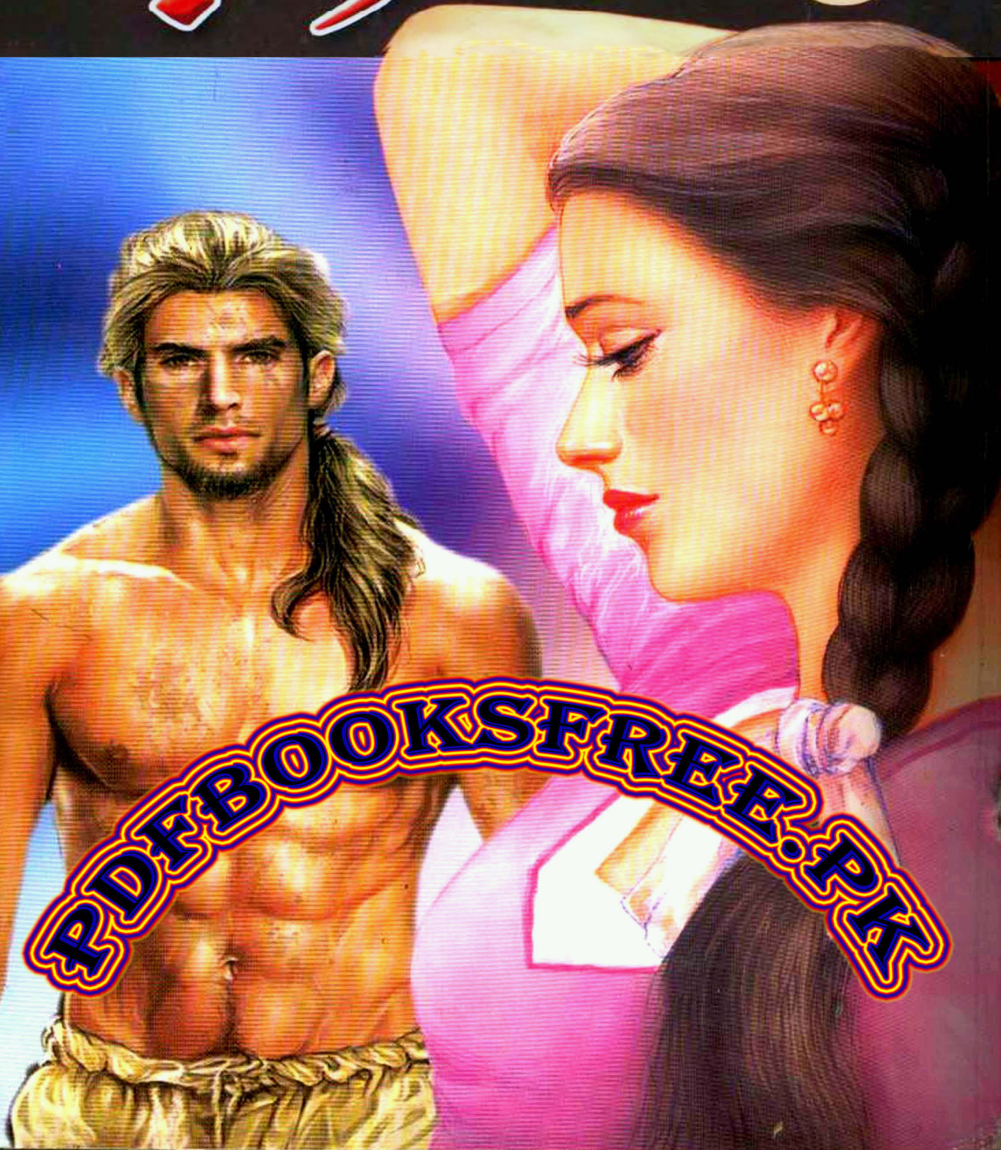
ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

9



ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تہلکہ خیز کہانی

سراب

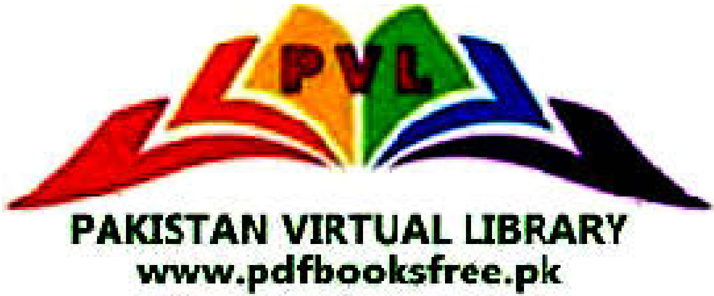
نواں حصہ

کاشف زبیر



علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون:37247414

باراشاعت ——— اول
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— 200 روپے
بیرون ملک ——— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist:(U.K)
Azhar Enterprises
315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 ONR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

میں عبداللہ سے بات کر کے واپس نشست گاہ میں آیا تو رفیق بھائی فون پر اسپتال کے کسی اہم فرد سے بات کر رہے تھے۔ "دیکھیں جی میرا تو اپنا بیٹا غائب ہے اور وہ آپ کی ایمبولینس سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے آپ ایسی بات نہ کریں اور پولیس میں رپورٹ کرانا آپ کا فرض ہے۔"

انہوں نے موبائل بند کر دیا۔ "ہسپتال والے تھے؟"

انہوں نے سر ہلایا۔ "وہ میرے پیچھے پڑے ہیں کہ ایمبولینس واپس کرنا میری ذمے داری ہے اور ابھی تک اس کی چوری کی رپورٹ بھی درج نہیں کرائی ہے۔"

"رفیق بھائی میرا مشورہ ہے آپ جا کر تھانے میں رپورٹ لکھوادیں۔"

"کس کے خلاف؟"

ان کے سوال پر اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے کہا۔ "جس شخص نے ایمبولینس کا اغوا کیا ہے اس کا نام فاضلی ہے اور وہ مرشد علی کا اہم ترین آدمی ہے۔ آپ اس کے خلاف رپورٹ لکھوادیں اس سے مرشد علی پر بھی دباؤ آئے گا۔"

"میں ایسا ہی کرتا ہوں لیکن پہلے عتیق واپس مل جائے۔"

"ہاں یہ کام اس کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے ضروری نہیں ہے کہ عتیق کے بازیابی کے بارے میں بتایا جائے۔ مل جانے کے بعد بھی اسے گم شدہ ظاہر کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں ایسا کیا جا سکتا ہے۔" وہ بے دلی سے بولے۔ "تمہارے آدمی کہاں تک پہنچ چکے ہیں؟"

"وہ جی ٹی روڈ پر ہیں اور مرشد سے بات ہو چکی ہے۔"

"کاش کہ میں ان کے ساتھ جاتا۔" وہ بے چین ہو گئے۔

"نہیں آپ کا جانا مناسب نہیں تھا اگر مرشد کوئی وعدہ خلافی کرے گا تو میرے آدمی اس سے ہتھیاروں کی زبان میں بات کریں گے۔ وہاں کسی دوسرے شخص کی موجودگی ان کو مشکل میں ڈال دے گی"

اسی لمحے زرین نشست گاہ میں آئی۔ اکیلے میں وہ مجھ سے بے تکلف ہوتی تھی لیکن دوسروں کے سامنے وہ محتاط بن جاتی تھی۔ "شہباز صاحب آپ کی کال آئی ہے۔"

میں اس کے ساتھ فون والے کمرے میں آیا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "وہ شخص کون ہے؟"

''میری بہن کے دیور ہیں۔ ان کا بیٹا زندگی وموت کی کشمکش میں ہے اور اس کا یہاں لا کر علاج کیا جانا ہے۔''

''لیکن اسے تو مرشد کے آدمی لے گئے ہیں۔''

''عبداللہ اور دوسرے گئے ہیں۔ مرشد کے کچھ آدمی میرے قبضے میں تھے اور وہ اس کے بدلے ان کو چاہتا تھا۔''

''تم نے اس کے آدمی دے دیئے؟''

''ہاں وہ عبداللہ کے ساتھ ہیں۔ جب مرشد کے آدمی عتیق کو حوالے کر دیں گے تو ان کو مرشد کے آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔'' میں نے سر ہلایا اور فون اٹھالیا۔ ''ہاں عبداللہ کیا ہوا؟''

''ایمبولینس نظر آ گئی ہے۔ ہم سڑک کے کنارے ہیں میرا ایک آدمی دیکھنے گیا ہے۔''

''وہ عتیق کو پہچانتا ہے نا؟''

''ہاں وہ اسے پہچانتا ہے۔''

''ٹھیک، جب وہ ایمبولینس تمہارے حوالے کر دیں تب فتح خان اور شریف کو ان کے حوالے کرنا۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب میں یہاں مصروف ہوں اس لیے آپ لائن پر رہیں۔''

وہاں بہت اہم معاملہ تھا اس لیے میں نے عبداللہ کو اس کا کام کرنے دیا۔ رفیق بھائی بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بتایا۔ ''ان کو ایمبولینس مل گئی ہے لیکن ابھی تبادلہ ہونا باقی ہے۔''

اسی لمحے عبداللہ کی آواز آئی۔ ''میرے آدمی نے اوکے کا اشارہ دیا ہے۔ ایمبولینس میں عتیق ہے اور ٹھیک ہے۔ اب ان کا آدمی آ کر فتح اور شریف کو دیکھے گا۔''

''اب تم ڈیل نمٹاؤ اور جب کام کر کے نکل جاؤ تو تب مجھ سے بات کرنا۔'' میں نے کہا۔

''یس سر۔''

میں نے رفیق بھائی کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ بیٹے کے زندہ سلامت ہونے کا سن کر ان کے مرجھائے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ ''اللہ کرے تمام معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں عبداللہ نے کہا۔

''شہباز صاحب مرشد آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ آپ رفیق صاحب کے نمبر سے اسے کال کر لیں۔''

میں نے ریسیور دوسرے کان سے لگایا اور رفیق بھائی سے موبائل لے کر مرشد علی کا نمبر ملایا۔ میری آواز سن کر اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''واہ ملک صاحب میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم خود ہو گے۔''

''تم غلط سمجھنا چھوڑ دو مرشد۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا تھا نا کہ کوئی غلط حرکت نہ کریں ورنہ بعد میں پچھتاتے ہی رہیں گے۔''

''کوئی غلط حرکت نہیں ہوگی۔'' اس نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔ ''میں نے صرف اس لیے تم سے بات کی ہے کہ تبادلہ غلط بندے سے تو نہیں ہو رہا ہے۔''

''بندہ صحیح ہوتا ہے بس اس کے اعمال بھی ٹھیک ہونے چاہئیں۔''

''میرا خیال ہے تمہارا بندہ تمہارے آدمیوں کے پاس آ گیا ہے۔''

میں نے عبداللہ سے تصدیق چاہی۔ اس نے بتایا۔ ''جی جناب ان لوگوں نے ایمبولینس میرے آدمیوں کے حوالے کر دی ہے وہ اسے چیک کر رہے ہیں۔''

''چیک کر رہے ہیں کس لحاظ سے؟''

''جناب اس میں کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے کوئی بم لگایا جا سکتا ہے یا گاڑی میں تکنیکی مسئلہ کیا جا سکتا ہے۔ دشمن سے تو کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے میں چیک کرا رہا ہوں۔''

میں سن ہو کے رہ گیا تھا میں نے اس نکتہ نظر سے تو سوچا نہیں تھا اگر مرشد کے آدمی ایمبولینس میں کوئی بم لگا کر ہمارے حوالے کر دیتے تو پتا بھی نہ چلتا اور راستے میں بم بلاسٹ ہو جاتا یا گاڑی میں کوئی گڑبڑ کر دیتے جس سے وہ حادثے کا شکار ہو جاتی تو ہم مرشد کو الزام دے بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ''عبداللہ یہ تم نے اچھا کام کیا ہے۔ اس میں کتنی دیر لگے گی؟''

''دس منٹ لگ سکتے ہیں۔ ایک انجن اور بریک چیک کر رہا ہے اور دوسرا آلے کی مدد سے بم کا پتا لگا رہا ہے۔''

''تم نے ابھی فتح خان اور شریف کو ان کے حوالے نہیں کیا ہے؟''

''نہیں میں نے مرشد کے آدمیوں سے کہہ دیا ہے جب تک میں مطمئن نہیں ہو جاتا میں بندے ان کے حوالے نہیں کروں گا۔''

عبداللہ منجھے ہوئے انداز میں کام کر رہا تھا اس لیے اسے ہدایات دینا بے کار تھا۔ ''گڈ اپنا کام کر کے جیسے ہی روانہ ہو مجھے انفارم کر دینا۔'' میں نے کہا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

''تمہیں پتا چل گیا ہو گا کہ میرے آدمی احمق نہیں ہیں اور وہ ایمبولینس کو چیک کر کے ہی فتح خان اور شریف کو تمہارے حوالے کریں گے۔''

''ایمبولینس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔'' اس نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔ ''شہباز میں بالکل فیئر ہو کر یہ ڈیل کر رہا ہوں۔ اگر مجھے ہر صورت فتح خان درکار نہ ہوتا تو شاید میں یہ کام نہیں کرتا۔''

''میں جانتا ہوں تمہیں۔'' میں نے طنز کیا۔ ''مرشد کوئی ایسا کام مت کرنا جس پر تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔''

''شہباز۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ''اگر میں شرافت سے پیش آ رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے تم میرے سر پر چڑھ کر مجھے دھمکیاں دینا شروع کر دو۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رفیق بھائی بے تابی سے منتظر تھے کہ میں فون پر بات ختم کروں تو وہ مجھ سے صورتِ حال معلوم کریں لیکن مرشد سے رابطہ ختم ہوتے ہی میں نے فون سنبھال لیا۔ اس پر عبداللہ موجود تھا۔ آخر اس کی آواز آئی۔ ''شہباز

صاحب آپ لائن پر ہیں؟''

''ہاں میں لائن پر ہوں۔''

''میرے آدمیوں نے ایمبولینس کلیئر کر دی ہے کوئی چکر نہیں ہے۔ اب ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

''فتح خان اور شریف کو ان کے حوالے کر دیا؟''

''نہیں یہ تبادلہ سڑک پر ہوگا۔ وہ وہیں وین میں ایاز اور بشیر کی نگرانی میں ہیں۔''

''بس تو نکلو یہاں سے۔'' میں نے کہا۔ ''گڑبڑ کا امکان اسی وقت ہو سکتا ہے۔ مرشد جیسے آدمی پر کسی صورت بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

عبداللہ اور اس کے آدمی پوری طرح چوکنا تھے اس لیے اس نے سڑک سے ہٹ کر فتح خان اور شریف کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مرشد کی طرف سے پانچ افراد تھے اور وہ سب بھی پوری طرح مسلح تھے یعنی دونوں پارٹیاں برابر کی تھیں اور تصادم کسی کے مفاد میں نہیں تھا۔ اگر مرشد نے کوئی الگ سے گھات لگا رکھی تھی تو اس کا کہا نہیں جا سکتا تھا لیکن موجودہ سیٹ اَپ میں امکان تھا کہ عبداللہ عتیق کو لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پانچ منٹ بعد اس نے بتایا۔

''میں نے فتح خان اور شریف کو ان کے حوالے کر دیا ہے اور ان کی گاڑی انہیں لے کر روانہ ہو گئی ہے ہم بھی سڑک پر آ گئے ہیں۔''

''تعاقب کا خاص خیال رکھنا۔ یہ ہمارا ٹھکانہ جاننے کی پوری کوشش کریں گے۔''

''آپ بے فکر رہیں اگر کسی نے تعاقب میں آنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ ایسا سلوک کروں گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا۔ ان کا جوتا ان کے سر ماروں گا۔''

میں چونکا۔ ''مطلب؟''

عبداللہ ہنسا۔ ''میں نے ٹائر کلر بیلٹ اٹھا لی تھی اور اس وقت وہ میرے پاس ہے۔''

میں بھی ہنس دیا تھا۔ عبداللہ صحیح معنوں میں حاضر دماغ آدمی تھا۔ اس نے ہر پہلو سے سوچ کر رکھا تھا۔ ''تمہیں کتنی دیر لگے گی؟''

''شاید آدھا گھنٹا..... کوٹھی کے پاس آ کر میں دیکھوں گا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم انتظار کر رہے ہیں اگر کوئی ہنگامی صورت حال ہو تو تم رفیق بھائی کے موبائل پر کال کرنا۔'' میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ رفیق بھائی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کو بتایا۔ ''وہ لوگ عتیق کو لے کر روانہ ہو گئے ہیں۔''

''کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟''

''زیادہ سے زیادہ پون گھنٹہ لگے گا۔''

''عتیق کی حالت کیسی ہے؟''

''عبداللہ نے دیکھا ہے اس کے وائٹل سائن ویسے ہی ہیں۔ یعنی خطرے کی حد میں نہیں ہیں۔''

میں اور رفیق بھائی نشست گاہ میں آئے میں نے ان سے کھانے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ

بیٹھے بھی نہیں اور بے چینی سے ٹہلتے رہے تھے۔خود میں بھی بے چین تھا۔اپنے معاملات میں، میں پُرسکون رہنے کا عادی ہوں اور ایک حد سے زیادہ پریشان نہیں ہوتا ہوں بلکہ جو چیز میرے بس میں نہ ہو اسے خدا پر چھوڑ دیتا ہوں۔البتہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ میں چاہنے کے باوجود خود کو پُرسکون نہیں رکھ پا رہا تھا۔رفیق بھائی کو اندر گھٹن ہو رہی تھی انہوں نے کہا۔''آؤ یار باہر لان میں چلتے ہیں۔''

ہم باہر لان میں آئے۔تین بجے تھے لیکن دھوپ ڈھلنے لگی تھی اور اس میں تمازت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لیکن پھر بھی یہ اچھی لگ رہی تھی۔کوٹھی میں اس وقت ایک گارڈ اور منیر تھے۔عبداللہ نے اس جگہ کے لیے زیادہ گارڈز نہیں رکھے تھے۔کیونکہ اس جگہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ راجا صاحب کی ہے اور یہاں ہم لوگ موجود ہیں لیکن ایک بات یقینی تھی کہ اگر میں نے اس جگہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر رکھا تو جلد یا بدیر یہ جگہ دشمن کی نظر میں آجائے گی اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ جب عتیق یہاں آجائے گا تو میں اس جگہ سے کہیں اور منتقل ہو جاؤں گا اور وہیں سے دشمنوں کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھوں گا۔عتیق کو علاج کے لیے اور حکیم قادس کو علاج کرنے کے لیے پُرسکون ماحول کی ضرورت تھی۔

ٹہلتے ہوئے میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔نصف گھنٹہ گزر گیا تھا۔میں نے رفیق بھائی سے ان کا موبائل لے کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔اس نے کال ریسیو کی۔''کہاں ہو تم لوگ؟''

''آپ کا اندازہ درست تھا مرشد کے آدمی ہمارے پیچھے تھے ان سے ابھی جان چھڑائی ہے بس پانچ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔''

''او کے آؤ تو بات کرتے ہیں۔''میں نے کہا اور موبائل رفیق بھائی کو واپس کر دیا۔''وہ پانچ منٹ میں آنے والے ہیں۔''

چار منٹ گزرنے کے بعد میں نے گیٹ پر موجود گارڈ کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور اس نے گیٹ کھول دیا۔فوراً ہی پہلے سیاہ وین اور پھر عتیق کو لیے ایمبولینس اندر آئی تھی۔رفیق بھائی اس کے رکنے سے پہلے اس کی طرف لپکے تھے۔انہوں نے اس کا عقبی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔میں ان کے پیچھے تھا۔اندر عتیق اسٹریچر پر ساکت لیٹا تھا۔ایک لمحے کو میرا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اس کا سینہ ساکت ہی لگا تھا لیکن پھر قریب سے دیکھنے پر وہ آہستہ سے ڈوبتا ابھرتا نظر آیا۔اس کے جسم سے لگی مشینیں اس کی سانس اور دل کو چلا رہی تھیں۔یہ ساری مشینیں اس کے اسٹریچر سے منسلک تھیں۔وین سے بیتو، عبداللہ اور اس کے ساتھی بھی اتر آئے تھے۔عبداللہ نے کہا۔

''ہمیں ایمبولینس کو ابھی کہیں چھوڑنا بھی ہے۔عتیق کو فوراً اندر لے جانا ہے۔''

اسی دوران میں گیٹ کھلا اور وہی ڈاکٹر اندر آیا جس نے مجھے دیکھا تھا۔وہ ایمبولینس میں چڑھ گیا اور اس نے عتیق کا معائنہ کیا۔اسے یقیناً عبداللہ نے بلایا تھا۔اس نے معائنے کے بعد کہا۔''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے لیکن فوری طور پر کوئی خطرہ بھی نہیں ہے۔''

''اسے اندر لے جانا ہے۔''عبداللہ نے کہا۔

''اسے پورے یونٹ کے ساتھ اندر لے جانا ہوگا۔اس دوران میں کسی مشین کا فنکشن رکنا نہیں چاہیے۔''

ڈاکٹر نے خبردار کیا۔

اسٹریچر کے ساتھ مشینوں کو چلانے کے لیے بیٹریز بھی لگی تھیں یہ ایک خاص قسم کا پورا یونٹ تھا۔ عبداللہ کے آدمیوں نے ڈاکٹر کی زیرنگرانی عتیق کو ایمبولینس سے نکال کر اس خاص کمرے میں منتقل کر دیا جہاں حکیم قادس کو اس کا علاج کرنا تھا۔ یہاں یو پی ایس اور بستر کا بندوبست تھا اس لیے اسٹریچر اور اس کی بیٹریز کی ضرورت نہیں تھی ان کو واپس ایمبولینس میں ڈال کر ایاز ایمبولینس کو کہیں چھوڑنے چلا گیا تھا۔ حکیم قادس کو اطلاع کر دی تھی کہ اس نے جس مریض کا علاج کرنا ہے وہ آ گیا ہے۔ وہ اپنا بکس سنبھالے آ موجود ہوا۔ اس نے سب سے پہلے تو کمرے میں اتنے افراد کی موجودگی پر ناک بھوں چڑھائی اور ایک مختصر تقریر کی عبداللہ نے اس کا ترجمہ کیا۔

''حکیم کا مطالبہ ہے کہ غیر متعلقہ لوگ باہر چلے جائیں۔''

کمرے میں صرف چار افراد تھے یعنی ڈاکٹر، میں، رفیق بھائی اور عبداللہ تھے میں نے کہا۔ ''اسے بتاؤ کہ ایک لڑکے کا باپ ہے۔ باقی ہمیں تو یہ جانتا ہے۔''

حکیم قادس کو بتایا کہ تیسرا فرد مریض کا باپ ہے تو اس کا اعتراض کم ہوا تھا۔ یعنی اس نے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ البتہ اس کا منہ بنا رہا تھا۔ اسے اصل اعتراض ڈاکٹر کی موجودگی پر تھا۔ اس نے عتیق کا معائنہ کیا اور اس کی نبض دیکھی۔ پھر اس کی آنکھ کی پتلی اور منہ کھول کر اس کی زبان بھی دیکھی تھی۔ پھر اس نے عبداللہ سے مطالبہ کیا۔

''اس کے جسم سے لگی مشینیں الگ کر دی جائیں۔''

عبداللہ نے اسے بتایا کہ عتیق ان مشینوں کے سہارے ہی زندہ تھا اگر مشینیں الگ کر دی جاتیں تو اس کی زندگی کو خطرہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ بات بتائی۔ اس نے کہا۔ ''مجھے شک ہے یہ شخص اس لڑکے کو مار نہ ڈالے۔''

''نہیں۔'' رفیق بھائی بولے۔ ''یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟''

عبداللہ نے انہیں بے بسی سے دیکھا۔ ''سر میں کیا کہہ سکتا ہوں یہ معالج ہے اور علاج کے لیے یہ جو کہے وہ کرنا پڑے گا۔''

''مشینیں الگ کرنے سے اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔'' ڈاکٹر نے پھر خبردار کیا۔

حکیم قادس نے محسوس کر لیا کہ ڈاکٹر اس کی مخالفت کر رہا ہے اور اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ عبداللہ اسے سمجھانے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ معاملہ خرابی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر اور رفیق بھائی کو باہر چلنے کو کہا۔ ہم باہر آئے اور میں نے رفیق بھائی کو سمجھایا۔ ''دیکھیں یہ جو کہہ رہا ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ یہ اپنے کام کا ماہر ہے اور یہ عتیق کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ یہ کچھ کر سکے گا۔'' ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب ضروری نہیں ہے ساری سائنسی ریسرچ آپ ڈاکٹر حضرات نے کر رکھی ہو دنیا میں اس فیلڈ میں اور بھی لوگوں نے ریسرچ کر رکھی ہے۔''

''تب آپ کی مرضی۔'' اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

''ایک منٹ ڈاکٹر صاحب آپ کو یہاں معاونت کے لیے بلایا ہے۔ اعتراض کرنے کے لیے نہیں۔'' اس بار میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''آپ کا کام کسی ہنگامی صورتِ حال میں عتیق کو طبی امداد مہیا

کرنا ہے۔ پلیز اپنا کام کیجیے۔''

بادلِ ناخواستہ ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔''

میں نے رفیق بھائی کی طرف دیکھا۔'' آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور اسے اپنا کام کرنے دیں۔ میرا خیال ہے آپ باہر بیٹھیں کیونکہ ہوسکتا ہے اس علاج کے دوران میں کچھ مشکل مراحل پیش آئیں۔ آپ ان کو نہ دیکھ سکیں۔''

رفیق بھائی سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے سر ہلایا۔''ٹھیک ہے میں باہر رکتا ہوں۔''

میں ڈاکٹر کے ساتھ اندر آیا۔''ڈاکٹر اس کے جسم سے مشینیں ہٹا دو۔'' میں نے کہا اور عبداللہ سے بولا۔ ''حکیم کو بتا دو کہ مشینیں ہٹانے کے ری ایکشن سے نمٹنے کے لیے تیار رہے۔''

عبداللہ نے اس سے کہا تو اس نے سر ہلایا۔'' فکر مت کرو میں اپنا کام کرنا جانتا ہوں۔''

حکیم جو کہتا تھا عبداللہ اس کا فوراً ترجمہ کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر عتیق کے جسم سے منسلک مشینوں کو الگ کرنے لگا اور جیسے ہی اس نے دل اور سانس چلانے والی مشینیں ہٹائیں۔ اس کی سانس رکنے لگی تھی اور دل کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔ حکیم قادس سامنے آیا اور اس نے عتیق کی نبض دیکھی اور پھر اس نے پہلے سے نکالی ایک چھوٹی سی شیشی کھول کر اسے عتیق کی ناک کے نیچے رکھ دیا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ شاید ڈاکٹر یا عبداللہ کے لیے حیرت انگیز ہو لیکن میرے لیے یہ بات نئی نہیں تھی۔ عتیق کے سانس لینے کا انداز بہتر ہونے لگا تھا اور مشین پر اس کے دل کی دھڑکن بھی بہتر ہو رہی تھی۔ حکیم نے عبداللہ کو سامنے آنے اور اس شیشی کو تھامنے کو کہا اور پھر اپنا بکس ٹٹولا جو دیکھنے میں کسی زنبیل سے کم نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک چھوٹا سا ڈبا نکالا اور پھر عتیق کے سینے کو دل والی جگہ سے ننگا کر دیا اور عین دل کے مقام پر اس ڈبے سے گریس نما ایک چیز نکالی، کر انگلی سے اس کی مالش کرنے لگا۔ حکیم کا انداز انتہائی احتیاط والا تھا جیسے اس کی انگلی پر لگا مرہم نہ ہو کوئی خطرناک مادہ ہو جو ذرا سی بے احتیاطی سے اسے یا عتیق کو کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ وہ تھوڑی سی مالش کرتا اور اس کے بعد عتیق کی نبض دیکھتا۔ حالانکہ اس کی دل کی دھڑکن اور نبض سامنے لگے مانیٹر پر صاف نظر آ رہی تھی لیکن حکیم کو اول تو اس کا پتا نہیں تھا اور اگر اسے پتا بھی ہوتا تب بھی وہ اس کے بجائے اپنے طریقہ کار پر عمل کرتا۔ میں دیکھ رہا تھا جیسے جیسے وہ اس گریس نما مرہم کی مالش کر رہا ہے عتیق کے دل کی دھڑکن بہتر ہوتی جا رہی تھی اور کوئی دس منٹ بعد وہ تقریباً نارمل تک آ چکی تھی جب کہ مشین پر لگے ہونے کے باوجود عتیق کی دھڑکن نارمل نہیں تھی۔ پہلی بار میں نے عتیق کے چہرے پر سرخی آتے دیکھی تھی۔ جب حکیم مطمئن ہو گیا تو اس نے مالش بند کر دی اور عتیق کی قمیص اس کے سینے پر برابر کر دی۔ میں نے عبداللہ کے توسط سے اس سے پوچھا۔

''اب کیا کرو گے؟''

حکیم نے حسبِ عادت ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا خلاصہ عبداللہ نے یوں پیش کیا۔'' ابھی کچھ نہیں کرنا ہے۔ جب تک اس کا سانس اور دل کی دھڑکن اپنے طور پر نہیں چلتی ہے جب یہ از خود چلنا شروع ہو جائے گی۔ تب اس کے زخموں کا علاج کروں گا۔''

یہ اس کا اپنا طریقہ علاج تھا۔ بہر حال اس نے ایسا کر دکھایا تھا جو دوسروں کو مطمئن کرنے کے لیے

ضرورت سے زیادہ کافی تھا۔ عتیق جو آدھے گھنٹے پہلے مشین کے ساتھ بمشکل سانس لے رہا تھا۔ اب وہ مشین کے بغیر بہتر انداز میں سانس لے رہا تھا اور اس کے دل کی دھڑکن بھی نارمل ہو چکی تھی میں نے کہا۔ ''اس کی سانس اور دل دونوں نارمل ہو چکے ہیں پھر تم علاج کب شروع کرو گے؟''

حکیم نے جواب دیا۔ ''ابھی یہ معمول پر نہیں ہے بلکہ دوا کے سہارے اس کی کارکردگی بہتر ہوئی ہے۔ ابھی اسے از خود یہ دونوں کام کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔''

''اس میں کتنا وقت لگے گا؟''

''کم سے کم دو دن۔'' حکیم قادس نے بتایا۔

ڈاکٹر دم بخود سا عتیق کی بدلتی حالت دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس نے سوچ لیا تھا کہ یہ کارٹون نظر آنے والا شخص اس نوجوان کی جواں مرگی کا باعث بنے گا اور اس وقت وہ اپنی برتری جتا سکے گا لیکن یہ تو اس نے سوچا نہیں تھا کہ دو معمولی سی دواؤں سے عتیق کی حالت اس قدر بہتر ہو جائے گی کہ وہ مشینوں کے بغیر بھی سانس لے سکے گا۔ میں نے رفیق بھائی کو اندر بلایا تو وہ بھی عتیق کی حالت دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ حکیم قادس نے عبداللہ کو حکم دیا کہ اس کا بوریا بستر اسی کمرے میں منتقل کر دیا جائے وہ اب عتیق کے ساتھ ہی قیام کرے گا۔

''جب تک اس کا علاج جاری رہے گا میں یہیں رکوں گا۔''

''کیا میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا؟'' رفیق بھائی نے اس سے عاجزی سے پوچھا۔

''کیوں نہیں...... مجھے امید ہے اگر خدا نے اس کی مزید سانسیں رکھی ہیں تو چار یا پانچ دن بعد یہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' حکیم نے جواب دیا۔

''لیکن یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہا ہے؟''

''یہ ہوش میں آ سکتا ہے لیکن ابھی اس کے زخم اس کے لیے بہت تکلیف دہ ہیں اور یہ تکلیف اس کی جان لے سکتی ہے اس لیے یہ بے ہوش ہے۔ میں اسے ہوش میں لا سکتا ہوں لیکن ابھی اسے ہوش میں لانا مناسب نہیں ہوگا۔ جب میں اس کا علاج شروع کروں گا تو پھر اس کی تکلیف کم ہو جائے گی اور تب میں اسے ہوش میں لاؤں گا۔''

عتیق کو ڈرپ کی مدد سے خوراک اور طاقتور دوائیں دی جا رہی تھیں لیکن اب اس کا علاج ایک حکیم کر رہا تھا۔ رفیق بھائی نے اس کی خوراک کے بارے میں پوچھا۔ ''تم فکر مت کرو یہ میرا ذمہ ہے بس جو میں کہوں وہ مجھے مہیا کر دو۔''

''تمہیں کیا چاہیے؟'' رفیق بھائی نے پوچھا۔

جواب میں حکیم قادس نے ایک لمبی چوڑی فہرست عبداللہ کو لکھوائی۔ اس نے مطالبہ کیا کہ یہ ساری چیزیں اسے جلد از جلد فراہم کی جائیں۔ ان میں سے بعض چیزوں کے نام تو ایسے تھے کہ میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ حکیم قادس نے کہا کہ یہ چیزیں کسی اچھے پنساری کی دکان سے مل جائیں گی۔ ان میں سے اکثر جڑی بوٹیاں تھیں۔ ظاہر ہے ایک حکیم جڑی بوٹیوں سے علاج کرے گا۔ حکیم قادس کا سامان اسے اسی کمرے میں مہیا کر دیا گیا تھا اور عبداللہ۔ نے منیر کو سامان لانے کے لیے روانہ کیا۔ کچن مکمل طور پر زرین نے سنبھال لیا تھا اور منیر کو اس

طرف سے تقریباً بے فکر کر دیا تھا اور وہ باہر کے کام بھی کر سکتا تھا۔ جب یہ معاملات نمٹ گئے۔ عتیق بحفاظت واپس آ گیا اور حکیم قادس نے اس کا علاج بھی شروع کر دیا تھا تو مجھے پہلی بار بھوک کا احساس ہوا۔ شام ہو چکی تھی اور میں نے صرف صبح ناشتہ کیا تھا۔ میں کچن میں آیا جہاں زرین رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

''تم تو مجھے بھول ہی گئے ہو۔''

''میں تو کھانے کو بھی بھولا ہوا تھا۔ ابھی یاد آیا جب میں بھوک سے فوت ہونے والا ہو رہا ہوں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' وہ فکر سے بولی۔ ''تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔''

''ہوش ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا اور اسے مختصراً حالات بتائے۔ ''اس بار مرشد کا داؤ چل گیا لیکن زندگی رہی تو اس کا حساب بھی برابر کر دوں گا۔''

''نوڈلز بنا دوں کھانے میں تو ابھی وقت ہے۔''

''کچھ بھی بنا دو۔''

اس نے نوڈلز کا پیکٹ کھولا اور پانی ابلنے کے لیے رکھ دیا۔ ''فتح خان تمہارے لیے اہم تھا لیکن تم نے اپنے آدمی کے بدلے اسے مرشد کے حوالے کر دیا۔''

''ہاں میں اس لڑکے پر ایسے دس فتح خان قربان کر سکتا ہوں۔''

''اگر مرشد مجھے مانگ لیتا تب؟'' اس نے اچانک سوال کر دیا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہا تو اس نے پھر کہا۔ ''اگر وہ مجھے مانگتا تو کیا تم مجھے اس کے حوالے کر دیتے؟''

''ایسا ممکن نہیں ہے مرشد بھی یہ بات سمجھتا ہے اس لیے اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے ایک اور ساتھی کو بھی مجھ سے مانگ لیا لیکن اس نے تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ اسے معلوم ہے میں اس کی یہ بات نہیں مانوں گا۔''

''چاہے وہ اس لڑکے کو قتل بھی کر دیتا؟''

''زرین جو ہوا نہیں اس کے بارے میں بات کرنے کا کیا فائدہ؟'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ایسی کسی آزمائش سے بچا لیا۔''

اس نے کھولتے پانی میں نوڈلز ڈالے اور سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو جس آزمائش میں ہم پڑے نہیں اس کے بارے میں بات کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ بس میرے ذہن میں خیال آ گیا تھا۔''

زرین نے ایک سادہ سا لباس پہن رکھا تھا جو میں نے اسے نہیں دلایا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کپڑے تم نے خود لیے ہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''نہیں منیر کے پاس تھے۔ چند مہینے پہلے اس کی ماں اس کے پاس رہنے آئی تھی تو وہ اپنے دو سوٹ یہاں بھول گئی تھی۔ اتفاق سے میرے ناپ کے نکل آئے۔ میں کام کرتے ہوئے انہیں استعمال کرتی ہوں۔''

''تمہارے پاس رقم ہے؟''

''ہاں تم نے جو دی تھی وہ رکھی ہے۔ کہو تو لا دوں۔''

''نہیں اپنے پاس رکھو اب وہ تمہاری ہے۔''

''اور تم؟'' اس نے نوڈلز کا پیالہ میرے سامنے رکھا۔ ساتھ میں اس کا مسالہ بھی تھا لیکن اسے میں نے ایک طرف کر دیا۔ میں سادہ ہی کھاتا۔

''مجھے ضرورت نہیں ہے اور جب ضرورت پڑے گی تو خدا کہیں نہ کہیں سے انتظام کر دے گا۔'' میں نے کہا اور کھانا شروع کر دیا۔ کچن میں قورمے اور بریانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زرین نے میرے کہے بغیر کافی کا پانی رکھ دیا اور کافی کا ڈبا نکالا۔

''یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔''

''ہاں یہ سب بہت اچھے ہیں۔'' میں نے تائید کی۔

''منیر مجھ سے احترام سے پیش آتا ہے۔ عبداللہ بہت کم بات کرتا ہے لیکن میں نے کبھی اس کے انداز میں اپنے لیے حقارت محسوس نہیں کی۔''

میں کھاتے کھاتے رک گیا۔ ''تمہیں یہ خدشہ کیوں ہوا کہ عبداللہ یا کوئی بھی تمہیں حقیر سمجھے گا۔''

وہ پیٹھ موڑ کر پتیلی میں چمچ چلانے لگی۔ ''یہ لوگ جانتے ہیں کہ میرا ماضی کیا ہے؟''

''ہاں لیکن ان میں سے کوئی تمہیں اس معاملے میں قصوروار نہیں سمجھتا ہے بلکہ یہ تمہاری مزید عزت کرتے ہیں کہ تم نے مرشد جیسے طاقتور شخص کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟''

''میرے الفاظ کی تصدیق میرے ساتھیوں کا رویہ بھی کرتا ہے۔''

اس نے سوچا۔ ''ہاں یہ تو ہے یہ سب مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔''

''بس تو تم اس معاملے میں بےفکر رہو۔ تم ہمارے لیے ایک بہت اچھی اور پاکباز عورت ہو۔'' میں نے کہا اور پیالہ خالی کرنے میں لگ گیا۔ پھر مجھے بیتو اور رفیق بھائی کا خیال آیا وہ بھی صبح سے بھوکے تھے۔ زرین نے مجھے بتایا کہ بیتو اچھی طرح کھا پی کر سونے کے لیے جا چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ایسا کرو دو کافی اور ساتھ میں کچھ بسکٹس وغیرہ نشست گاہ میں لے آؤ۔''

میرا اندازہ درست نکلا رفیق بھائی وہیں تھے اور فون پر گھر میں کسی سے بات کر رہے تھے۔ ''ہاں اب خاصی بہتر ہے...... بس اللہ سے دعا کرو وہ صحت مند ہو کر آئے...... ہاں تاؤ کی جان...... اب بہتر ہے وہ...... نہیں تم یہاں نہیں آسکتیں...... تم بس اس کے لیے دعا کرو...... ہاں شہباز یہیں ہے لو بات کرو۔'' رفیق بھائی نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف شمی تھی۔

''ہیلو گڑیا کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بےتابی سے بولی۔ ''شیبی رفیق تایا سے بات کر کے مجھے وہاں آنے کی اجازت دلوا دیں۔''

''یہ تو ممکن نہیں ہے بلکہ اگر یہ اختیار میرے پاس ہوتا تب بھی میں تمہیں اجازت نہ دیتا۔'' میں نے کہا۔
''یہ سمجھ لو کہ عتیق ابھی اسپتال میں ہے اور اسپتال میں ایک سے زیادہ افراد کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔''
''آپ بھی تو ہیں وہاں؟''
''ہاں لیکن یہاں کوئی لڑکی یا عورت نہیں رک سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے عتیق کی جلد ری کوری کی امید ہے۔''
''سچ شیبی؟'' وہ خوش ہو گئی۔ ''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔''
''یہ بات اس حکیم نے کی ہے جس نے میرا ہاتھ ٹھیک کیا تھا۔''
''تو میں نہیں آ سکتی؟'' وہ مایوس ہو گئی۔ میں نے اسے تسلی دی اور سمجھا کر موبائل واپس رفیق بھائی کو دے دیا۔ انہوں نے بات کر کے کال ختم کی تو میں نے ان سے کہا۔
''رفیق بھائی آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''
''بھوک نہیں ہے یار۔'' وہ بولے۔
''دیکھیں اب ایک امید نظر آ رہی ہے اس لیے آپ اتنا پریشان نہ ہوں۔''
زرین کافی اور بسکٹس لے آئی۔ میں نے رفیق بھائی کو مجبور کیا۔ انہوں نے کافی کے ساتھ کچھ بسکٹ لیے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ حکیم کیا چیز ہے؟''
''آپ نے دیکھا اس نے صرف دو معمولی سی چیزیں استعمال کیں اور عتیق کو مشینوں کے سہارے سے نجات مل گئی۔''
''میں نے ایک ہفتے میں پہلی بار اس کے چہرے پر سرخی دیکھی ہے۔''
''ان شاء اللہ...... وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے کافی کا کپ رکھا۔ منیر اندر آیا اس نے ایک بڑا سا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ اس نے تھیلا دکھاتے ہوئے اطلاع دی۔
''ساری چیزیں مل گئی ہیں۔''
''شکر ہے۔'' رفیق بھائی خوش ہو کر بولے۔ ''حکیم انتظار کر رہا ہے ان چیزوں کا۔''
منیر تھیلا لے کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''آپ کو حکیم صاحب بلا رہے ہیں۔''
عتیق کے کمرے میں حکیم قادس کے ساتھ عبداللہ بھی موجود تھا کیونکہ ترجمانی کے فرائض اسے ہی انجام دینے تھے۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''حکیم صاحب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''
''میں حاضر ہوں۔''
حکیم نے کہا۔ ''میں تمہارا ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔''
میں نے ایک نظر عتیق کو دیکھا۔ وہ بستر پر دراز تھا اور اس کا سینہ پہلے سے زیادہ بہتر انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ چہرہ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ زندگی والا لگ رہا تھا۔ میں حکیم قادس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا اور وہ میرے بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے دبا کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر اس نے اسے سونگھا اور اپنے بکس سے وہی سبز رنگ کا لیپ نکال کر ذرا سا میری کلائی کے پاس لگا دیا۔ اس نے عبداللہ سے کہلوایا۔ ''اسے کچھ

دیر لگا رہنے دو چھیڑنا نہیں۔''

میں وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔عبداللہ ایک طرف کھڑا تھا۔حکیم قادس نے اس کے لائے تھیلے کو فرش پر بچھی اپنی چادر پر الٹ دیا اور اس میں سے چیزوں کو نکال کر ان کا معائنہ کرنے لگا۔جو چیز اسے ٹھیک لگ رہی تھی وہ ایک طرف رکھتا جارہا تھا اور جس پر اسے اعتراض تھا اسے وہ عبداللہ کو دے کر مزید ہدایات بھی دے رہا تھا۔چیزوں کی چھان پھٹک کا کام مکمل کر کے اس نے میرے ہاتھ کا معائنہ کیا اور پھر لیپ کو ذرا گیلا پا کر اسے چھیڑا نہیں۔اس نے کوٹنے اور چھاننے کے لیے کچھ چیزیں بھی منگوائی تھیں اور آنے والی جڑی بوٹیاں لے کر ان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔کچھ دیر بعد منیر لکڑی کے کوئلے سے جلنے والی ایک چھوٹی لیکن ذرا جدید قسم کی انگیٹھی لے آیا۔کوئلے اچھی طرح دہکے ہوئے تھے اور ان سے ذرا سا دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ حکیم نے انگیٹھی کیوں منگوائی ہے کیونکہ سینٹرلی ہیٹنگ کی وجہ سے اندر سردی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن کچھ دیر بعد اس نے اس انگیٹھی پر مٹی کی ایک چھوٹی سی ہانڈی رکھی اور پھر اس میں پانی بھر کر اس میں کچھ جڑی بوٹیاں ڈال دیں۔عبداللہ نے کہا۔

''جناب یہ چیزیں دوبارہ لانی ہیں میں منیر کو دے کر آتا ہوں۔''

اب حکیم کچھ چیزوں کو لے کر ان کو کونڈی میں کوٹنے کی تیاری کر رہا تھا اور یہ سارے کام وہ خود کر رہا تھا اس نے کسی کی مدد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اپنے سارے کام وہ خود کرتا تھا اسے کسی اور کے کام پر اعتبار نہیں تھا۔عبداللہ چلا گیا اور ترجمے کی ضرورت نہیں تھی ورنہ حکیم اسے جانے نہ دیتا۔کوئی نصف گھنٹے بعد اس نے میرے ہاتھ کا معائنہ کیا۔لیپ خشک ہو گیا تھا۔اس نے اسے احتیاط سے اتارا اور اپنے پاس موجود ایک مخملی تھیلی میں ڈال لیا۔اس کے بعد وہ مجھ سے بے نیاز ہو گیا تھا۔میں نے اشارے سے پوچھا کہ میں جاؤں تو اس نے سر ہلا کر مجھے اجازت عطا فرما دی۔

میں باہر آیا۔عبداللہ نے اس بار منیر کو بھیجنے کے بجائے خود جانا مناسب سمجھا تھا اور اس نے زرین سے کہہ دیا تھا کہ اس کی آمد کا انتظار کیے بغیر کھانا لگا دے کیونکہ ہم صبح سے بھوکے تھے۔میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔کچھ دیر میں زرین نے اندر جھانکا۔''شہباز کھانا تیار ہے۔''

''شکر ہے۔'' میں فوراً اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔''میں تو بھوک سے فوت ہونے والا تھا۔''

''یہ کارٹون کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔''جو اس لڑکے کا علاج کر رہا ہے۔''

''حکیم قادس نام ہے اس کا اور اس کے حلیے پر مت جاؤ ایسے باکمال لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں یوں سمجھ لو کہ یہ مُردے میں جان ڈال دیتا ہے۔''

زرین نے منہ بنایا۔''مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے مجھ سے کوئی دشمنی ہے۔''

ظاہر ہے اسے کہاں پسند ہوتا۔میں نے دیکھا تھا کہ حکیم عورتوں سے چڑتا ہے۔شاید اس نے زرین سے بھی کچھ کہا تھا اور پھر وہ اسے نظر انداز بھی کرتا تھا۔کوئی عورت نظر انداز کیا جانا برداشت نہیں کرتی ہے چاہے نظر انداز کرنے والا حکیم قادس جیسا ستر سالہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو۔یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے چڑ رہی تھی۔

''وہ عورتوں کو پسند نہیں کرتا ہے اس سے دور رہنا۔'' میں نے کہا۔''ویسے بھی وہ حکیم ہے اس کے پاس

خطرناک زہر بھی ہوتے ہیں۔"

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اس بڈھے کھوسٹ کے پاس گھسنے کا۔" زرین نے تنک کر کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ ڈائننگ روم میں میز پر منیر کھانا لگا رہا تھا اور رفیق بھائی وہاں آ گئے تھے۔ منیر نے ان کے لیے ایک کمرہ کھول دیا تھا۔ ان کے پاس سامان نہیں تھا کیونکہ ان کا تھوڑا بہت سامان ان کے واقف کار کی کوٹھی میں تھا۔ اب وہ وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ ایاز ایمبولینس ایک ویران مقام پر چھوڑ آیا تھا اور اس نے فون کر کے اسپتال والوں کو اطلاع کر دی تھی کہ ان کی ایمبولینس کہاں کھڑی ہے اور وہ وہاں سے اسے لے سکتے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا امید تھی کہ اسپتال والوں کو ان کی ایمبولینس مل جائے گی تو وہ اس کو مزید نہیں کھینچیں گے۔ رفیق بھائی اسپتال کے تمام واجبات پہلے ہی ادا کر چکے تھے۔ اگر ان کو کپڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہ میرے کپڑے بھی پہن سکتے تھے۔ ان کا اور میرا ناپ ایک ہی تھا۔ دوسری ضروریات کی تمام چیزیں بھی اس کوٹھی میں موجود تھیں اور ان کو کسی چیز کے لیے یہاں سے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانے کے بعد انہوں نے ایک نظر عتیق کو دیکھا اور سونے چلے گئے وہ صبح سے نہیں بلکہ کئی دن سے بے آرام تھے اور عتیق کی طرف سے آج ان کو کچھ اطمینان ہوا تھا۔

عبداللہ سامان لے کر آ گیا تھا اور اس بار حکیم قادس نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا کہ وہ کھانے کے بعد مجھ سے نشست گاہ میں ملے۔ حکیم قادس نے اشیا گھونٹنے اور ابالنے کا عمل جاری رکھا تھا۔ جب ہم گئے تو کمرے میں ہلکی سی بھاپ کے ساتھ جڑی بوٹیوں کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ رفیق بھائی کو ان کے کمرے تک چھوڑ کر میں واپس نشست گاہ میں آیا۔ عبداللہ یقیناً کھانے میں مصروف تھا میں نے انٹرکام پر کچن میں رابطہ کیا تو وہاں زرین موجود تھی۔

"کافی مل سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں تم ایسے کیوں پوچھ رہے ہو۔ تم تو حکم دیا کرو۔"

"جب بغیر حکم کے کام چل رہا ہے تو حکم دینے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے ہنس کر کہا اور انٹرکام رکھ دیا۔ وہ دس منٹ بعد کافی کے ساتھ نشست گاہ میں چلی آئی۔ میں نے اسے دیکھا۔ "تمہیں یہ تو بتایا نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں پھر تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

اس نے کافی کی ٹرے سامنے رکھی۔ "وہ ایسے کہ آدھی کوٹھی میں تمہیں دیکھنے کے بعد یہاں آئی ہوں۔"

"تو مجھ سے انٹرکام پر پوچھ لیتیں؟"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ "وہ مجھے استعمال کرنا نہیں آتا ہے بے چارے منیر نے دو تین بار سمجھایا بھی لیکن میں بس کال سن لیتی ہوں کسی کو کال کر نہیں سکتی اس سے۔"

"اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اگر تمہیں کوئی کام نہیں آتا ہے اور تمہیں اس پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے تو تمہیں اسے سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسا کروں؟"

"فرض کرو اگر میں چاہتا ہوں تو؟"

''تو میں کروں گی۔'' اس نے بنا ہچکچائے کہا۔ ''جو تم چاہو گے یا کہو گے میں ضرور کروں گی۔''

''میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم کھڑی کیوں ہو بیٹھو۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''شہباز نہ جانے کیوں میں تمہارے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی ہوں اور اگر میں سوچوں کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو مجھے لگتا ہے جیسے میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی۔''

''زرین تم خود بہت مضبوط عورت ہو......''

''نہیں۔'' اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں مضبوط نہیں ہوں اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو مجھ پر جو گزری تھی شاید میں صدمے سے مر جاتی لیکن تم نے مجھے زندہ رکھا۔''

''اگر ایسا ہے کہ تم مجھ سے قوت پاتی ہو تو اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔''

''کمال تو ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے تم جیسا آدمی نہیں دیکھا جو مجھے دیکھے اور اس کی آنکھوں میں گند نہ آئے۔''

میں ہنس دیا۔ ''کیونکہ تم نے ابھی تک مرشد اور اس کے آدمیوں جیسے لوگ ہی دیکھے ہوں گے۔ ورنہ مجھ جیسے لوگ بہت ہیں۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال تم یہ جان لو کہ شاید میں جلد یہاں سے چلا جاؤں۔''

''کہاں؟'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''کہیں بھی......اصل میں یہ جگہ بہت اہم ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے یہ دشمنوں کی نظر میں آئے۔ یہاں تم ہو اور عتیق کا علاج بھی ہو رہا ہے اگر دشمن کو اس جگہ کا پتا چل گیا تو سب غیر محفوظ ہو جائیں گے۔''

''تم کہاں جاؤ گے؟''

''میں اپنی سرگرمیاں کہیں اور سے بھی جاری رکھ سکتا ہوں۔''

''نہیں یہ جگہ محفوظ ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''اگر تم جانے کا فیصلہ کر چکے ہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''بابا تم جیسے پیاروں کو محفوظ کرنے کے لیے میں یہاں سے جا رہا ہوں اور تم کہہ رہی ہو کہ میرے ساتھ چلو گی۔''

''میں خود کو تمہارے ساتھ محفوظ سمجھتی ہوں۔''

''تم ایسا سمجھتی ہو لیکن خود سوچو کہ اگر کوئی مشکل مرحلہ آ گیا تو میں دشمن سے لڑوں گا یا اس سے تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ میرے اور بھی بہت سارے پیارے ہیں لیکن ان کو بچانے اور اپنی توجہ ایک طرف رکھنے کے لیے میں نے ان کو باہر بھیج دیا۔''

''تم سفیر، مونا، وسیم اور سادھنا کی بات کر رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں ان کے بارے میں کس نے بتایا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بیتو نے وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بالکل سادہ سا اور جیسے دنیا دیکھی نہ ہو۔''

''وہ ایسا ہی ہے لیکن بے وقوف نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ ہنسی۔ ''بہت چالاک ہے میں نے بڑی مشکل سے اس سے یہ سب اگلوایا ہے۔ میں جب اس سے تمہارے بارے میں کوئی بات کرتی تو وہ موضوع بدل دیتا۔''

''پھر بھی اس نے سب تو بتا دیا۔''

''لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم کس سے محبت کرتے ہو یا کوئی تم سے محبت کرتا ہے۔''

''یہ تو تم مجھ سے بھی پوچھ سکتی ہو۔ میں اپنے تمام ساتھیوں سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔''

''میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں جو کسی ایک عورت سے کی جاتی ہے۔''

''تم کیوں جاننا چاہتی ہو؟'' میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو گیا تھا۔ وہ سہم گئی۔

''بس مجھے خواہش ہوئی تو میں نے پوچھ لیا کیا تمہیں برا لگا۔''

''نہیں۔'' میں نے گہری سانس لے کر اپنے اوپر قابو پایا۔ حالانکہ اس میں غصے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس پر غصہ آ گیا تھا۔ ''ہاں مجھے محبت ہے لیکن کس سے ہے یہ مت پوچھنا۔''

''کیوں؟'' اس کے انداز میں مایوسی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔

''بس فی الحال میں خود بھی اسے یاد نہیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کافی کا خالی مگ اسے پکڑا دیا۔ ''تم بھی صبح سے کام میں لگی ہو اب آرام کرو جا کر۔''

وہ مسکرانے لگی۔ ''تم مجھے ٹال رہے ہو۔''

''نہیں سچ میں خود بھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اب آرام کروں گا۔''

اسی لمحے عبداللہ نشست گاہ میں داخل ہوا۔ ''واہ کافی۔'' اس نے چہک کر کہا۔ ''ایک کپ مجھے مل سکتا ہے۔''

''میں لاتی ہوں۔'' زرین بولی اور مجھ سے پوچھا تو میں نے سر ہلایا۔

''ہاں ایک کپ چلے گا تم کافی بہت اچھی بناتی ہو۔''

''کھانے کی طرح۔'' عبداللہ نے میری تائید کی۔ ''منیر بھی اچھا بناتا ہے لیکن جب سے زرین بنا رہی ہیں کھانے کا ذائقہ ہی الگ محسوس ہونے لگا ہے۔''

زرین کھل اٹھی تھی۔ ''شکریہ۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''یار یہ مظلوم اور بہت اچھی عورت ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ بن جائے۔''

''یہی اس کے لیے سب سے بہتر ہوگا کیونکہ بہر حال یہ ہمیشہ یہاں تو نہیں رہ سکتی اور آپ جانتے ہیں ہم سب شریف ہی ہیں پھر بھی صرف ایک عورت کا اس کوٹھی میں رہنا مناسب نہیں ہے وہ بھی......'' عبداللہ کہتے کہتے رک گیا لیکن میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کا اشارہ زرین کے بلاخیز حسن کی طرف تھا۔

''تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس کے ماضی اور اس کی ذات سے لاحق خطرات کو نظر انداز

کرے۔اس سے شادی کر لے۔"

"میرا خیال ہے کوئی نہ کوئی مل جائے گا لیکن کیا یہ راضی ہو جائے گی؟"

"میرے خیال میں تو ہو جانا چاہیے اسے خود بھی پتا ہوگا کہ یہ اس طرح اکیلی نہیں رہ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تب میں اس بات کا دھیان رکھوں گا۔" عبداللہ نے کہا۔" پھر بھی آخری فیصلہ اسے ہی کرنا ہوگا۔"

"ظاہر ہے وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔"

"آپ نے مجھے کسی خاص وجہ سے بلایا ہے؟" عبداللہ کام کی بات پر آ گیا۔

"ہاں عبداللہ یہ کوٹھی اسلام آباد میں ہمارا اہم ٹھکانہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم اسے عمومی استعمال نہ کریں کیونکہ اس طرح دشمن اس کے بارے میں جان سکتے ہیں۔"

عبداللہ سمجھ گیا۔" آپ چاہتے ہیں ہم اپنی سرگرمیاں کہیں اور منتقل کر دیں؟"

"بالکل......ہم کسی اور جگہ سے بھی اپنی کارروائیاں جاری رکھ سکتے ہیں۔"

"لیکن جناب کسی اور جگہ ہمیں یہ ساری سہولتیں میسر نہیں ہوں گی۔"

"میں جانتا ہوں ہم ذرا مشکل سے گزارا کر سکتے ہیں بلکہ میں بلاوجہ تمہیں شامل کر رہا ہوں۔ اصل میں، میں خود کہیں اور جانا چاہتا ہوں۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں صرف آپ کے جانے سے یہ جگہ محفوظ ہو جائے گی؟"

"خاصی حد تک کیونکہ دشمن اصل میں تو میری تلاش میں ہیں اگر میں یہاں نہیں ہوں گا تو اس کا امکان کم ہے کہ وہ اس جگہ کو قابلِ توجہ سمجھیں۔"

"ایسا نہیں ہے اب وہ سب کو آپ کا ساتھی سمجھ کر برابر کی توجہ دیں گے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کسی قیمت پر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے اس لیے ہم بھی آپ جتنے دشمن ہیں۔"

"ٹھیک ہے فی الحال اس تجویز کو ایک طرف رکھو اور یہ بتاؤ کہ اسلام آباد یا راولپنڈی کے علاقے میں راجا صاحب کی کوئی اور جائیداد ہے؟"

"بس وہی کوٹھی ہے جس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ راجا صاحب کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے ہمیں متبادل ٹھکانے بنانا ہوں گے۔" میں نے سوچ کر کہا۔" دو تین دن میں تم ان شہروں میں متوسط درجے کی آبادی میں دو مکان تلاش کرو۔ چھوٹے ہوں اور قیمت بھی زیادہ نہ ہو۔ ہمیں متبادل ٹھکانے تیار رکھنے چاہئیں۔"

"مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق ہے۔" اس نے کہا۔" میں کل سے یہ کام شروع کر دوں گا۔"

عبداللہ نے بتایا کہ اس نے رات اور دن میں گارڈز کی تعداد دو کر دی ہے کیونکہ اب خطرہ زیادہ ہے اور سب مستقل طور پر مسلح رہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ رات کو بیتو اور ایاز پہرہ دیں گے اس لیے وہ کام سے آنے کے بعد فارغ ہو کر سونے کے لیے چلے گئے تھے۔ چوکیداری کے علاوہ بھی عبداللہ نے کچھ الیکٹرانک آلات بھی لگوائے تھے۔ اگر کوئی کوٹھی کی دیواریں پھلانگتا تو اندر الارم بج جاتا۔ اس کے علاوہ کیمرے بھی تھے جن سے

پوری کوٹھی کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔ ان کیمروں کا کنٹرول کمپیوٹر والے کمرے میں تھا۔ زرین کافی لے آئی تھی اور ہم نے خاموشی سے کافی ختم کی۔ کچھ دیر بعد عبداللہ سونے کے لیے چلا گیا۔ میں بھی سونے کا سوچ رہا تھا لیکن پہلے میں نے ایک نظر عتیق کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں رفیق بھائی پہلے سے موجود تھے اور اس کے بستر کے پاس کھڑے تھے۔ حکیم قادر ایک طرف زمین پر قالین پر اونی کمبل لیے سو رہا تھا۔ عتیق کا سانس پہلے سے زیادہ ہموار لگ رہا تھا۔

''یہ پہلے سے بہتر ہے۔'' رفیق بھائی نے آہستہ سے کہا۔

''اللہ نے چاہا تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اس حکیم سے کون پوچھے کہ عتیق کا علاج اب کس مرحلے میں ہے؟''

''میرا خیال ہے شاید یہ کل تک عتیق کا باقاعدہ علاج شروع کرے اور کچھ نہ کچھ تو یہ اس دوران میں بھی کرتا رہا ہوگا تبھی عتیق کی حالت پہلے سے بہتر لگ رہی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''آئیں اب آپ بھی سوئیں۔'' میں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اس طرح جاگ کر آپ خود بیمار پڑ جائیں گے۔''

وہ میرے ساتھ آئے اور میں ان کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جسمانی اور ذہنی تھکن بہت زیادہ تھی لیکن جب سونے کے لیے لیٹا تو نیند ایک بار پھر میری آنکھوں سے غائب ہوگئی۔ مجھے مونا، سفیر، وسیم اور سادھنا کا خیال آیا اور ذہن سے چپک گیا۔ دن بھر مصروفیات کے دوران میں ان کے بارے میں سوچنے سے بچا رہتا تھا لیکن جہاں سونے کے لیے لیٹتا تھا وہیں ان کا خیال آن موجود ہوتا، اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ اب دبئی میں نہیں تھے بلکہ وہاں سے پاکستان آنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے لیکن اب وہ کہاں تھے اور کن حالات سے دوچار تھے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور یہی لاعلمی میرے لیے باعثِ اذیت تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی میں خیالوں سے نکلا۔

''کون ہے آجاؤ؟''

دروازہ کھلا اور زرین اندر آئی۔ اس نے شب خوابی کا آرام دہ لباس پہن لیا تھا اور یہ ڈھیلا ہونے کے باوجود اس پر اچھا لگ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ اتنی رات گئے اس کا میرے کمرے میں آنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا میں نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدہ ہو رہی تھی میں اٹھ گیا۔ ''کیا ہوا زرین خیریت ہے۔''

وہ قریب آئی اور کچھ دیر کھڑی اپنے گلابی ہونٹ دانتوں سے کاٹتی رہی پھر بولی۔ ''میں یہ کہنے آئی ہوں کہ تمہیں یا کسی اور کو میرے مستقبل کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے میں سمجھ گیا کہ اس نے میری اور عبداللہ کی بات سن لی تھی۔ ''کیوں ضرورت نہیں ہے؟''

''کیونکہ میں اپنی زندگی خود گزارنا چاہتی ہوں اور گزار بھی سکتی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن کیا تمہارے خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ تمہارے مستقبل

کے بارے میں فکرمند ہوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ وہ بدستور ہونٹ کاٹتی رہی۔

''تمہیں ہے یہ حق لیکن کسی اور کو نہیں ہے۔''

''عبداللہ مجھ سے الگ نہیں ہے۔''

''وہ تمہارا ساتھی ہے لیکن اس کا ساتھ یقیناً محدود ہوگا تم اس سے ہر بات تو نہیں کرتے ہونا۔ کیا تم نے کبھی عبداللہ سے اس لڑکی کے بارے میں بات کی ہے جس سے تم محبت کرتے ہو؟''

''نہیں اور اس کی ضرورت یوں نہیں پڑی کہ وہ کبھی میرے معاملات میں شامل نہیں ہوئی ہے لیکن تم یہاں ہو اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ یہ کوٹھی اصل میں راجا صاحب کی ہے اور عبداللہ یہاں ان کے تمام معاملات کا نگران ہے اس لیے اگر کوئی کوٹھی میں ہے تو وہ اس کے بارے میں بات کرسکتا ہے۔''

''وہ صرف میرے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بات کرسکتا ہے۔'' زرین کا لہجہ تیز ہوگیا۔ ''لیکن اسے میرے مستقبل کے بارے میں بات کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''زرین تم غصے میں ہو۔ اس نے یقیناً حق کا نہیں کہا ہے اس بے چارے نے صرف اہل رائے دی ہے یقین کرو کوئی تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا ہے۔'' میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

اس کا غصہ کسی قدر ٹھنڈا بھی ہوا تھا۔ وہ بستر کے کنارے ٹک گئی۔ ''اگر تم یہ بات کرتے تو میں بالکل برا نہیں مناتی کیونکہ تمہیں یہ حق ہے۔''

''دیکھا جائے تو مجھے بھی یہ حق نہیں ہے۔ بہرحال میں عبداللہ کو بھی منع کردوں گا۔ اور یہ بات تم مجھ سے اسی وقت کرسکتی تھیں۔''

''میں انتظار کر رہی تھی کہ سب اپنے کمرے میں چلے جائیں تو میں تمہارے پاس آؤں۔''

میں ہچکچایا۔ ''زرین یہ اچھی بات نہیں ہے اگر کسی نے تمہیں میرے کمرے میں آتے یا جاتے دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گا؟''

''کیوں تم تو کہتے ہو یہ تمہارے ساتھی ہیں؟'' اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

''ہاں یہ میرے ساتھی ہیں اور مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہیں لیکن میں ایسی کوئی حرکت کیوں کروں جس سے ان کے اعتماد کو ٹھیس لگے یا وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوجائیں۔''

''ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ میں اس وقت تک یہاں ہوں جب تک تم ہو اور میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

''میں تمہیں نہیں لے جاسکتا۔''

''اس صورت میں، میں کہیں اور چلی جاؤں گی۔''

''زرین تم جذباتی ہو رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ تم سمیت ہم سب کتنے مشکل حالات سے گزر رہے ہیں اور ہم سب ہی خود کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں کسی جذباتی فیصلے کا نتیجہ سوائے مزید پریشانی کے اور کچھ نہیں نکلے گا۔''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں اگر یہاں سے کہیں جاتے ہوئے تم مجھے لے کر نہیں گئے تو میں خود یہاں سے

چلی جاؤں گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ میں نے سر تھام لیا۔ یہ ایک نئی مشکل تھی۔ اگر چہ میرا یہاں سے فوری جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جب تک کوئی معقول ٹھکانہ نہ مل جاتا۔ مگر زرین ابھی سے رکاوٹ بن رہی تھی۔ اسے میں مرشد کی کوٹھی سے نکال کر لایا تھا اور دیکھا جائے تو اب وہ میری ذمے داری بنتی تھی جب تک اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہ بن جائے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی اور میری مشکلات سے قطع نظر کر کے جذباتی انداز میں فیصلے سنانا شروع کر دے۔ میں فکر میں پڑ گیا تھا۔ اگر زرین اچانک یہاں سے چلی جاتی۔ ایک تو وہ خود مشکل میں پڑ جاتی دوسرے اگر وہ دوبارہ مرشد کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ اس جگہ کے بارے میں جان جاتا۔ بہر حال ابھی فوری کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ زرین کے آنے کا ایک فائدہ ہوا تھا کہ میرا ذہن بٹ گیا اور مجھے نیند آ گئی تھی۔



صبح عبداللہ نے دروازے پر دستک دی۔ "آ جاؤ۔" میں نے بستر سے پکارا تو عبداللہ نے اندر جھانکا۔

"اٹھ جائیں جناب حکیم قادس عتیق کا علاج شروع کرنے والا ہے۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے اس کا مطلب ہے وہ اس کی رسپائری سسٹم سے مطمئن ہو گیا ہے۔" میں نے اٹھ کر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا اور تازہ دم ہو کر کچن میں آ گیا۔ زرین ناشتہ بنا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے میری پسند پوچھی۔ اس کے لہجے میں رات والی تلخی نہیں تھی۔ میں اپنی پسند بتائی۔ "جلدی مل جائے تو اچھا ہے مجھے جا کر عتیق کو دیکھنا ہے۔"

"میں بھی چل سکتی ہوں؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"چل تو سکتی ہو لیکن وہاں حکیم قادس ہوگا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "وہ تمہیں پسند نہیں ہے۔"

"بالکل بھی نہیں۔" وہ فوراً دست بردار ہو گئی۔ اس نے مجھے ناشتہ بنا کر دیا اور ناشتہ کر کے میں نے چائے کا کپ لیا اور عتیق کے کمرے کا رخ کیا جہاں حکیم قادس اس کے علاج کی تیاری کر رہا تھا۔ یعنی وہ مطمئن تھا کہ عتیق کا دل اور سانس از خود چلنے کے قابل ہو گئے تھے ورنہ اس سے پہلے وہ مشینوں اور پھر حکیم کی دواؤں کے سہارے چل رہے تھے۔ حکیم قادس نے اس دوران میں اس کا کچھ نہ کچھ علاج جاری رکھا تھا اور اس وجہ سے عتیق از خود سانس لینے اور اس کا دل از خود دھڑکنے کے قابل ہو گیا تھا۔ عتیق کو اس کے حکم پر اٹھا کر فرش پر بچھی ایک سادہ سی چادر پر لٹا دیا گیا تھا اور اس کا اوپری جسم ننگا تھا نیچے اس نے صرف ایک پاجامہ پہن رکھا تھا۔ وہاں عبداللہ اور منیر کے علاوہ رفیق بھائی بھی تھے۔ حکیم قادس نے ان کی طرف دیکھ کر کچھ کہا۔ عبداللہ نے ترجمہ کیا۔ "یہ کہہ رہا ہے لڑکے کا زخم کھولنا ہوگا اس لیے رفیق صاحب باہر چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔"

لیکن رفیق بھائی نے جانے سے انکار کر دیا۔ "اب میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوں اس سے کہو اپنا کام کرے۔"

عبداللہ نے حکیم تک رفیق بھائی کی بات پہنچائی تو اس نے سر ہلایا اور عتیق کے پیٹ پر بندھی پٹی کھولنے لگا۔ زخم ابھی ہرا تھا کیونکہ پٹی سے سرخی جھلک رہی تھی۔ حکیم نے قینچی سے پٹی کاٹی اور پھر اسے اتارنے لگا۔ نیچے

سے زخم پر رکھی چکنی پٹی نکلی تھی۔ ڈاکٹروں نے اچھا خاصا بڑا آپریشن کیا تھا کیونکہ عتیق کے پیٹ پر درجن سے بھی زیادہ ٹانکے لگے تھے۔ ٹانکوں کے ساتھ جڑا زخم ابھی کچا تھا اور اس سے سرخی جھلک رہی تھی۔ حکیم قادس نے اپنے ایک دیسی اوزار سے ٹانکے کاٹنے شروع کیے تو رفیق بھائی نے تشویش سے کہا۔ ''اس سے کہو کہ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔''

''رفیق بھائی یہ اپنا کام جانتا ہے شاید اسی لیے یہ آپ کو باہر جانے کو کہہ رہا تھا۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں کم سے کم اس کے ہاتھوں عتیق کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اللہ نے چاہا تو فائدہ ہی ہوگا۔''

ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے اس کے باوجود حکیم قادس نے ہمیں گھور کر دیکھا تھا۔ منیر کمرے سے چلا گیا تھا اور عبداللہ دور ہٹ گیا تھا عتیق کے پاس صرف میں اور رفیق بھائی تھے۔ ٹانکے کاٹ کر حکیم نے ایک چمٹی نما اوزار سے زخم کی کھال کو پکڑ کر جدا کیا اور اب وہ عتیق کا پیٹ کھولنے جا رہا تھا۔ یہ خاصا خوفناک منظر تھا اور میں نے رفیق بھائی کے چہرے پر لرزتے تاثرات دیکھے۔ میں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''رفیق بھائی بہتر ہوگا آپ باہر آ جائیں۔ آپ کی یہاں موجودگی حکیم پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے اور شاید اس صورت میں یہ اپنا کام صحیح طور سے نہیں کر سکے گا۔''

رفیق بھائی سے بیٹے کی حالت برداشت نہیں ہو رہی تھی اس لیے انہوں نے میری بات مان لی اور باہر چلے گئے۔ اس دوران میں حکیم قادس عتیق کا پیٹ کھول چکا تھا اور اس کے اندر جھانک رہا تھا۔ زخم سے خون بہنے لگا تھا۔ اصل میں یہ کچا زخم تھا کیونکہ ابھی بھرا ہی نہیں تھا اور ذرا سا چھیڑتے ہی اس سے خون بہنے لگا تھا لیکن حکیم قادس خون سے لاپروا نظر آ رہا تھا اس نے خون روکنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر اس نے اپنی انگلیاں زخم میں ڈالیں اور اندر کچھ ٹٹولنے لگا۔ یہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ زخم اور لاشیں میرے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں ہیں۔ میں ہر طرح کے کٹے پھٹے انسانی جسم دیکھ چکا تھا لیکن اپنے ایک پیارے کے زخم دیکھنا واقعی دنیا کا دشوار ترین کام ہے۔ عتیق سے میرا کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا لیکن شمی کی وجہ سے عتیق سے مجھے دلی لگاؤ ہو گیا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ شمی اور عتیق ایک ہو جائیں کیونکہ ان کی اپنی خواہش بھی یہی تھی۔

اس جگہ معدہ اور شاید دوسرے اہم اعضا ہوتے ہیں۔ جہاں حکیم قادس انگلیاں ڈال کر ٹٹول رہا تھا۔ شاید اس طرح وہ زخم کا اندازہ لگا رہا تھا۔ میں زخم کے بجائے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ عتیق کے زخم کی حالت اچھی نہیں تھی۔ آخر حکیم نے زخم سے انگلیاں نکال لیں۔ اس نے ایک صاف کپڑے سے انگلیاں صاف کیں اور پھر کسی دوائی سے تر کپڑے سے عتیق کا زخم صاف کرنے لگا۔ اس کپڑے پر لگی دوائی کا حیرت انگیز اثر سامنے آیا۔ جہاں جہاں سے زخم صاف ہو رہا تھا وہاں سے خون بہنا بند ہو رہا تھا اور زخم کا منہ آپس میں ملتا جا رہا تھا۔ اگرچہ یہ ویسے بند نہیں ہو رہا تھا جیسے ٹانکوں سے بند تھا لیکن اب یہ پہلے کی طرح کھلا ہوا نہیں تھا۔ یہ کام کرنے اور خون مکمل طور پر صاف کرنے کے بعد حکیم نے ایک مرتبان نکالا اور اس میں سے وہی مخصوص سبز رنگ کا جانا پہچانا پتلا مرہم نکال کر عتیق کے زخم پر ڈال دیا اس نے اسے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ لکڑی کے چمچ سے زخم پر ٹپکا رہا تھا۔ جب مرہم نے پوری طرح زخم کو ڈھک دیا تو اس نے ایک صاف کپڑا اس پر ڈال دیا۔ پھر اس کے اشارے پر عبداللہ نے عتیق کا جسم

ایک ہلکے کمبل سے ڈھک دیا تھا۔

''اس کی حالت کیسی ہے؟'' میں نے حکیم سے پوچھا۔عبداللہ نے اسے سوال بتایا اور پھر اس کا جواب مجھ تک پہنچایا۔

''اچھی نہیں ہے زخم اندر سے بہت خراب ہو چکا ہے۔''

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔''کیا یہ ٹھیک ہو جائے گا؟''

''میں کوشش کروں گا۔'' حکیم قادس نے صاف گوئی سے کہا۔''اگر یہ لڑکا مجھے چار دن پہلے ملا ہوتا تو اب تک یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا لیکن اب اس کا علاج بہت مشکل کام ہے۔''

''لیکن تم کوشش تو کرو گے؟''

اس نے سر ہلایا۔''میری پوری کوشش ہو گی اور میں ایک نئی دوا آزما کر دیکھوں گا لیکن اس کے لیے لڑکے کے باپ کی اجازت چاہیے ہو گی۔''

''کیسی اجازت؟''

''دوائی ہے اور اس کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ہو سکتا ہے لڑکا صحت یاب ہو جائے لیکن اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔زخم نے اس کی آنتوں،معدے اور جگر کو متاثر کیا ہے۔''

حکیم اپنی انگلیوں سے یہی ٹٹول کر دیکھ رہا تھا کہ زخم کی خرابی کہاں تک پہنچی ہے۔یہی کام ڈاکٹر طویل اور پیچیدہ قسم کے ٹیسٹ کرانے کے بعد بتاتے ہیں۔بہر حال مسئلہ اس وقت عتیق کی زندگی کا تھا میں نے حکیم قادس سے کہا۔''تم اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کرو تم جانتے ہو میں راجا صاحب کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہوں یوں سمجھ لو تمہیں اس نوجوان کی نہیں میری جان بچانی ہے۔''

جب عبداللہ نے اس تک میری بات پہنچائی تو اس کے چہرے پر تعجب نظر آیا تھا شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں عتیق کے بارے میں ایسی بات کروں گا۔کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔''ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا لیکن مجھے ایک آدمی مستقل چاہیے اور مزید اشیا درکار ہوں گی۔''

''تم جو مانگو گے تمہیں ملے گا۔اگر یہ لڑکا ٹھیک ہو گیا تو میں اور اس کا باپ تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔''

انعام کی بات سن کر حکیم قادس خوش ہوا تھا لیکن اس نے کہا۔''اگر یہ لڑکا ٹھیک ہو جائے تو میرے لیے یہی سب سے بڑا انعام ہو گا میں نے آج تک اتنی خراب حالت والے کسی مریض کا علاج نہیں کیا ہے۔''

''تم اس ڈرائیور کو بھول رہے ہو جس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اگر تم اس کا علاج نہ کرتے تو وہ کچھ دیر کا مہمان تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا تو وہ مسکرانے لگا۔

''وہ بات اور تھی تازہ تازہ چوٹ تھی اس لیے میں نے اس کا علاج کر دیا۔اس میں خاصی دیر ہو گئی ہے۔''

اس نے عتیق کی طرف دیکھا۔''پھر بھی میں کوشش کروں گا۔''

''تم ابھی سے کوشش شروع کر دو اور جو چیز چاہیے وہ بتا دو۔''

''میں چیزیں لے آتا ہوں۔'' عبداللہ نے اس سے بات کر کے کہا۔''مددگار کے طور پر منیر کو اس کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔''

حکیم عبداللہ کو بتانے لگا کہ اسے کیا کیا لانا تھا۔ وہ اپنی نوٹ بک میں ان چیزوں کے نام اور مقدار درج کرنے لگا۔ میں نے ایک نظر عتیق کو دیکھا اور باہر آ گیا۔ رفیق بھائی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز کیا کہہ رہا ہے حکیم؟''

''اس نے امید دلائی ہے۔'' میں نے صاف بتانے سے گریز کیا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ زخم پرانا ہو گیا ہے اس لیے اس کے علاج میں ذرا مشکل ہو گی لیکن وہ پوری کوشش کرے گا۔''

''عتیق بچ جائے گا نا؟'' وہ ڈوبتے لہجے میں بولا۔

''کیوں نہیں رفیق بھائی۔'' میں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اللہ نے چاہا تو وہ ضرور صحت یاب ہو گا۔ آپ دعا کریں گھر میں بھی سب سے دعا کرنے کو کہیں کیونکہ دعا کے سوا کوئی چیز تقدیر کے لکھے کو نہیں ٹال سکتی ہے۔''

ان کی آنکھوں میں نمی تھی لیکن وہ بہادری سے اپنے آنسو پی رہے تھے۔ انہوں نے ایک نظر عتیق کو دیکھا اور پھر میرے ساتھ نشست گاہ میں آ گئے۔ ان کا دھیان بٹانے کے لیے ٹی وی لگا دیا تھا۔ اس دوران میں بیتو بھی آ گیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے عتیق کا احوال پوچھا تو میں نے اسے بتایا۔ اس نے فوراً کہا۔ ''منیر کو چھوڑو ہم حکیم کے ساتھ کام کرے گا۔ ہم کو پتا ہے اس قسم کا لوگ کس طرح کام چاہتا ہے۔ اپنے قبیلے میں کچھ دن ہم نے ایک حکیم کے ساتھ کام کیا ہے۔''

''اگر تم نے ناشتہ نہیں کیا ہے تو ناشتہ کر کے فوراً حکیم کے پاس پہنچ جاؤ شاید اسے ابھی سے مدد کی ضرورت ہے۔''

''ہم ناشتہ کر کے آ رہا ہے۔ زرین دیدی بہت اچھا کھانا بناتا ہے۔'' بیتو نے جاتے ہوئے کہا۔

''شہباز یہ لڑکی کون ہے؟'' رفیق بھائی نے پہلی بار زرین میں دلچسپی لی تھی۔

''یہ بھی مرشد کی زخم خوردہ ہے۔'' میں نے رفیق بھائی کو تفصیل سے زرین کے بارے میں بتایا۔ وہ اس سے متاثر ہوئے تھے۔

''واقعی بہت بہادر لڑکی ہے ورنہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو ذہنی توازن کھو چکی ہوتی اور پھر خوش قسمت بھی ہے کہ اسے تم مل گئے ورنہ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتی تو اسے مزید برے حالات سے گزرنا پڑتا لیکن شہباز کیا یہ اس طرح صرف مردوں کے درمیان میں رہ سکتی ہے۔''

''یہی فکر مجھے بھی ہے لیکن فی الحال میں اسے کہیں بھیج بھی نہیں سکتا ہوں۔ میں اسے مرشد کے چنگل سے نکال کر لایا ہوں اس لیے یہ میری ذمے داری ہے۔''

''تم نے ٹھیک کیا ہے لیکن کیا تم ان حالات میں یہ ذمے داری اٹھا سکتے ہو جب کہ دشمن خود تمہارے پیچھے ہے۔ وہ تمہارے خاندان والوں پر حملے کر رہا ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''آپ نے ٹھیک کہا ہے لیکن جہاں تک ذمے داری اٹھانے کی بات ہے تو جب تک یہ میرے بس میں ہے میں اسے ضرور اٹھاؤں گا۔ ہاں جب میرے بس سے باہر ہو گا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہو گا۔''

رفیق بھائی نے سوچا۔ ''اگر تم چاہو تو میں اسے حویلی بھیج سکتا ہوں وہاں یہ آرام سے رہے گی۔''

''مجھے اس سے پوچھنا پڑے گا۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ وہ جن حالات سے گزری ہے اس نے زرین کو حساس بنا دیا ہے اور کب کون سی بات اس کے دل کو لگ جائے یہ کہنا مشکل ہے۔''

''ٹھیک ہے تم جس طرح مناسب سمجھو اس معاملے کو ڈیل کرو میری پیش کش موجود ہے۔ اسلام آباد میں اس کے لیے خطرہ ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں لیکن فی الحال وہ ہم سب کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھ رہی ہے۔''

رفیق بھائی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں اپنے کمرے کی طرف آیا۔ میں نے کئی دن سے حویلی کال نہیں کی تھی اور نہ ہی ندیم سے بات کی تھی۔ میں نے پہلے حویلی کال کی۔ بابا نے کال ریسیو کی سلام دعا کے بعد انہوں نے عتیق کا احوال دریافت کیا میں نے اس بارے میں بتایا پھر ماں جی سے بات ہوئی۔ میں سویرا کے بارے میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا لیکن میری زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ ماں جی سے بات کر کے میں نے فون بند کیا تھا کہ بیل بجی اور ایک اجنبی نمبر آیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا کوئی میرے اس نمبر کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ پہلے میں نے کال ریسیو نہ کرنے کا سوچا لیکن پھر ریسیو کر ہی لی کہ نہ جانے کون ہو اور کیا اہم بات ہو۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے ایک ہلکی نسوانی آواز نے کہا تو میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

''سویرا۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔ ''تم......''

''شہباز۔'' اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔ ''آپ یہاں سے جانے کے بعد مجھے بھول گئے۔''

''خدا کی قسم ایسا نہیں ہے تمہارا خیال تو دل سے جاتا نہیں ہے لیکن میں تم سے کیسے رابطہ کرتا، تم جانتی ہو بابا یا ماں جی اسے اچھا نہیں سمجھتے کہ میں تم سے فون پر بات کر رہا ہوں۔ ابھی تم عدت میں ہو اور ابھی رابطہ کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں لیکن کم سے کم مجھے آپ کی خیریت کی اطلاع تو ملنی چاہیے۔''

''وہ مل گئی۔'' میں ہنسا۔ ''تم نے یہ نمبر کیسے حاصل کیا؟''

''چالاکی سے۔'' وہ بھی ہنسی۔ ''ماں جی نے بات کر کے مجھے موبائل دیا کہ بابا کو واپس کر دوں تو میں نے اس میں سے نمبر دیکھ لیا۔''

''تمہارے پاس موبائل ہے یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔''

''موبائل میرے پاس نہیں ہے۔ آپا کا ایک سیٹ خراب ہو گیا تھا تو انہوں نے دوسرا منگوا لیا۔ یہ بھی ٹھیک کرا لیا اور اسے گھر چھوڑ گئی تھیں میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ یہ نمبر بھی آپا کا ہے۔''

''اب تم موبائل لے لو۔''

''ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں لیکن شرم آتی ہے کہیں ماں جی یا بابا یہ نہ سمجھیں کہ آپ سے بات کرنے کے لیے موبائل لیا ہے۔''

''اب حویلی آیا تو میں خود لے آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔''

''پھر کب؟''

''وہ جب عدت ختم ہو جائے گی تب۔''اس نے شرما کر کہا۔''اب میں فون بند کر رہی ہوں۔''

بات ہو چکی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔قدرت بھی کبھی کیسے نواز دیتی ہے میرا سویرا سے بات کرنے کو دل چاہا اور اس نے خود کال کر لی۔میں نے ندیم کا نمبر ملایا۔میری آواز سن کر وہ چلایا۔''ابے میری جان کے دشمن کہاں غائب ہے؟''

''چلامت میرے دشمن سن لیں گے اور تیری جان کے دشمن بھی بن جائیں گے۔''

''تو اب کون سے کم ہیں۔''اس نے خفگی سے کہا۔''زندگی حرام کر دی ہے تم سب نے مل کر میری......''

اس کی بات سن کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔وہ سب کا ذکر کر رہا تھا کیا اسے کہیں سے اطلاع ملی تھی۔''کن سب کی بات کر رہا ہے؟''

''وہی تیرے یار اوران کی ہوتیاں سوتیاں ہیں،کل سفیر کا فون آیا تھا۔''

''سفیر کا۔''میں نے بمشکل کہا۔''کہاں تھا کیا کہہ رہا تھا؟''

''یہیں پاکستان آن مرے ہیں سب اور ابھی بتایا نہیں کہہ رہا تھا سرپرائز دوں گا۔''ندیم سخت مشتعل تھا۔''حرامزادے یہاں کے حالات نہیں جانتے جو سرپرائز دینے چلے آئے۔ایسا نہ ہو وہ مرشد ان سب کو سرپرائز دے۔سرہی توڑ دے سالوں کا۔''

''ندیم بکواس بعد میں کرنا پہلے بتا کیا کہہ رہا تھا سفیر پاکستان میں کہاں ہے؟''

''مجھے کیا پتا کراچی سے خیبر تک کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔''

''فون کیا تھا تو کہیں کا نمبر تو آرہا ہوگا؟''میں نے بھنا کر کہا۔''وہ دیکھا تھا یا تُو عقل کے ساتھ آنکھ سے بھی اندھا ہو گیا تھا اس وقت۔''

''سالے نے بات ہی دو منٹ کی اور نمبر موبائل کا تھا مجھے کیا پتا کہ کس شہر یا جگہ سے بات کر رہا تھا۔''

''تو نے اس نمبر پر ٹرائی نہیں کیا۔''

اس بار ندیم بھنا گیا۔''بالکل ہی عقل سے پیدل نہیں ہوں کوشش کی تھی لیکن نمبر بند جا رہا ہے۔''

''مجھے نمبر بتاؤ۔''

اس نے نمبر بتایا۔اس خبر نے میرے اندر ایک لہر سی دوڑا دی تھی کہ سفیر اور دوسرے پاکستان آچکے تھے لیکن اس نے ندیم سے یہ ادھورا رابطہ کیوں کیا تھا اور وہ کیا اچانک آکر مجھے سرپرائز دینا چاہ رہے تھے،مگر سوال یہ تھا کہ ان کو یہاں کے حالات کا کیا علم تھا اور دوسرے وہ پاکستان آکر مجھے کہاں تلاش کرتے۔ندیم کی بات درست لگ رہی تھی کہ کہیں مرشد ہی ان کو سرپرائز نہ دے دے۔وہ ان دنوں بہت تیز جا رہا تھا اور اس نے بڑی کامیابی سے فتح خان کو واپس حاصل کر لیا تھا۔اگرچہ اس کا رویہ مفاہمانہ تھا لیکن یہ اس کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ندیم نے مجھے نمبر بتایا۔

''میں تیرا نمبر کل سے ملا رہا ہوں اور وہ بند جا رہا ہے۔''

''موبائل مس ہو گیا تھا بلکہ مرشد کے قبضے میں جا چکا ہے یہ دوسرا نمبر ہے اسے نوٹ کر لے اور اب مجھ

سے اس پر رابطہ کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک نیک کام کر یہ دیکھ کہ میرے بینک اکاؤنٹس میں کتنی رقم ہے اور وہ مجھے کتنی جلدی مل سکتی ہے۔''

''اندازاً کوئی پندرہ لاکھ سے اوپر رقم ہے اور وہ تجھے تین دن میں مل سکتی ہے۔ میرے پاس تیرے دیئے ہوئے چیک ہیں میں ان کی مدد سے رقم اپنے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کر کے تجھے کیش دے سکتا ہوں لیکن تجھے فوری ضرورت ہے تو مجھ سے لے لے۔''

''نہیں فوری ضرورت نہیں ہے اور لگتا ہے تیری پریکٹس اچھی چل رہی ہے تبھی اتنی فراخدلی دکھا رہا ہے۔''

''بس تم جیسے کمینوں کی دعائیں ہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''اگر جلدی نہیں ہے تو دو دن میں بتاتا ہوں تیرے اکاؤنٹس میں موجود رقم کتنی ہے لیکن تجھے کرنا کیا ہے؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے کچھ مستقل ٹھکانے بنا کر رکھوں۔''

''کیا تُو خریدنے کے بارے میں سوچ رہا ہے؟''

''ہاں۔''

''احمق نہ بن اگر تجھے ٹھکانوں کی ضرورت ہے تو کرائے پر لے لے اسلام آباد راولپنڈی میں بے شمار مکانات کرائے پر خالی ہیں۔ تُو براہِ راست اسٹیٹ ایجنٹس سے بات کر اور وہ تجھے مکان دلوا دیں گے تجھے مالک مکان کا سامنا کرنے یا کسی قسم کی ضمانت بھرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ بس چھ مہینے کا کرایہ دے اور چابی حاصل کر لے۔''

''یہ تو اچھا آئیڈیا ہے۔'' مجھے اس کی بات پسند آئی تھی۔

''مکان خریدنے اور بیچنے کے چکر میں کہاں پڑے گا۔ ویسے بھی تیرے دشمن سائے کی طرح پیچھا کرتے ہیں کسی ایک ٹھکانے تک پہنچ جائیں تو وہاں سے فوراً نو دو گیارہ ہو جا۔ چند مہینے کے کرائے کا نقصان ہوگا وہ بھی بعد میں وصول کر سکتا ہے۔''

''بس تو یہ کام تیرے ذمے ہے۔ دونوں شہروں میں کم سے کم ایسے دو ٹھکانے تلاش کر۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اوہ بھائی میں نے تجویز پیش کی تھی۔'' اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''میں اپنی تجویز واپس لیتا ہوں۔''

''بکواس نہ کر دوستوں کا کام کرتے ہوئے تجھے موت آ رہی ہے۔''

''اچھا یار کر دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''اگر ان کی طرف سے کوئی اطلاع آئے تو مجھے بھی بتانا میرا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم لوگوں کا کچھ نہیں جائے گا میرے چار موجود اور پانچویں آنے والے کو کون پالے گا۔''

''پل جائیں گے یار تُو فکر کیوں کرتا ہے سب بانٹ لیں گے آپس میں۔''

''اور میری بیوی کا کیا ہوگا؟'' اس نے بھنا کر کہا۔

''اس کا بھی کوئی ٹھکانہ کر دیں گے۔ بس تُو میرا کام کر۔'' میں نے کہا اور فون بند کر کے وہ نمبر ملایا جو ندیم نے دیا تھا لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔ نہ جانے سفیر نے کس نمبر سے کال کی تھی اگر اس نے کسی سے لے کر یہ کال کی تھی

تب بھی فون بند ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اتنی احتیاط اور ایمرجنسی کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ ملک میں آتے ہی وہ لوگ کسی مشکل کا شکار ہو گئے تھے جس طرح میں نے ان کی آمد کا اندازہ لگا لیا تھا اسی طرح یہ کام دشمن بھی کر سکتا تھا اور شاید اس کے آدمی پہلے ہی ان راستوں پر ناکے لگا کر بیٹھے تھے جہاں سے میرے ساتھی ملک میں داخل ہو سکتے تھے اور اگر ان کا دشمن سے ٹکراؤ ہو چکا تھا تو اس احتیاط کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ ممکن ہے سفیر کے پاس فی الحال موبائل نہ ہو اور صرف سم ہو جسے اس نے کسی دوسرے کے موبائل میں استعمال کیا ہو۔ اب اس کے پاس موقع نہیں تھا کہ وہ کال کر سکتا یا کسی اور طریقے سے ندیم سے رابطہ کر سکتا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا میں نے پہلے ہی ندیم سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ عبداللہ گیا ہوا تھا وہ آتا تو میں اس کی مدد سے اس فون کے بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ اسی کمپنی کی سم تھی جس کی میرے پاس تھی اور میں ہیلپ لائن سے بات کر کے کم سے کم یہ معلوم کر سکتا تھا کہ یہ نمبر کہاں کا تھا۔ میں نے ہیلپ لائن کال کی اور آپریٹر سے نمبر کے بارے میں پوچھا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ نمبر ملک کے کس حصے میں جاری ہوا ہے؟''

''یہ کوئٹہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی سیریل کا نمبر ہے۔'' آپریٹر نے بتایا۔

''یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس نمبر سے آخری کال کب اور کہاں سے کی گئی ہے؟''

''سوری یہ معلومات راز ہوتی ہیں اور ہمیں بھی نہیں معلوم کہ کال کب اور کہاں سے ہوتی ہے۔'' آپریٹر نے معذرت کی۔

''شکریہ۔'' میں نے فون بند کر دیا۔ یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ سفیر اور دوسرے اس وقت کوئٹہ یا بلوچستان میں کہیں تھے یا پھر اسلام آباد آ چکے تھے کیونکہ ندیم سے سفیر کا رابطہ ہوئے چوبیس گھنٹے گزرنے والے تھے اور اتنی دیر میں آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ میں باہر آیا جہاں ایاز گیٹ کے پاس کرسی ڈالے بیٹھا تھا میری معلومات کے مطابق اس نے رات کو ڈیوٹی دی تھی اور بیتو بھی ڈیوٹی پر رہا تھا اور دونوں ہی جاگ رہے تھے میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم لوگ رات بھر کے جاگ رہے ہو نیند نہیں آ رہی؟''

ایاز مسکرایا۔ ''جاگنا بھی کوئی کام ہے جناب...... نیند اس وقت آتی ہے جب جسم تھکن سے چُور ہو جاتا ہے۔''

''تمہیں یہ جاب اچھی لگی ہے؟''

''تب ہی تو یہاں رکا ہوں ورنہ مجھے کسی ایک جگہ ٹک کر کام کرنا پسند نہیں ہے۔ ان لوگوں سے میرا مزاج مل گیا ہے۔''

''کوئی تنخواہ طے ہوئی ہے؟''

جو دیں گے عبداللہ صاحب وہ لے لیں گے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''بس اپنا اور جیپ کا کام چلتا رہے باقی سب خیر ہے۔''

''بس تو خوش رہو۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ''لیکن یاد رکھنا کوئی زبردستی والی بات نہیں ہے جب تمہارا دل چاہے تم چھوڑ کر جا سکتے ہو۔''

''آپ پر بھی کوئی مجبوری نہیں ہے جب دل چاہو کہہ دینا میں چلا جاؤں گا۔''
''میں کسی کو خود سے الگ کرنے والا شخص نہیں ہوں۔''
''میں بھی کسی کو چھوڑ کر نہیں جاتا۔'' وہ مسکرایا۔''شہباز صاحب پہلی بار تو اپنے مطلب کے لوگ ملے ہیں میں چھوڑ کر جانے والا نہیں ہوں۔''
''میرے کچھ اور ساتھی ہیں جو آنے والے ہیں ابھی وہ کہیں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔''
''آپ حکم کریں تو ان کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔''
''وہ یہاں نہیں ہیں بلوچستان یا کسی اور جگہ ہیں۔'' میں نے کہا۔''تم تیار رہنا ممکن ہے ان کو لینے یا ان کی مدد کے لیے جانا پڑے۔''
اسی اثنا میں ہارن بجا اور گارڈ نے جھانک کر گیٹ کھول دیا۔ عبداللہ کی گاڑی اندر آئی تھی۔ یہ منی چیری کار تھی۔ عبداللہ سامان لے آیا تھا۔ ہارن سن کر منیر باہر آیا اور سامان کے تھیلے نکالنے لگا۔ عبداللہ نے اس سے کہا۔
''ان کو حکیم صاحب والے کمرے میں پہنچا دو۔''
منیر سامان لے کر چلا گیا۔ عبداللہ میری طرف آیا۔''کوئی نئی پیش رفت ہوئی ہے؟''
''عتیق کے معاملے میں تو نہیں لیکن میں نے ندیم سے بات کی ہے کل اسے سفیر کی کال آئی تھی وہ پاکستان آ گئے ہیں۔''
''یہ تو اچھی خبر ہے۔''
''اتنی بھی اچھی نہیں ہے اس کے بعد سے ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ جس نمبر سے سفیر نے کال کی تھی وہ کوئٹہ کا ہے اور مستقل بند جا رہا ہے۔''
''اس کا مطلب ہے انہوں نے پاکستان میں آتے ہی سم لے لی تھی۔ نمبر کیا ہے؟''
میں نے اسے نمبر دیا۔''اس کمپنی میں میرا ایک جاننے والا کام کرتا ہے میں اس سے بات کرتا ہوں۔''
عبداللہ نے موبائل نکال کر اس شخص کو کال کی۔''لطیف صاحب میں عبداللہ بات کر رہا ہوں...... جی اللہ کا شکر ہے آپ سنائیں...... ہاں سب خیریت ہے بس آپ سے ایک کام پڑ گیا ہے...... جی ایک نمبر ہے اس کے بارے میں انفارمیشن چاہئیں...... نمبر لکھ لیں...... معلوم یہ کرنا ہے کہ نمبر کب ایشو ہوا اور آخری بار کہاں سے استعمال ہوا تھا...... جی مشکل تو ہے لیکن آپ کے لیے کیا مشکل ہے جناب۔''
اس نے فون بند کر کے میری طرف دیکھا۔''وہ کہہ رہا ہے کہ ذرا مشکل کام ہے لیکن وہ کوشش کرے گا اصل میں اس قسم کا ریکارڈ سینٹرلی ہوتا ہے اور ہر آدمی کی اس تک رسائی نہیں ہوتی ہے۔''
''اگر وہ کہہ رہا ہے کہ وہ کوشش کرے گا تو اس کا مطلب ہے یہ کام اس کے اختیار میں ہے۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے لیکن کوئی رکاوٹ بھی ہو سکتی ہے تبھی اس نے گنجائش رکھی ہے۔''
ہم اندر آئے۔ حکیم قادس عبداللہ کے لائے سامان کا معائنہ کر رہا تھا اور اس نے کچھ کہا۔ عبداللہ نے اسے جواب دیا تو وہ سر ہلانے لگا۔ عبداللہ نے بتایا کہ ایک شے مطلوبہ مقدار میں نہیں تھی۔ یہ اتنی ہی ملی تھی لیکن عبداللہ مزید کے لیے کہہ آیا تھا اور رقم بھی دے آیا تھا باقی مقدار شام تک مل جاتی۔ اتنی دیر میں حکیم نے کمرے میں مزید

دو کوئلے سے چلنے والی انگیٹھیاں منگوالی تھیں اور ان پر مختلف چیزیں مٹی کی ہانڈیوں میں ابل رہی تھیں اور ان سے بخارات اٹھ کر کمرے کی فضا کو دھند آلود کر رہے تھے لیکن یہ دھند کثیف نہیں تھی بلکہ اس میں ایک کیف آور خوشبو تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ تمام انگیٹھیاں عتیق کے آس پاس تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے حکیم ان نباتات کے بخارات اسے دے رہا ہو۔ بیتو نے اس کی ہدایت پر کمرے میں ہوا کی آمد و رفت کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ کھڑکیوں اور روشن دان کو مکمل طور پر بند کر دیا تھا اور اگر کہیں سوراخ تھا تو اسے ٹیپ لگا دیا تھا۔ دروازے کے نیچے موٹا کپڑا لگا کر اسے بھی سیل کر دیا تھا۔ اس کے باوجود اندر گھٹن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حکیم یقیناً سانس کے ذریعے اسے کوئی دوا دینے کی تیاری کر رہا تھا کیونکہ اس نے ایک لکڑی اور ربر کا بنا کیف نما آلہ بھی نکالا تھا جس کا اگلا سرا انسان کے منہ سے لگایا جا سکتا تھا۔ عتیق سمیت وہاں پانچ افراد تھے۔ حکیم نے عبداللہ سے کچھ کہا۔ اس نے بتایا۔

''یہ کہہ رہا ہے کہ کوئی دو افراد باہر چلے جائیں۔''

عتیق کا علاج ہو رہا تھا اور حکیم قادس اس کا علاج کر رہا تھا اور بیتو اس کا نائب بنا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے اور عبداللہ کو باہر جانا پڑا تھا۔ ہمارے باہر آتے ہی بیتو نے دروازہ پوری طرح بند کر دیا تھا۔ بیتو نے بعد میں انکشاف کیا کہ وہ حکیم قادس کی زبان کسی حد تک سمجھتا ہے کیونکہ وہ بھی پہاڑی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس کی زبان پاکستان میں ہمالیہ کے علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں سے ملتی جلتی تھی۔ رفیق بھائی بھی باہر موجود تھے انہوں نے پوچھا۔

''حکیم کیا کر رہا ہے؟''

''وہ شاید عتیق کو سانس کے راستے بخارات دے رہا ہے کیونکہ اس نے پورا کمرہ سیل کر دیا ہے اور ہمیں بھی باہر نکال دیا ہے۔''

رفیق بھائی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن تم لوگ میرے بچے کے لیے جو کر رہے ہو اس کا احسان میں ساری عمر بھی نہیں اتار سکوں گا۔''

''رفیق بھائی۔'' میں نے شکوہ کیا۔ ''عتیق صرف آپ کا ہی بیٹا نہیں ہے آپا اور شمی کے ناطے وہ میرا بھی بہت کچھ لگتا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے دل میں اتر جاتے ہیں عتیق بھی ان میں سے ایک ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کا انسان کسی کے لیے اتنی بے غرضی سے کام نہیں کرتا ہے جیسے تم لوگ کر رہے ہو۔''

''میری غرض تو واضح ہے۔ عتیق شمی کا دلہا بنے یہ میری سب سے بڑی غرض اور خواہش ہے۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے۔'' وہ بولے۔ ''بس میرا بچہ ایک بار زندگی کی طرف لوٹ آئے تو میں اس سے وابستہ تمام خوشیاں پوری کروں گا۔''

''اللہ نے چاہا تو ایسا ضرور ہوگا۔'' میں نے کہا۔ رفیق بھائی وہیں کمرے کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئے تھے میں اور عبداللہ باہر آ گئے۔ مجھے خیال آیا۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ اس کا تعاقب کس نے کیا تھا اور

اس نے کس طرح تعاقب کرنے والے سے پیچھا چھڑایا تھا جب وہ عتیق کو لے کر آ رہا تھا۔ وہ ہنسا۔ ''ایک کار پیچھے لگ گئی تھی۔ رش میں تو پتا نہیں چلا لیکن جب سنسان سڑکوں پر آئے تو واضح ہو گیا۔ مزید پکا کرنے کے لیے میں نے وین اور ایمبولینس کو بلا وجہ سڑکوں پر گھمایا۔ پھر میں نے اس کے راستے میں وہی ٹائر کلر پھینک دیا۔ اگر رفتار زیادہ ہوتی تو کار الٹ بھی سکتی تھی لیکن اس کی بچت ہو گئی۔

''وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں تم نے ٹائر کلر پھینکا تھا؟''

''کوئی ایک ڈیڑھ کلومیٹر ہو گی۔''

''یہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ جب کہ یہاں آنے والی سڑکیں بھی بس دو ہیں۔ وہ اس علاقے کو فوکس کر کے تلاش کر سکتے ہیں۔''

''میرے خیال میں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''دشمن کو کبھی کمزور مت سمجھو اور کوئی کام نہ ممکن نہیں ہوتا ہے اگر آدمی اسے کرنے کا ارادہ کر لے تو۔''

''پھر بھی یہ جگہ وہاں سے بہت دور ہے۔'' عبداللہ نے اصرار کیا۔

''ہو سکتا ہے لیکن اگر دشمن کئی گاڑیوں کے ساتھ آس پاس کی آبادیوں میں چکر لگانا شروع کر دے تو صرف گیٹ سے جھانکنے پر اسے وین نظر آ جائے گی اور اس کا نمبر ان کے پاس ہو گا۔''

عبداللہ تشویش زدہ ہو گیا۔ ''نمبر کی تو خیر ہے جب بھی کسی خاص کام سے نکلتے ہیں تو نمبر ہر بار مختلف ہوتا ہے لیکن وین تو وہی ہے۔ میں اسے گیراج میں کھڑا کروا دیتا ہوں۔''

''بالکل اور اپنے گارڈ سے کہو کہ گلی سے گزرنے والی گاڑیوں پر نظر رکھے۔ خاص طور سے ایسی گاڑیوں پر جو گیٹ کے سامنے رکیں اور ان میں موجود افراد کوٹھی کا معائنہ کریں۔ اگر کسی پر شک ہو تو فوراً تم کو اطلاع دے۔''

''میں کہہ دیتا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا اور گیٹ کی طرف چلا گیا۔ عبداللہ کا رویہ بھی ٹھیک تھا کیونکہ وہ خاص آدمی ہوتے ہوئے بھی اب تک زیادہ تر عام زندگی گزارتا رہا ہے۔ جب کہ میں عام آدمی ہونے کے باوجود مسلسل ایک خاص اور فکرمند زندگی بسر کر رہا تھا اس لیے معمولی سی بات بھی میرے ذہن کو کھٹکتی تھی جو کسی دوسرے کے لیے بالکل عام سی بات ہوتی تھی مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اکثر جس بات پر میں کھٹک جاتا تھا وہ درست ثابت ہوتی تھی۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا کہ عبداللہ نے تعاقب کرنے والی گاڑی سے کہاں پیچھا چھڑایا تھا۔ اس نے جو بتایا تھا وہ میرے لیے فکرمندی کی بات تھی اگرچہ عبداللہ کے لیے اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی لیکن جب وہ گیٹ سے واپس آیا تو پریشان لگ رہا تھا اس نے آتے ہی کہا۔

''شہباز صاحب ایسا لگ رہا ہے آپ کی بات درست ہونے والی ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ایک کار میں سوار دو افراد نے گیٹ کے سامنے رک کر گارڈ سے ایک پتا دریافت کیا ہے۔ پتا پچھلی گلی کا ہے لیکن گارڈ کا کہنا ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر جھانک رہے تھے۔ جب گارڈ نے ذرا سخت لہجے میں ان سے بات کی تو وہ واپس گئے تھے۔''

''شاید یہ مرشد کے آدمی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''گارڈ کو وہ پتا یاد ہے جو وہ پوچھ رہے تھے اور کیا اس وقت یہ وین یہیں کھڑی تھی؟''

''دوسرے سوال کا جواب ہے ہاں وین یہیں کھڑی تھی اور پہلے سوال کا میں معلوم کر کے آتا ہوں۔''

''ایک منٹ اگر گارڈ کو پتا یاد ہے تو منیر کو بھیج کر اس گھر سے معلوم کرو کہ ابھی ان کے باہر سے دو افراد ایسی گاڑی میں آئے ہیں؟''

عبداللہ گیٹ کی طرف چلا گیا اور کچھ دیر بعد اندر سے منیر نکل کر گیٹ کی طرف گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گارڈ کو پتا یاد تھا اور اب منیر معلوم کرنے جا رہا تھا۔ اگر آنے والے مرشد کے آدمی تھے تو اس کا مطلب تھا کہ ہم سب شدید خطرے میں تھے۔ عبداللہ گیٹ کی طرف سے آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

''اس سے پہلے منیر آئے تم احتیاطی تدابیر کرلو اور سب مسلح ہو جائیں۔ گارڈ سے کہو گیٹ کو پوری طرح بند کر دے اور اگر تم نے کوٹھی کے باہر کیمرے لگا رکھے تو ان کو پوری طرح سے فعال کر دو اور کوئی نہ کوئی ان کی مستقل نگرانی کرے۔''

''باہر صرف ایک کیمرہ ہے جو گیٹ پر سامنے آنے والے کو دکھاتا ہے۔''

''کیا دو کیمرے ایسے لگ سکتے ہیں جو گلی کو دائیں بائیں سے دکھائیں؟''

''لگ سکتے ہیں کیونکہ اتفاق سے گھر کے بالکل سامنے کھمبا ہے۔ اس پر لگائے جا سکتے ہیں۔''

''تب فوری یہ کام کرو اگر خطرہ نہ بھی ہوا تو بعد میں کام آئیں گے۔''

عبداللہ اندر گیا۔ کوٹھی میں سامان سارا تھا۔ وہ اندر سے دو عدد مزید چھوٹے نگرانی کرنے والے کیمرے نکال کر لایا۔ وائرنگ کے لیے سوئچ مین گیٹ کے اندر لگا تھا یہاں سے کیمروں کو بجلی اور ڈیٹا کورڈ کا کنکشن دیا جا سکتا تھا۔ دس منٹ بعد منیر آ گیا تھا اور اس نے جو بتایا اس سے میرے خدشات کو مزید تقویت ملی تھی۔ اس گھر والوں نے انکار کیا تھا کہ ان کے ہاں کسی نے آنا تھا یا اس حلیے اور گاڑی والے دو افراد آئے تھے۔ عبداللہ کمپیوٹر کا ماہر تھا وہ خود یہ کام کر رہا تھا۔ منیر سے رپورٹ میں نے لی تھی۔ میں گیٹ کی طرف کم ہی جاتا تھا کیونکہ میرا چہرہ دشمنوں کے لیے سب سے زیادہ مانوس تھا اور وہ میری تلاش میں ہی اس طرف آتے۔ عبداللہ نے اپنا کام آدھے گھنٹے میں نمٹا لیا تھا۔ وہ اندر آیا۔

''اب ان کیمروں کو کمپیوٹر سے منسلک کرنا ہوگا۔''

اس کے پاس سی سی ٹی وی سے زیادہ جدید سسٹم تھا کیونکہ اس میں کیمروں کی تعداد محدود ہو جاتی ہے جب کہ کمپیوٹر سے منسلک ہونے کی صورت میں کیمروں کی تعداد محدود نہیں تھی۔ عبداللہ نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بتایا کہ ان دو کیمروں کے اضافے سے کیمروں کی کل تعداد پندرہ ہو جائے گی۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور اس میں کیمروں کی سیٹنگ کرنے لگا۔ یہ ذرا بڑا اور طاقتور کمپیوٹر تھا جو بیک وقت کئی کام کر سکتا تھا، اس زمانے میں پینٹیم فور کمپیوٹرز آ گئے تھے لیکن یہ ان سے بھی آگے کی کوئی چیز تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ یہ خصوصی کمپیوٹر اور اس کے لوازمات کوئی پانچ لاکھ روپے میں آئے تھے۔ کمپیوٹر آن کر کے اس نے کیمرے اس میں انسٹال کیے اور ان کی کارکردگی چیک کرنے لگا۔ کیمروں کا رزلٹ اچھا تھا۔ ان میں زوم نہیں تھا لیکن ان کی تصویر بہت واضح تھی۔ گلی میں ایک کار داخل ہوئی تو پچاس فٹ کے فاصلے سے اس کا نمبر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوٹھی گلی کے وسط میں تھی اور دونوں طرف کوئی دو سو فٹ کی گلی تھی۔ کیمروں سے دونوں طرف گلی بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی اور اب کوئی

گاڑی نظروں میں آئے بغیر نہ تو یہاں آسکتی تھی اور نہ یہاں سے جاسکتی تھی۔ ایک کیمرہ گیٹ پر لگا تھا۔ چھ عدد کوٹھی کے چاروں طرف باہر لگے تھے اور باقی کیمرے اندر لگے تھے۔ ایک آدمی یہاں بیٹھ کر آرام سے پوری کوٹھی اور اس کے آس پاس کی نگرانی کر سکتا تھا۔ بتیس انچ کے ایل سی ڈی مونیٹر پر بیک وقت چھ کیمروں کی تصویریں دیکھی جاسکتی تھیں اور ایک سوفٹ ویئر کی مدد سے مانیٹر پر خود بہ خود کیمرے بدلتے رہتے تھے اور نگرانی کرنے والے کو مینولی بدلنا نہیں پڑتے تھے البتہ وہ کوئی خاص کیمرہ مانیٹر پر رکھنا چاہتا تو اسے بس ایک بٹن دبانا پڑتا۔ عبداللہ نے منیر کو بلالیا تھا۔

''خود کار رائفلیں نکالو۔''

''کتنی؟'' اس نے پوچھا۔

''چار عدد مزید نکال لو۔'' عبداللہ نے اسے بتایا۔ کوٹھی میں چار عدد گارڈز تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ یہ چار عدد رائفلیں یقیناً میرے، بیتو، ایاز اور عبداللہ کے لیے تھیں۔ منیر سمیت نو مسلح افراد کسی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھے لیکن اس کے لیے ضروری تھا ہم پہلے سے تیار ہوں۔ عبداللہ کے ساتھی عام طور سے تہہ خانے میں رہتے تھے اور وہاں سے صرف ضرورت کے وقت ہی باہر آتے تھے لیکن اس وقت عبداللہ نے ان کو اوپر بلوالیا اور ان کی ڈیوٹیاں کوٹھی کے مختلف حصوں میں لگا دیں۔ طے ہوا کہ چار افراد مستقل پہرے پر رہا کریں گے اور آٹھ آٹھ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔ چار میں سے دو ہمہ وقت گیٹ پر رہا کریں گے اور باقی دو کوٹھی کے اندر گشت کرتے رہیں گے خاص طور سے پچھلے حصے پر نظر رکھیں گے کیونکہ اس طرف ایک چھوٹی سی گلی تھی اور دیوار کوئی دس فٹ اونچی اور خاردار باڑھ سے ڈھکی تھی۔ اس طرف سے کسی کا آنا آسان نہیں تھا لیکن زیادہ مشکل بھی نہیں تھا خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو اندر داخل ہونے کا فیصلہ کرلیں۔ عبداللہ نے دو کیمرے اس طرف کی نگرانی کے لیے بھی لگا رکھے تھے۔ پھر کوٹھی کے اس حصے سے عمارت کے اندر براہِ راست داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک راستہ دائیں طرف باغ کے ساتھ کچن میں داخلے کا تھا۔ اس پر بھی فولادی جالی والا دروازہ تھا۔ ایک راستہ سامنے کی طرف سے تھا۔ ان کے علاوہ عمارت میں کسی جگہ سے داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ بشرطیکہ کوئی گرل یا کھڑکی نہ توڑ دی جائے اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس لحاظ سے کوٹھی بہت محفوظ تھی۔

''آپ کا کیا خیال ہے دشمن اندر گھسنے کی کوشش کرے گا؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے وہ اس کے بجائے کوئی ایسا حملہ کرے گا جس میں یہاں تباہی پھیلانے کے لیے اسے اندر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔'' میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ''اس کی کوشش ہوگی ہمیں یہاں سے نکالے اور کہیں باہر گھیرے۔''

''اس صورت میں ہماری حکمتِ عملی کیا ہونی چاہیے۔''

''عبداللہ میرا خیال ہے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ کیونکہ میں یہاں نہیں ہوں گا تو اس کا امکان کم ہے دشمن یہاں حملہ کرے۔''

''اسے بھلا کیسے پتا چلے گا کہ آپ یہاں نہیں ہیں؟''

''اس کی بھی کوئی تدبیر کی جاسکتی ہے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''فی الحال تم ایک کام کرو۔ اپنے آدمیوں

میں سے دو کو کوٹھی کے آس پاس رہنے کو کہو۔ وہ نظروں سے اوجھل رہیں اور کسی بھی حملے کی صورت میں وہ عقب سے حملہ آوروں پر حملہ کر سکتے ہیں۔''

''یہ ہو سکتا ہے۔'' عبداللہ بولا۔

''بس تو اس پر بھی عمل کرو۔ اگر مرشد جان گیا ہے کہ میں یہاں ہوں یا یہ جگہ میرا ٹھکانہ ہے تو وہ یہاں آج رات ہی حملہ کرا سکتا ہے۔ اگر آج رات سکون سے گزر جائے تو سمجھ لو کہ اسے یقین نہیں ہے۔''

عبداللہ کو کمپیوٹر اور کنٹرول سسٹم کے ساتھ الجھا چھوڑ کر میں باہر آیا۔ مجھے بیتو سے بات کرنی تھی اور وہ حکیم کے پاس تھا میں کمرے تک آیا تو وہ بدستور سیل تھا اور رفیق بھائی باہر بیٹھے تھے۔ میں ان سے بات کر رہا تھا کہ زرین نے گیلری میں جھانکا اور مجھے متوجہ پا کر اشارہ کیا۔ رفیق بھائی اسے نہیں دیکھ سکے تھے میں ان سے معذرت کر کے زرین کے پیچھے آیا۔ وہ گیلری کے باہر میری منتظر تھی۔ اس نے میرا بازو پکڑا۔

''میرے ساتھ آؤ۔''

''کہاں؟''

وہ میرا سوال سنے بغیر مجھے اپنے کمرے کی طرف لے آئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں انجان بنا۔

''منیر نے تہہ خانے سے رائفلیں نکالی ہیں اور گارڈز بھی اوپر آ گئے ہیں۔ کوئی خطرے کی بات ہے؟''

''کیسا خطرہ؟''

''مجھے لگ رہا ہے جیسے کچھ ہوا ہے۔'' وہ فکر مند تھی۔ ''کیا آس پاس مرشد کا کوئی آدمی نظر آیا ہے۔''

میں اس کے اندازے پر ایک لمحے کے لیے حیران ہوا تھا۔ ''ایسی بات نہیں ہے یہ سب احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا جا رہا ہے۔''

''تو پہلے کیوں نہیں کیا تھا؟''

''بابا ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کل سے سب کتنا بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔''

''سب تو نہیں بس عبداللہ لگا ہے۔ ہاں باقی سب ابھی کچھ دیر پہلے حرکت میں آئے ہیں۔'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''شہباز تم ٹھیک کہہ رہے ہو نا؟''

''فرض کرو اگر یہاں مرشد کے آدمیوں کی طرف سے حملے کا خطرہ بھی ہے تب بھی تم کیا کر سکتی ہو۔''

''اس صورت میں مجھے بھی کوئی ہتھیار دو۔''

''تمہیں چلانا آتا ہے۔''

''خودکار چلانا کون سا مشکل کام ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''میں کسی صورت دوبارہ مرشد کے پاس نہیں جاؤں گی۔''

''تم فکر مت کرو تم یہاں محفوظ ہو جب تک ہم زندہ ہیں تمہیں ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

زرین کی آنکھوں سے نمی جھلکنے لگی تھی۔ ''میں جانتی ہوں اور تم لوگوں کے ساتھ خود کو محفوظ بھی سمجھتی ہوں

لیکن ماضی کی یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں رات کو خوابوں میں ڈراتی ہیں اور جب ڈر کر میری آنکھ کھل جاتی ہے تو میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔''

''تم اکیلی نہیں ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''شہباز۔'' اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔'' مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھو گے۔کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے نا؟''

''جب تک میرے بس میں ہوا۔'' میں نے خلوص سے کہا۔''لیکن بندہ بشر ہوں۔ممکن ہے کبھی حالات کے آگے مجبور ہو جاؤں۔''

''اس صورت میں شاید میں زندہ نہ رہوں۔''

''تم بار بار مرنے کا کیوں سوچتی ہو؟''

''کیونکہ ان چند دنوں کو چھوڑ کر مجھے اپنی زندگی صرف غلاظت کا ڈھیر لگتی ہے اور میں اس ڈھیر میں واپس نہیں جانا چاہتی ہوں۔''

''تمہیں کوئی جانے بھی نہیں دے گا۔'' میں نے کہا۔''اب ساری فکریں چھوڑو اور کافی بنا کر پلاؤ۔ میں نے بہت کم لوگوں کو اتنی اچھی کافی بناتے دیکھا ہے۔''

''مرشد کو کافی پسند ہے اور وہ جب آتا تھا مجھ سے بار بار بنواتا تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی میں اچھی کافی بنانے لگی تھی۔جو ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے اب میں تم کو کافی بنا کر دے رہی ہوں۔''

ان دو دنوں میں وہ مزید نکھر گئی تھی۔جسم اور اس کے ساتھ اس کی روح کے گھاؤ بھی خاصی حد تک بھر گئے تھے۔چہرے پر آنے والے نیل مٹ چکے تھے۔ان دو دنوں میں اس کی صحت بھی بہتر ہوئی تھی اور اتنی تیزی سے میں نے کسی کی صحت بہتر ہوتے نہیں دیکھی تھی۔میں کمرے سے جانے لگا تو اس نے عقب سے آواز دی۔

''اے سنو۔''

میں پلٹا۔''ہاں کہو۔''

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے شرمیلے انداز میں پوچھا۔اس نے سیاہ ٹراؤزر کے ساتھ گلابی رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی اور یہ کسی قدر اس کے بدن پر چست تھی اس لیے اچھی لگ رہی تھی اور اصل میں تو خوب صورت وہ تھی اس لیے ہر لباس اس پر اچھا لگتا تھا۔میں نے غور سے اسے دیکھا اور بولا۔''اچھی لگ رہی ہو۔''

''صرف اچھی؟'' اس نے شکوہ کیا۔

میں مسکرایا۔''نہیں بہت اچھی لگ رہی ہو لیکن اب یہ مت پوچھنا کہ کتنی اچھی لگ رہی ہو میں بتا نہیں سکوں گا۔''

''آج میں کوئی خاص چیز بنانا چاہ رہی ہوں تم اپنی پسند بتاؤ گے؟''

''ہاں کیوں نہیں بہت دن ہو گئے پلاؤ کھائے ہوئے اور ساتھ میں چکن کارن سوپ بھی مل جائے تو کیا بات ہو گی۔''

''اللہ تمہاری پسند کتنی سادہ ہے۔'' وہ ہنسی۔''میں نے محسوس کیا ہے تم کھانے میں سادہ چیزیں پسند کرتے ہو۔''

''ہاں اصل میں تو میں دیہاتی آدمی ہوں اس لیے سادہ کھانے پسند کرتا ہوں۔''

''میں ابھی بناتی ہوں۔'' اس نے کچن کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔ ''کافی کہاں دوں تم کو؟''

''کمپیوٹر والا کمرہ دیکھا ہے وہاں لے آنا۔''

عبداللہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس نے اپنا ایک آدمی بھی نگرانی کے لیے بلوالیا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ کون سا کیمرہ کس طرح سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اب یہاں چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی نگرانی کے لیے موجود رہا کرتا۔ میں نے وہ نمبر ملایا جو سفیر کے پاس ہوسکتا تھا لیکن وہ بدستور بند جا رہا تھا۔ زرین کافی لائی۔ میں کافی لے کر عتیق کے کمرے کے باہر آیا۔ دروازہ کھل گیا تھا کیونکہ رفیق بھائی اندر تھے۔ میں بھی اندر آ گیا۔ حکیم قادس اپنا کام مکمل کر کے دوائیں رکھ رہا تھا اور اس نے انگیٹھیاں بجھا دی تھیں۔ کھڑکیوں کی سیل کھول دی تھی تاکہ کسی قدر تازہ ہوا اندر آئے میں نے سوالیہ نظروں سے بیتو کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پاس آیا۔

''حکیم نے کچھ بتایا نہیں پر اس کے انداز سے لگتا ہے کہ یہ مطمئن ہے۔''

''اس نے کیا کیا تھا؟''

''عتیق بھائی کے منہ پر وہ آلہ لگا کر جڑی بوٹیوں کا بھاپ دیا تھا۔ بہت دیر تک دیا۔ پھر اس کا زخم صاف کر کے دیکھا اور دوبارہ مرہم لگایا تھا۔''

''اسے کچھ کھانے کو دیا ہے؟''

''ہاں ایک سبز سوپ نما چیز پلایا ہے۔'' بیتو نے سر ہلایا۔ ''اس کا کہنا ہے اس سے عتیق بھائی کا پیٹ بھی بھرے گا اور اس کا کمزوری بھی دور ہو گا۔''

''حکیم سے پوچھو کہ یہ عتیق کی حالت سے کس حد تک مطمئن ہے؟''

بیتو نے اس سے سوال کیا اور پھر مجھے بتایا۔ ''اس کا کہنا ہے پہلا مرحلہ اچھا ہوا ہے اب یہ شام کو دوسرا علاج کرے گا۔''

''دوسرا علاج؟''

''مطلب یہ کہ دوسرا مرحلہ شروع کرے گا۔'' بیتو نے دانت نکالے۔

حکیم قادس بوڑھا آدمی تھا اگرچہ اس کی صحت اچھی تھی لیکن پھر بھی وہ جوان آدمی کی طرح محنت نہیں کر سکتا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی مشقت نے اسے تھکا دیا تھا۔ سامان سمیٹ کر اس نے اپنا بستر سنبھالا اور لیٹ کر سو گیا۔ ایک منٹ میں اس کے ہلکے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے تھے۔ عتیق اسی طرح فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک معمولی سا کھیس بچھا ہوا تھا اور اوپر ایک ہلکا کمبل تھا۔ اندر سردی کم تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی کہ فرش پر لیٹ کر اور ہلکے کمبل سے کام چل جاتا۔ یقیناً حکیم نے کسی خاص وجہ سے اسے سرد فرش پر لٹایا تھا۔ ہم باہر آ گئے۔ بیتو تھک گیا تھا اور اسے حسبِ معمول بھوک بھی لگ گئی تھی اس لیے وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ واپسی پر وہ خوش تھا۔

''آج تو زرین دیدی اسپیشل کھانا بنا رہا ہے۔''

''کس خوشی میں؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''آج اس کا جنم دن ہے۔'' بیتو نے بتایا۔

''واقعی؟'' میں چونکا۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''دیدی نے...... وہ دکھی تھا ہم نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا جنم دن ہے اور کسی نے اسے پیدا ہونے کا بدھائی نہیں دیا۔''

مجھے بیتو کی بات پر ہنسی آ گئی۔ ''کوئی بات نہیں ابھی جا کر اسے پیدا ہونے کی بدھائی دے دیتے ہیں۔''

بیتو سنجیدہ ہو گیا۔ ''شوبی بھائی کیا کسی کو جنم دن کا مبارک خالی ہاتھ دیا جاتا ہے۔''

''نہیں لیکن اسے کیا دوں؟''

''کچھ تو دو نا۔'' اس نے اصرار کیا۔

''فی الحال تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور کچن کی طرف آیا۔ زرین تن دہی سے کھانے کی تیاری میں مگن تھی۔ اچانک میری نظر کچن سے باہر باغ کی طرف گئی اور میں دبے قدموں زرین کے پیچھے سے گزر کر باغ میں آیا۔ کچھ دیر بعد میں واپس اندر آیا تو زرین مجھے دیکھ کر چونکی۔

''تم۔''

''ہاں میں۔'' میں نے کہا اور ہاتھ آگے کر دیا۔ ''ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔''

وہ پھول دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ''تھینک یو۔'' اس نے پھول لیے۔ ''تمہیں یقیناً بیتو نے بتایا ہوگا۔''

''ہاں تم نے اسے بتایا اور اس نے مجھے بتایا ویسے تم مجھے براہِ راست بھی تو بتا سکتی تھیں۔''

اس نے رخ موڑ لیا۔ ''تمہارے خیال میں بیتو کو اس لیے بتایا تھا کہ وہ تمہیں بتا دے۔''

''یقین تو نہیں لیکن شک ہے۔''

''کیا تمہیں برا لگا ہے؟''

''اگر مجھے برا لگا ہوتا تو میں تمہیں تحفے میں پھول پیش نہ کرتا۔''

''نہیں مجھے لگ رہا ہے تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگی ہے۔''

''ایسا نہیں مس زرین...... اگر تمہاری سال گرہ ہے اور تم نے بتا دیا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ بلکہ اچھا ہے نا تمہاری سال گرہ سیلی بریٹ کر لیں گے۔''

وہ خوش ہو گئی۔ ''باہر چل کر؟''

میں ہچکچایا۔ ''اگرچہ باہر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن تمہاری یہ خواہش ہے تو ہم باہر بھی جا سکتے ہیں۔''

وہ مرجھا گئی۔ ''خطرہ ہے تو پھر رہنے دو۔''

مجھے افسوس ہوا یہ بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ''نہیں ہم جا سکتے ہیں۔''

''تم نے کہہ دیا یہی کافی ہے۔'' اس نے ایک طرف چھلکا اتار کر رکھی پیاز کترنا شروع کر دی۔

''اب شاید تمہیں میری بات بری لگی ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیا۔

''نہیں تو۔'' اس نے آنکھیں صاف کیں۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ابھی حالات باہر جانے کے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔''

پھر وہ یوں شدت سے کاموں میں مصروف نظر آنے لگی جیسے اسے وہاں میری موجودگی کی خبر ہی نہ ہو اور میں کچن سے نکل آیا۔ مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ یہ لڑکی میرے ساتھ نارمل انداز میں کیوں نہیں پیش آ رہی تھی ضروری ہے کہ بلا وجہ کی جذباتیت شامل کی جائے اور عام سی بات کو بھی پیچیدہ بنا کر پیش کیا جائے۔ شاید وہ جن اذیتوں سے گزر کر آئی تھی انہیں بھلانے کے لیے میرے ساتھ یوں پیش آ رہی تھی۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی اور ضروری نہیں ہے کہ سہارا صرف جسمانی ہو۔ اس سے کہیں زیادہ ضرورت انسانوں کو نفسیاتی اور ذہنی سہارے کی ہوتی ہے۔ زرین کو بھی نفسیاتی سہارے کی ضرورت تھی اور کیونکہ یہاں اس سے سب سے قریب میں تھا اس لیے وہ یہ سہارا مجھ سے چاہتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد بیتو نے جھانکا۔

''شوبی بھائی کھانا لگ گیا ہے۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا مجھے سچ مچ بھوک نہیں تھی۔ حالانکہ زرین نے میری فرمائش پر پلاؤ بھی بنایا تھا۔ بیتو شانے اچکا کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد ہی زرین نازل ہو گئی۔

''تم کھانے پر کیوں نہیں آ رہے ہو؟''

''ابھی بھوک نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے میں نے اتنی محنت سے کس کے لیے بنایا ہے۔''

''کھانے والے اتنے سارے لوگ ہیں۔''

''لیکن تم نہیں کھاؤ گے تو میری محنت کا صلہ تو نہیں ملے گا۔'' اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔ ''کیا تم مجھ سے اس حد تک چڑنے لگے ہو کہ میرے ہاتھ کا بنا کھانا بھی نہیں کھانا چاہتے۔''

میں کسی قدر بوکھلا گیا کیونکہ وہ رونے کا اسٹارٹ لینے والی تھی۔ ''ارے بابا...... یہ بات نہیں ہے۔''

''یہی بات ہے۔'' اس نے رونا شروع کر دیا۔

''اف...... زرین پلیز...... کوئی آ جائے گا۔'' میں نے اسے چپ کرانے کے زبانی جتن شروع کیے۔ پھر عملی اقدامات پر آنا پڑا اور وہ سب کرنا پڑا جو ایک آدمی کو ایک روتی عورت کو چپ کرانے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ خدا خدا کر کے وہ چپ ہوئی اور پھر مسکرانے لگی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر میں جھینپ گیا۔ پھر جلدی سے کہا

''شکر ہے تمہارے چہرے پر مسکراہٹ تو نظر آئی۔ بڑے جتن کرنے پڑے ہیں۔''

اس بار وہ شرما گئی۔ ''تم نا......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا میں؟''

''بدتمیز۔'' اس نے کہا اور کمرے سے تقریباً بھاگ گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دوران میں کوئی وہاں آیا نہیں تھا ورنہ اسے اچھے خاصے سین دیکھنے کو مل جاتے اور میری ساری ساکھ خاک میں مل جاتی۔ اگرچہ میری نیت بالکل درست تھی اور اس میں کہیں بھی خرابی نہیں تھی۔ میں صدق دل سے اس کی بہتری کے لیے کوشش کر رہا تھا اور اس بار یہ کوششیں عملی حدود میں داخل ہو گئی تھیں۔ خاتون نے جاتے جاتے بدتمیز کا خطاب دے کر تسلیم کر لیا تھا کہ میری کوششیں اثر انگیز تھیں۔ میں مسکراتے ہوئے باہر آیا اور وہاں بیتو کو موجود پا کر گڑبڑا گیا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

''بیتو تم......؟''

''شوبی بھائی ابھی دیدی کسی گائے کی طرح بھاگ کر گیا ہے۔''

''ہاں......وہ مجھے نہیں معلوم۔''

اس نے شک سے دیکھا۔ ''ابھی کمرے سے نکلا ہے آپ بھی ادھر سے آ رہا ہے اور آپ کو نہیں معلوم؟''

''میرا مطلب یہ ہے برخوردار کہ مجھے اس کے گائے کی طرح فرار کی وجہ نہیں معلوم ہے۔''

بیتو معنی خیز انداز میں مسکرایا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے سیدھا ہو گیا۔

''وہ آپ کو عبداللہ بھائی تلاش کرتا ہے، کھانے کا واسطے۔''

میں ڈائننگ روم میں آیا۔ وہاں کھانے کی میز پر عبداللہ کے ساتھ رفیق بھائی بھی تھے۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ زرین نے واقعی دل لگا کر پلاؤ اور دوسری چیزیں تیار کی تھیں۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں کھاتی تھی لیکن آج اس کی سال گرہ تھی اور اگر وہ ہمارے ساتھ کھانا کھاتی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا میں نے بیتو سے کہا۔

''زرین کو بلا لو وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے گی۔''

''ہم ابھی بلاتا ہے۔'' بیتو خوش ہو گیا تھا۔ وہ گیا اور تقریباً زبردستی زرین کو لے آیا۔ وہ جھینپ رہی تھی۔ اس نے منمنا کر کہا۔

''میں الگ سے کھا لیتی۔''

''تم الگ بھی کھا سکتی ہو لیکن آج تمہاری برتھ ڈے ہے اس لیے سب کے ساتھ کھانے میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔'' میرے بجائے عبداللہ نے کہا تو وہ ایک کرسی پر ٹک گئی۔ اس نے تھوڑا سا کھایا اور کھڑی ہو گئی۔

''آپ لوگ کھائیں مجھے کچھ دوسرے کام بھی ہیں۔''

میں نے یا کسی نے اصرار نہیں کیا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔ جب ہم نے کھانا کھا لیا تو منیر نے آ کر برتن اٹھائے اور میز صاف کی۔ ''آپ ابھی یہیں رکیں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں کوئی خاص آئٹم بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

منیر نے سر ہلایا۔ ''بالکل ہے......بہت خاص آئٹم ہے۔''

کچھ دیر بعد زرین طشتری میں بڑا سا کیک اٹھا کر لائی۔ یہ پائن ایپل کریم چاکلیٹ کیک تھا اور یقیناً گھر میں بنا تھا۔ اس نے میز پر لا کر رکھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم نے خود بنایا ہے؟''

''ہاں میں نے خود بنایا ہے۔'' وہ فخر سے بولی۔

''یہ تو بالکل بیکری کا کیک لگ رہا ہے۔'' رفیق بھائی نے بھی تعریف کی۔

''آپ سب کھا کر بتائیں کہ کیسا ہے؟''

''وہ بھی بتاتے ہیں لیکن پہلے تم اسے کاٹو۔'' عبداللہ بولا۔ اس نے ایک چھری زرین کی طرف بڑھا دی۔ جب سے عبداللہ نے مجھ سے زرین کے مستقبل کے بارے میں کی تھی اور اس نے سن لی تھی تب سے وہ عبداللہ سے کچھ کھنچ گئی تھی۔ اس بار بھی اس نے عبداللہ کی طرف دیکھے بغیر بادلِ ناخواستہ انداز میں اس سے چھری لی اور کیک پہ رکھ کر اسے کاٹ دیا۔ ہم سب نے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو گایا۔ پھر اس نے کیک کے پیس کر کے سب کو سرو

کیے۔ میں نے اسے چکھا اور بے ساختہ کہا۔

''کیک سچ مچ بہت مزے کا ہے۔''

''سچ میں؟'' زرین خوش ہوگئی تھی۔

''سو فی صد سچ ہے۔''

پھر بیتو اور اس کے بعد سب نے تعریف کی تھی۔ کیک خاصا بڑا تھا اور ہم سب نے بمشکل اس کا چوتھائی حصہ کھایا تھا لیکن ابھی کھانے والے بہت تھے۔ منیر اور دوسرے لوگ اپنی ڈیوٹیوں کے لحاظ سے باری باری کھاتے تھے۔ زرین باقی کیک لے گئی۔ کچھ دیر بعد میں اسے کافی کا کہنے گیا تو وہ کچن میں نہیں تھی اور منیر برتن دھو رہا تھا۔ میں نے زرین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''اپنے کمرے میں ہوں گی۔ صبح سے کام کر رہی تھیں میرا خیال ہے اب آرام کر رہی ہوں گی۔''

''تب تم فارغ ہو کر کافی بنا دینا۔'' میں نے کہا اور زرین کی کمرے کی طرف آیا۔ دستک کے جواب میں اس نے پوچھا۔

''کون ہے؟''

''شہباز۔''

''آ جاؤ۔'' اس کی آواز آئی میں اندر داخل ہوا تو وہ بستر پر نیم دراز تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم کو اس کمرے میں داخل ہونے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے کسی خاتون کے کمرے میں داخل ہونے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''سوری تمہارے لیے کافی بنانے کا خیال نہیں رہا۔''

''کوئی بات نہیں ویسے بھی تم صبح سے مصروف تھیں اور تھک گئی ہو گی۔ اس لیے ٹھیک ہے۔''

''بیٹھو۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

''تم نے صبح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''بس دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''لگتا ہے تمہاری افسردگی کسی اور طریقے سے دور کرنا پڑے گی۔''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''اب تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔''

مجھے احساس ہوا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا مطلب ہے ہم کہیں باہر چلتے ہیں رات کے کھانے پر۔''

''سچ میں۔'' وہ خوش ہوگئی پھر اسے یاد آیا۔ ''لیکن ابھی حالات باہر نکلنے کے لیے ٹھیک نہیں ہیں۔''

''تم اس کی فکر مت کرو اگر تم تیار ہو تو ہم چلتے ہیں۔''

''میں تو دل و جان سے تیار ہوں۔'' وہ بستر سے اتر آئی۔ ''میں ابھی سے تیاری کرتی ہوں۔''

''اتنی جلدی۔'' میں نے گھڑی دیکھی جس میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔

''ہاں ہم سیر بھی کریں گے۔''

''اتنی سردی میں آؤٹ ڈور تو مشکل ہے کسی اچھے اور بڑے ہوٹل میں چلتے ہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی لیکن مجھے تیاری میں اتنا وقت تو لگ جائے گا۔'' اس نے کہا اور میری طرف دیکھا۔

''پلیز تم بھی اچھے کپڑے پہن لو۔''

''ان کپڑوں میں کیا برائی ہے؟''

''نہیں کوئی دوسرے۔'' اس نے مچل کر کہا۔ ''تم صبح سے یہی کپڑے پہن کر گھوم رہے ہو۔''

''اوکے میں دیکھتا ہوں لیکن میرے پاس یہاں زیادہ کپڑے نہیں ہیں۔''

''ایسے نہیں لے سکتے جیسے مجھے دلائے تھے۔ وہیں چینج کر لینا۔''

''میرے ساتھ ناپ کا مسئلہ ہو جائے گا۔ تمہاری طرح مثالی فگر تو ہیں نہیں کہ سوٹ بالکل فٹ آئے۔''

وہ شرمائی۔ ''ٹھیک ہے پھر جو اچھا لگے وہ پہن لو لیکن بائیک پر نہیں جائیں گے۔''

''بالکل بھی نہیں...... اس دن میری بھی قلفی جم گئی تھی۔ یہاں کئی گاڑیاں ہیں ان میں سے کوئی لے لیں گے۔'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔ ''بس تم تیار ہو جاؤ۔''

میں باہر آیا اور ندیم سے رابطہ کیا۔ ''کیا حال ہیں یار۔'' میں نے اس کی آواز سن کر کہا۔ ''مجھے فوری طور پر پچاس ہزار کی ضرورت ہے۔''

''پچاس ہزار اس وقت کہاں سے لاؤں؟''

''بیٹے کہیں سے بھی لے آ...... اور میں شام چھ بجے سپر مارکیٹ میں ملوں گا۔''

''تُو باہر آئے گا۔'' وہ چونکا۔ ''لگتا ہے تیرے دل میں اندر ہونے اور اکرم چشتی سے خاطر تواضع کرانے کا ارمان مچل رہا ہے۔''

''اس کی کیا مجال جو مجھے ہاتھ لگائے۔'' میں نے حقارت سے کہا۔

''ہاں وہ ڈنڈوں اور لتر سے تیری تواضع کرے گا۔'' ندیم نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''ہاتھ تو بالکل نہیں لگائے گا۔''

''پچاس ہزار تیار کر کے لانا۔'' میں نے اس کی بات اَن سنی کر کے کہا۔ ''میں انتظار کروں گا۔''

گھر سے میں جتنی رقم لایا تھا وہ خرچ ہو چکی تھی اور باقی زرین کو دے دی تھی اب اس سے واپس مانگتے ہوئے شرم آ رہی تھی اسی طرح عبداللہ سے کہنا بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب کہ میرے بینک اکاؤنٹس میں لاکھوں کی رقم موجود تھی۔ اس لیے میں نے ندیم سے کہہ دیا۔ میں عتیق کے کمرے کی طرف آیا تو پتا چلا کہ حکیم قادس نے اس کے علاج کے دوسرے مرحلے کا آغاز کر دیا ہے اور کمرہ ایک بار پھر اندر سے سیل کر دیا گیا تھا۔ اس لیے اب کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا اور نہ باہر آ سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔ پینٹ شرٹ نکالی اور اس کے ساتھ جیکٹ لے لی۔ میں تیار ہو رہا تھا کہ عبداللہ دستک دے کر اندر آیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔

''کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں میں زرین کو باہر لے جا رہا ہوں۔''

عبداللہ ایک لمحے کو چپ ہوا تھا جیسے میری بات سے متفق نہ ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز صاحب

یہ رسکی کام ہوگا۔''

''میری تو پوری زندگی ہی رسک ہے یار۔'' میں ہنسا۔ ''اب میں اس ڈر سے گھر میں تو نہیں بیٹھ سکتا۔''

''دوسرے باہر دھند شروع ہوگئی ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' میں خوش ہوگیا۔ ''اب کسی کے لیے مجھے دیکھنا اور تعاقب کرنا مشکل ہوگا۔''

''لیکن اس موسم میں ڈرائیونگ مشکل ہوتی ہے۔''

''اس پر آدھا شہر اس وقت باہر نکلا ہوا ہوگا۔'' میں نے جیکٹ پہنی۔ ''کوٹھی میں گاڑیاں کتنی ہیں؟''

عبداللہ سمجھ گیا تھا کہ میں نہیں رکوں گا اس لیے اس نے بادلِ ناخواستہ بتایا۔ ''تین گاڑیاں ہیں۔ ان میں صرف چیری ایسی ہے جو دشمنوں کی نظروں سے محفوظ ہے۔''

''اس کے بجائے ایاز کی جیپ بہتر رہے گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اسے بھی ساتھ لے جائیں تو بہتر رہے گا۔'' عبداللہ نے فوراً کہا۔ ''ایک سے دو بھلے ہوں گے۔''

مجھے خیال آیا کہ شاید زرین اسے پسند نہ کرے کہ میں اسے لے جا رہا ہوں اور ساتھ میں ایک آدمی اور بھی ہو۔ بے شک وہ ڈرائیور ہی کیوں نہ ہو۔ ''نہیں ایاز کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس صورت میں چیری بہتر رہے گی چھوٹی کار ہے اور نمایاں نہیں ہوتی ہے۔ ایاز کی جیپ نمایاں بہت ہوتی ہے۔''

ایاز کی جیب نمایاں ہوتی تھی اور زیادہ آرام دہ بھی نہیں تھی جیپ ویسے بھی آرام دہ سواری نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے عبداللہ کی بات مان لی۔ اس نے مجھے پوری طرح مسلح ہو کر جانے کا مشورہ دیا تھا۔

''میرے پاس پستول ہے۔''

''نہیں میں عقبی سیٹ کے ساتھ پائیدان پر رائفل اور فالتو میگزین رکھ دیتا ہوں۔ خدانخواستہ کوئی مشکل پیش آئی تو اسلحہ ہی سب سے زیادہ کام آتا ہے۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔ منیر نے آکر چائے کافی کا پوچھا۔ وہ چائے اچھی بناتا تھا اس لیے میں نے اسے چائے کا کہہ دیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ رفیق بھائی ابھی ایاز کے ساتھ کہیں گئے تھے اور وہ چھ بجے تک آنے کو کہہ گئے ہیں۔ میں ذرا فکرمند ہوا۔ ''ان سے رابطہ ہے۔''

''جی ہاں اور وہ بالکل خیریت سے ہیں۔'' عبداللہ میری تشویش بھانپ گیا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے راجا صاحب کی کال آئی تھی انہوں نے حکیم قادس سے بات کی ہے۔''

''کیا بات ہوئی ہے؟''

''ایک تو انہوں نے عتیق کی کنڈیشن دریافت کی ہے اور دوسرے اس کے ہر ممکن علاج کا حکم دیا ہے۔ وہ آج رات آپ سے بات کریں گے۔ ان کا کہنا ہے دس بجے ان کا فون آئے گا۔''

''اس وقت تک میں واپس آجاؤں گا ورنہ میرا موبائل نمبر ان کو دے دینا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''کوٹھی کے آس پاس مزید کوئی مشکوک سرگرمی نظر آئی ہے؟''

''نہیں، صبح سے اب تک امن ہے۔ ان کارسواروں کے علاوہ کوئی نہیں آیا۔''

''ممکن ہے وہ مرشد کے آدمی نہ ہوں لیکن احتیاط بہتر ہے۔''

عبداللہ ایک خاص مقصد سے کمرے میں آیا تھا اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ آپ کے لیے ہے؟''

''اس میں کیا ہے؟''

''کچھ رقم ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے......'' میں نے کہنا چاہا۔

''یہ بات آپ راجا صاحب سے کہیے گا ان کا کہنا ہے ان کی طرف آپ کا کچھ حساب نکلتا ہے اور یہ رقم اسی حساب میں ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا راجا صاحب پر ایسا کوئی حساب نہیں نکلتا ہے۔''

''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن ان کا کہنا ہے کہ ہیروں کا کچھ معاملہ تھا اور اگر آپ رقم لینے سے انکار کریں تو آپ کو رانا ویاس کا حوالہ دیا جائے۔ اصل میں یہ رقم انہوں نے بھیجی ہے۔''

میں کنفیوژ ہو گیا کیونکہ رانا ویاس کو میں نے ہیرے فروخت کیے تھے لیکن ان کی کل رقم وہ بینک میں ادا کر چکا تھا۔ پھر یہ کون سا حساب رہ گیا تھا۔ بہر حال عبداللہ محض رقم دینے کے لیے راجا عمر دراز کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے لفافہ لے کر کھولا اور حیران رہ گیا۔ اس میں پانچ ہزار کے نوٹوں والی دو گڈیاں تھیں۔ اس وقت پانچ ہزار کے نوٹ نئے نئے آئے تھے اور یہ دس لاکھ کی رقم تھی۔

''تم جانتے ہو یہ کتنی رقم ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آج ہی کوریئر سے پارسل آیا ہے جس میں یہ لفافہ بھی تھا۔''

میں نے ایک گڈی نکالی۔ ''یہ پانچ ہزار کی ہے اور ایسی دو گڈیاں ہیں۔ یعنی کل دس لاکھ روپے ہیں۔''

روپے کی بے قدری تو اس وقت بھی تھی لیکن اتنی نہیں تھی جتنی کہ آج ہے۔ عبداللہ ذرا حیران ہوا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ میں نے گڈی سے دس عدد نوٹ نکالے اور باقی گڈی لفافے میں ڈال کر عبداللہ کے حوالے کر دی۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ''میں اس کا کیا کروں جناب؟''

''رکھ لو مجھے ضرورت ہوگی تو تم سے لے لوں گا۔'' میں نے کہا اور لفافہ اسے تھما دیا۔ میرا کام ہو گیا تھا اس لیے عبداللہ کے جانے کے بعد میں نے ندیم کو کال کی۔ ''اب رقم مت لا......ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت کی اولاد۔'' وہ بھنا گیا تھا۔ ''ابھی میں اتنی سردی میں جا کر دوا ے ٹی ایمز سے رقم نکلوا کر لایا ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے بیوی بچوں کو شاپنگ کرا دے میری طرف سے۔''

''تو سچ کہہ رہا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں یار تیری فیسیں بھی تو دینی ہیں۔''

''بکواس نہ کر ورنہ یہی نوٹ تیری......'' اس نے گرم ہو کر کہا اس کی باقی بات ناقابلِ اشاعت تھی

جائے۔ میں ہنسا۔

''اچھا اچھا...... زیادہ مت تپ...... میرا کچھ صدقہ خیرات نکالنے کا ارادہ ہو رہا ہے اور تو بہت مستحق ہے۔''

اس سے پہلے کہ ندیم مزید گالیاں دیتا میں نے فون بند کر دیا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور زرین اندر آئی۔ اس نے کھلتے سرخ رنگ کا شلوار سوٹ اور اوپر آتشیں رنگ کا سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ کپڑے جیسے اس کے تناسب کو سامنے رکھ کر سیئے گئے تھے اور رہی سہی کسر سوئیٹر نے پوری کر دی تھی جو شاید ناپ سے ذرا کم تھا اور جان بوجھ کر کم لیا گیا تھا۔ میں چند لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا۔ میری محویت دیکھ کر وہ شرمائی۔

''کیسی لگ رہی ہوں۔''

''ماشاءاللہ...... چشم بدور...... سبحان اللہ...... وغیرہ وغیرہ۔''

''میرا مذاق اُڑا رہے ہو؟'' وہ خفا ہو گئی۔ ظاہر عربی میں اس کی استعداد زیادہ نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ارے نہیں میں تو تعریف کر رہا ہوں۔''

''یہ چشم دور کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے شک سے پوچھا۔

میں نے سر کھجایا۔ ''میرا خیال ہے چشم سے دور ہونا...... لیکن صحیح سے مجھے بھی نہیں معلوم۔''

اس تشریح نے اسے مزید خفا کر دیا۔ ''یعنی میں تمہاری آنکھ سے دور ہو جاؤں؟''

''اوہ بی بی یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ میں کوئی اردو کا ماہر نہیں ہوں میرا خیال ہے اصل مطلب کچھ اور ہے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''اب تم ایک لفظ کے پیچھے اپنی شام مت غارت کرو۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''کیوں کیا شام صرف میری ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے آنکھیں چرائیں۔ ''میری بھی ہے اور اب چلو۔''

کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے پستول اور اس کے دو عدد اضافی میگزین جیکٹ میں رکھ لیے۔ کچھ عرصے پہلے میں نے بال بنوائے تھے اور پھر شیو بھی کئی دن کی بڑھی ہوئی تھی اس لیے میں اپنے معمول کے حلیے سے ذرا مختلف نظر آ رہا تھا۔ زرین دیکھ رہی تھی اور سمجھتی تھی کہ یہ پستول میری زندگی کا ایک لازمی جزو ہے اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ گیراج سے چیری کار نکلوا کر ہم روانہ ہوئے۔ میں نے اسلام آباد کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔ شدید دھند کی وجہ سے میں رینگنے کی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ زرین اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک پوچھا۔

''شہباز ایک بات سچ سچ بتاؤ گے؟''

''اگر بتا سکا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''کیونکہ ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی ہے۔''

''میں جانتی ہوں میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتے ہو؟''

میں نے سوال پر غور کیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارا اتنا خیال کیوں رکھ رہا ہوں؟''

''یہی تو میں جاننا چاہ رہی ہوں...... آخر کیوں؟''

''دیکھو بی بی میرے پاس کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اول تم ایک مظلوم عورت ہو اور میں عورت کی عزت

کرنے والا شخص ہوں، دوم تم بے پناہ حسن رکھتی ہو اور میں ایک حسن پرست مرد ہوں، سوم تم میرے دشمن سے تعلق رکھتی ہو اور میں تمہیں اس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہوں۔''

''ان میں سے کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

میں ہنسا۔ ''اس کا مطلب ہے ان سب وجوہات پر غور کر چکی ہو تب کیا جاننا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ تم میرا اتنا خیال کیوں رکھ رہے ہو؟''

''اس کی بڑی سادہ سی وجہ ہے۔ تم جینا چاہتی ہو اس لیے میں تمہارا خیال رکھ رہا ہوں۔ اگر تم میں جینے کی امنگ ہی نہ ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تو کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی ہوں؟''

''کیوں نہیں اچھی لگتی ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم اچھی نہ لگتیں تو تمہیں ساتھ لیے کیوں گھوم رہا ہوتا؟''

''میرا مطلب ہے تم اس لیے میرا خیال نہیں رکھتے ہو کہ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اس لیے تمہارا خیال رکھتا ہوں کہ تم مجھے عورت کی حیثیت سے اچھی لگتی ہو تو تمہارا خیال کسی حد تک ٹھیک بھی ہے اور کسی حد تک غلط بھی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ کوئی مرد تمہارے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اور میں بھی ایک مرد ہوں لیکن تم برا مت ماننا میں نے تم سے زیادہ حسین عورتیں بھی دیکھی ہیں اور ان میں سے کچھ میری دشمن تھیں۔ میں نے ان میں سے کسی کو مارا نہیں لیکن اگر میری جان پر بن آتی تو میں یہ سوچے بغیر ان کو مار دیتا کہ وہ دل کش عورت ہیں۔''

''فرض کرو میں تمہاری دشمن بن جاؤں تو کیا تم میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرو گے؟''

''شاید۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگرچہ کسی عورت پر ظلم کرنا مجھے سخت ناپسند ہے لیکن مجبوری ہوئی تو میں ایسا بھی کر گزروں گا۔''

اس نے جھرجھری لی۔ ''مجھے معلوم ہے تم سخت بھی بہت ہو اور شکر ہے میرا اور تمہارا دشمنی کا رشتہ نہیں ہے۔''

میں نے موضوع بدل دیا۔ ''تمہارے رشتے داروں میں کوئی بہن بھائی نہیں ہے؟''

''نہیں میں بابا کی ایک ہی بیٹی تھی۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''بابا کے علاوہ سب سے قریبی رشتے دار میرے چچا زاد ہیں اور ان میں سے ایک شارق کا رویہ تم دیکھ چکے ہو۔ وہ بے حیائی سے اس شخص کی نوکری کر رہا ہے جس نے مجھے داشتہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔''

''یعنی اگر تم اپنے گھر کی طرف واپس نہ جاؤ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟''

''نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واپس جانے کا مطلب مرشد کے ہاتھ آ جانا ہوگا۔''

''امید رکھو ایک دن مرشد کے خوف سے بھی نجات ملے گی۔''

''اپنی زندگی میں تو مجھے یہ امید نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے امید ہے۔'' میں نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ اب ہم ایک مین روڈ پر تھے جہاں تیز روشنی والے بلب لگے تھے۔ اس وجہ سے دھند کا اثر کم ہو رہا تھا۔ پھر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم ہوٹل میں تھے۔ باہر کی بے پناہ کی سردی کے مقابلے میں ہوٹل کے لاؤنج میں خوش گوار گرمی تھی۔ شام ساڑھے چھ بجے وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ زرین پہلی بار کسی ایسی جگہ آئی تھی اس لیے وہ کسی قدر نروس نظر آنے لگی۔ اپنے لحاظ سے وہ بہت تیار ہو کر آئی تھی لیکن جب اس نے وہاں موجود خواتین کی تیاری اور ملبوسات دیکھے تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''اللہ، ان عورتوں کو شرم نہیں آتی ایسے لباس پہنتے ہوئے؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہ اس ملک کا اوپری طبقہ ہے اور یہاں یہ کسی قدر جامے میں ہے۔'' میں نے ایک کونا منتخب کر کے اس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ یہاں ایک گلاس ٹاپ میز کے دونوں طرف دو چھوٹے صوفے رکھے تھے۔ ''آؤ یہاں بیٹھتے ہیں۔''

زرین نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں لوگ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ وقت گزار رہے تھے یا کچھ پی رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''یہ کیسا ہوٹل ہے یہاں لوگ کھا نہیں رہے؟''

''یہ ہوٹل کی لابی ہے۔ ڈائننگ ہال اندر ہے۔ ابھی ڈنر میں وقت ہے اس لیے میں یہاں آ گیا۔''

''مجھے یہاں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''اس کے علاوہ صرف سوئمنگ پول ہے لیکن تم وہاں نہیں جا سکو گی۔'' میں نے کہا۔ ''سب سے بہتر جگہ یہی ہے اور تم آس پاس توجہ مت دو بس یہ دیکھو کہ ہم یہاں ہیں اور تمہاری برتھ ڈے سلی بریٹ کرنے آئے ہیں۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں۔''

میں نے ویٹر کو اشارہ کیا اور پھر اس سے اورنج جوس منگوایا۔ اگرچہ موسم سرد تھا لیکن یہاں اورنج جوس بہت اچھا ہوتا تھا۔ اکثر سردیوں میں، میں، سفیر اور مونا یہاں آتے تھے۔ زرین نے کہا۔ ''اتنی سردی میں جوس؟''

''ابھی تم دیکھنا اگر پسند نہ آئے تو کچھ اور منگوا لینا۔''

جوس زرین کو پسند آیا تھا۔ ہم وہاں ایک گھنٹہ رہے پھر ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ زرین وہاں خوش تھی۔ ماحول اچھا تھا اور ایک طرف آرکسٹرا ہلکی موسیقی بجا رہا تھا۔ زرین نے فرمائش کر کے کئی دھنیں بجوائیں۔ نو بجے تک ہم ڈنر کر چکے تھے اور زرین پہلے سے زیادہ خوش تھی۔ اس نے کچھ دیر اور رکنے کو کہا۔ ہم پھر لاؤنج میں آ گئے۔ ڈنر کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں رش کم ہو گیا تھا۔ زرین نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''شہباز میں شاید ہی زندگی میں اتنی خوش ہوئی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے آگے زندگی میں تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ خوشیاں منتظر ہوں گی۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''بس کہہ سکتا ہوں یوں سمجھ لو کہ یہ میری نیک تمنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''گھر چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کچھ دیر اور رکو نا'' اس نے اصرار کیا۔ ''مجھے یہاں بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''تمہاری مرضی آج تو نکلے ہی تمہارے لیے ہیں۔'' میں نے کہا اور اس بار ویٹر سے چائے کا کہا۔ ہوٹل میں ایک چھوٹا سا شاپنگ سینٹر بھی تھا۔ چائے پی کر ہم وہاں آئے۔ زرین نے منع کیا۔

''مجھے کچھ نہیں لینا ہے۔''

''تم چپ کرو۔'' میں نے کہا اور اس کے لیے کچھ پرفیوم اور کاسمیٹکس لی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی ان چیزوں کی خواہش تھی اگرچہ اسے خاص ضرورت نہیں تھی۔ خدا نے اسے ویسے ہی حسین بنایا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ میں نے سامان پیک کرایا اور شاپر اسے تھمایا۔ ''یہ میری طرف سے تمہاری سالگرہ کا گفٹ ہے۔''

''شکریہ۔''

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور ہوٹل کے اندر زندگی عروج پر تھی لیکن ہم تھک گئے تھے اس لیے واپسی کا فیصلہ کیا۔



باہر آئے تو مجھے دیکھ کر پارکنگ اٹینڈینٹ نے کار لانے کو کہا۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ یہاں بے پناہ سردی تھی اور اگر تیز روشنیاں نہ ہوتیں تو آس پاس کا منظر بھی دھند کی وجہ سے غیر واضح ہو جاتا۔ کچھ دیر میں کار آ گئی اور اٹینڈنٹ نے چابی مجھے دی۔ ہم کار میں بیٹھ رہے تھے کہ لابی کا گلاس ڈور کھلا اور اس میں کوئی باہر آیا میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کی طرف دیکھا تو مجھے جھٹکا لگا تھا۔ وہ فاضلی تھا۔ مرشد کا گرگائے خاص اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں نے کار کا ایکسلریٹر دبا دیا تھا۔ فاضلی پیچھے رہ گیا اور اسے دیکھنے کے چکر میں کار ان رکاوٹوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی جو گیٹ کے ساتھ کھڑی کی گئی تھیں۔ ان رکاوٹوں کا مقصد کسی گاڑی کو براہ راست دندناتے ہوئے اندر آنے سے روکنا تھا اور یہ انتظام یقیناً دہشت گردی کی وارداتوں کی روک تھام کے لیے تھا۔ فاضلی کو دیکھ کر میرا ذہن اسی میں الجھ گیا تھا اور مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کار رکاوٹ کی طرف جا رہی ہے۔ زرین نے ہلکی سی چیخ ماری اور میں نے گاڑی بروقت روک لی۔

''کیا ہے تمہارا دھیان کہاں ہے؟''

''زرین بی بی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' میں نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ ''دشمن نے دیکھ لیا ہے اور مرشد کا گرگائے خاص فاضلی ہوٹل میں بہ نفس نفیس موجود ہے۔''

زرین کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ ''میرے خدا...... اب کیا ہو گا؟''

میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فاضلی کے اس طرح باہر آ کر مجھے اپنی صورت دکھانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ اگر اسے یا اس کے ساتھیوں کو میرا تعاقب ہی کرنا تھا تو یہ کام چھپ کر زیادہ آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ باہر اتنی دھند تھی کہ مجھے تعاقب کا پتا بھی نہ چلتا۔ جیسے ہی میری کار ہوٹل سے باہر نکلی دائیں طرف سڑک پر موجود کسی

گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں اور میں نے بے ساختہ کار بائیں طرف گھما دی۔ مجھے اسی طرف جانا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے گڑبڑ کا پھر احساس ہوا۔ اس طرح میری گاڑی دیکھتے ہی کسی دوسری گاڑی کا ہیڈ لائٹس آن کرنا مجھے خبردار کرنے کے مترادف تھا۔ گویا مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ دشمن پیچھے ہے بھاگو۔

جس گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں تھیں وہ مناسب فاصلے اور رفتار سے میرے پیچھے آنے لگی۔ میں جس طرح بار بار عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا زرین سمجھ گئی۔ ''ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے؟''

''میرا خیال ہے۔''

وہ روہانسی ہوگئی۔ ''یہ میری وجہ سے ہوا ہے نہ میں ضد کرتی اور نہ ہم یوں دشمن کی نظروں میں آتے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ یہ تو قسمت میں لکھا تھا۔ شکر کرو کہ دشمن ہمارے ٹھکانے سے واقف نہیں ہے۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''انہوں نے ہمیں یہیں دیکھا ہے اور یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں بھگاتے ہوئے ہمارے ٹھکانے تک لے جائیں۔ اس طرح اپنی صورت دکھانے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے۔''

''تب ہم کیا کریں؟''

''کوٹھی کی طرف نہیں جانا ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کار کو اچانک ہی بائیں طرف جانے والی ایک سڑک پر گھما دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دھند کے باوجود رفتار تیز کر دی تھی۔ فوراً ہی عقب سے آنے والی گاڑی بھی اسی سڑک پر گھوم گئی اور اس کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ میں نے زرین سے کہا۔ ''سیٹ بیلٹ باندھ لو۔''

''یہ کیسے باندھتے ہیں۔'' اس نے سیٹ بیلٹ دیکھی۔

میں نے سڑک سے نظر ہٹائے بغیر ہاتھ بڑھا کر بیلٹ کھینچی اور زرین کے گرد باندھ دی۔ ''اس طرح باندھتے ہیں۔''

''میں سمجھ گئی۔'' اس نے نکال کر پھر سے بند کی۔

یہ چھوٹی کار تھی اور اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہو سکتی تھی جب کہ تعاقب کرنے والی گاڑی بڑی اور طاقتور تھی۔ ذرا سی دیر میں اس نے ہمیں آلیا تھا اور اب کچھ دور تھی لیکن اس نے اوورٹیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وجہ صاف ظاہر تھی ان کا مقصد ہمیں پکڑنا نہیں بلکہ تعاقب کر کے ہمارا ٹھکانہ دیکھنا تھا۔ زرین بہت خوف زدہ تھی وہ پہلے بھی مرشد اور اس کے آدمیوں کی درندگی سہہ چکی تھی اس نے مڑ کر دیکھا۔

''ان سے پیچھا چھڑاؤ۔''

''مشکل ہے ہماری کار چھوٹی ہے رفتار میں اس گاڑی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔'' میں نے ایکسلریٹر کو مزید دبایا لیکن کار پہلے ہی اپنی حد رفتار پر دوڑ رہی تھی۔ اس سے زیادہ تیز رفتاری اس کے لیے ممکن نہیں تھی۔ دوسری طرف دھند بھی تھی۔ اگرچہ سڑک کے کنارے کھمبوں پر تیز روشنیوں والے بلب جل رہے تھے مگر ان کی روشنی بھی ناکافی تھی۔ یہ سڑک آگے جا کر مری روڈ سے مل جاتی تھی۔ کیونکہ سڑک ون وے تھی اس لیے سامنے کی طرف سے بھی ٹریفک آ رہا تھا۔ کئی بار گاڑیاں بہت پاس سے گزر گئی تھیں۔ زرین خوف زدہ تھی۔ ایک بار مخالف

سمت سے آنے والی گاڑی کار کو تقریباً چھوتی ہوئی گزری تو زرین کی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''شہباز آرام سے۔''

''کیسے آرام سے......ان لوگوں سے پیچھا نہیں چھڑانا ہے کیا؟''

اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ دشمن مجھے خوف زدہ کر کے کوٹھی کی طرف جانے پر مجبور کر رہا ہے لیکن اچانک ہی سڑک پر ایک بڑے سائز کا آئل ٹینکر اس طرح کھڑا نظر آیا کہ سڑک سے گزرنے کا راستہ ہی باقی نہیں رہا تھا۔ تب میری سمجھ میں ان کا پلان آ گیا۔ وہ جان بوجھ کر مجھے اس طرف لائے تھے اور یہاں ان کا جال میرا منتظر تھا۔ سڑک پر دائیں طرف ایک گرین ڈھلان تھی اور کار اس پر کسی صورت نہیں چڑھ سکتی تھی کیونکہ سبزے کو عوام سے بچانے کے لیے کنارے پر فولادی گرل لگا دی گئی تھی جب کہ بائیں طرف جنگل تھا۔ اسلام آباد میں اس قسم کے جنگل جا بہ جا موجود ہیں اور یہ خاص طور سے اگائے گئے ہیں۔ ایسے کچھ جنگل راولپنڈی کی حدود میں بھی آجاتے ہیں یہ ایسا ہی ایک جنگل تھا۔ میں نے سوچا اور فوری فیصلہ کیا۔ میں نے کار یک دم ہی جنگل کی طرف موڑ دی۔ سڑک کے کنارے بنے برساتی پانی کی نکاسی کے چھوٹے سے نالے گزرتے ہوئے کار کو زبردست جھٹکے لگے تھے اور وہ کسی طرح اس سے گزر گئی تھی۔ اب کار درختوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ زبردست جھٹکوں نے زرین کے حواس چند لمحے کے لیے گم ہو گئے تھے اس نے چلا کر کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''دشمن سے پیچھا چھڑانے کی کوشش۔'' میں نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔ ''خود کو قابو میں رکھو۔''

کار کے اس طرف گھومتے ہی تعاقب میں آنے والی گاڑی بھی جنگل کی طرف گھوم گئی تھی لیکن یہاں اسے اپنے بڑے جسم کا نقصان ہوا تھا۔ کچھ دور آنے کے بعد وہ درختوں میں پھنس گئی اور اسے راستے کی تلاش میں ریورس ہونا پڑا تھا۔ زرین نے گھوم کر دیکھا اور خوشی سے بولی۔ ''وہ واپس جا رہے ہیں۔''

''وہ واپس نہیں جا رہے بلکہ گھوم کر آئیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''لو ہم بھی پھنس گئے۔''

سامنے درخت آپس میں اس طرح ملے ہوئے تھے کہ اس میں سے کار تو کیا بائیک بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں تھا مجھے یقین تھا کہ تعاقب کرنے والے اب پیدل آ رہے ہوں گے۔ میں نے عقبی نشست کے نیچے رکھی خودکار رائفل اور اس کے تین اضافی میگزین اٹھائے۔ پھر ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا اور اس میں موجود کار کے کاغذات بھی نکال لیے۔ ''نیچے اترو۔''

زرین نیچے آ گئی۔ باہر بلا کی سردی تھی اور درختوں کے درمیان نمی کی وجہ سے دھند بھی بہت زیادہ تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور یہ اس لحاظ سے اچھی بات تھی کہ ہمیں دشمن سے بچنا تھا۔ میں نے زرین کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھنے لگا۔ ذرا آگے جا کر میں نے اندازے سے اپنا رخ سڑک کے متوازی کر لیا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔ دشمن کہیں پیچھے تھا لیکن بہت دور بھی نہیں تھا کیونکہ اس کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے زرین سے کہا۔ ''بے شک ہم آہستہ چلیں لیکن کوئی آواز مت کرنا خاص طور سے چیخ وغیرہ مارنے سے گریز کرنا۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

''کیونکہ خواتین کی سریلی آواز بہرے مردوں کو بھی بہت دور سے متوجہ کر لیتی ہیں۔''میں نے جواب دیا۔''اب مہربانی کر کے چپ کر جاؤ اور میرا بازو تھامے رکھنا۔''

میں تاریکی اور دھند کی وجہ سے بہت دیکھ بھال کر قدم آگے بڑھا رہا تھا کیونکہ یہاں کوئی گڑھا یا کوئی پتھر ہونا عین ممکن تھا۔ زرین مجھ سے لگی میرے بالکل پیچھے تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے منمنا کر کہا۔''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''اسی طرح چلتی رہیں تو سردی کا احساس کم ہو جائے گا۔''

اس نے کچھ دیر بعد پھر کہا۔''مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے۔''

''اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

یہاں درخت ترتیب سے لگے تھے یعنی یہ باقاعدہ جنگل تھا اور اس کی پرورش میں انسانی ہاتھوں کا عمل دخل تھا یہی وجہ تھی کہ یہاں زمین ہموار تھی اور درخت ایک مخصوص فاصلے پر لگے تھے ان کی وجہ سے ہمیں حرکت کرنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ اچانک عقب سے بڑی ٹارچوں کی روشنیاں لہرانے لگیں۔ دشمن پورے انتظامات کے ساتھ آ رہا تھا اس نے دھند اور تاریکی کا بندوبست کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس رفتار سے چلتے رہے تو جلد ہی تعاقب کرنے والے ہم تک پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ روشنی کی وجہ سے زیادہ تیزی سے سفر کر رہے تھے۔ پھر ایک بار تو روشنی خاصی قریب پڑی تھی۔ اگر ہم کچھ درختوں کی آڑ میں نہ ہوتے تو یقیناً روشنی کی زد میں آ جاتے۔ زرین سہم کر بولی۔''وہ پاس آ گئے ہیں۔''

''تیز چلو اور بولو مت۔''میں نے کہا اور اس کا بازو تھام لیا کیونکہ اس کا امکان تھا کہ وہ تیز رفتاری کی وجہ سے کہیں گر نہ جائے۔ میرے سہارے کے باوجود وہ بمشکل ہی چل رہی تھی مگر میں نے رفتار کم نہیں کی تھی۔ رفتار تیز ہونے اور خاموشی سے سفر کرنے کی وجہ سے بالآخر ہم نے دشمن کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اب روشنیاں دور لہرا رہی تھیں اور ان کی آوازیں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ زرین کراہنے لگی۔

''اب مجھ سے نہیں چلا جا رہا میرے پاؤں بھی زخمی ہو گئے ہیں۔''

''کیوں؟''میں رک گیا۔

''سینڈلز نہیں ہیں۔''

میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔''سینڈل کہاں گئے؟''

اس نے جل کر جواب دیا۔''اگر پہنے رہتی تو کیا اس رفتار سے یہاں چل سکتی تھی؟''

اس نے ہائی ہیل سینڈل پہنے تھے اور ان کے ہوتے ہوئے اس جنگل میں بھاگنے تو کیا چلنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے پیروں میں بہترین جوتے تھے جو مجھے مدد دے رہے تھے۔ اس لیے میں بلا تکان چلتا رہا میں نے ندامت سے کہا۔''سوری مجھے خیال نہیں رہا۔''

''کوئی بات نہیں۔''اس نے بیٹھ کر اپنے پیروں کو ٹٹولا۔ یہاں اتنی روشنی نہیں تھی کہ سب صاف نظر آتا۔ اس نے سسکی لی۔''زخم ہو گئے ہیں۔''

میں نے اس کے پیروں کو چھو کر دیکھا۔ دونوں پاؤں زخمی تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ میں نے دل

ہی دل میں اس کی ہمت کی داد دی ان زخموں کے ساتھ اور پھر اس سردی میں اس کے لیے ننگے پاؤں چلنا یقیناً دشوار کام تھا۔ ہم دشمن سے دور ضرور نکلے تھے لیکن اتنی دور نہیں تھے کہ آرام سے بیٹھ جاتے۔ میں نے تجویز دی۔

''تم میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔''

''نہیں۔'' وہ شرمائے لہجے میں بولی۔ ''اچھا نہیں لگے گا۔''

''بابا اس وقت مسئلہ اچھا لگنے یا نہ لگنے کا نہیں ہے۔ دشمن پاس ہے اور ہمیں دور جانا ہے۔''

میرے سمجھانے پر وہ بادلِ ناخواستہ راضی ہوئی اور میری پیٹھ پر اس طرح سوار ہو گئی جیسے بچے ہوتے ہیں۔ سہارے کے لیے میں نے اس کے دونوں پاؤں کہنیوں میں پھنسا لیے تھے۔ وہ جھینپ کر ہنسی۔ ''اس وقت میں خود کو بچہ سمجھ رہی ہوں۔''

''بچہ ہی سمجھتی رہنا۔'' میں نے چلنے کا آغاز کیا۔ ''اور مہربانی کر کے میرے شانے پکڑو۔ اس طرح گردن پکڑی تو کچھ دیر بعد تم مجھے اٹھا کر لے جا رہی ہوگی۔''

اس نے جلدی سے شانے پکڑ لیے۔ ''تم نے کتنے آرام سے مجھے اٹھا لیا ہے حالانکہ میرا اچھا خاصا وزن ہے۔'' وہ میرے کان میں بولی۔ ''کچھ مہینے پہلے میں نے وزن کیا تھا تو پچپن کلوگرام تھا۔''

''وزن کیوں کرایا تھا؟ تم کو اوور ویٹ کا مسئلہ تو نہیں ہے۔''

''وہ ایک مسئلہ تھا اس کے لیے لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔'' اس نے جھینپے انداز میں بتایا۔ ''اسی نے وزن کیا تھا۔ یعنی میرا وزن ڈیڑھ من تو ہے اور تم نے آسانی سے اٹھا رکھا ہے۔''

''اس طرح کسی کو اٹھانا آسان ہو جاتا ہے۔'' میں نے تکنیکی وجہ بیان کی تو وہ ہنسی۔

''تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ میرا وزن پھول سا ہے۔''

ممکن ہے میں شاعرانہ موڈ میں ہوتا تو کہہ بھی دیتا لیکن اس وقت ناہموار جنگل میں اسے اٹھا کر یوں چل رہا تھا کہ عقب میں دشمن تھے اور سامنے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس لیے شاعرانہ خیال آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''چپ کیوں ہو گئے؟''

''شش...... مجھے لگ رہا ہے کوئی پاس ہی ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔ ''تم بھی چپ رہو۔''

یہ بات میں نے اسے چپ کرانے کے لیے کہی تھی لیکن وہ سچ مچ سہم گئی اور زبان بند کر کے مجھ سے چمٹ گئی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ دشمن ہماری تلاش میں بھٹک کر کہیں دور جا چکا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا تھا کہ اب وہ ہمیں نہیں پا سکتا ہے لیکن اس وقت اچانک ہی وہ ہوا جو میں نے سوچا نہیں تھا۔ میری پتلون کی جیب میں رکھے موبائل کی بیل بجی اور بدقسمتی سے اس کی بیل خاصی لاؤڈ تھی۔ اس سناٹے میں اس کی آواز دور تک گئی اور دشمن تک چلی گئی کیونکہ میں نے دور کسی کے چلانے کی آواز سنی اور پھر یہ آوازیں قریب آنے لگیں۔ میں بوکھلاہٹ کے عالم میں زرین کو سوار کیے ہوئے موبائل نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہ ممکن نہیں ہو رہا تھا اور بیل تھی کہ مستقل بجے جا رہی تھی اور دشمن کو ہمارا پتا دے رہی تھی۔ مجبوراً میں نے اسے تقریباً نیچے گرا دیا اور جلدی سے جیب سے موبائل نکال کر اسے آف کر دیا۔ کال ریسیو کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے زرین کو دوبارہ پیٹھ پر سوار کیا اور آگے کی طرف بھاگا۔ وہ میرے کان میں منمنائی۔

"یہ مصیبت بھی ابھی آنی تھی۔"

"مجھے خیال نہیں رہا ورنہ اس کی بیل پہلے ہی آف کر دیتا۔" میں ہانپتے ہوئے بولا۔

"مجھے نیچے اتار دو میں خود چلوں گی۔"

میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ اسے لے کر بھاگنا نہایت دشوار کام تھا اور اگر میں اسی طرح سفر جاری رکھتا تو دشمن جلد یا بدیر مجھے آلیتا۔ میں نے اسے نیچے اتار دیا۔ "ہمت کرو اگر یہاں سے نکل گئے تو پھر شاید ان لوگوں سے بچ جائیں۔"

ایک بار پھر بھاگنے سے ہم نے دشمن کو کہیں دور چھوڑ دیا تھا۔ میں نے زرین کو نیچے اتار دیا اور وہ ہمت کر کے میرے ساتھ بھاگنے لگی لیکن جب اس کے پاؤں کے زخم زمین پر لگتے تھے تو اس کی کراہ نکل جاتی تھی۔ اچانک مجھے سامنے کی طرف روشنی دکھائی دی تھی۔ شاید اس طرف کوئی آبادی تھی۔ "زرین آگے روشنی ہے۔"

روشنی کا سن کر اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے زخموں کی پروا کیے بغیر رفتار تیز کر دی۔ کچھ دیر بعد ہم ایک سڑک کے کنارے تھے جس کے پاس ایک نسبتاً اونچی زمین پر ایک عام سی بستی تھی۔ یعنی یہ نہ تو نچلے طبقے کی آبادی تھی اور نہ اوپری طبقے کی۔ کچھ درمیانی قسم کی آبادی تھی۔ زرین خوش ہوگئی۔ "یہاں ہمیں مدد مل سکتی ہے۔"

لیکن میں نے سڑک پار کرنے سے پہلے اطمینان کر لیا کہ وہاں دشمن کی طرف سے کوئی گھات لگا کر تو نہیں رکھی گئی تھی۔ ممکن ہے ہمیں پہلے کی طرح ہنکا کر ایک خاص گھیرے میں لایا جا رہا ہو لیکن مجھے سڑک پر دور تک کوئی مشکوک فرد یا گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں لیکن یہ عام گاڑیاں تھیں اور ان کا پیچھے لگے دشمن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا تو میں نے زرین کو اشارہ کیا۔

"اب چلو۔"

ہم نے دوڑ کر سڑک کراس کی اور ایک گلی میں گھس گئے۔ اس میں پکی سڑک تھی اس لیے زرین کو ننگے پاؤں چلنے میں دشواری نہیں ہو رہی تھی پھر بھی زخموں میں تکلیف تو ہو رہی ہوگی۔ اس نے چلتے چلتے مڑ کر دیکھا اور اضطراب سے بولی۔ "وہ بھی آگئے ہیں۔"

مرشد کے گرگے سڑک پار کر کے آبادی کی طرف آ رہے تھے۔ شکر ہے گلی میں زیادہ روشنی نہیں تھی ورنہ ہم فوراً ان کی نظروں میں آ جاتے۔ احتیاطاً ہم ایک دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ زرین نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ہمیں کہیں پناہ لینی ہوگی۔"

میں نے انکار کر دیا۔ "اس وقت کسی کا دروازہ بجانے کا مطلب ہے اہلِ خانہ سے پہلے انجانے دشمنوں کو متوجہ کر لینا۔"

"دروازہ بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ دیوار پھلانگ کر اندر چلے جاتے ہیں اور جب یہ چلے جائیں گے تو ہم بھی نکل سکتے ہیں۔"

"اگر اس دوران میں مکان میں رہنے والوں نے دیکھ لیا اور شور کر دیا تو؟"

"تمہارے پاس پستول ہے رائفل ہے کوئی ان کے ہوتے ہوئے کیسے شور کر سکتا ہے۔"

"ہم قائل ہوئے۔" میں نے کہا رائفل اسے پکڑائی اور دیوار کے اوپر ہاتھ جماتے ہوئے ذرا اچک کر

دیکھا۔ یہ چھوٹا سا صحن تھا اس کے آگے برآمدہ تھا جس پر فولادی گرل لگی تھی۔ مکان چھوٹا لیکن اچھا بنا ہوا تھا۔ دیوار مشکل سے ساڑھے چھ فٹ اونچی تھی۔ میں آرام سے اس پر چڑھ گیا، دیوار پر بیٹھ کر میں نے پہلے رائفل لی اور پھر زرین کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ دیوار پر بیٹھ کر وہ گھبرا گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو پکڑ کر لیا اور سہمے لہجے میں بولی۔

''میں گر جاؤں گی۔''

''مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھو۔'' میں نے کہا اور آرام سے اندر اتر گیا۔ میری کوشش تھی کہ کوئی آواز نہ ہو جو کسی کو متوجہ کرے لیکن شاید مکان میں کوئی نہیں تھا جو متوجہ ہوتا۔ میں نے زرین کا پاؤں پکڑ کر کھینچا تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گری میں نے آرام سے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا اور سرگوشی کی۔ ''ہاں اب لگا کچھ پھول سا وزن۔''

''بناؤ مت۔'' وہ ہنسی۔ ''جب کمر پر سوار تھی تب کہتے نا؟''

''تب تو دم نکل رہا تھا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''اب چپ رہنا میں ذرا مکان کا معائنہ کرلوں۔''

مکان کے سامنے والے حصے میں پورا صحن تھا۔ اس کے بعد دائیں بائیں دو کمرے تھے اور ان کے درمیان میں ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اور اس میں شاید غسل خانہ اور لیٹرین تھا۔ فولادی گرل پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ میں زرین کو وہیں چھوڑ کر اوپر آیا۔ یہاں سے مجھے اندازہ ہوا کہ مرشد کے آدمی آبادی کی کئی گلیوں میں پھیل کر ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ میں نے چھت سے دوسری طرف جھانکا تو پچھلے حصے میں کچا صحن تھا جس میں پھولدار پودے لگے تھے۔ کمرے دو ہی تھے۔ میں واپس آیا تو زرین صحن میں کھلنے والے ایک کمرے کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''سردی اب ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔''

وہ اپنے ہیر کلپ سے دروازے کا لاک کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کلپ لینا چاہا۔ ''یہ تم سے نہیں کھلے گا......''

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ہلکی سی کلک کی آواز آئی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''کھل گیا۔''

واقعی دروازے کا تالا کھل گیا تھا۔ میں حیران ہوا۔ ''تمہیں یہ کام بھی آتا ہے۔''

''اب آ گیا ہے۔'' اس نے دروازہ کھولا۔ ''فلموں اور ڈراموں میں چوروں کو ایسا کرتے دیکھا ہے خود پہلی بار کوشش کی ہے۔''

ہم اندر آ گئے لیکن میں نے لائٹ جلانے سے پہلے کھڑکی کے پردے اچھی طرح برابر کر دیئے۔ کمرہ خاصا بڑا تھا اور شاید بیڈ روم تھا۔ وہ بھی کسی خاتون کا کیونکہ روشنی کرتے ہی کچھ ایسی اشیا نظر آئیں کہ ہم دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔ میں نے بوکھلا کر زرین سے کہا۔ ''میں دوسرا کمرہ دیکھتا ہوں۔''

میں برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے باہر آیا۔ یہ کھلا تھا شاید گرل بند کرنے کے بعد اسے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ میں نے دوسرے کمرے میں جھانکا۔ یہ نشست گاہ تھی اور جنہیں میں

لیٹرین اور باتھ روم سمجھ رہا تھا وہ واش روم اور کچن نکلے تھے۔ پورا گھر بہترین انداز میں بنا تھا۔ ماربل فلور تھا۔ کچن اور واش روم میں ٹائلز لگی تھیں اور فرنیچر بھی بہترین تھا۔ مکان کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ استعمال میں تھا اور اہلِ خانہ کچھ دیر کے لیے کہیں گئے تھے۔ یہاں شاید ایک عورت یا جوڑا رہتا تھا کیونکہ وہاں کسی بچے کا سامان نظر نہیں آیا تھا۔ میں واپس بیڈروم میں آیا تو زرین مذکورہ اشیا کہیں چھپا چکی تھی اور خود بستر پر بیٹھی اپنے زخمی پیروں کا معائنہ کر رہی تھی۔ باہر کے مقابلے میں بند کمرے میں سردی خاصی کم تھی۔ میں نے زخم دیکھے یہ معمولی سے تھے کانٹے اور نوکیلے پتھروں سے آئے تھے۔ اگر احتیاط کی جاتی تو ایک دو دن میں بھر جاتے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کہیں دوا جیسی چیز نظر نہیں آئی تھی میں نے باتھ روم میں بھی دیکھ لیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ٹشو اور ٹیلکم پاوڈر کا ڈبا تھا۔ میں نے ٹشو سے زخم صاف کیے اور ان پر ٹیلکم پاوڈر چھڑک با۔ زرین نے کہا۔

''بہتر ہے روشنی بجھا دو یہ ہلکے پردے ہیں ان سے روشنی باہر نظر آئے گی۔ اگر ہماری طرح کسی نے دیوار سے جھانک لیا تو اسے نظر آئے گی اور باہر گیٹ پر تالا لگا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا اور روشنی بند کر کے عبداللہ کو کال کرنے کے لیے جیب سے موبائل نکالنا چاہا تو پتا چلا کہ جیب میں تو موبائل ہی نہیں ہے۔ میں نے جلدی سے ساری جیبیں دیکھیں پھر جیکٹ بھی چیک کر لی لیکن موبائل کہیں نہیں تھا۔ شاید وہ واپس رکھتے ہوئے نیچے گر گیا تھا اور جلدی میں مجھے احساس نہیں ہوا تھا۔ زرین میری حرکت دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''موبائل غائب ہے۔'' میں نے موسم کی مناسبت سے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کہیں گر گیا ہے۔''

''اوہ اب عبداللہ سے کس طرح رابطہ کرو گے؟''

''اللہ مالک ہے۔'' میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سنو مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی اکیلی عورت رہتی ہے۔''

''یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا۔''

زرین جواب دیتے ہوئے ذرا جھجکی۔ پھر اس نے کہا۔ ''وہ اپنے مخصوص استعمال کی چیزیں جس طرح لاپروائی سے پھینک کر گئی ہے اس سے اندازہ ہوا ہے۔''

میں نے دوسرے زاویے سے دیکھا۔ ''ممکن ہے یہاں اکیلی عورت کے بجائے کوئی میاں بیوی رہتے ہوں؟''

''نہیں اگر ایسا ہے تو وہ بہت بے شرم عورت ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے سامنے اس طرح سے رہ سکتی ہے۔''

وہ بے چاری شرم کی وجہ سے کھل کر نہیں کہہ پا رہی تھی لیکن میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ واقعی کوئی عورت اس طرح سے اپنے شوہر کے سامنے نہیں رہ سکتی تھی۔ اپنی ذاتی استعمال کی چیزیں یوں لاپروائی سے پھینک دینا کسی اکیلی رہنے والی عورت کا کام ہو سکتا تھا۔ بہرحال ہم یہاں خاتونِ خانہ کے بارے میں بحث کرنے نہیں آئے تھے بلکہ دشمن سے چھپ کر یہاں آئے تھے۔ جیسے ہی خطرہ ہٹتا ہم بھی یہاں سے رخصت ہو جاتے۔ اس

لیے میں نے زیادہ توجہ نہیں دی لیکن زرین کو اس کے بارے میں سخت تشویش ہو رہی تھی۔ یہ خواتین کا خاصہ ہے اگر ان کو کسی دوسری عورت کے بارے میں تجسس لاحق ہو جائے تو جب تک یہ تجسس رفع نہیں ہوتا ان کو چین نہیں آتا ہے۔

''اگر یہ اکیلی ہے تو کرتی کیا ہے؟''

''ہمیں اس سے کیا کہ وہ کیا کرتی ہے؟'' میں نے نرمی سے کہا۔

''نہیں سوچو نا اگر وہ اکیلی ہے تو کس طرح رہتی ہے۔''

میں بھنا گیا۔ ''شاید وہ کچھ دیر میں آجائے گی تب تم اس سے پوچھ سکتی ہو۔''

ابھی الفاظ میرے منہ میں تھے کہ باہر گھر کے گیٹ پر آہٹ ہوئی اور پھر کسی عورت کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ میں نے پھرتی سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کوئی مین گیٹ پر لگا تالا کھول رہا تھا۔ کمرے میں چھپنے کے لائق کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر آتے میں نے زرین کو اشارہ کیا اور ہم تیزی سے برآمدہ عبور کر کے نشست گاہ میں گھس گئے۔ جیسے ہی میں نے دروازہ بند کیا۔ باہر گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا تھا اور ایک نسوانی آواز آئی۔ ''اندر آجاؤ۔''

''یہ تمہارا گھر ہے؟'' اس بار کسی مرد نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ نشے میں تھا۔ کم سے کم آواز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔

''ہاں۔'' عورت ہلکے سے ہنسی۔ ''اور آج رات کے لیے تمہارا بھی ہو گیا ہے لیکن میں معاوضہ پیشگی لیتی ہوں۔ صبح تم نے خالی جیب دکھا دی تو میں کیا کروں گی۔''

میں دروازہ سے لگا دم بخود کھڑا تھا اور اس مختصر سی گفتگو نے ان سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا جو زرین اور کسی حد تک میرے ذہن میں بھی کلبلا رہے تھے۔ زرین مجھ سے لگ کر کھڑی تھی اور اتنی دم بخود تھی کہ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے لگ کر کھڑی ہے۔ جب مرد اور عورت اندر بیڈ روم میں چلے گئے تو اس نے میرے کان میں کہا۔ ''ہائے یہ اتنی بری عورت نکلی، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''ہمیں اس سے کیا؟'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''ابھی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ تب یہ جانے اور اس کے اعمال جانیں۔''

میں نے اسے کہہ تو دیا تھا کہ ہمیں اس سے کیا لیکن مرد نے اندر آتے ہی جس بے تابی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ دس فٹ دور دوسرے کمرے میں پیدا ہونے والی ساری آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔ مجھے سخت سردی میں بھی پسینہ آگیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ زرین کا حال بھی مجھ سے الگ نہیں ہوگا۔ شاید اسی وجہ سے وہ مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ شکر ہے یہاں اندھیرا تھا اور ہمیں ایک دوسرے کے تاثرات نہیں دیکھنا پڑے تھے۔ میرا دوران خون تیز ہو رہا تھا اور میں ان کو لگام دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں دخل در معقولات کرتا عورت نے خود ہی مرد کو روک دیا۔

''اتنے بے صبرے کیوں بن رہے ہو ساری رات پڑی ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے کھانا کھانے دو۔ شام سے اس موسم میں ماری ماری پھر رہی تھی۔''

''مجھے تو صرف پیاس لگ رہی ہے جو شراب سے اور تمہارے......'' مرد نے جواب دیا اور اس کی باقی بات نا قابلِ بیان تھی۔ میں نے سنی تو ظاہر ہے زرین نے بھی سنی ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نوازا۔ بہرحال عورت کچن میں آ گئی۔ اس نے برآمدے کی لائٹ جلا دی تھی۔ اب کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ زرین میرے پاس آئی اور اس نے گھبرائی آواز میں سرگوشی کی۔ ''پلیز اس جگہ سے چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

میں بھی یہاں نہیں رکنا چاہتا تھا لیکن باہر جان اور آزادی کے دشمن گھوم رہے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ دبا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور نشست گاہ کا ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ عورت کچن میں تھی اور سردی کی وجہ سے اس نے دروازہ بھیڑ رکھا تھا بس ذرا سی جھری تھی۔ میں دبے قدموں کچن تک آیا۔ جھری سے اندر جھانکا تو وہ پیٹھ دروازے کی طرف کیے چولہے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ متناسب جسم کی جوان عورت تھی۔ اس موسم میں بھی اس نے سلیولیس قمیص پہن رکھی تھی جس میں اس کی گوری بانہیں نمایاں تھیں۔ اس کے براؤن بال جُوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ میں خاموشی سے اندر داخل ہوا اور اچانک عقب سے اس کی گردن کو بازو کے شکنجے میں لے لیا۔ اس نے تڑپ کر خود کو چھڑانا چاہا لیکن میری گرفت سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ خود کیا اس کی آواز تک نہیں نکلی تھی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''مزاحمت مت کرو ورنہ تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی اور تم ایک منٹ میں مر جاؤ گی۔''

اس کا جسم کسی قدر ڈھیلا ہوا تھا لیکن اس نے مزاحمت ترک نہیں کی تھی۔ مجبوراً مجھے اس کی کنپٹی پر ایک ہلکا ہاتھ رسید کرنا پڑا تھا اور وہ نیم بے ہوش ہو کر میرے بازو میں جھول گئی۔ میں اسے اٹھا کر نشست گاہ میں لے آیا اور صوفے پر ڈال دیا۔ زرین نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ ''اسے کیوں لے آئے ہو؟''

''اس کی نگرانی کرو۔'' میں نے پستول اسے تھما دیا۔ ''اگر ہوش میں آنے لگے تو اس کے سر پر ایک وار کر دینا۔''

''اس کے سر پر؟'' اس نے تھوک نگل کر کہا۔

''ہاں اور احتیاط سے کرنا ورنہ یہ مر بھی سکتی ہے۔''

زرین کو یقیناً اس عورت سے نفرت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس پر وار کرنے کے خیال سے اس کا دم خشک ہو گیا تھا اس نے پستول واپس مجھے تھما دیا۔ ''اپنے پاس رکھو کہیں غلطی سے چل نہ جائے۔''

''تمہاری مرضی۔'' میں نے پستول واپس رکھ لیا۔ میں اس عورت کو اس لیے لایا تھا کہ اسے اور مرد کو اگلے مرحلے کے آغاز سے روکا جائے۔ نہ جانے ہمیں کتنی دیر یہاں رکنا پڑے اور اس دوران میں ان لوگوں کی حرکتیں قابلِ برداشت نہیں تھیں۔ نشست گاہ میں تاریکی تھی اس لیے مجھے عورت کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ مجھے مرد کی فکر تھی میں نے بیڈروم میں جھانکا۔ مرد بستر پر نیم دراز تھا اور ایک بوتل سے براہِ راست پی رہا تھا وہ یقیناً بلانوش تھا۔ اس کی نظریں دروازے کی طرف نہیں تھیں لیکن تمام حسیات عورت کی طرف ضرور تھیں۔ وہ کچھ دیر تو صبر کرتا رہا پھر اس نے آواز دی۔

''ماہا جی آ بھی جاؤ۔''

ماہا جی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ یہ اچھا خوش شکل اور جوان آدمی تھا۔ جب ماہا جی کی طرف سے جواب نہیں آیا تو وہ اٹھا اور جھومتے ہوئے دروازے کی طرف آیا۔ میں پیچھے ہوا اور آہستہ سے واش روم کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اسی لمحے وہ باہر آیا اور قدرتی طور پر اس کا دھیان روشن کچن کی طرف گیا تھا جیسے ہی وہ ذرا آگے نکلا میں نے عقب سے اس کی گدی پر وار کیا اور وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔ کیونکہ میں نے عقب سے مارا تھا اس لیے اسے منہ کے بل گرنے سے روکنا ممکن نہیں تھا اس لیے جب سیدھا کرنے پر اس کی ناک سے خون نکلتا دکھائی دیا تو مجھے افسوس ہوا تھا۔ میں اسے بھی کھینچ کر نشست گاہ میں لے آیا جہاں صوفے پر پڑی ماہا جی کسمسا رہی تھی۔ زرین پریشان تھی کہ اب کیا کرے۔ میں نے روشنی کر کے ماہا جی کا معائنہ کیا وہ صورت و جسم کی اچھی تھی۔ رنگ بھی گورا تھا لیکن اس کے کرتوت کالے تھے اور ان کا اثر اس کے خدوخال پر بھی ہوا تھا۔ ان میں بے حیائی کا تاثر جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ چند منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور ہمیں دیکھا۔ اس سے پہلے وہ چیخ مارتی میں نے پستول کی نال اس کے کھلے منہ میں رکھ دی۔

''آواز نکلی تو یہ چل جائے گا۔''

ڈر کے مارے اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ اس نے سر ہلا کر بتایا کہ وہ آواز نہیں نکالے گی۔ اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر التجا کر رہی تھیں کہ پستول اس کے منہ سے نکال لیا جائے۔ ذرا سی دیر میں اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ مجھے لگا کہیں اسے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ پھر بھی میں نے اسے خبردار کیا۔ ''کوئی آواز نہ نکلے ورنہ تمہیں مرنے میں بس ایک سیکنڈ لگے گا۔''

''میں...... آواز...... نہیں...... نکالوں گی۔'' اس نے رک رک کر کہا۔ اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔ اس نے زرین کو دیکھ لیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ماہا...... سب ماہا جی کہتے ہیں۔''

''سب کون؟...... تمہارے گاہک؟''

اس کا رنگ سرخ ہوا تھا۔ ''آپ جانتے ہو جی؟''

''ہم تمہارے آنے سے پہلے سے یہاں موجود ہیں۔'' میں نے اسے جتایا کہ ہم سب سن اور جان چکے ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''کچھ نہیں باہر سردی بہت ہے اس لیے ہم یہاں کچھ دیر رکیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔''

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''تم چور نہیں ہو؟''

''چور کسی عورت کو لے کر آتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں کیوں نہیں آتے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میں خود ایسے ہی ایک گروہ کے ساتھ کام کر چکی ہوں وہ مجھے آگے رکھتے تھے اور میری وجہ سے لوگ ان کے دھوکے میں آ جاتے تھے اور وہ گھروں میں گھس کر سب لوٹ لیتے

تھے۔''

''مال و دولت بھی...... اور عزت بھی۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''جو لوگ تم جیسی عورت کو استعمال کرتے ہوں گے ان کے اخلاق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے اسی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے ایک ریٹائرڈ کرنل کی کمسن بیٹی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی تھی۔ وہ شاید چودہ پندرہ برس کی تھی۔''

''لہٰذا تمہارا ضمیر جاگ گیا۔'' میں طنز کیا۔ ''اس لیے تم نے ان کا ساتھ چھوڑ کر اپنا الگ سے دھندہ شروع کر دیا۔''

''ہاں میں کسی کو دھوکا تو نہیں دیتی ہوں۔'' وہ بھڑک اٹھی۔ ''اپنا جسم بیچتی ہوں اور اس کا معاوضہ لیتی ہوں۔''

میرا ہاتھ اٹھا تھا لیکن پھر میں نے خود کو روک لیا۔ وہ مجھے رکتا دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگی جیسے کہہ رہی ہو بس اتنے ہی مرد ہو۔ وہ اٹھ بیٹھی تھی اور جیسے ہی اس کی نظر بے ہوش مرد پر گئی۔ اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ اس نے پھر سہم کر میری طرف دیکھا۔ ''اسے مار دیا ہے تم نے؟''

''نہیں مارا تو نہیں ہے بس بے ہوش ہے ابھی دو ڈھائی گھنٹے میں ہوش میں آجائے گا۔'' میں نے کہا۔

وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہم اس سے کیا چاہتے تھے۔ کیونکہ میں نے اس کے سوال کا جواب غلط دیا تھا۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا۔ ''اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم جا کر دیکھو کچن میں چائے کافی بنانے کا سامان ہو گا۔''

زرین جانا نہیں چاہتی تھی ماہا جی کے ساتھ مجھے اکیلا چھوڑ کر، اس لیے منہ بنا کر گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے عورت سے انٹرویو کا آغاز کیا۔ ''تم یہاں رہتی ہو یا یہ تمہارا عارضی ٹھکانہ ہے؟''

''میں یہاں رہتی ہوں۔''

''یہ ایک عام سی آبادی ہے اور یہاں اس قسم کی سرگرمیاں چھپی نہیں رہتی ہیں۔ اس صورت میں لوگ تمہیں کیسے برداشت کررہے ہیں؟''

''یہاں کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں دیتا ہے۔'' اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''تم سچ نہیں کہہ رہی ہو۔'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''اس قسم کے کام عام طور سے کسی طاقتور شخص کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہوتے ہیں۔''

وہ ہچکچائی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''مجھے کسی کی سرپرستی کی ضرورت نہیں تھی اس سے پہلے میں آنٹی رشید کے ساتھ تھی۔''

میں چونکا آنٹی رشید ایک جانا نام پہچانا نام تھا اور وہ اسلام آباد اور راولپنڈی کی ہائی سوسائٹی میں معروف تھی۔ اس کا لڑکیاں سپلائی کرنے کا کاروبار تھا اور بڑی بڑی شخصیات اس کی سرپرستی کرتی تھیں۔ وہ خود سکہ بند طوائف تھی اور کسی زمانے میں شیداں کے نام سے مشہور تھی لیکن جب اس نے اپنا بزنس اعلیٰ پیمانے پر شروع کیا تو

شیداں سے آنٹی رشید ہو گئی۔ مجھے تعجب ہوا۔ ''جب تم اس کے ساتھ کام کرتی تھیں تو الگ کیسے ہوئیں؟''

آنٹی رشید کے بارے میں مشہور تھا کہ کوئی لڑکی جو ایک بار اس کے چنگل میں پھنس جائے تو وہ مر ہی نکل سکتی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''میں خود سے نہیں نکلی اور نہ ہی نکلنا چاہتی تھی۔ یہ تو سارا اکرم چشتی کا حرامی پن ہے۔''

اگر وہ صوفے کے کشن تلے سے پستول نکال کر مجھے گولی مار دیتی تب بھی مجھ پر وہ اثر نہیں ہوتا جو اس کی بات سن کر ہوا تھا۔ ''اکرم چشتی سے کیا تعلق ہے تمہارا؟''

وہ جہاندیدہ عورت تھی تاڑ گئی کہ میں اکرم چشتی سے ناواقف نہیں ہوں۔ ''تم جانتے ہو اسے؟''

''میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''وہی جو کسی غلام کا آقا سے ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب تم اس کی غلام ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ باقاعدگی سے آنٹی رشید کی کوٹھی پر آتا تھا۔ وہیں اس نے مجھے دیکھا اور آنٹی رشید سے مانگ لیا۔''

''اور اس نے تمہیں اس کے حوالے کر دیا؟''

''نہیں وہ اتنی آسانی سے ماننے والی عورت نہیں تھی۔ پہلی بار اکرم نے میرے سامنے ہی اس سے مطالبہ کیا تھا لیکن آنٹی رشید نے اسے بے عزت کر دیا تھا۔ میں بھی خوش ہو گئی تھی کیونکہ اس شخص کے ساتھ رات گزارنا ہی بڑا عذاب تھا اس کے ساتھ مستقل رہنے کے خیال سے میں کانپ گئی تھی اس لیے جب آنٹی رشید نے انکار کیا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔''

''لیکن اب تم اکرم چشتی کے ساتھ ہو۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''پتا نہیں اس نے کون سا جیک لگایا کہ دو دن بعد ہی آنٹی رشید نے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔''

''تم نے انکار نہیں کیا؟''

اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں پہلے آنٹی رشید کی زرخرید تھی اسے کیسے انکار کر سکتی تھی۔''

''اکرم چشتی نے تمہیں یہاں رکھا ہوا ہے؟''

''نہیں پہلے وہ مجھے فتح جنگ لے گیا تھا۔ دو مہینے اس نے وہاں رکھا پھر اس محلے میں لے آیا۔ اس نے مجھے دھندا کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے اور ہر ہفتے مجھ سے بیس ہزار روپے لیتا ہے۔ ہفتے کی رات میں اس کے لیے مخصوص ہوتی ہوں اس دن کسی گاہک کو یہاں نہیں لا سکتی۔''

اب میری سمجھ میں آیا کہ محلے والے کس طرح ٹھنڈے پیٹوں ماہا جی کو برداشت کر رہے تھے۔ اس کی پشت پر اکرم چشتی جیسے افسران کے منہ چڑھے پولیس مین کا ہاتھ تھا۔ ''پھر بھی یہاں کسی نے تو احتجاج کیا ہوگا؟''

''مسجد کے ملاں نے کیا تھا۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''دو دن حوالات میں رہ کر آیا تو باتھ روم میں بیٹھتے ہوئے بھی ہائے ہائے کرتا تھا۔ اس کے بعد کسی کی جرأت نہیں ہوئی۔''

''تم اکرم کو ہفتے کے بیس ہزار دیتی ہو تو کیا اتنا کما لیتی ہو؟''

''ہاں کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر ہو ہی جاتے ہیں۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔ ''اگر کم پڑ جائیں تو اگلے ہفتے پورے کرنے پڑتے ہیں۔ اصل میں دھندے میں مندہ آ گیا ہے۔''

''اچھا میں نے تو سنا ہے کہ اس روشن خیالی کے دور میں اگر کوئی بزنس چل رہا ہے تو وہ یہی ہے۔''

''اسی وجہ سے تو دھندہ مندہ ہو گیا ہے۔ اب تو شریف گھرانوں کی لڑکیاں میدان میں اتر آئی ہیں۔ انہوں نے ہمارا کام بھی خراب کر دیا ہے۔ ہزار دو ہزار میں مان جاتی ہیں۔''

وہ درست کہہ رہی تھی غربت اور مہنگائی کے ہاتھوں تنگ آ کر شریف گھروں کی لڑکیاں اور عورتیں بھی اس گندی دلدل میں اتر گئی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے گھر والوں کو بھوک اور بیماری کے ہاتھوں مرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ملازمتوں کے لحاظ سے بھی ماحول پہلے سے بہت بدل گیا تھا اور سوائے چند اچھی جگہوں کو چھوڑ کر لڑکیاں اور عورتیں جہاں جاب کرنے جاتی ہیں ان کو بطور ورکر نہیں بلکہ بطور عورت ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ ہم بہ حیثیت مجموعی عورت کے لیے عزت و احترام چھوڑتے جا رہے ہیں اور نئی نسل خاص طور سے اس چیز سے بے شعور ہے۔ زرین چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس دوران میں، میں نے بے ہوش شخص کو ایک طرف کونے میں ڈال دیا تھا۔ زرین نے کپ میری طرف بڑھایا وہ صرف دو کپ بنا کر لائی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہاں سے کب چلو گے؟''

''جب مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ دشمن اب باہر ہماری گھات میں نہیں ہے۔''

میری بات پر عورت چونکی۔ ''وہ لوگ تمہاری تلاش میں ہیں؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟''

''جنہوں نے ہمیں روکا تھا اور اس شخص کی گاڑی میں جھانک کر بھی دیکھا تھا۔'' اس نے بے ہوش مرد کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی بات میں مجھے سب سے زیادہ قابلِ توجہ لفظ گاڑی کا لگا تھا۔ زرین نے بھی سن لیا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ''ان کے پاس گاڑی ہے۔''

''میری نہیں اس شخص کی ہے۔'' ماہا نے جلدی سے تردید کی۔

''کسی کی بھی ہو گاڑی تو گاڑی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر بے ہوش مرد کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے چابیوں کے ساتھ ایک عدد موبائل فون بھی نکلا تھا۔ میں خوش ہو گیا۔ ''موبائل بھی ہے اس کے پاس۔''

''اب ہم بات کر سکتے ہیں۔'' زرین خوش ہو گئی تھی۔

مجھے عبداللہ کا نمبر یاد تھا لیکن جب میں نے ڈائل کیا تو آگے سے ریکارڈ آواز نے بتایا۔ ''اس کال کے لیے آپ کے پاس بیلنس نہیں ہے۔''

''بیلنس نہیں ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''گاڑی ہے اور کال گرل کے ساتھ رات گزارنے کے لیے رقم بھی ہے لیکن موبائل میں بیلنس نہیں ہے۔''

''اس کے پاس بھی تو موبائل ہو گا۔'' زرین نے ماہا کی طرف دیکھا۔

''میرے پاس موبائل ہے لیکن خراب ہو گیا ہے کل گر گیا تھا تب سے آن نہیں ہوا ہے۔'' اس نے اطلاع

دی۔ ''تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو میرے بیڈ کے ساتھ پڑا ہے۔''

یہ قسمت کی خرابی تھی۔ میرا موبائل گر گیا تھا۔ ایک موبائل ٹھیک ملا تو اس میں بیلنس نہیں تھا اور دوسرا موبائل خراب تھا۔ بہر حال ایک عدد گاڑی مل گئی تھی اور اس کی مدد سے ہم یہاں سے نکل سکتے تھے۔ اکرم چشتی کا سن کر میں فکر مند ہوا تھا لیکن ماہا نے بتایا تھا کہ وہ صرف ہفتے کی رات اس کے پاس آتا تھا اور آج جمعرات تھی۔ یعنی بہ ظاہر اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ماہا مجھے غور سے دیکھ رہی تھی اور زرین اس پر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ ماہا جی مجھے تاڑ رہی تھی۔

''تم اکرم چشتی کو کیسے جانتے ہو؟''

''جان پہچان تو اس سے پرانی ہے۔'' میں نے کہا تو یک دم اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا وہ سمجھی کہ شاید میں اکرم چشتی کا واقف کار ہوں اور اس نے مجھ سے جو کہا ہے اب وہ اکرم چشتی کو بتا دوں گا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''خدا کے لیے یہ سب باتیں اکرم کو مت بتانا ورنہ وہ میری کھال ادھیڑ دے گا۔''

میں تو خود اس فکر میں تھا کہ کس طرح اسے منع کروں کہ وہ بعد میں اکرم چشتی سے ہمارا ذکر نہ کرے۔ اس نے یہ بات کر کے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ ''ٹھیک ہے اگر تم کہتی ہو تو نہیں کروں گا بلکہ سرے سے ہی نہیں کہوں گا کہ میں یہاں آیا تھا اور تم سے ملاقات کی تھی لیکن یہ تعاون ایک شرط پر ہوگا۔''

''کیسی شرط؟''

''شرط یہ ہے کہ میں اس شخص کی گاڑی لے جاؤں گا۔''

''یہ مجھے نہیں چھوڑے گا؟''

''تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ یہ ابھی ہوش میں آ جائے گا۔ ہم جاتے ہوئے تمہیں باندھ جائیں گے اور تم اسے بتا سکو گی کہ گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے اور اسے بے ہوش کر کے تمہیں باندھ گئے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا اور بات پولیس تک چلی جائے گی۔''

''میرا نہیں خیال کہ بدنامی کے ڈر سے یہ پولیس تک جائے گا۔''

''یہ چلا جائے گا کیونکہ یہ پولیس کا بھی باپ ہے۔ اینٹی کرپشن میں کام کرتا ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''مجھے بھی رگڑ دے گا۔''

''او کے تب میں اسے بھی لے جاؤں گا اور تم بعد میں کہہ سکتی ہو کہ تمہیں کچھ نہیں معلوم تم کچن میں تھیں کہ کسی نے عقب سے وار کر کے تمہیں بے ہوش کر دیا اور تمہیں ہوش آیا تو وہ اپنی گاڑی سمیت غائب تھا بلکہ تم چاہو تو اسے بھی الزام دے سکتی ہو کہ یہ کام اس کا ہے۔''

ماہا جی سوچ میں پڑ گئی تھی۔ زرین نے مجھے گھورا۔ ''تمہیں اس سے اتنی ہمدردی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے اسے آنکھ ماری تو وہ مجبوراً چپ ہو گئی ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ شاید اکرم چشتی کے بارے میں بھی زبان کھول دے گی۔ ماہا بادلِ ناخواستہ مان گئی۔ وہ مجبور تھی انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کا خدشہ دور نہیں ہوا۔

''تم اس کے بارے میں جانتے نہیں ہو بڑا حرامی بندہ ہے۔ آنٹی رشید کے پاس دو بار میرے ساتھ رات گزار چکا ہے اور آج مجھے دیکھ کر رک گیا اور پھر یہاں تک آ گیا۔''

''تم فکر مت کرو میں اسے اپنی زبان میں سمجھاؤں گا تو یہ یہاں کا رخ نہیں کرے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بس تم اپنی زبان اس معاملے میں بند رکھنا اور یہ پھر بھی تنگ کرنے آ جائے تو اکرم کو بتا دینا ہمارا ذکر کیے بغیر وہ خود اس کا بندوبست کر لے گا۔''

میں نے آدمی کا پرس چیک کیا اس میں اس کے شناختی کارڈ کے ساتھ ادارے کا کارڈ بھی تھا اور کوئی بیس ہزار کی رقم بھی تھی۔ جو ظاہر ہے اس کے لیے ریز گاری کے برابر تھی۔ اینٹی کرپشن کا آدمی اس قسم کے شوق اسی صورت میں رکھ سکتا ہے جب وہ اپنے عہدے کو کیش کرائے اور رشوت لینے والوں کے لیے اتنی رقم معمولی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے یہ نوٹ نکال کر ماہا جی کو تھما دیئے۔

''یہ رکھ لو۔''

''نہیں۔'' اس نے سہمے انداز میں کہا۔

''ابھی آتے ہوئے تو تم اس سے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں پیشگی ادا کرے بعد میں ہری جھنڈی نہ دکھا دے۔''

''وہ مذاق تھا میں نے بتایا نا اسے جانتی ہوں۔''

''تم فکر مت کرو یہ رقم بھی ہمارے کھاتے میں جائے گی یہ تم سے اس کا حساب لینے نہیں آئے گا۔'' میں نے اصرار کیا تو اس نے بیس ہزار روپے لے لیے اور جیسے ہی اس نے رقم ہاتھ میں لی میں نے اس کی کنپٹی پر پھر ہاتھ مارا اور وہ بے ہوش ہو کر لڑھک گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں اتنا مہربان ہونے کے بعد اس کے ساتھ یہ سلوک کروں گا۔ زرین کے لیے بھی یہ بات غیر متوقع تھی۔

''یہ کیا کیا؟''

''بے ہوش...... تاکہ یہ ہماری روانگی میں دخل اندازی نہ کرے۔'' میں نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ذرا ہمت کرو اور چھت پر جا کر آس پاس کا معائنہ کرو کہ ہمارے دشمن ہیں یا دفع ہو گئے؟''

''اس میں ہمت کی کیا بات ہے؟''

''باہر سردی بہت ہو گئی ہے۔''

وہ ایک منٹ بعد آئی تو کانپ رہی تھی۔ ''تم نے ٹھیک کہا ہے باہر سردی بہت ہے لیکن ایک اچھی بات ہوئی ہے دھند مزید شدید ہو گئی ہے اور اگر ہم نکلیں گے تو کسی کی نظر میں نہیں آئیں گے۔''

میں نے بے ہوش مرد کے ہاتھ پاؤں ماہا جی کی شال کے ٹکڑے کر کے باندھے۔ اس کے کارڈ کے مطابق اس کا نام شاہین خان تھا۔ پہلے میں نے باہر جا کر گلی کا معائنہ کیا۔ واقعی دھند اتنی شدید ہو گئی تھی کہ دس فٹ سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال اچھی تھی۔ میں نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ یہ نئے ماڈل کی ہنڈا اکارڈ تھی۔ اس وقت اس کی قیمت دس لاکھ سے کچھ اوپر ہی تھی۔ اینٹی کرپشن کا ایک معمولی اہلکار ایسی قیمتی کار میں گھوم رہا تھا تو ملک میں کرپشن کی حالت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ میں اسے اٹھا کر لایا اور کار کے پچھلے

حصے میں ڈال دیا۔ زرین فرنٹ سیٹ پر آئی اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ انجن اسٹارٹ کر کے میں نے سب سے پہلے فیول کا جائزہ لیا۔ ٹنکی تین چوتھائی بھری تھی۔ میں نے کار آگے بڑھادی۔ ہیڈ لائٹس فل کرنے پر بھی دس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ایسے میں کار کو تیس میل سے اوپر نہیں چلایا جا سکتا تھا جب تک کوئی ہنگامی حالت نہ ہوتی۔ گلیوں سے میں سُست روی سے گزر رہا تھا اور کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور رائفل میرے زانوؤں پر رکھی تھی۔ مین روڈ پر آنے کے بعد صورتِ حال بہتر ہوئی کیونکہ وہاں تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ زرین آگے پیچھے دیکھ رہی تھی۔

''شکر ہے یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''لیکن میرا نہیں خیال ہے انہوں نے اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑا ہوگا۔'' دھند شیشے پر جم رہی تھی اسے صاف کرنے کے لیے میں نے وائپر چلا دیئے اور ساتھ ہی کار کا ہیٹر آن کر دیا۔ باہر ایسی سردی تھی جیسے درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے آ گیا ہو۔ کار فریز ر بنی ہوئی تھی ہیٹر چلا تو جان میں جان آئی۔ زرین نے پوچھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''فی الحال تو کہیں نہیں۔'' میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ابھی تک کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی لیکن میرے اندر کہیں یہ بات موجود تھی کہ دشمن نے اتنی آسانی سے میری جان نہیں چھوڑی ہے کیونکہ میرے پیچھے فاضلی تھا اور وہ اب تک ملنے والے دشمنوں میں سب سے شاطر ثابت ہو رہا تھا۔ اگرچہ میں ابھی تک اس کے شر سے بچا ہوا تھا پھر اس نے عتیق کو مارنے کی کوشش کی تو وہ بھی ناکام رہی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ میں اب تک درست طور پر نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس نے مجھے اپنی صورت کیوں دکھائی تھی۔ جہاں تک تعاقب کر کے ہمارا ٹھکانہ دیکھنے کی بات تھی تو وہ خاموشی سے تعاقب کر کے بھی دیکھ سکتا تھا اور بعد میں اس پر دھاوا بھی بولا جا سکتا تھا۔ اس طرح مجھے خبردار کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟

میں نے مری روڈ کا رخ کیا ہوا تھا وہاں سے میں واپس گھوم کر عبداللہ کی کوٹھی کی طرف جا سکتا تھا۔ ذرا آگے جا کر یہ سڑک ایک کراسنگ سے گزر رہی تھی۔ جیسے ہی کار کراسنگ سے آگے آئی دائیں طرف سے کسی بڑی گاڑی کا انجن غرایا اور تیز ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں۔ میری چھٹی حِس نے خبردار کیا اور میں نے بے اختیار ایکسلریٹر دبایا۔ کار کی رفتار تیز ہوئی تو عقب سے آنے والی بڑی جیپ بھی تیزی سے پیچھے آئی۔ زرین نے بھی بھانپ لیا۔

''یہ شاید ہمارے پیچھے ہی آ رہے ہیں۔''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ اس وقت کار کی رفتار کوئی چالیس میل فی گھنٹہ تھی اور دھند دیکھتے ہوئے یہ رفتار بھی زیادہ تھی۔ مگر جیپ تیزی سے پیچھے آ رہی تھی۔ اس لیے مجھے رفتار بڑھانی پڑی تھی۔ رات کوئی ایک بجے سڑکیں سنسان تھیں اس لیے تیز رفتاری میں ٹریفک رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا لیکن سامنے سے اچانک کوئی گاڑی آ جاتی تو حادثے سے بچنا مشکل ہو جاتا کیونکہ سڑک ون وے تھی۔ میں نے کار کو ممکنہ حد تک بائیں طرف کر لیا۔ مری روڈ تک جانے سے پہلے میں اس جیپ سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ مگر اس سیدھی سڑک پر پیچھا کہاں چھڑا تا؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر میں رفتار بڑھاتا تب بھی اس جیپ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا وہ رفتار میں کار سے کم نہیں تھی بلکہ شاید بہتر تھی۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا تھا کہ وہ مستقل کار کے قریب آ رہی تھی اور

میں کوشش کے باوجود درمیانی فاصلہ بڑھانے میں ناکام رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سیدھی سڑک پر اس جیپ سے پیچھا چھڑانا بہت دشوار تھا مجھے لازمی کوئی اور راستہ پکڑنا تھا۔ میں نے آغاز میں غلطی کر دی تھی اور اسی سڑک پر نکل آیا تھا۔ حالانکہ مجھے آبادی میں سے گزر کر کوئی دوسری سڑک تلاش کرنی چاہیے تھی۔ اصل میں، میں نے پہلے یہ آبادی دیکھی ہی نہیں تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس میں دوسری طرف سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ شاید اسی وجہ سے میں نے لاشعوری طور پر اس طرف جانے سے گریز کیا تھا۔ اب مجھے خیال آرہا تھا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے پستول نکالتے ہوئے زرین سے کہا۔

''سیٹ بیلٹ باندھ لو۔''

''میرے خدا۔'' وہ کراہی لیکن اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں کار کی رفتار سُست کرنا شروع کی اور زرین کو اسٹیرنگ سنبھالنے کو کہا۔ ''کیا میں اسٹیرنگ پکڑوں؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور پاؤں سیٹوں کے درمیان پھنساتے ہوئے دروازہ کھول کر نصف جسم باہر نکالا۔ دروازوں کے درمیان والے حصے پر الٹا ہاتھ جماتے ہوئے میں نے جھک کر پستول سے جیپ کے اگلے ٹائروں کا نشانہ لیا اور پھر لگاتار فائر کرنے لگا۔ شور میں مجھے زرین کے چلانے کی آواز آئی تھی لیکن میں سمجھ نہیں سکا۔ البتہ خطرے کے احساس نے مجھے سیدھا ہونے پر مجبور کیا۔ میں نے پورا میگزین خالی کر دیا تھا اور مجھے اس کا نتیجہ بھی نہیں معلوم تھا۔ جیسے ہی میں اندر ہوا کوئی چیز پوری قوت سے کار کے کھلے دروازے سے ٹکرائی اور وہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔ میں بال بال بچا تھا اگر مجھے سیدھا ہونے میں ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کی دیر ہوتی تو دروازہ مجھے لگتا اور اگر میں بدستور باہر ہوتا تو دروازہ مجھے درمیان سے کاٹ کر رکھ دیتا۔ زرین ابھی تک چیخ رہی تھی اور اس نے اسٹیرنگ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

''پلیز چپ ہو جاؤ میں بچ گیا ہوں۔'' میں نے زور سے کہا تو وہ چونکی اور چلائی۔

''تم سن نہیں رہے تھے سامنے سے گاڑی آرہی تھی۔''

''فائرنگ کے شور میں سنائی ہی نہیں دیا۔'' میں نے اسٹیرنگ سنبھالا اور عقب میں دیکھا۔ دروازہ کو ٹکر مارنے والی گاڑی تو غائب ہو چکی تھی لیکن جیپ بدستور پیچھے تھی اور اب ذرا محفوظ فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری ایک گولی بھی نشانے پر نہیں بیٹھی تھی۔ میں کوئی اچھا نشانے باز نہیں تھا۔ میرے مقابلے میں وسیم کا نشانہ اچھا تھا اور بیتو کا بھی اچھا تھا۔ اس لیے جب کوئی گولی نشانے پر نہیں لگی تو مجھے تعجب نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی مجھے پستول سے نشانہ لینے میں ہمیشہ مشکل ہوتی تھی اس کے مقابلے میں رائفل سے میرا نشانہ کہیں بہتر تھا۔ کار کے دروازے کا یقیناً حشر ہو گیا تھا اور شاید اب اسے کھولنے میں بھی دشواری ہوتی۔ بہرحال میرا مقصد پورا ہو گیا تھا میں جیپ کو ذرا فاصلے پر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ دور ہو گئی تھی اور اب مجھے کہیں سلپ ہونے کا موقع ملتا تو میں اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں اسلام آباد میں گلیاں سیدھی اور بڑی ہیں اور ان میں کسی کو چکر دینا مشکل کام تھا میں اس بڑی جیپ کو صرف تنگ گلیوں والے کسی علاقے میں چکر دے سکتا تھا۔ زرین اب تک کانپ رہی تھی۔

''اللہ...... اگر تمہیں سیدھا ہونے میں ایک لمحے کی دیر ہوتی تو......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو کیا ہوتا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''میرا سر۔'' وہ خفا ہوگئی۔ ''تمہیں احساس ہی نہیں ہے تم پر کتنا بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔''

''لیکن ہوا تو نہیں ہے اور جو نہیں ہوا اس کا رونا رونے سے فائدہ۔''

اس نے منہ پھیر لیا گویا بالکل ہی خفا ہوگئی تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اسے چیک کرو یہ ہوش میں نہ آجائے۔ ابھی تو ایک ہی مصیبت پیچھے لگی ہے۔''

وہ مزید خفا ہوگئی۔ ''میں مصیبت ہوں؟''

''اوہ بابا تمہیں نہیں ان لوگوں کو کہہ رہا ہوں جو پیچھے ہیں۔''

اس نے مڑ کر اسے چیک کیا اور ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ ہوش میں ہے یا نہیں؟''

یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا کہ اگر وہ ہوش میں ہوا تو زرین کس طرح پتا چلائے گی کہ وہ ہوش میں ہے یا نہیں۔ اسے نبض سے یہ بات جاننا تو ایک طرف رہا نبض تلاش کرنی بھی نہیں آتی تھی لیکن اس نے معلوم کر لیا کہ وہ ہوش میں ہے یا نہیں۔ شاہین خان ہوش میں آ گیا تھا اور دم سادھے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ وہ کسی خطرناک آدمی کے ہاتھ لگ گیا ہے اس لیے مکر کیے پڑا تھا لیکن جب زرین اس کے پاس آئی تو اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی اور اس نے بے اختیار اسے دبوچ لیا۔ زرین نے چیخ ماری اور اپنے بازو اس سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اسے پچھلی نشست پر کھینچ رہا تھا۔ میں اس افتاد کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ زرین کی چیخ پر میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''یہ ہوش میں ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھے پکڑ......لیا ہے۔''

میں نے اسے واپس کھینچنے کی کوشش کی لیکن ڈرائیونگ کرتے ہوئے یہ کام مشکل تھا۔ میں نے کار کی رفتار کم کی اور زرین سے کہا۔

''پستول دے رہا ہوں اس حرامزادے کے سر میں سوراخ کر دو۔''

میری دھمکی کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا اور اس نے فوراً زرین کو چھوڑ دیا اور گھگھیائے انداز میں بولا۔ ''مجھ سے غلطی ہوئی پلیز مجھے گولی مت مارنا۔''

لیکن زرین اتنی مشتعل تھی کہ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پستول مانگا۔ ''دو مجھے میں اسے شوٹ کر دوں گی۔''

لیکن پستول کے بجائے میں نے اسے اسٹیرنگ تھما دیا اور خود گھوم کر پچھلی نشست کی طرف آیا۔ مجھے دیکھ کر شاہین خان اپنی جگہ سمٹ گیا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور سر کی ایک بھرپور ٹکر اس کی پہلے سے زخمی ناک پر رسید کی تو وہ ایک آہ بھر کر دوبارہ بے ہوش گیا تھا اس نے نہ جانے کیسے اپنے ہاتھ پاؤں بھی کھول لیے تھے۔ میں واپس ڈرائیونگ پر آیا۔ زرین اب خوش تھی۔

''تم نے بالکل ٹھیک کیا اس عالم میں بھی بدمعاشی سے باز نہیں آیا تھا۔''

شاہین خان نے یقیناً اس کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کی تھی جس پر وہ مشتعل تھی میں نے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو وہ بہت دنوں تک اپنی ناک کو روتا رہے گا اگر زندہ بچ گیا تو۔''

زرین چونکی۔ ”تم نے ایسا مارا ہے؟“

”نہیں یہ تو میں حالات کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ ابھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم بھی بچتے ہیں یا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ بی بی کہ میں نے پستول سے فائر کیے اور ممکن ہے وہ جواب میں بم ماریں اور ہم دوسری دنیا کو سدھار جائیں۔ جب ہم مریں گے تو یہ کیسے بچ سکتا ہے۔“

زرین نے پیچھے دیکھا۔ ”ویسے یہ ہے تو اسی قابل۔“

”سیٹ بیلٹ پھر باندھ لو۔“ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ جیپ اب قریب آنے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے پستول میں دوسرا میگزین لگایا اور عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ جیپ سے فائر ہوا اور گولی کار کی باڈی میں کہیں ٹن سے لگی۔ شاید ٹائر کا نشانہ لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ زرین نے ہلکی سی چیخ ماری۔ میں کار لہرانے لگا اگرچہ اس دھند میں یہ بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔ سامنے سے کوئی گاڑی اچانک آ جاتی تو بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس پہلے فائر کے بعد عقب سے رہ رہ کر فائر کیے جانے لگے اور یہ رائفل کی آواز تھی اور شاید اسلام آباد کا علاقہ ختم ہو گیا تھا اور یہ اسی وجہ سے اتنی بےفکری سے فائرنگ کر رہے تھے۔ اسلام آباد میں پولیس کا خوف ہوتا۔ کچھ دیر میں مری روڈ آ گئی اور میرا مری کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے پہلے کٹ سے کار کو واپس شہر کی طرف موڑ لیا لیکن میں مری روڈ پر ہی رہا تھا۔ جیپ مستقل مزاجی سے پیچھے لگی تھی مری روڈ پر آنے کے بعد اس سے فائرنگ رک گئی تھی۔ کیونکہ یہاں ہائی وے پولیس ہوتی ہے۔ میں اب جیپ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور اس سڑک پر یہ کام مشکل تھا۔ اس لیے جیسے ہی مجھے بائیں طرف ایک سڑک نکلتی نظر آئی میں نے کار اچانک اس پر موڑ دی۔ جیپ والوں کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔ مگر اسے پیچھے آنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا۔

”تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس سڑک پر آتے ہی وہ مجھے روکنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ زرین میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی اور مجھے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ میں نے رفتار کم کی اور اچانک بریک لگا کر کار اس طرح گھما کر روک لی کہ ڈرائیونگ سیٹ کا رخ جیپ کی طرف ہو گیا میں نے شیشہ پہلے ہی نیچے کر لیا تھا اور کار کے رکتے ہی جیپ کا نشانہ لے کر فائر کرنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ اس کا کم سے کم ایک ٹائر برسٹ ہو جائے۔ جیپ پہلے بھی کچھ زیادہ دور نہیں تھی اور جب میں نے کار روکی تو وہ اور بھی پاس آ گئی تھی۔ جب میں نے فائرنگ شروع کی تو وہ مشکل سے تیس گز دور تھی اس کی رفتار بھی کم ہوئی اور جب فائرنگ کی تو اس کے ڈرائیور نے بریک لگا دی تھی۔ میں نے لگاتار فائر کرتے ہوئے ذہن میں گولیوں کا حساب بھی رکھ رہا تھا اور آخری دو فائر میں نے جیپ کی ونڈ اسکرین پر کیے جو بالکل سامنے آ گئی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے کار کا ایکسلریٹر دبایا اور کار جست لگا کر سڑک سے اتر گئی۔ اگر اسے سڑک سے اترنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو جیپ اس سے ٹکرا جاتی۔ کار کچے میں گئی اور بری طرح اچھلنے لگی لیکن میں نے اس کی رفتار کم نہیں کی تھی۔ کیونکہ عقب سے فائرنگ کا شور سنائی دے رہا تھا۔ جیپ

والوں نے خودکار رائفلوں کے منہ کھول دیئے تھے اور ان کی تعداد یقیناً تین تو تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ جیپ کا کیا حال ہوا تھا لیکن اس میں سوار لوگ بالکل محفوظ رہے تھے اس کا ثبوت ان کی طرف سے جوابی کارروائی تھی۔ میں کار کو قابو کرتے ہوئے سڑک پر واپس لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرین سر کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے آگے جھک گئی تھی۔ برسنے والی گولیوں میں سے کئی کار کی باڈی سے لگی تھیں لیکن معجزانہ طور پر اس کے ٹائر اور شیشے محفوظ رہے تھے۔ میں اپنے اوسان بحال رکھ کر کار کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو کئی بار تو الٹتے الٹتے بچی تھی۔ اس وقت بھاگ نکلنے کے چکر میں ایکسلریٹر پورا دبا رکھا تھا۔

پھر نہ جانے کیسے کار واپس سڑک پر آ گئی۔ اس وقت رکی جیپ کوئی سو گز پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ سڑک پر آتے ہی میں نے رفتار بڑھا دی کیونکہ اب بھی ہم فائرنگ کی زد میں تھے اور کسی وقت بھی کوئی گولی کام تمام کر سکتی تھی۔ سڑک پر آنے کے بعد رفتار کوئی پچاس میل فی گھنٹہ ہوئی تھی اور یہ کوئی زیادہ رفتار نہیں ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے ایک تو رات کا وقت تھا اور دوسرے دھند تھی۔ تیسری بدقسمتی اس گولی کی صورت میں نازل ہوئی جس نے دائیں طرف کا عقبی ٹائر پھاڑ دیا۔ کار بری طرح بے قابو ہوئی اور میں اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ الٹ گئی۔ میں نے اور زرین نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی اس لیے ہم الٹنے پلٹنے سے محفوظ رہے تھے۔ مگر کار قلابازیاں کھا رہی تھی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب ایک چھپاکا ہوا اور کار میں پانی بھرنے لگا تب پتا چلا ہم کسی جوہڑ یا نالے میں جا گرے تھے۔ اوسان بحال ہوتے ہی زرین نے چیخ ماری اور میں نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے کہا۔

''سیٹ بیلٹ کھولو۔''

''مجھ سے نہیں کھل رہی ہے۔'' اس نے کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں پستول اور رائفل تلاش کر رہا تھا۔ رائفل نہ جانے کہاں چلی گئی تھی لیکن خوش قسمتی سے پستول میری جیکٹ کی جیب میں تھا۔ اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ تصادم کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ شاید کھلنے سے انکار کر دے لیکن جب میں کوشش کی تو وہ کھل گیا اور فوراً ہی یخ بستہ پانی کا ریلا اندر آیا۔ زرین نے ایک چیخ اور ماری تھی۔ وہ اب تک اپنی بیلٹ نہیں کھول سکی تھی۔

''مجھ سے بیلٹ نہیں کھل رہی۔''

''آرام سے رہو میں دیکھتا ہوں۔''

میں نے کوشش کی اور اس کوشش میں کئی صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا کیونکہ اس کے جسم کو چھوئے بغیر اسے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ بیلٹ کھلی تو میں باہر آیا۔ یہاں پانی کوئی چار فٹ تھا اور یہ ایک برساتی نالہ تھا جس میں اچھا خاصا پانی بہہ رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ پہاڑوں میں کہیں بارش ہوئی تھی۔ شکر ہے کار پانی میں الٹی نہیں گری تھی ورنہ ہمارے لیے بچ نکلنا آسان نہ ہوتا نالے میں کوئی دو ڈھائی فٹ پانی بہہ رہا تھا جب کہ یہاں شدید دھند تھی۔ باہر آتے آتے ہم دونوں بری طرح بھیگ گئے تھے اور سردی سے برا حال تھا۔ زرین نے تو باقاعدہ کانپنا شروع کر دیا۔

''اف......اتنی......سر......سردی۔''

''ہمت کرو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نالے کی دیوار پر چڑھنا شروع کیا۔ میں نے لاشعوری طور پر مخالف سمت کا رخ کیا تھا۔ دشمن پیچھے تھے۔ ان کی گاڑی خراب ہوئی تھی لیکن وہ ٹھیک تھے اور سب دانتوں تک مسلح تھے۔ یقینی بات تھی کار کا حادثہ انہوں نے اگر دیکھا نہیں تھا تب بھی سنا ضرور ہوگا اور وہ اس طرف دوڑے آرہے ہوں گے۔ میں ان کی آمد سے پہلے اس نالے سے نکل جانا چاہتا تھا اسی لیے بھیگ جانے کے باوجود یہاں سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ زرین کو کھینچنا پڑ رہا تھا۔ سردی کے موسم میں سرد پانی کتنی تیزی سے جسم کی حرارت کھا جاتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جن کا ایسے حالات سے واسطہ پڑا ہوا ایسا لگ رہا تھا جیسے ہاتھ پاؤں بے کار ہوئے جا رہے ہیں۔ ہم کسی نہ کسی طرح نالے کی دیوار چڑھ کر اوپر آ گئے تھے۔

''مجھ سے...... نہیں چلا جا رہا۔'' زرین لرزتے ہوئے بولی۔

''کیا تم پھر مرشد اور اس کے درندہ صفت آدمیوں کے ہاتھ آنا چاہتی ہو؟'' میں نے کسی قدر سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ زیادہ کانپ کر بولی۔ ''اس سے بہتر ہوگا تم مجھے یہیں گولی مار دو۔''

''اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ ہم دونوں جان بچانے کی کوشش کریں اور آخر تک مقابلہ کریں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''بس تو چلنا شروع کر دو۔ چلو گی تو سردی کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ اسی لمحے نالے کے دوسری طرف سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

''اوئے گڈی اتھے اے...... اوتھے کی ویکھ رہا اے۔''

''وہ آ گئے۔'' میں نے کہا اور زرین کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا وہ میرے ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔ خود میری حالت بھی اچھی نہیں تھی لیکن ایک تو مجھے اس قسم کے حالات کا بارہا تجربہ ہو چکا تھا۔ دوسرے میں مرد تھا اس لیے مجھے مجبوراً ہمت دکھانا تھی۔ دھند اور تاریکی میں راستے کا بالکل پتا نہیں چل رہا تھا اور ہم اندازے سے چل رہے تھے اس لیے ہر چند قدم کے بعد لڑکھڑاتے یا گرتے تھے۔ پیروں تلے موجود زمین سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کسی ملری علاقے میں تھے جہاں زمین کی شکل قدرت تراشتی ہے اور اس میں قدرتی ناہمواری اور کھردرا پن تھا۔ زرین ہر کچھ دیر بعد اعلان کرتی تھی کہ اب اس سے نہیں چلا جا رہا ہے اور میں اسے بس چند قدم اور کا دلاسہ دے کر آمادہ سفر رکھتا تھا۔ اس طرح گرتے پڑتے اور رکتے ہوئے ہم اس جگہ سے خاصی دور نکل آئے تھے یعنی اتنی دور نکل آئے تھے کہ دشمن کی آواز بھی نہیں آرہی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دور ہو گیا تھا ممکن ہے وہ بنا آواز کے ہمارا تعاقب کر رہا ہو۔ کیونکہ گرنے اور لڑکھڑانے کے دوران میں زرین چیخ مارے بغیر نہیں رہتی تھی اور عین ممکن ہے یہ چیخیں تعاقب کرنے والوں کے لیے اس تاریکی میں مشعل راہ کا کام کر رہی ہوں۔ میں زرین کو چپ بھی نہیں کرا سکتا تھا وہ اس وقت اپنے پورے حواس میں ہی نہیں تھی اور پھر اچانک ہی وہ بوری کی طرح لڑھک گئی۔ اگر میں اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ اس ڈھلان پر نہ جانے کہاں نکل جاتی جس پر ہم اتر رہے تھے۔

''زرین...... زرین۔'' میں نے اسے جھنجھوڑا پھر منہ پر ہلکے سے تھپڑ مارے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا

تھا۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ سردی کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا تھا کہ دھند کا جو حصہ زمین پر گر رہا تھا وہ برف کی طرح جمتا جا رہا تھا اور ہمارے پیروں تلے کرچ کرچ کی آواز کر کے ٹوٹ رہا تھا۔ زرین مکمل طور پر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب اسے شانے پر اٹھائے بنا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ اسے اٹھا کر میں پھونک پھونک کر ڈھلان سے اترنے لگا کیونکہ اب گرنے بلکہ لڑکھڑانے کی گنجائش بھی نہیں تھی ہم گرتے تو بہت بری طرح گرتے۔

خدا خدا کر کے میں اس ڈھلان سے نیچے آنے میں کامیاب رہا اور اب ایک جنگل سے گزر رہا تھا۔ جنگل سے مراد یہ ہے کہ وہاں درخت تھے اور جنگل کے انداز میں تھے۔ میں ٹٹول ٹٹول کر راستہ بنا رہا تھا۔ اچانک میرے ہاتھ کے سامنے ایک دیوار آ گئی۔ یہ کچی مٹی سے بنی دیوار تھی۔ اس دیوار کو محسوس کر کے مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی میں بتا نہیں سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بالآخر ایک خلا تک پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شاید دروازہ ہوگا لیکن گرے ملبے نے بتایا کہ یہاں سے دیوار ہی گر گئی تھی۔ میری خوشی ماند پڑنے لگی۔ کیا یہ کوئی ویران گھر تھا۔ میں ٹٹول کر احاطے کے اندر آیا۔ تب کسی قدر اندازہ ہوا کہ یہ واقعی ویران مکان تھا۔ احاطہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس کے وسط میں ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری بنی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف صحن تھا۔ کوٹھری کا دروازہ ٹوٹ کر باہر جھول رہا تھا۔ یہاں دھند کی شدت کم تھی اس لیے اتنا تو نظر آ رہا تھا۔ میں زرین کو لیے ہوئے کوٹھری کی طرف بڑھا اور اسے دیوار کے ساتھ زمین پر لٹا دیا۔ پھر میں اندر داخل ہوا۔ میرے پاس روشنی کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے مجھے جو دیکھنا تھا اپنے ہاتھوں کی مدد سے دیکھنا تھا۔

لیکن ہاتھ سے پہلے میرے پیروں نے دیکھ لیا۔ یہ ایک خستہ حال چارپائی تھی اور میں ٹکرا کر اس پر ڈھیر ہوا تو یہ ٹوٹ گئی تھی۔ سہارا لے کر بمشکل اس سے اٹھا تھا۔ پھر دیواروں کو ٹٹول رہا تھا کہ ایک طاق میں ہاتھ گیا اور اس سے ایک چیز آواز پیدا کرتی نیچے گری۔ میری باچھیں کھل گئی تھیں یہ ماچس کی آواز تھی۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر اسے تلاش کیا اور ہاتھ میں آتے ہی بیتابی سے ایک تیلی جلائی۔ روشنی کیسی نعمت ہوتی ہے اس کا صحیح معنوں میں اندازہ اس رات ہوا تھا۔ ایک معمولی سی تیلی نے کس طرح تاریکی کو روشنی میں بدل دیا تھا۔ میں نے اس روشنی میں کوٹھری کا معائنہ کیا۔

یہ بمشکل دس بائی دس فٹ کی کوٹھری تھی اور اس میں سوائے اس ٹوٹ جانے والی خستہ حال چارپائی کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا کہ روشنی کے لیے وہاں کچھ ہو لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ کچی زمین پر خشک گھاس اور چند لکڑیاں پڑی تھیں۔ تیلی بجھ گئی تو دوسری جلائی اور جلدی سے کچھ گھاس ایک طرف جمع کر کے اسے آگ دکھائی۔ خشک گھاس نے فوراً آگ پکڑ لی پھر میں نے چند لکڑیاں آپس میں ملا کر مشعل بنائی اور اسے آگ دکھائی۔ جب یہ جل اٹھی تو اسے دیوار میں سوراخ میں لگا دیا۔ یہ کام کر کے میں باہر آیا جہاں زرین دیوار سے ٹکی بے سدھ پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر اندر لایا اور احتیاط سے ٹوٹی چارپائی پر لٹا دیا۔ ذرا سی دیر میں اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ اسے سردی لگ گئی تھی اور نمونیا بھی ہو سکتا تھا اور اسے حرارت پہنچانے کی اشد ضرورت تھی۔

چارپائی کے دو عدد پائے ٹوٹ گئے تھے اور میں نے ان کو آسانی سے چارپائی سے الگ کر لیا۔ پھر کوشش کر کے ان کے مزید دو ٹکڑے کیے اور گھاس جمع کر کے اسے آگ دکھائی اور اس پر ٹوٹے پائے ڈال دیے۔ آگ

کو بجھنے سے روکنے کے لیے مجھے کوٹھری سے چن چن کر گھاس کے تنکے الاؤ میں ڈالنا پڑے تب کہیں جا کر لکڑی نے آگ پکڑی تھی۔ میں نے چارپائی کھینچ کر الاؤ کے قریب کر دی تا کہ زرین کو زیادہ سے زیادہ حرارت ملے۔ باہر سے آتی یخ ہوا کو روکنے کے کے لیے کوٹھری کا دروازہ کسی نہ کسی طرح اس کی چوکھٹ میں فٹ کر دیا تھا کہ نہ تو باہر سے ہوا آ سکے اور الاؤ کی روشنی بھی باہر نہ جا سکے۔ لکڑیوں کو صحیح سے آگ لگی تو کوٹھری اندر سے گرم ہونے لگی تھی۔ اس دوران میں، میں زرین کے ہاتھ اور پاؤں سہلاتا رہا تھا تا کہ اسے گرمائش پہنچے۔ اس کے چہرے کی نیلاہٹ کم ہوئی تھی لیکن وہ ہوش میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بہت زیادہ بھیگے تھے کیونکہ سوئیٹر اور لباس نے خاصا پانی جذب کر لیا تھا۔ میں نے اس کا سوئیٹر اتار دیا اور اسے الاؤ کے پاس چارپائی سے لٹکا دیا۔ اپنی جیکٹ اتار کر اسے خشک کرنے لگا۔ پتلون بھی بھیگ گئی تھی لیکن اسے نہیں اتار سکتا تھا۔ الاؤ کی گرمی اور میری کوشش رنگ لائی اور کچھ دیر بعد زرین کراہنے لگی۔ وہ ہوش میں آ رہی تھ ا۔ میں نے جلدی سے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

''زرین......شاباش آنکھیں کھولو۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ ''ہم کہاں ہیں؟''

''ایک ویران مکان ہے یہاں بس یہی کوٹھری ہے۔ شاباش اٹھ کر آگ کے پاس آؤ تا کہ گرمائش مل سکے۔''

آگ کا سن کر وہ بے تابی سے اٹھی تھی۔ اس نے چارپائی سے جھک کر دونوں ہاتھ آگ کے اوپر کر دیئے۔ میں نے اس کے ہوش میں آنے پر سکون کا سانس لیا تھا اگر اب ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑتا تو زرین کو اٹھانے کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ جس طرح ہمیں یہ مکان مل گیا تھا اسی طرح ہمارے دشمن بھی یہاں آ جائیں۔ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے تھے۔ جیکٹ خشک کر کے میں نے قمیص اتاری اور جیکٹ پہن کر اسے خشک کرنے لگا۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا۔

''سنو تم قمیص اتار کر سوئیٹر پہن کر اپنی قمیص خشک کر لو۔''

وہ ہچکچائی۔ ''نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

''نہیں یہ موقع ہے ممکن ہے ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے اس لیے جو ہو سکتا ہے وہ کر لو میں دوسری طرف منہ کر لیتا ہوں۔''

میں نے دوسری طرف منہ کیا تو اس نے قمیص اتار کر کسی قدر سوکھ جانے والا سوئیٹر پہن لیا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو ہنسی آ گئی۔ صرف سوئیٹر اور شلوار میں وہ عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ کھسیا گئی۔ ''ہنس کیوں رہے ہو، کیا بری لگ رہی ہوں؟''

''بری تو نہیں لیکن عجیب سی لگ رہو۔''

وہ خفا ہو گئی اور چپ کر کے قمیص خشک کرنے لگی۔ اس دوران میں میری قمیص خشک ہو گئی تھی میں نے اسے پہن لیا۔ اب صرف پتلون بھیگی ہوئی تھی اور وہ بھی آگ اور جسم کی گرمی سے کسی قدر خشک ہو چلی تھی۔ کچھ دیر میں اس نے قمیص خشک کر لی تو میں نے دوبارہ منہ پھیرا اور اس نے سوئیٹر تلے قمیص پہن لی۔ سردی کا اثر کم ہوا تو اس کا

موڈ خوشگوار ہونے لگا۔

''شکر ہے یہ ٹھکانہ ملا ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا سردی کے ہاتھوں میری موت ہونے والی ہے۔''

''بس یہ اللہ کا احسان ہے وہ اپنے بندوں کا اتنا امتحان لیتا ہے جتنی ان میں برداشت ہوتی ہے۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''میں نے دیکھا ہے تم اللہ کا بہت ذکر کرتے ہو۔''

''ہاں لیکن اتنا نہیں جتنا کرنا چاہیے۔''

''تم مذہبی خیالات رکھتے ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شاید اسی لیے میری قربت تم پر اثر نہیں کرتی ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''میں تمہارے ساتھ ہوتی ہوں لیکن تم میری طرف توجہ نہیں دیتے ہو۔''

''توجہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے......'' وہ بولتے بولتے رک گئی پھر اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''میں بتا نہیں سکتی لیکن بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر میں کسی اور کے ساتھ ہوتی تو وہ مجھ سے یوں پیش نہ آتا۔''

''کیا تمہیں میرے رویے سے کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں......نہیں مجھے تو تمہارا رویہ بہت اچھا لگتا ہے۔ سچی بات ہے تم میری جتنی عزت کرتے ہو میں خود کو اتنی عزت کے قابل نہیں سمجھتی ہوں۔ تم مردوں کی وہ قسم ہو میرا جس سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے۔'' اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا تھا۔ ''ورنہ تم سے پہلے جو مرد ملے......''

''فی الحال اس بحث کو یہیں چھوڑ دو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ درحقیقت میں بور ہو رہا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس قسم کی باتیں کر رہی تھی۔ اصل بات یہ تھی اس سے میرا رویہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس بے نیازی کی عادی نہیں تھی۔ کوئی عورت نہیں ہوتی ہے خاص طور سے جب وہ زرین کی طرح حسین اور دل کش بھی ہو۔ ممکن ہے وہ عام حالات میں مجھے ملی ہوتی تو میں اسے اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کر پاتا لیکن اس وقت میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس کی طرف توجہ دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ غور سے میرے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ مجھے بے وقت کی راگنی اچھی نہیں لگی ہے۔

''شاید تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگی۔''

''زرین تم میرے لیے عورت سے زیادہ ایک مخلص ساتھی ہو جیسے بیتو ہے یا عبداللہ ہے یا میرے دوسرے ساتھی ہیں اور میں تم کو ایک ساتھی کے طور پر دیکھتا ہوں۔ اگر تمہیں اس سے تکلیف ہوتی ہے تو میں صرف معذرت کر سکتا ہوں۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ پھر اس نے سسکی لی تو میں چونکا۔ ''تم رو رہی ہو...... کیوں؟''

''میرے مقدر میں ہی رونا ہے۔'' اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ''شاید تم بھی بے زار ہوتے جا رہے ہو؟''

''اوہ بی بی۔'' میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''یہ کون سا موقع ہے اس بحث کا جب کہ دشمن پاگل کتے کی طرح

ہماری تلاش میں ہے۔"

اس بار وہ چپ ہو گئی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور اس نے مجھ سے کون کون سی توقعات وابستہ کر لی تھیں جب کہ میں اسے کئی بار بتا چکا تھا کہ میں اسے عورت کی نظر سے دیکھتا ہی نہیں ہوں۔ پھر وہ بار بار یہ موضوع کیوں چھیڑ دیتی تھی؟ شاید وہ اپنی نسوانی فطرت سے مجبور تھی جو مرد کی توجہ حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ اس میں جنس کے جذبے کا لازمی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ ایک بیٹی اپنے باپ کی ایک بہن اپنے بھائی کی اور ایک ماں اپنے بیٹے کی توجہ بھی اسی طرح چاہتی ہے۔ جیسے ایک عورت ایک چاہنے والے مرد کی توجہ چاہتی ہے۔



لکڑیاں اب انگاروں میں بدل رہی تھیں لیکن انہوں نے کچھ دیر کے لیے کوٹھری میں حرارت بھر کر ہمیں زندگی بخش دی تھی اور ہم پھر سے جی اٹھے تھے۔ گرمی نے ہمارے لباس تقریباً خشک کر دیئے تھے۔ صرف میری پتلون کے پائنچے ذرا نم رہ گئے تھے۔ میں نے جوتے اور موزے اتار کر خشک کر لیے تھے۔ دیوار میں لگی مشعل بھی بجھنے کے قریب تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی صبح کے چار بج رہے تھے لیکن سردی کے دن تھے اس لیے سورج کوئی ساڑھے سات بجے نمودار ہوتا اور دھند کی وجہ سے روشنی نو بجے سے پہلے نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے انگاروں کی طرف دیکھا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ میں نے چارپائی کا جائزہ لیا اور پھر اس کا ایک پایہ الگ کیا لیکن یہ مضبوط تھا اور اس کے ٹکڑے کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے اسے سالم ہی انگاروں پر رکھ دیا دوسرا پایہ الگ کرنے سے چارپائی کی چوکھٹ زمین سے لگ گئی اور اب اس پر بلا خوف و خطر لیٹا جا سکتا تھا۔ میں نے زرین سے کہا۔

"تم کچھ دیر آرام کر لو۔"

"اور تم؟"

"میں سوچ رہا ہوں باہر کا ایک چکر لگا آؤں ممکن ہے دشمن آس پاس ہو اس صورت میں ہم یہیں گھر سکتے ہیں۔ تم ذرا دروازہ پکڑ کر رکھنا ورنہ اندر کی ساری گرمی نکل جائے گی۔"

میں نے دروازہ کھول کر زرین کو پکڑا دیا۔ اس نے اسے بند کر دیا۔ باہر آتے ہی لرز اٹھا تھا۔ شکر ہے اب کپڑے خشک تھے ورنہ پھر سے برا حال ہو جاتا۔ میں نے دبے قدموں احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگا اور سن گن لینے کی کوشش کی کیونکہ نظر تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ احاطے اور اس کے آس پاس سوائے جھینگروں اور دوسرے رات کو الاپ کرنے والے کیڑوں کی آوازوں کے کوئی آواز نہیں تھی۔ میں واپس آ گیا۔ "فی الحال خطرہ نہیں ہے، تم کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔" میں نے دروازہ فکس کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آئے گی۔" زرین چارپائی پر لیٹ گئی۔

"سونے کے بجائے جسم اور ذہن کو آرام پہنچانے کی کوشش کرو۔"

اس نے یہی کیا تھا نتیجے میں کچھ ہی دیر میں اس کے سریلے خراٹے سنائی دینے لگے۔ میں الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔ دوسرے پائے نے آگ پکڑ لی تھی اور اس کے پاس سے حرارت کی فرحت بخش لپیٹیں آ رہی تھیں۔ اس

کے علاوہ ایک پایہ اور بھی تھا اور ان کی مدد سے ہم رات سکون سے گزار سکتے تھے۔ بشرطیکہ دشمن دخل در نامعقولات کر کے ہمیں اس پناہ گاہ سے بے دخل نہ کر دیتا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگالی اور سر گھٹنوں میں دے کر آرام کرنے لگا۔ پھر شاید مجھے بھی نیند آ گئی تھی یا یہ غنودگی تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے آس پاس سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اچانک میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں چونک کر بیدار ہو گیا۔ شاید میں نے کوئی آہٹ سنی تھی۔ الاؤ جل رہا تھا میں نے تیزی سے اس پر مٹی ڈالی اور آگ بجھ گئی لیکن انگاروں کی مدھم روشنی باقی تھی میں نے تیزی سے آگے ہو کر زرین کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلایا۔ وہ تڑپ کر جاگ گئی تھی۔

''آرام سے۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''آواز مت نکالنا یہاں کوئی ہے۔'' میں نے اس کا منہ چھوڑا تو وہ بولی۔

''کون ہے؟''

''باہر کوئی ہے۔'' میں نے کہا اور دبے قدموں دروازے تک آیا۔ اس سے لگ کر میں نے سانس روک لی اور اپنی تمام تر توجہ سماعت پر لگا دی۔ اس کا صلہ بھی فوری ملا۔ باہر کسی نے بہت آہستہ سے کچھ کہا۔ آواز انسان کی تھی۔ جملے غیر واضح تھے لیکن اس سے یہ ثبوت مل گیا کہ میری چھٹی حس نے ٹھیک خبردار کیا تھا۔ زرین اٹھ کر میرے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''میرا خیال ہے وہ اندر ہیں؟'' اس بار الفاظ سنائی دیئے۔

''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' دوسرے آدمی نے کہا تو میں نے زرین کو کوٹھری کے گوشے میں دھکیل دیا اور پستول نکال لیا۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر وہ کونے میں دبک گئی تھی۔ میں آنے والوں کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ حسبِ توقع ان میں سے کسی نے دروازے کو لات ماری اور وہ سیدھا الاؤ کے اوپر جا پڑا۔ اس کے تلے انگاروں کی روشنی دب گئی تھی۔ یہ رحم اور مروت کا موقع نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا اور سامنے والے کو شوٹ کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسے گولی کہاں لگی تھی لیکن اس کی چیخ میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اس کے گرتے ہی میں نے عقب میں اس کے ساتھی پر لگاتار دو فائر کیے اور اس کی ہلکی سی کراہ سنائی دی وہ واپس بھاگا تھا۔

میں گولیاں ضائع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ آخری میگزین تھا۔ یہ ختم ہو جاتا تو میں خالی ہاتھ رہ جاتا۔ بھاگنے والے نے ذرا پیچھے جا کر دروازے کی طرف اندھا دھند فائرنگ کی تھی۔ اس نے اپنے ساتھی کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ جب اس نے فائرنگ روکی تو میں نے بیٹھ کر لاش ٹٹولی اور اسے اندر کھینچ لیا۔ اس کے لباس کی تلاشی لی۔ جلد مجھے مطلب کی چیز مل گئی یہ ایک عدد ریوالور اور اس کی گولیوں کا پاؤچ تھا۔ میں نے اسے نکال لیا۔ مزید تلاشی لی تو ایک عدد ٹارچ بھی مل گئی۔ میں نے ٹارچ کا منہ اپنی ہتھیلی سے دبایا اور بٹن دبایا تو وہ روشن ہو گئی۔ اس کے ساتھی کے پاس پستول تھا۔ جس جیب میں ٹارچ تھی اسی سے اس کا پرس بھی ملا تھا یہ سب میں نے جیکٹ میں رکھ لیا۔ اب مجھے اس کے ساتھی کی فکر تھی کہ وہ کہاں تھا اور اس نے خود اپنی نشانی دہی کر دی۔

''اوئے جیرے۔'' کسی نے دور سے چلا کر کہا۔ ''فائر کس نے کیتے؟''

''جیرا مارا گیا ہے۔'' اس کے ساتھی نے چلا کر کہا اور مجھے اس کی کمین گاہ کا پتا چل گیا۔ میں نے پستول

اس طرف سیدھا کیا اور باقی گولیاں اس پر چلا دیں۔ تیسری چوتھی گولی پر اس کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔ میں نے زرین کو پکارا۔

''آجاؤ...... یہاں سے نکلنا ہے۔''

وہ بھاگ کر آئی اور ہم کوٹھری سے نکل آئے۔ میں نے ٹوٹی دیوار کا رخ کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس کے بجائے میں نے سامنے والے رخ سے پہلے زرین کو دیوار پر چڑھایا اور پھر خود بھی کود کر دوسری طرف آ گیا۔ میں نے ٹارچ روشن نہیں کی تھی کیونکہ آس پاس آہٹیں بتا رہی تھیں کہ دشمن کے مزید آدمی آ گئے تھے۔ روشنی کرنے کا مطلب ان کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا میں نے آہستہ سے زرین سے کہا۔ ''میرے پیچھے رہو اور کوئی آواز مت نکالنا۔''

گزشتہ چند گھنٹے کے تجربات سے زرین نے بہت کچھ سیکھا تھا اور اب وہ سنبھل کر اور دبے قدموں چل رہی تھی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس نے اپنی آواز کو قابو میں رکھا تھا۔ میرا بازو پکڑنے کے باوجود وہ کئی مقام پر لڑکھڑائی تھی اور مجھے لگا تھا کہ وہ ابھی چیخ مارے گی لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور کوئی آواز نکالنے سے گریز کیا۔ واحد سوال اس نے میرے کان میں گھس کر یہ کیا تھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''مجھے بھی نہیں معلوم۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ہم درختوں میں تھے اور یہاں سفر کرنا آسان تھا کیونکہ درختوں کو سہارے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور سنبھل کر قدم بڑھائے جاتے تو منہ کے بل گرنے کا امکان کم تھا۔ دھند تو شاید کم ہوئی تھی لیکن کہرا گر رہا تھا۔ ہمارے لباس کا اوپری حصہ بھیگتا جا رہا تھا۔ مگر یہ بارش میں بھیگنے سے مختلف تھا۔ اس کا اثر ہمارے جسموں تک نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد زرین نے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ واقعی ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم مارگلہ کے پہاڑوں سے زیادہ دور نہیں تھے اور ممکن ہے یہ بھی مارگلہ کا کوئی حصہ ہو۔ اس پہاڑی سلسلے نے اسلام آباد اور راولپنڈی کو کسی سانپ کی طرح اپنے بلوں میں جکڑ رکھا تھا اور یہ کئی جگہوں پر موجود تھا۔ درحقیقت یہ پورا علاقہ کسی قدر میدانی ہے اور یہاں پہاڑ صرف مارگلہ کے ہیں ورنہ اصل پہاڑی سلسلے تو آگے ملتے ہیں جن میں ہزارے کا پہاڑی علاقہ اور پھر مری کی پہاڑیاں ہیں۔ مارگلہ کی وجہ سے ہی اسلام آباد کا موسم خوش گوار ہے۔ یہ جنوب کی گرم میدانی ہواؤں سے اس خطے کو بچاتے ہیں اور ان پہاڑوں کی وجہ سے یہاں بارش کا تناسب بھی زیادہ ہے۔ عین اسلام آباد میں دامن کوہ سے اوپر چلے جائیں تو تقریباً تیرہ سو میٹرز کی بلندی پر گرمی میں بھی موسم بہت خوش گوار ملتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی نے ان پہاڑوں پر اثر ڈالا ہے اور اب یہ پہلے کی طرح سرسبز اور شاداب نہیں رہے ہیں۔ پھر تعمیراتی کاموں کے لیے ان سے پتھر بھی نکالے جاتے ہیں اور بے گھر افراد نے چٹانیں کاٹ کر ان میں گھر بھی بنا لیے ہیں۔

شاید میں اصل موضوع سے بھٹک کر کہیں اور نکل گیا کیونکہ میں خود بھٹک رہا تھا۔ اس وقت پانچ بج رہے تھے صرف بیس منٹ پہلے ہم سکون سے ایک گرم کمرے میں [illegible] رہے تھے اور اب سردی میں بھٹکتے پھر رہے

تھے۔ سمت اور منزل کا کچھ نہیں پتا تھا اور معلوم نہیں تھا کہ کس طرف جا رہے ہیں۔ اب ڈھلان واضح ہوگئی تھی۔ ہم واقعی بلندی کی طرف جا رہے تھے اور یہ تشویش ناک بات تھی کیونکہ بلندی کی طرف جانے کا مطلب تھا زیادہ سردی کا سامنا کرنا لیکن ہم واپس نہیں جا سکتے تھے کیونکہ مرشد کے آدمی یقینی طور پر ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میری رہی سہی خوش فہمی اس وقت دور ہوگئی تھی جب وہ اس کچے مکان تک چلے آئے تھے۔ فاضلی بڑی ہوشیاری سے اپنے آدمیوں سمیت میرے پیچھے تھا۔ مجھے یقین تھا وہ اس وقت بھی ہمارا پیچھا کر رہا ہوگا۔ اس میں چالاکی کے ساتھ صبر اور حوصلہ بھی تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس جیسا شخص مرشد جیسے گھٹیا آدمی کا گرگا بنا ہوا تھا۔ جو انسانوں کو تو دھوکا دے رہا تھا۔ نعوذ باللہ بزعم خود خدا کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔ اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی کہ مرشد کے پاس دولت کی طاقت تھی اور وہ فاضلی جیسے لوگوں کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔

''میں تھک گئی ہوں۔'' زرین نے آہستہ سے کہا۔

''ابھی چلتی رہو کیونکہ اس تاریکی میں ہم ان سے جتنا دور نکل جائیں اچھا ہے روشنی میں ان کی نظر میں آنے کا امکان ہوگا۔''

''میں سمجھتی ہوں لیکن مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے پیروں میں اب جان باقی نہیں رہی ہے۔'' وہ تھکے لہجے میں بولی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ ایک نازک عورت تھی جس کا اس قسم کی بھاگ دوڑ سے ایک ہی بار واسطہ پڑا تھا اور وہ بھی جب میرے ساتھ مرشد کی کوٹھی سے فرار ہوئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے رک جائیں۔

''ٹھیک ہے لیکن ہم دس منٹ رکیں گے اور اپنا سانس بحال کرنے کے لیے جان بوجھ کر تیز اور گہرے سانس لو اس سے تھکن جلد اتر جائے گی۔''

وہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس طرح سانس لینے لگی جیسے پرانی فلموں میں ہیروئن بلا وجہ محض جذبات ظاہر کرنے کے لیے گہرے گہرے سانس لیتی تھیں۔ پانچ منٹ میں اس کی حالت بہتر ہوگئی تھی اور اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''تم نے بہت اچھا طریقہ بتایا ہے۔ اب میں بہت کم تھکن محسوس کر رہی ہوں۔''

''اگر انسان درست انداز میں سانس لیتا رہے تو اسے تھکن بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ اب تم چلنے کے دوران میں بھی اسی طرح سانس لیتی رہنا۔ اس سے تھکن کم ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''بس تو پھر اٹھ جاؤ۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ہم پھر چلنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ ہم خاصی دور نکل آئے تھے اور دشمن آس پاس نہیں تھا اگر میں ٹارچ روشن کر لیتا تو ہم راستہ بہتر طور پر دیکھ کر تیز رفتاری سے چل سکتے تھے۔ میں نے ٹارچ روشن کر لی۔ اس کی روشنی محدود کرنے کے لیے میں نے اس کے آگے ہاتھ رکھ لیا تھا اور انگلیوں سے تھوڑی سی روشنی نکل رہی تھی۔ جس سے سامنے زمین نظر آ رہی تھی اب ہم بہتر چلنے لگے۔ زرین نے عقب سے کہا۔ ''شکر ہے تم نے روشنی کی لیکن یہ ٹارچ کہاں سے آئی؟''

''مرنے والے کی جیب سے نکلی تھی۔''

''شہباز جب تم مجھ سے بات کرتے ہو یا کوئی سلوک کرتے ہو تو تمہارے انداز میں اتنی نرمی ہوتی ہے لگتا

ہی نہیں ہے کہ تم کسی کے ساتھ ذرا سا بھی برا سلوک کرسکو گے لیکن جب دشمن سے نمٹتے ہو تو ایسے درشت بن جاتے ہو کہ مجھے بھی تم سے خوف آنے لگتا ہے۔تم نے کتنے آرام سے ان دونوں کو مار دیا۔''

''تم میری دوست ہو اور وہ میرے دشمن تھے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔''دوست اور دشمن سے سلوک میں فرق تو فطری بات ہے یہ تمہیں عجیب کیوں لگ رہا ہے؟''

''بس جب میں تمہارا یہ رویہ دیکھتی ہوں تو مجھے عجیب ہی لگتا ہے۔''

''یہ شاید میری قسمت بھی ہے کیونکہ ہر شخص کو وہ سب دیکھنے کو نہیں ملتا ہے جو مجھے دیکھنے کو ملتا ہے اور نہ ہی مجھ جیسے حالات سب کو پیش آتے ہیں۔''

صبح ہونے کے ساتھ ساتھ دھند کی شدت میں کمی آرہی تھی اور اس کی سیاہی اب سفیدی میں بدلنے لگی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حدِ نظر بہتر ہوئی تھی۔روشنی کے باوجود چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔اب چھ بجنے والے تھے۔ چلتے رہنے سے سردی کا احساس کم ہوا تھا۔ پھر بھی ہم ٹھٹھرے جا رہے تھے۔مگر جب نالے میں گر کر بھیگے تھے تب کے مقابلے میں حالت بہت بہتر تھی۔ زرین میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے چلنے کے دوران میں گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس لیے اب اسے پہلے جیسی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ اس مسلسل سفر سے بے زار ضرور ہوگئی تھی اس نے پوچھا۔''ہم کب تک چلتے رہیں گے؟''

''جب تک کسی منزل تک نہ پہنچ جائیں۔'' میں نے منطقی جواب دیا۔''ویسے تم کیا چاہتی ہو؟''

وہ رک کر ایک درخت سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگی۔''میں چاہتی ہوں کہ مجھے ایک کمرہ اور ایک گرم بستر مل جائے اور میں اس پر لیٹ کر کبھی نہ اٹھنے کے لیے سو جاؤں۔''

''یہ تو موت کی خواہش ہے۔'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

''ہاں اتنا کچھ دیکھ لیا ہے کہ اب بس موت باقی رہ گئی ہے۔''

''ہر مصیبت زدہ یہی سمجھتا ہے کہ اس نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے اور اب صرف موت باقی ہے۔'' میں نے ایک اور سچائی بیان کی۔''میرا خیال ہے جلد تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔''

وہ چونکی۔''موت کی؟''

''نہیں گرم بستر کی۔'' میں نے چلنا شروع کر دیا۔''چلو کیونکہ یہ خواہش صرف چلنے سے پوری ہوگی۔''

اس وقت ہم شاید تین ہزار فٹ کی بلندی کے آس پاس تھے کیونکہ یہاں برف نظر آرہی تھی شدید سردی میں ان پہاڑوں پر بھی برف باری ہوتی ہے لیکن یہ ہر سال نہیں ہوتی ہے تین چار سال بعد ہوتی ہے۔اس سال سردی غیر معمولی تھی اس لیے اس بلندی پر برف پڑی تھی۔ یہ برف شاید چوبیس گھنٹے کے دوران پڑی تھی کیونکہ اس بلندی پر برف زیادہ دیر نہیں رہتی ہے اور سورج کی روشنی میں فوراً ہی پگھل جاتی ہے۔

''گرم بستر نہ سہی موت ہی آ جائے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''اتنی مایوسی اچھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔''انسان کو ہر حال میں مثبت انداز میں سوچنا چاہیے۔''

''سب تمہاری طرح مضبوط نہیں ہوتے ہیں۔''

میں نے ایسے ہی ایک بات کہی تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ منہ سے نکلی یہ بات جلد اسی طرح پوری ہو

جائے گی۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور اب کسی قدر نظر آ رہا تھا میں نے ٹارچ بند کر دی کیونکہ احتیاط کے باوجود اس کی روشنی کو دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس جگہ درخت فطری انداز میں لگے تھے اور یہاں انسانوں کی مداخلت کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ گویا ہم سچ مچ کے جنگل سے گزر رہے تھے۔ مارگلہ کے بہت سارے حصے آباد ہیں لیکن اس کے بہت سارے حصے غیر آباد بھی ہیں خاص طور سے جو شہر سے دور ہیں وہ زیادہ تر ویران ہیں۔ ان پہاڑوں میں اسلام آباد بننے سے پہلے بہت سارے گاؤں تھے جو اب رفتہ رفتہ ختم ہوتے جا رہے ہیں یا شہری آبادی ضم ہو چکے ہیں۔ روزگار کی نوعیت کی تبدیلی نے بہت ساری آبادیوں کو ختم کر دیا ہے۔

''یہ آواز کیسی ہے؟'' زرین نے کہا۔

میں خیالوں میں گم تھا اس لیے میں سن نہیں سکا تھا اس لیے جب اس نے توجہ دلائی تو میں چونکا۔ کان لگانے پر واقعی ایک گنگناتی آواز محسوس ہوئی اور چند لمحوں میں دماغ نے اس آواز کو شناخت کر لیا۔ میں نے کہا۔

''یہ کسی گاڑی کی آواز ہے۔''

''اور پاس ہی کوئی سڑک بھی ہے۔'' زرین جوش سے بولی۔

''سڑک کا تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''کسی گاڑی کے انجن کی اتنی ہموار آواز صرف سڑک پر ہوتی ہے۔''

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ''واہ تم نے ذہانت کی بات کی ہے۔ آؤ اب دیکھتے ہیں کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔''

آواز اوپر سے آ رہی تھی۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ کچھ آگے گئے تو درخت چھدرے ہونے لگے تھے اور ان کی جگہ جھاڑیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ زمین بھی ہموار ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم ایک سڑک کے کنارے تھے۔ پہاڑوں میں بل کھاتی یہ سڑک نشیب سے آ رہی تھی اور بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے کون سا پہاڑی مقام تھا لیکن نیچے یہ سڑک یقینی طور پر اسلام آباد یا راولپنڈی جاتی تھی۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا۔

''مبارک ہو کم سے کم ایک سڑک تو ملی۔''

وہ کراہی۔ ''اب اس پر چلنا پڑے گا۔''

''تب ہی تو اپنی منزل تک پہنچیں گے۔ گرم بستر والی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''کہیں دشمن اس سڑک پر گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی لیکن اس وجہ سے ہم یقیناً یہاں پہاڑوں میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ ''ہمیں نیچے جانا ہے۔'' میں نے کہا اور سڑک پر مارچ شروع کر دی۔ وہ میرے پیچھے لپکی۔

''ارے رکو...... اس طرح کہاں بھاگ رہے ہو؟''

''بھاگ کہاں رہا ہوں۔'' میں نے اسی طرح لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کہا۔ ''اسے چلنا کہتے ہیں۔''

وہ جھنجلا گئی۔ ''تمہارے لیے کہتے ہوں گے مجھے تو بھاگنا پڑ رہا ہے۔''

''اچھی بات ہے اس طرح تمہارے جسم میں گرمی آئے گی۔''

''تب تم چلتے رہو۔'' وہ سڑک کے کنارے ایک گرے درخت کے تنے پر بیٹھ گئی۔ ''میں یہیں رکتی ہوں۔''

میں اچھے موڈ آ گیا تھا۔ ''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی......گھر پہنچ کر اسی پتے پر خط لکھ دوں گا۔''

میرا خیال تھا کہ مجھے آگے جاتا دیکھ کر وہ اٹھ کر آ جائے گی لیکن وہ بیٹھی رہی۔ میں رکا تھا اسی لمحے سامنے سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ جب وہ پاس آ گئی تب اس کی آواز آئی تھی اور صورت بعد میں دکھائی دی۔ نیچے شاید ہمیں اسی گاڑی کی آواز آئی تھی۔ یہ جدید قسم کی بڑی اور لگژری کار تھی۔ میں نے جیکٹ کی جیب میں ریوالور پر گرفت مضبوط کر لی۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ فاضلی اور اس کے ساتھی ایسی لگژری کار میں ہمیں تلاش کریں لیکن امکان تو تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے نتیجے میں کار کی رفتار کم ہوئی اور پھر وہ پاس آ کر رک گئی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ نیچے ہوا اور اس میں سے ایک ادھیڑ عمر لیکن مہذب اور پڑھے لکھے نظر آنے والے شخص نے میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے نوجوان؟''

''سر ہمیں لفٹ چاہیے میں اور میری بیوی رات سے اس علاقے میں بھٹک رہے ہیں ہماری کار ایک نالے میں گر گئی تھی۔''

''تمہاری بیوی؟'' اس نے آس پاس دیکھا۔ اسی لمحے اس کی نظر سامنے سے آتی زرین پر گئی۔ کار دیکھ کر وہ اٹھ آئی تھی۔ ''اوہ آئی سی...... میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''ہمیں اسلام آباد جانا ہے۔''

''سوری میں وہیں سے آ رہا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے آگے جانا ہے۔''

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''یہ سڑک ایبٹ آباد کی طرف جاتی ہے مری اور دوسرے علاقوں سے بھی لنک کرتی ہے۔ اسی پر میری کوٹھی ہے اور میں وہاں جا رہا ہوں۔''

میں مایوس ہوا۔ ''یعنی آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے ہیں۔''

''نہیں میں اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں اور بعد میں میرا ملازم تم کو ذرا آگے ایک بازار تک چھوڑ دے گا وہاں سے تمہیں اسلام آباد جانے کے لیے ٹیکسی یا پرائیویٹ کار مل جائے۔''

''آپ کی کوٹھی کتنی دور ہے؟''

''یہاں سے کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت پر ہے اور بازار اس سے پندرہ منٹ کی مسافت پر ہے۔''

میں نے ذہن میں حساب کتاب کیا۔ صبح کے سات بجے تھے اور اس موسم میں اس سڑک پر کوئی اور سواری ملنا مشکل تھا اور ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں آئے تھے ممکن تھا کہ فاضلی اور اس کے آدمی یہاں بھی ہمیں تلاش کر رہے ہوں۔ اس لیے میں نے ایک یقینی نظر آنے والے موقع کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ہمیں جانے اور واپس آنے میں کوئی دو ڈھائی گھنٹے لگ سکتے تھے لیکن ہم آرام سے واپس آ سکتے تھے اور ہمیں اس موسم میں یہاں

بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں شکر گزار ہوں گا سر اگر آپ ہمیں لفٹ دے سکیں۔''

''تب آ جاؤ۔'' اس نے بٹن دبا کر دوسرے دروازے اَن لاک کر دیئے۔ میں اس تے برابر آ گیا اور زرین پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے شیشہ بند کیا تو اندر ہیٹر کی حرارت بھرنے لگی اور چند سیکنڈ کے اندر درجہ حرارت بہت خوش گوار ہو گیا تھا۔ یہ واقعی بہت لگژری اور آرام دہ کار تھی۔ مرد نے قیمتی اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور وہ یقیناً دولت مند آدمی تھا۔

''سوری میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ مجھے ڈاکٹر توفیق شاہ کہتے ہیں۔''

''شہباز احمد اور یہ میری مسز ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے عقبی آئینے میں دیکھا اور مسکرایا۔ ''تم یقیناً خوش قسمت ہو ینگ مین، میں نے بہت کم لوگوں کی بیویوں کو اتنا خوب صورت پایا ہے۔''

وہ یقیناً مغربی انداز کا پرُوردہ تھا جس کے نزدیک دوسرے کی بیوی کے حسن کی تعریف کرنا بھی اخلاق میں شامل ہے۔ میں بھی اخلاقاً مسکرایا۔ ''ہاں اس لحاظ سے میں خوش قسمت ہوں۔''

زرین جس نے ڈاکٹر کی بات پر برا سا منہ بنایا تھا میری بات پر کھل اٹھی۔ ڈاکٹر توفیق اس پہاڑی سڑک پر بہت احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کی ساری توجہ سڑک پر تھی اگرچہ وہ مجھ سے بھی بات کر رہا تھا۔ ''کیا کرتے ہو؟''

''ایک ٹریولنگ ایجنسی چلاتا ہوں۔'' میں نے اپنا پرانا کاروبار بتایا۔

''اس موسم میں کہاں نکلے ہوئے تھے؟''

''دھند کی وجہ سے راستہ بھٹک کر غلط سڑک پر نکل گئے تھے پھر حادثہ پیش آ گیا اور اس کے بعد دیر تک جنگل میں بھٹکتے رہے۔''

''سردی بہت تھی حیرت ہے تم لوگ ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم دونوں میں سردی برداشت کرنے کی صلاحیت ہے۔''

''شاید آپ ہمارا طبی تجزیہ کر رہے ہیں؟'' میں ہنسا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ درست ہے...... آج کل ہمارے لوگوں کی قوتِ مدافعت بہت کم ہو گئی ہے خاص طور سے موسم کی سختی برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ میں نے یہاں بہت کم لوگوں کو صحت کے معیار پر پورا اترتے پایا ہے۔''

''آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟''

اس نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے ینگ مین...... میں چار سال پہلے ہی آیا ہوں۔''

''جنرل ڈاکٹر ہیں؟''

''نہیں وائرولوجی کا ماہر ہوں۔ یہاں صحت کے پروجیکٹس پر کام کر رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے ہماری حکومت کو اس قسم کے ماہرین کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے سادہ سے لہجے

میں کہا۔
وہ مسکرایا۔ ''درست کہہ رہے ہو لیکن میں حکومت کے لیے نہیں صحت سے متعلق ایک غیر ملکی این جی او کے پروجیکٹ پر یہاں کام کر رہا ہوں۔''
''اب مجھے حیرت ہے کسی غیر ملکی این جی او کو ہماری صحتوں سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟''
''اصل میں یہ این جی او یہاں موجود ایسے وائرسز پر تحقیق کر رہی ہے جو یہاں بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔''
''یعنی آپ ان بیماریوں کا توڑ تلاش کر رہے ہیں؟''
''بالکل۔''
''اس کے بعد اس توڑ کو کسی بین الاقوامی دوا ساز ادارے کو فروخت کر دیا جائے گا اور اس کی بنی مہنگی دوائیں یہاں بکیں گی؟''
اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اگر ایسا بھی ہے تو اس میں کیا برائی ہے بے شک مہنگی سہی لیکن مرض کی دوا تو ملے گی۔''
''اس میں واقعی خرابی تو کوئی نہیں سوائے اس کے کہ کہیں یہ وائرس مغرب کی کسی تجربہ گاہ میں جنم لے کر تو یہاں نہیں آیا ہے؟''
وہ ہنس دیا۔ ''ینگ مین لگتا ہے تم ہالی ووڈ کی اس موضوع پر بنائی جانے والی فلمیں شوق سے دیکھتے ہو ریزڈینٹ ایول ٹائپ؟''
''میں نے ایسی کوئی فلم نہیں دیکھی ہے لیکن میں مغربی ذہنیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''
''ہم بہرحال ایسا نہیں کر رہے ہیں۔'' اس نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ پھر اس نے سامنے ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''اگر تم کبھی میری لیب میں آؤ تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ ہم کس طرح کام کرتے ہیں۔''
میں نے اس سے کارڈ لیا جس پر ایک دائرہ بنا تھا اور اس دائرے کو متعدد لکیروں نے کراس کیا تھا۔ اس پر صرف ڈاکٹر توفیق کا نام اور اس کا موبائل نمبر لکھا تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ ''میں کوشش کروں گا۔''
''تمہیں وائرولوجی سے دلچسپی ہے؟''
''نہیں۔'' میں نے سچائی سے کہا۔ ''لیکن اس بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے۔''
''آنے والی دنیا میں یہ اہم ترین مضمون ہوگا اور وہی ملک سپر پاور بنے گا جو اس علم میں سب سے زیادہ ماہر ہوگا یا جس کے پاس اس علم کے سب سے زیادہ ماہر ہوں گے۔''
''صحت سے متعلق ایک مضمون سے کسی ملک کے سپر پاور بننے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔''
''وائرس۔'' اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''وائرس مستقبل میں سب کچھ ہوں گے۔ یہ توانائی پیدا کریں گے۔ یہ ہمارا برقی نظام چلائیں گے۔ یہی الیکٹرانک نظاموں اور خاص طور سے نیٹ ورکنگ پر انحصار کرنے والی چیزیں چلائیں گے جیسے انٹرنیٹ اور موبائل سروس وغیرہ...... یہ ہمارے لیے انزائم بنائیں گے یہ دوائیں بنائیں

گے۔''

''اور بذاتِ خود یہ تباہ کن ہتھیار ہوں گے۔'' میں نے اس کی بات مکمل کی۔''حیرت ہے آپ نے وائرس پر تحقیق کے اس شعبے کا ذکر تو کیا ہی نہیں جس پر نام نہاد امن پسند اور انسانی حقوق کے علم بردار ممالک اربوں ڈالرز خرچ کر رہے ہیں۔''

''کیونکہ میں وائرس کے اس استعمال کو پسند نہیں کرتا ہوں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

''آپ کے پسند یا ناپسند کرنے سے یہ حقیقت بدل نہیں جائے گی ڈاکٹر۔ وائرسز پر تحقیق کا نوے فیصد حصہ ان خفیہ پروجیکٹس کی صورت میں ہے جنہیں مغربی حکومتیں براہِ راست مدد دے رہی ہیں اور ان میں کام کرنے والے لوگ بھی ان کے اصل مقاصد سے بے خبر ہیں۔''

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔''تم کہہ رہے ہو تم نے اس بارے میں بہت تھوڑا سا پڑھا ہے۔''

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں تم نے ٹھیک کہا ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔''

''یہی تو مصیبت ہے ہم کچھ کر نہیں سکتے حد یہ کہ ان لوگوں کو آئینہ بھی نہیں دکھا سکتے۔ ہمارے اندر اتنی جرأت نہیں ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ بولا اور پھر موضوع بدل دیا۔''لو ہم پہنچنے والے ہیں۔''

تب میں نے پہلی بار دیکھا ہم خاصی بلندی پر آ گئے تھے اور یہاں ہر طرف برف بکھری ہوئی تھی۔ دیودار اور چیڑ کے بلند قامت درخت تھے جن کی شاخیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں سڑک تنگ تھی اور بار بار بل کھا رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم چھ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر آ گئے تھے۔ ڈاکٹر کی گاڑی بہت طاقتور خاص پہاڑی سڑکوں پر خراب موسم میں سفر کے لیے موزوں تھی۔ اس لیے اس میں سفر کا پتا ہی نہیں چلا تھا یہاں آبادی نہیں تھی اور نہ ہی راستے میں کوئی بازار نظر آیا تھا۔ گویا یہ سڑک آباد علاقوں سے کٹ کر گزر رہی تھی۔ لازمی بات تھی یہاں ذرائع زندگی کی دستیابی بھی مشکل تھی لیکن ڈاکٹر دولت مند آدمی تھا وہ یہاں تمام سہولتیں مہیا کر سکتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔''میرا خیال ہے ہم چھ ہزار فٹ کی بلندی تک آ گئے ہیں؟''

ڈاکٹر توفیق نے تصدیق کی۔''یہاں بلندی چھ ہزار دو سو فٹ ہے اور میری کوٹھی اس سے مزید دو فٹ بلند ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے اچانک کار پہاڑ کی طرف گھمائی۔ پہلے تو ایسا لگا جیسے کار ڈھلان پر چڑھ جائے گی لیکن پھر مختصر سی سڑک نظر آئی جو اوپر جا رہی تھی اور اس پر پرائیویٹ کی تختی لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس سڑک کے دونوں طرف خاردار تاریں لگی ہیں۔ ڈاکٹر نے میری توجہ نوٹ کر لی تھی اس نے وضاحت کی۔

''یہاں اکثر جانور آ جاتے تھے جو کئی بار میری یا کسی دوسرے کی گاڑی تلے آ کر کچلے گئے ان کو روکنے کے لیے یہ باڑھ لگائی گئی ہے۔''

کچھ دیر میں کار ایک گیٹ کے سامنے رکی۔ فولادی گیٹ بند تھا۔ ہارن کی آواز پر ایک شخص نے چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانکا اور پھر خود نکل کر باہر آیا۔ ڈاکٹر نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور مسلح گارڈ نے جھک کر

اس کی صورت دیکھ کر اطمینان کیا تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر نے گیٹ کھولنے سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ گارڈ واپس گیا اور اس نے گیٹ کھول دیا۔ یہ کسی برقی طریقے سے کھلنے والا گیٹ تھا۔ جس کا کنٹرول گارڈ کی چھوٹی سی چوکی میں تھا۔ جو گیٹ کے ساتھ ہی تھی۔ سردی کی وجہ سے گارڈ نے مکمل گرم لباس پہن رکھا تھا۔ کار اب ایک پتھریلی سڑک پر سامنے موجود چھوٹی سی کوٹھی کی طرف جارہی تھی۔ میں نے کہا۔

''آپ کا گارڈ زیادہ ہی محتاط ہے آپ کو دیکھے بغیر اس نے دروازہ نہیں کھولا۔''

''ہاں اس کا کام یہی ہے۔ صرف کار سے پتا نہیں چلتا کہ اندر کون ہے۔'' اس نے کار پورچ میں روک دی۔ کوٹھی احاطے سے مزید بلند تھی اور اس کے چاروں طرف صنوبر، چنار اور چیڑ کے درخت لگے تھے۔ کوٹھی کی عمارت بہت بڑی نہیں تھی اور شاید کل دو سو مربع گز پر پھیلی ہوئی تھی۔ جب کہ کوٹھی کا احاطہ کم و بیش ایکڑ رقبے پر محیط لگ رہا تھا۔ یہ جگہ اسلام آباد سے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ڈاکٹر توفیق روز اسی طرح آتا جاتا تھا اور اس وقت وہ کہاں سے آرہا تھا۔ بہر حال یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اس نے ہمیں یہاں تک لفٹ دے دی تھی ہمارے لیے یہی کافی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''لفٹ کا بہت شکریہ...... آپ مہربانی کرکے ہمیں بازار بھجوادیں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے۔ تم دونوں میرے ساتھ ناشتہ کرکے جاؤ گے۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

میں بھی نیچے اتر آیا تھا۔ ''آپ کی اتنی مہربانی کافی ہے۔ آپ اجازت دیں۔''

''اوکے اگر تم ناشتہ نہیں کرنا چاہتے تب بھی میرے ساتھ ایک کپ کافی تو لینا ہوگی۔''

اس نے کافی کا نام لے کر مجھے للچا دیا تھا۔ رات بھر دھکے کھانے اور سردی برداشت کرنے کے بعد کافی کا نام ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ پھر ڈاکٹر مجھے عام آدمی لگا تھا اور مجھے اس سے خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا اس لیے میں مان گیا۔ ''آپ نے کیا کہہ دیا ہے اب رکنا پڑے گا۔''

وہ ہنسا۔ ''میرا اندازہ درست نکلا تم کافی کے شوقین ہو ویسے زیادہ دیر نہیں لگے گی اور میرا کک کافی لاجواب بناتا ہے آؤ اندر۔''

وہ ہمیں لے کر عمارت میں داخل ہوا جو باہر کی سردی کے مقابلے میں اندر سے گرم تھی ایسا لگ رہا تھا یہاں گرمائش کا مرکزی نظام لگا ہوا تھا۔ عمارت بہت آراستہ اور جدید انداز کی تھی۔ داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹی نشست گاہ تھی۔ ڈاکٹر ہمیں وہیں لے آیا۔ اس نے پہلی بار غور سے ہمیں دیکھا۔ ہمارا حلیہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''لگتا ہے رات تم لوگوں نے برا وقت گزارا ہے۔ اگر تم چاہو تو ری فریش ہو سکتے ہو۔''

''اگر منہ ہاتھ دھونے کو مل جائے تو۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

زرین نے جھرجھری لی۔ ''لیکن پانی گرم ہو اتنی سردی میں، میں سرد پانی سے منہ نہیں دھو سکتی۔''

''آپ بے فکر رہیں مسز شہباز۔'' ڈاکٹر توفیق نے مہذب لہجے میں کہا۔ ''یہاں آپ کو تمام سہولتیں میسر ہوں گی۔ واش روم یہ برابر میں ہے۔'' اس نے کمرے میں موجود ایک چھوٹے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ دونوں ری فریش ہو جائیں تب تک میں کافی بنوا لیتا ہوں۔''

وہ ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ لیڈیز فرسٹ کے اصول کے تحت زرین پہلے گئی تھی۔ وہ کوئی پانچ منٹ بعد آئی تو تر و تازہ اور خوش لگ رہی تھی۔ ”بہت صاف ستھرا واش روم ہے اور تمام چیزیں بھی ہیں میں نے تو کپڑوں پر لگی مٹی بھی صاف کر لی ہے۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے واش روم کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ رات بھر سردی میں بھٹکنے سے دوسرے کچھ مسائل بھی پیدا ہو گئے تھے ان کو حل کر کے طبیعت کو بڑی فرحت ملی تھی۔ پھر گرم پانی سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں لباس اور سر کے بال بھی صاف کر لیے۔ وہاں لیکوڈ واش کی سہولت بھی تھی۔ اس سے آسانی رہی تھی۔ جب میں باہر آیا تو سچ مچ خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت میں ڈاکٹر کا بہت شکر گزار تھا۔ اگر وہ ہمیں باہر سے رخصت کر دیتا تو یہ سہولت کئی گھنٹے بعد ملتی۔ زرین صوفے پر بیٹھی وہاں میز پر رکھے میگزینز میں سے ایک کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ یہ انگریزی کے مختلف میگزین تھے جو حالات حاضرہ سے لے کر سائنس تک کے بارے میں تھے۔ زرین نے مجھے دیکھا تو میگزین رکھ دیا۔

”شکر ہے ہمیں ڈاکٹر مل گیا ورنہ ویسے ہی حلیے میں پھر رہے ہوتے۔“

میں بھی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ”ہاں یہ ہے لیکن ابھی واپسی کا کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے سا سفر ہے اس کے بعد ہی کہیں جا کر سکون کا سانس ملے گا۔“

”ممکن ہے یہ ہمیں یہاں روک لے۔“ زرین نے امید سے کہا۔ ”کچھ دیر آرام کر لیں تو پھر جا سکتے ہیں۔“

”اتنا پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”تم بھول رہی ہو کہ میں نے تمہیں بیوی ظاہر کیا ہے اور یہاں رکنے کی صورت میں یہ ہمیں ایک ہی کمرہ دے گا۔“

”تو کیا ہوا؟“ اس نے شوخی سے کہا۔ ”کیا ایک کمرے میں تمہیں کچھ ہو گا۔“

”احتیاط بہتر ہے بی بی۔“ میں نے شانے ہلائے۔

”کیوں کیا میں تمہیں کھا جاؤں گی۔“ وہ خفا ہو گئی۔

میں مسکرایا۔ ”نہیں ایسی بات تو نہیں ہو لیکن کسی عقل مند نے کہا ہے ایسی حسین عورت سے اکیلے میں ڈرنا چاہیے جب وہ آپ کے ساتھ اکیلے رہتے ہوئے نہ ڈرے۔“

اس نے منہ بنایا۔ ”وہ عقل مند نہیں کوئی احمق ہو گا۔“

”درست فرمایا وہ عقل مند یہ خاکسار ہی ہے۔“

اس سے پہلے میں کچھ کہتا ڈاکٹر توفیق اندر آ گیا۔ اس نے اوور کوٹ اتار دیا تھا اور اس وقت نفیس قسم کے تھری پیس سوٹ میں تھا۔ ”میں نے کافی کا کہہ دیا ہے۔ کچھ دیر ہو گی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دس پندرہ منٹ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”میرا تو مشورہ ہے کہ آج رک جاؤ کیونکہ ابھی موسم کی رپورٹ دیکھی ہے۔ اس سارے علاقے پر گہرے بادل ہیں اور کسی وقت بھی برف باری شروع ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں کوئی ٹیکسی والا جانے کو تیار نہیں ہو گا۔“

''یہ تو بری خبر ہے۔'' میں نے فکر مند ہو کر کہا۔ ''لیکن ہم کوشش کریں گے۔''

''ڈاکٹر۔'' زرین نے پہلی بار اسے مخاطب کیا تو اس کے ساتھ میں بھی چونک گیا۔ ''آپ کی رہائش یہاں ہے اور کام اسلام آباد میں ہے تو آپ روز کیسے آتے جاتے ہیں۔ خاص طور سے جب موسم خراب ہو۔''

وہ مسکرایا۔ ''اچھا سوال ہے مسز شہباز...... اس کا جواب میری گاڑی ہے یہ خاص طور سے ایسے علاقوں میں سفر کے لیے بنائی گئی ہے اور یہ برف پر بھی چل سکتی ہے۔ اس لیے خراب ترین موسم میں بھی مجھے یہاں آنے جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے۔''

''شہر سے اتنی دور رہنے کی وجہ؟''

''مجھے یہ جگہ اچھی لگتی ہے۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ''ورنہ خوب صورت تو اسلام آباد بھی ہے۔''

سفید لباس میں ملبوس ایک صاف ستھرا شخص کافی کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آیا اس کا لباس جدید شیف انداز کا تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی۔ ٹرے میں کافی کے تمام تر لوازمات تھے۔ ایک چھوٹی ٹرے میں سینڈوچز بھی تھے ڈاکٹر نے معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ ''تم نے ناشتے سے منع کر دیا تھا اس لیے میں نے سینڈوچز بنوا لیے۔''

شیف نے پلیٹوں میں سینڈوچز سرو کیے اور جب میں نے پہلا سینڈوچ کھایا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر بھوکا تھا۔ اس کے بعد میں بلا تکلف پلیٹ صاف کر گیا میں نے زرین کے گھورنے کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ خود اس نے بھی تین چوتھائی پلیٹ صاف کر دی تھی۔ شیف وہیں موجود تھا اس نے سکون سے انتظار کیا اور جب ہم نے پلیٹیں واپس رکھیں تو اس نے کافی سرو کی۔ ڈاکٹر نے سینڈوچ نہیں لیے تھے لیکن اس نے کافی لی تھی۔ سینڈوچز اچھے خاصے تھے اور ان کو کھا کر پیٹ کافی حد تک بھر گیا تھا۔ خاص طور سے زرین کی آنکھوں میں نیند کا خمار بھی آ گیا تھا۔ خود میں بھی سُستی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ کافی لے کر سُستی دور ہو جائے گی۔ پہلے گھونٹ نے بتا دیا تھا کہ کافی نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اور بنائی بھی بہترین تھی۔ میں نے تعریف کی تو ڈاکٹر توفیق خوش ہو گیا۔

''میں اسپیشل منگواتا ہوں۔ یہ نیس کیف کا لگژری برانڈ ہے عام مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ خاص گاہکوں کو براہِ راست فراہم کیا جاتا ہے۔''

شیف کافی دے کر رخصت ہو گیا تھا۔ گفتگو پھر موسم کی طرف مڑ گئی تھی اور ڈاکٹر توفیق نے دوبارہ تجویز پیش کی۔ ''تم دونوں یہاں رک کیوں نہیں جاتے، میرے پاس ایک اضافی بیڈ روم ہے اور اتفاق سے اس میں ڈبل بیڈ ہے۔''

میں ہچکچایا۔ ''آپ کو زحمت ہوگی۔''

''بالکل بھی نہیں بھلا مجھے کیوں زحمت ہونے لگی اگر تم دونوں ایک آدھ دن یہاں رک جاتے ہو۔''

میں سوچ میں تھا کہ زرین نے کہا۔ ''اگر ڈاکٹر اتنے اصرار سے کہہ رہے ہیں تو رک جاتے ہیں۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ اس نے ڈاکٹر کو شروع میں ناپسند کر دیا تھا اور اب وہ اس کی بات کی حمایت کر رہی تھی۔ جب کہ میں یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بہانہ کیا۔ ''ہمارے پاس کپڑے نہیں

ہیں۔''

''کپڑے بھی یہاں مل سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ ''تمہارا اور میرا سائز ایک ہی ہے اس لیے چل جائیں اور ان کو شاید میری وائف کے کپڑے آجائیں۔''

''آپ کی وائف؟...... وہ یہاں نہیں ہیں؟'' زرین نے پوچھا۔

''نہیں اپنے ماں باپ کے گھر کراچی گئی ہیں میری سسرال وہیں ہوتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تو آپ دونوں رک رہے ہیں جب تک موسم بہتر نہیں ہو جاتا؟''

میں نے سر ہلا دیا۔ ''ٹھیک ہے ہم موسم بہتر ہونے تک یہاں رک جاتے ہیں۔''

''گڈ۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں آپ کے لیے بیڈ روم کھلوا دیتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے زرین کی طرف دیکھا۔ ''ہم یہاں کیوں رک رہے ہیں؟''

''اس نے اتنے خلوص سے کہا ہے۔''

میں قائل ہو گیا واقعی ڈاکٹر توفیق نے بہت خلوص سے کہا تھا پھر مجھے خیال آیا۔ ''لیکن ہمیں ایک ہی بیڈ روم میں رہنا ہوگا۔''

''تو کیا ہوا؟'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہم کوئی نوعمر تو نہیں ہیں جو تنہائی پا کر بہک جائیں۔ اور کیا کل رات ہم اس کوٹھری میں اکیلے نہیں تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب میں نے اپنا لباس بھی اتار دیا تھا۔''

میں خفیف ہو گیا۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔''

''کیوں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''جب میں قمیص اتار رہی تھی اور تم نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا تو تمہارے دل میں خیال آیا تھا کہ میری طرف دیکھو۔''

میں بوکھلا گیا تھا۔ ''بالکل بھی نہیں...... اور پلیز اب چپ کر جاؤ اگر کسی نے سن لیا تو جان جائے گا ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔''

وہ شرارتی انداز میں ہنس کر چپ ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قسم کی گفتگو کیوں کر رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے وہ مجھ سے قریب تھی اور کسی قدر کھل کر بات بھی کر لیتی تھی لیکن اس وقت اس کا انداز بہت زیادہ کھلا ہوا تھا۔ وہ صوفے سے سر ٹکا کر نیم دراز ہو گئی۔ ''مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے۔''

گزشتہ رات کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی کے بعد بہترین ناشتہ، کافی اور ایک آرام دہ بستر کا آسرا پا کر آدمی کو تھکن ہی محسوس ہو سکتی تھی۔ مگر وہ جس طرح لیٹی تھی اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا میں نے اس پر سے نظر ہٹا لی۔ خود میں بھی تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن اب مجھے فکر ہو رہی تھی کہ اس کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونا پڑے گا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر توفیق اندر آیا۔

''آ جاؤ میں نے بیڈ روم کھلوا دیا ہے۔ میرا خیال ہے تم دونوں تھک گئے ہو؟''

مجھے ذرا خفت ہوئی تھی کیونکہ ڈاکٹر کو دیکھ کر بھی زرین نے اپنا انداز تبدیل نہیں کیا تھا اور اسی طرح نیم دراز رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''زرین آؤ۔''

وہ کاہلی سے اٹھی اور جسم کھولنے کے انداز میں انگڑائی لی۔ ڈاکٹر کچھ دیر کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا تھا اور مجھے زرین پر غصہ آنے لگا وہ کیوں ایسی حرکتیں کر رہی تھی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ اس نے چست سوئیٹر پہن رکھا تھا جس میں اس کا شباب بہت نمایاں تھا۔ پھر ڈاکٹر نے اس پر سے نظریں ہٹالیں۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ ہمیں نشست گاہ سے باہر راہداری میں لایا اور جہاں راہداری بائیں طرف مڑ رہی تھی وہیں بیڈ روم تھا۔ یہ خاصا پُرتعیش اور سجا ہوا بیڈ روم تھا جس پر درمیانے سائز کا ڈبل بیڈ تھا اور اس پر ڈبل پلائی کا ایک ہی بڑا سا کمبل پڑا تھا۔ اندر کا درجہ حرارت موزوں تھا اس لیے یہ کمبل بھی کام دیتا، مسئلہ یہ تھا کہ کمبل ایک ہی تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''تمہارے لیے اپنا ایک سلیپنگ سوٹ نکالا ہے اور ان کے لیے اپنی وائف کا نائٹ سوٹ نکالا ہے کیونکہ گھر میں پہننے والے سارے کپڑے میری وائف اپنے ساتھ لے گئی ہیں اور اب اس کے صرف پارٹی ڈریس ہیں۔''

''کوئی بات نہیں ویسے بھی ہمیں سونا ہے۔'' زرین نے بے تکلفی سے کہا۔ ''نائٹ سوٹ بھی چلے گا۔''

''میں ابھی لاتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

''زرین یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' ڈاکٹر کے جاتے ہی میں نے اس سے دانت پیس کر کہا اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کیا کر رہی ہوں؟''

''تم نے اس کے سامنے انگڑائی لی کیا کوئی عورت کسی غیر مرد کے سامنے اس طرح کرتی ہے۔''

''سوری مجھے خیال نہیں رہا۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔

''او کے...... اب خیال رکھنا کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے اسے شک ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے فرماں برداری سے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شاید رات بھر کی بھاگ دوڑ، سردی اور پھر تھکن نے اس کے ذہن پر اثر ڈالا تھا اور وہ کچھ دیر کے لیے بے خود ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ہینگر پر دو عدد شب خوابی کے لباس لے آیا۔ وہ اس نے ایک طرف دیوار کے ساتھ ہینگ کر دیئے اور بولا۔ ''اگر تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف انٹر کام پر ایک نمبر بٹن دبا کر کہہ دینا۔'' اس نے بیڈ کے ساتھ دراز پر رکھے انٹر کام کی طرف اشارہ کیا پھر ہنسا۔ ''رات کا وقت تو گزر گیا ہے اس لیے گڈ مارننگ۔''

اس کی بات پر مجھے خیال آیا۔ ''ڈاکٹر آپ صبح آ رہے تھے کیا آپ کی نائٹ شفٹ تھی؟''

''نہیں میں کل صبح گیا تھا پھر ایک کام ذرا طول کھینچ گیا اور رات مجھے لیب میں رکنا پڑا تھا اس لیے صبح آف کر لیا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے مردانہ نائٹ سوٹ اٹھا کر باتھ روم کا رخ کیا۔ یہ بڑا لگژری قسم کا باتھ تھا جس میں نہانے کے لیے ٹب بھی تھا۔ پانی گرم آ رہا تھا اور میرا دل مچل اٹھا اس لیے میں نے لباس اتار کر ایک طرف رکھا اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ گرم پانی سے غسل نے میل کچیل اور گرد مٹی کے ساتھ جیسے تھکن بھی نچوڑ لی تھی اور اب میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ تولیہ سے خود کو خشک کر کے میں باہر آیا تو زرین خفا بیٹھی تھی۔

''اتنی دیر لگا دی...... مجھے بھی چینج کرنا ہے۔'' پھر وہ چونکی۔ ''تم نہا کر آئے ہو۔''

''ہاں مزے کا گرم پانی آ رہا ہے۔''

''تب میں بھی نہاؤں گی۔'' اس نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس کے جاتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شیف سر۔'' باہر سے آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا۔ ''اگر آپ کو اپنے کپڑے دھلوانے ہیں تو مجھے دے دیں ایک گھنٹے میں واپس مل جائیں گے۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے کہا اور دروازہ بند کر کے باتھ روم تک آیا اور آہستہ سے دستک دی۔

''کیا ہے؟'' زرین بولی۔

''اپنے کپڑے دے دو دھلنے کے لیے دینے ہیں۔ یہاں باہر رکھ دو میں لے لوں گا۔''

''شکر ہے۔'' وہ بولی۔ ''ورنہ مجھے تو اب ان سے گھن آ رہی ہے۔''

اس نے ذرا سا دروازہ کھولا اور کپڑے مجھے تھما دیئے۔ اگرچہ یہ صرف اوپری لباس تھا لیکن پھر بھی میں نے تسلی کر لی۔ اپنے اور زرین کے کپڑے شیف کو دیئے اور کہا۔ ''جلدی نہیں ہے جب ہم سو کر اٹھ جائیں تب تم دے سکتے ہو۔''

دروازہ بند کر کے میں نے بیڈ کی طرف دیکھا۔ ایک بیڈ پر ہم دونوں نہیں سو سکتے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا لیکن کمبل بھی ایک ہی تھا۔ اندر سردی کم تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی کہ ہم میں سے کوئی کمبل کے بغیر گزارا کر سکتا۔ بہرحال ابھی تو زرین باتھ روم میں تھی اس لیے میں کمبل میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ مجھے ذرا تعجب ہوا تھا کہ کہاں تو ہم دو گھنٹے پہلے جنگل میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور اس وقت زرین نے گرم بستر کی خواہش کی تھی اس کی خواہش کچھ زیادہ ہی پوری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کا رویہ ہمارے ساتھ اتنا اچھا تھا کہ ہم اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ مجھے واحد پریشانی زرین کے ساتھ ایک کمرے میں ہونے کی تھی۔ ایسی بات نہیں تھی کہ مجھے خود پر اعتماد یا قابو نہیں تھا لیکن میں نے کبھی خود کو اتنا مضبوط نہیں سمجھا کہ اس قسم کی آزمائش میں بلا خوف اتر جاؤں۔ میں ایک عام گناہ گار انسان ہوں اگرچہ جان بوجھ کر گناہ کرنا مشکل ہی سہی لیکن خطا تو ہو سکتی ہے اور جب معاملہ ایک عونت بلکہ حسین ترین عورت کا ہو تو خطا کا امکان بڑھ جاتا ہے اور میں اس خطا سے بچنا چاہتا تھا۔

زرین نے خاصی دیر لگا دی تھی۔ وہ نہا کر باہر آئی اس نے ڈاکٹر کی بیوی کا نائٹ سوٹ پہن لیا تھا۔ یہ ایک ریشمی کرتہ اور اسی کپڑے کا پاجامہ تھا جو کسی قدر ڈھیلا تھا لیکن اس کے بدن کے تناسب پر یوں ڈھلک رہا تھا کہ ساخت کا حصہ بن گیا تھا اور کہیں کہیں سے گیلا ہو کر چپک بھی رہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ شرما کر ہنسی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''پتا نہیں کیا دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''تم اس وقت ہوش ربا لگ رہی ہو۔''

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے رقص کے انداز میں گھوم کر خود کو دکھایا۔ ''کیسے اچھی لگ رہی ہوں؟''

''ہر طرح سے۔'' میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹا لیں۔ اس وقت میرے اندر ایک ابال بپا آ رہا تھا۔ پھر میں بستر سے اٹھ گیا۔ ''آؤ تم لیٹ جاؤ۔''

''اور تم؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''میں یہاں نیچے لیٹ جاؤں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سردی ہے تم بغیر کمبل کے اس ہلکے سے قالین پر نہیں لیٹ سکتے۔''

''تب کیا کریں...... کمبل بھی ایک ہے۔''

وہ ہچکچائی پھر بولی۔ ''تم بھی بستر پر آ جاؤ۔''

میں لرز گیا۔ ''زرین یہ ممکن نہیں ہے میں ایک کمزور انسان ہوں اور کسی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

وہ میرے پاس آ گئی۔ ''کیسی آزمائش؟''

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم جانتی ہو۔''

اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ ''شہباز میں نے تم کو کبھی غیر نہیں سمجھا۔''

میں چاہنے کے باوجود اس کی بانہیں خود سے دور نہیں کر سکا تھا اس کا آتشیں بدن میرے جسم کو چھو رہا تھا۔

''لیکن ہم میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''ایک تعلق تو ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

اس کے لمس نے میرے اندر موجود ابال کو مزید تیز کر دیا تھا۔ ''زرین تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں تمہارے اور اپنے درمیان تمام پردے گرا دینا چاہتی ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ لیا۔ میرے اندر کا ابال بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے تو اس کا بدن کانپ اٹھا تھا اور وہ جیسے مجھ میں جذب ہونے لگی۔ میرے ہاتھ اس کے ریشمی شانوں سے پھسلتے ہوئے اس کی کمر تک آ گئے۔ میرے اندر جذبات مچلنے لگے تھے۔ میں نے کبھی عورت کے حوالے سے خود کو اس طرح کشمکش میں محسوس نہیں کیا تھا۔ زرین کا موج در موج وجود میرے ہوش و حواس پر چھا رہا تھا۔ اس سے پہلے بارہا حسین ترین عورتوں نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کبھی ان کے معاملے میں ایسی بے بسی محسوس نہیں کی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اندر سے زرین کے آگے ہتھیار ڈالتا جا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور مدہوش انداز میں میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کا چہرہ اتنا قریب تھا کہ اس کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

''شہباز۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

اس سے پہلے کہ میں بالکل اختیار کھو دیتا اور جذبات کی رو میں بہہ جاتا اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے زرین نے نہیں بلکہ سویرا نے پکارا ہے۔ سویرا...... یہ نام ذہن میں آتے ہی میرے پورے وجود کو شدید ترین جھٹکا لگا تھا اور اس جھٹکے نے زرین کو یوں مجھ سے الگ کر دیا جیسے وہ میرے جسم سے لپٹا کوئی کیڑا تھا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں تمہیں کچھ ہوا ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''خود کو سنبھالو۔''

''نہیں میں خود کو سنبھالتے سنبھالتے تھک گئی ہوں۔'' اس نے جذباتی انداز میں کہا اور میری طرف بڑھی۔ میں بے ساختہ پیچھے ہٹ گیا۔

''زرین ہوش میں آؤ۔''

''پلیز شہباز...... پلیز۔'' اس نے پھر میرے پاس آنے اور مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی۔ ''مجھے تمہاری

ضرورت ہے۔"

میں کوشش کے باوجود اسے خود سے لپٹنے سے نہیں روک سکا تھا۔ اس کا لمس ملا تو ایک بار پھر میرے جذبات بے قابو ہونے لگے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ اس بار جذبات میں شدت بہت زیادہ تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا سر اوپر کیا اور اس سے پہلے وہ کچھ سمجھتی اس کی کنپٹی پر ہاتھ مارا اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ جیسے ہی وہ بے ہوش ہوئی میرے جذبات بھی اعتدال پر آنے لگے تھے۔ میں گہرے سانس لیتے ہوئے خود پر قابو پاتا رہا اور جب میں اعتدال میں آگیا تو زرین کو اٹھالیا۔ اسے بستر پر لٹا کر پہلے اس کی نبض چیک کی۔ نبض سست تھی لیکن خطرے والی بات نہیں تھی۔ میرے نپے تلے وار نے اسے چند گھنٹوں کے لیے بے ہوش کر دیا تھا۔ ساکت لیٹے ہوئے بھی اس کی دل کشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ نشیب و فراز اور پیچ و خم ویسے ہی دل فریب تھے لیکن اب یہ میرے جذبات میں تحریک پیدا نہیں کر رہے تھے۔ اصل تحریک زرین کے وہ جذبات اور احساسات تھے جنہوں نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ بے ہوش تھی اور اس کے جذبات اور احساسات بھی بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں نے اسے کمبل اوڑھا دیا اور خود بیڈ کے سرہانے سے سر ٹکا لیا۔

مجھے کل رات کی بھاگ دوڑ نے اس قدر نہیں تھکایا تھا جتنا ذرا سی دیر کی جذباتی کشمکش نے تھکا دیا تھا۔ میں بیڈ کے دوسرے کنارے پر لیٹ گیا اور کمبل کا دوسرا سرا اوڑھ لیا۔ زرین کے بے ہوش ہونے کے باوجود میں نے احتیاط رکھی تھی کہ میں اس سے دور رہوں۔ میں لیٹا اور کچھ دیر میں سو گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے بہت اچھی اور گہری نیند آئی تھی۔ میں ساڑھے نو بجے سویا تھا اور جب میری آنکھ کھلی تو چار بج رہے تھے۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا وہ کروٹ لے کر لیٹی ہوئی تھی میں نے آہستہ سے اس پر سے کمبل سرکایا اور اس کی گردن پر نبض دیکھی۔ نبض بالکل درست تھی یعنی اب وہ بے ہوش نہیں تھی بلکہ سو رہی تھی۔ پھر میں نے اس کی کنپٹی چیک کی اس پر کوئی نشان نہیں تھا لیکن ضرب والی جگہ پر ہلکا سا ابھار تھا۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں آیا اور وہاں دیوار میں لگے ریک کو چیک کیا اس میں کئی طرح کی دوائیاں تھیں ان میں اندرونی چوٹ پر لگانے والا ایک زود اثر بام بھی تھا۔

بام لا کر میں نے زریں کی کنپٹی پر اس کی مالش کی۔ چوٹ والی جگہ تکلیف ہوئی تو وہ سوتے میں کسمسائی تھی لیکن اس کی نیند نہیں ٹوٹی تھی یہ اچھی بات تھی وہ جتنی دیر سوتی سر کی تکلیف اتنی ہی کم ہو جاتی۔ بام لگا کر میں نے دوبارہ اسے کمبل اوڑھا دیا تھا۔ شام کا وقت ہو چلا تھا۔ میں باہر آیا بیڈ روم کے ساتھ ہی نشست گاہ تھی اور اس سے آگے کا حصہ میں نے نہیں دیکھا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اس طرف جاؤں یا نہ جاؤں۔ اچانک ہی سامنے سے ڈاکٹر توفیق نمودار ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"کیا حال ہیں ینگ مین نیند ٹھیک سے آئی...... بلکہ ٹھیک آئی ہوگی تم جوان لوگ جب چاہا لیٹ کر سو گئے۔ یہ تو ہم جیسے لوگوں کا مسئلہ ہے نیند کو دس طریقوں سے بہلا کر بلاتے ہیں۔"

"آپ بوڑھے نہیں ہیں۔"

وہ مجھے نشست گاہ میں لایا۔ "میری عمر باون سال ہے۔"

دیکھنے میں وہ چالیس سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی ایک تو وہ دولت مند تھا

اور دوسرا ڈاکٹر تھا اسے اپنی اصل عمر سے کم نظر آتا ہی تھا۔ میں نے اس سے موسم کے بارے میں پوچھا تو اس نے نشست گاہ کی کھڑکی سے پردے ہٹا دیئے۔ ''خود دیکھ لو۔''

باہر برف باری جاری تھی اور یہ شدید برف باری تھی اس میں چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ ''یعنی ہم آج نہیں جا سکیں گے؟''

''آج بھی اور شاید کل بھی مشکل ہے جب تک سڑکوں سے برف نہیں صاف کر دی جائے گی۔''

میں سوچ رہا تھا۔ ''اگر ہم ہمت کر کے نکل جاتے تو شاید اب تک اسلام آباد میں ہوتے۔''

''ہاں ہو سکتا ہے لیکن میرے گارڈ کا کہنا ہے اس وقت آج سڑک سے کوئی گاڑی نہیں گزری ہے۔''

''لیکن کل آپ تو جائیں گے۔''

''تم بھول رہے ہو کل ہفتہ ہے اور میری ہفتہ اتوار چھٹی ہوتی ہے اب میں پیر کی صبح جاؤں گا۔''

''اگر آپ اپنی گاڑی میں ہمیں بھیج دیں تو......''

''سوری فور دس...... میں اپنی گاڑی کسی ملازم کو نہیں دیتا ہوں یہی وجہ ہے میں نے ڈرائیور نہیں رکھا ہے۔ ویسے تمہیں مسئلہ کیا ہے؟''

''پیچھے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔

''ماں باپ؟''

''ہاں اور دوسرے بھی ہیں۔''

''افسوس کہ یہاں موبائل سروس نہیں ہے ورنہ تم اطلاع کر سکتے تھے۔''

''آس پاس لینڈ لائن ہے؟''

''نہیں...... اس پورے علاقے میں میلوں تک کہیں فون نہیں ہے۔'' اس نے اس بار بھی نفی میں جواب دیا۔ مجھے تعجب ہوا آج کے دور میں اس جیسا آدمی بغیر رابطے کے کس طرح اتنی دور ویران جگہ رہ رہا تھا۔ اس نے شاید بھانپ لیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا اس نے کہا۔ ''میں اس معاملے میں ذرا پرانی سوچ رکھتا ہوں۔ آخر آج سے دس سال پہلے بھی تو لوگ موبائل فون کے بغیر رہ رہے تھے۔ تو اب بھی رہ سکتے ہیں۔''

میں اس کی بات کا قائل ہو گیا۔ ''ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انسان واقعی آج بھی ان چیزوں کے بغیر رہ سکتا ہے۔''

''ہاں۔'' وہ خوش ہو گیا۔ ''اس لیے میں بغیر کسی مواصلاتی آلے کے سکون سے یہاں رہ رہا ہوں اور مجھے تین سالوں میں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہو۔''

مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی اور ابھی ساڑھے چار بجے تھے یقیناً کھانے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے انٹرکام پر شیف سے چائے کے ساتھ کچھ لانے کو کہا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''اگر اجازت ہو تو کچھ ذاتی نوعیت کے سوال کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس کا سوال غیر متوقع تھا اس لیے میں جواب دیتے ہوئے ذرا ہچکچایا۔ ''تین سال...... شاید سوا تین سال۔''

وہ مسکرایا۔ ''اگر یہی سوال تمہاری مسز سے کیا جاتا تو انہیں مہینے اور دن بھی یاد ہوتے۔''

میں خفیف ہو رہا تھا۔ ''مردوں کو اس قسم کی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔''

''بچے ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں۔''

''فیملی پلاننگ؟''

''نہیں قدرت کی طرف سے ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''بہت...... لیکن آپ اس بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں آپ کا تعلق گائنی سے تو نہیں ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''تم نے ٹھیک کہا لیکن ڈاکٹر ہوں نا...... جہاں صحت کے حوالے سے کوئی بات معمول سے ہٹ کر نظر آتی ہے تو اس میں دلچسپی لیتا ہوں اگر تم نے برا مانا ہے تو معذرت چاہوں گا۔''

''میں نے برا نہیں مانا۔'' میں نے نرمی سے کہا اور موضوع بدل دیا۔ ''آپ کا شیف ہمارے کپڑے لے گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں دھل جائیں گے۔''

''بالکل ایک گھنٹے میں دھل گئے ہوں گے یہاں لانڈری کا جدید ترین سسٹم نصب ہے۔''

''غالباً بجلی کا بھی ذاتی سسٹم ہے میں نے ان علاقوں میں شاذ ہی وولٹیج اتنا اچھا اور ہموار دیکھا ہے۔''

''ہاں یہاں سیلف پاور سسٹم ہے۔ تم کہو تو کپڑے منگوا دوں۔''

''جی کمرے میں بھجوا دیں میں زرین کو بھی اٹھا دوں۔''

''میں بھیجتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں کمرے میں آیا۔ زرین بدستور سو رہی تھی۔ میں نے اسے ہلایا۔

''اٹھ جاؤ بہت دیر سو لیا۔''

وہ کچھ دیر کسمساتی رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ میں نے نرمی سے پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''اس نے ماتھا سہلایا۔ ''ٹھیک ہوں لیکن میں کب سوئی؟''

''نہا کر آنے کے کچھ دیر بعد سو گئی تھیں۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے بے یقینی سے کہا پھر چونک گئی۔ ''میرے خدا مجھے یاد آ گیا۔''

''اگر تمہیں کچھ یاد آ گیا ہے تو بہتر ہے اسے بھول جاؤ۔''

اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ ''شہباز مجھے یقین نہیں آ رہا ہوں میں اتنی بے شرم ہو گئی تھی۔''

''میں نے کہا نا اسے بھول جاؤ۔''

''کیسے بھول جاؤں۔'' وہ رونے لگی۔ ''تم میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو گے؟''

''میں کچھ نہیں سوچ رہا ہوں اور میں نے کہا نا تم بھی اسے بھول جاؤ۔''
اس نے ایک بار پھر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔''تم سچ کہہ رہے ہو تم مجھے بری عورت نہیں سمجھ رہے ہو؟''
''بری عورت نہیں ہوتی ہے اصل میں آدمی برا ہوتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔''اگر تم نے کچھ برا کیا تو میں بھی تو اس میں شریک تھا۔''
''لیکن تم نے خود پر قابو رکھا۔'' اس نے سر تھام لیا۔''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔''
''کچھ نہیں ہوا تھا میرا خیال ہے تھکن، سردی اور جذباتی دباؤ کا اثر ہو گیا تھا تمہارا رویہ کوئی غیر معمولی نہیں تھا۔''
''تم اسے غیر معمولی رویہ نہیں سمجھتے؟''
''ہاں کیونکہ میرے خیال میں بنیادی طور پر ہم انسان ہیں اور انسان غلطی کا پتلا ہوتا ہے۔ غلطی کرنا اس کی فطرت ہوتی ہے۔ ہاں جب وہ اپنے گناہ پر شرمندہ ہونا چھوڑ دے تب وہ انسان نہیں رہتا ہے شیطان بن جاتا ہے۔ تم شرمندہ ہو اس کا مطلب ہے تم ایک انسان ہو۔''
''اس کا مطلب ہے تم مجھے برا نہیں سمجھ رہے؟'' اس کا لہجہ پھر بھیگنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''زرین تم بہت اچھی عورت ہو۔ یہ بات میں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ تم دن رات میرے ساتھ رہی ہو اور میں نے تمہیں بہت اچھی طرح پرکھ لیا ہے۔''
''لیکن آج جو ہوا......''
''میں نے کہا نا وہ جذباتی دباؤ کا نتیجہ تھا اور کوئی بات نہیں تھی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''مجھے تو تمہارے ساتھ کیے جانے والے سلوک کا افسوس ہو رہا ہے۔''
وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔''تم مجھے قتل کر دیتے تو خدا کی قسم بروز قیامت میں تمہیں اپنا خون معاف کر دیتی۔ یہ تو میری حرکت کی بہت معمولی سی سزا ہے لیکن شہباز مجھے ایک بات کہنے کی اجازت دو۔''
''تمہیں مجھ سے کچھ کہنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''
وہ یک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔''میں کیا کروں...... میں نے جان کر کچھ نہیں کیا ہے...... لیکن میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میں نے دنیا میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ تم ہو۔''
''یہ میرے لیے اعزاز ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔''
اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اوپر کیا۔''سچ کہہ رہے ہو؟''
''ہاں اور میں فخر سے اس محبت کو قبول کرتا لیکن تم جانتی ہو میں پہلے ہی کسی کی محبت کا اسیر ہوں کسی کا ہو چکا ہوں۔''
اس نے آنسو صاف کیے۔''میں جانتی ہوں اور میرے لیے یہی کافی ہے کہ تم میری قدر کرتے ہو۔''
دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھ کر باہر جھانکا شیف سلیقے سے تہہ کیے ہوئے کپڑے لیے کھڑا تھا اس

نے کپڑے میری طرف بڑھا دیئے۔ ''سر دیکھ لیں۔''

''ٹھیک ہوں گے۔'' میں نے لے لیے۔ ان میں میری جیکٹ اور زرین کا سوئیٹر بھی تھا۔ میں نے سامان اور ریوالور پہلے ہی الگ کر لیا تھا وہ بستر کے تکیے کے نیچے تھا۔ میں کپڑے لایا اور بستر پر رکھ دیئے۔

''جلدی سے چینج کر لو ڈاکٹر نشست گاہ میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔''

''شکر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ یہ نائٹ سوٹ تو بہت واہیات ہے۔''

''لیکن تم پر اچھا لگ رہا ہے۔'' میں نے اپنے کپڑے لے کر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ کپڑے بدل کر میں نے جیکٹ پہنی اور ریوالور اور دوسرا سامان اس کی جیبوں میں رکھ لیا۔ زرین لباس بدل کر آئی۔ اس نے پہلے دونوں نائٹ سوٹ سلیقے سے ہینگر پر کر کے لٹکا دیئے اور پھر اپنا سوئیٹر پہنا۔

''یہ تو اس نے پہلے سے بھی اچھا کر دیا۔'' اس نے کہا۔ میں نے جوتے صاف کر لیے تھے اس نے بھی اپنے جوتے صاف کیے یہ اس نے ماما جی کے گھر سے پار کیے تھے اس کے اپنے سینڈل تو بھاگنے میں رہ گئے تھے۔

''پاؤں کے زخم کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں معمولی سی تکلیف ہے۔'' اس نے کہا لیکن میں نے زخم دیکھے اور پھر ان پر زخم خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑکا یہ بھی مجھے باتھ روم میں ملا تھا۔ ہم نشست گاہ میں آئے تو چائے اور کھانے کا سامان لیے شیف ہمارا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب ذرا مصروف ہیں انہوں نے کہا ہے آپ ان کا انتظار مت کریں اور چائے لے لیں۔''

یقیناً ڈاکٹر چاہتا تھا کہ ہم بلا تکلف کھائیں پئیں اس لیے اس نے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ واقعی ہم اس کے سامنے شاید اس طرح سے نہیں کھا سکتے تھے جس طرح اس کی غیر موجودگی میں کھایا پیا تھا۔ زرین نے ایک پیسٹری لیتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر بہت مہذب آدمی ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں کوکیز سے انصاف کر رہا تھا۔ ''لیکن اس نے ایک بری اطلاع دی ہے۔ ہم پیر سے پہلے یہاں سے نہیں جا سکتے کیونکہ برف صاف ہونے تک عام ٹریفک نہیں چلے گا اور خود ڈاکٹر پیر والے دن اسلام آباد جائے گا۔''

''واقعی تب ہم پیر سے پہلے نہیں جا سکتے لیکن باہر موسم کیسا ہے؟''

میں نے پردہ ہٹا کر اسے جمع ہونے والی برف دکھائی۔ برف باری رک گئی تھی لیکن سیاہ بادل جمع تھے اور مزید برف باری کا پورا امکان تھا۔ اگر مزید برف باری ہو جاتی تو راستے یقیناً پیر سے پہلے صاف نہیں ہوتے اور پیر والے دن ہم ڈاکٹر کے ساتھ بھی جا سکتے تھے۔ زرین نے اپنے اور میرے لیے تازہ چائے نکالی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

اس نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز تمہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہو رہی ہے؟''

''کیسی غیر معمولی بات؟''

''یہی ہمارا رویہ...... ہم کوئی پہلی بار تو کہیں اکیلے نہیں رہے ہیں پھر اس طرح بے قابو کیوں ہو گئے؟''

اس کی بات قابلِ غور تھی۔ واقعی ہم کبھی اس طرح بے قابو نہیں ہوئے بلکہ میں نے تو سرے سے زرین کے لیے کوئی جذبہ محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ جب کہ آج میں اس حد تک بے قابو ہو گیا تھا کہ اگر قدرت مدد نہ کرتی تو میں گناہ کر بیٹھتا۔ اگر بات صرف زرین کی ہوتی تو میں اسے اس کی جذباتی کیفیت قرار دے سکتا تھا لیکن میں بھی اسی جذباتی کیفیت کا شکار تھا۔ مجھے کیا ہوا تھا لیکن میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے خیال میں اس کی کوئی وجہ ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے تمہیں چاہا ہے لیکن کبھی تمہارا ساتھ نہیں چاہا۔'' وہ کہتے ہوئے شرمائی۔ ''لیکن آج میں ایسا چاہ رہی تھی۔ شکر ہے تم نے خود پر قابو رکھا۔''

''ہاں خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں بچا لیا۔''

زرین پھر سوچ میں گم ہو گئی لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتی ڈاکٹر وہاں آ گیا۔ ''کیا حال ہیں ری فریش ہو گئے۔''

میں نے خالی ہو جانے والی پیالی میز پر رکھی۔ ''ڈاکٹر اتنی اچھی میزبانی کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔''

''ارے نہیں...... شرمندہ مت کرو میں نے کیا کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں جلد تمہارے گھر نہیں پہنچا سکتا۔''

''اگر آج رات مزید برف باری نہ ہوئی تو ہم کل کوشش کر سکتے ہیں۔''

''اگر تمہارے خیال میں جانا بہت ضروری ہے تو تمہاری مرضی ویسے میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ جب اس سڑک پر برف پڑی ہو تو اس پر ہر گاڑی سفر نہیں کر سکتی ہے۔''

''مجھے بھی لگ رہا ہے ہمیں پیر والے دن جانے کا موقع ملے گا۔''

''مے بی۔'' وہ کھڑے کھڑے بولا۔ ''اصل میں مَیں اپنا کچھ کام نمٹا رہا ہوں اور اسے چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر تم لوگ اجازت دو تو میں یہ کام نمٹا لوں۔''

''کیوں نہیں ڈاکٹر۔'' مجھ سے پہلے زرین نے کہا۔ ''آپ اپنا کام کریں۔''

''کھانا ٹھیک آٹھ بجے لگے گا تب تک آپ چاہیں تو ٹی وی سے دل بہلا سکتے ہیں۔'' اس نے ایک طرف رکھے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں دو چینل والا ڈش ریسیور ہے۔''

''شکریہ ڈاکٹر۔'' میں نے کہا۔

''مائی پلیور۔'' اس نے کسی قدر خم کھا کر کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے ٹی وی کے ساتھ رکھے ریموٹ سے اسے آن کیا۔ اس میں بہت سارے چینلز تھے لیکن ان میں مقامی چینلز کی تعداد کم تھی میں نے خبروں والا ایک چینل لگایا۔ اتفاق سے اس میں موسم کا حال بتایا جا رہا تھا۔ اسلام آباد کے آس پاس پہاڑوں میں شدید برف باری جاری تھی اور موسم کے مزید سرد ہونے کی پیشین گوئی کی جا رہی تھی۔ یہ ڈائریکٹ سیٹلائیٹ چینلز تھے اس لیے خراب موسم کے باوجود ان کی کوالٹی بہت شاندار تھی۔ میں کچھ دیر چینلز گھماتا رہا۔ زرین کو ٹی وی سے خاص

دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ صوفے سے سر ٹکا کر اونگھنے لگی تھی۔ میں نے نیشنل جیوگرافک لگایا تو اتفاق سے وہاں سے ایمن کا پروگرام آ رہا تھا جو اس نے ہمالیہ کے علاقوں پر تیار کیا تھا۔ یہ پرانا پروگرام تھا اور پھر سے نشر کیا جا رہا تھا۔ میں پروگرام دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ زرین نے میری دلچسپی کو نوٹ نہیں کیا ہوگا لیکن وہ دیکھ رہی تھی اس نے اچانک کہا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟''

''کون سی لڑکی؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''جس کا پروگرام تم اتنی دلچسپی سے دیکھ رہے ہو ورنہ اس سے پہلے تم صرف چینل گھما رہے تھے۔''

پہلے میں نے سوچا اسے ٹال دوں لیکن پھر مجھے یہ عجیب سا لگا۔ زرین سے میرا ایسا کوئی تعلق نہیں تھا کہ میں کسی دوسری عورت سے اپنے تعلق کو اس سے چھپاتا۔ ایمن کے بارے میں تو سویرا کو بھی بتایا تھا۔ ''اس کا نام ایمن ہے۔''

وہ چونک کر سیدھی ہوگئی۔ ''کون ایمن؟''

میں نے اسے ایمن کے بارے میں مختصر بتایا۔ وہ غور سے سنتی رہی میں نے یہ بتایا کہ ایمن سے میری دوستی ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لیتی ہے اور ایک موقع پر تو محبت کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ زرین نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''صرف دوستی ہے؟''

''ہاں تم جان گئی ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔''

''تمہارے بارے میں تو اچھی طرح جانتی ہوں میں اس کی بات کر رہی ہوں۔ کیا یہ تمہیں صرف دوست سمجھتی ہے؟''

''اس کا کہنا تو یہی ہے باقی دل کا حال صرف خدا جانتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے یہ خیال کیوں آیا کہ وہ دوستی سے ہٹ کر بھی کچھ دلچسپی رکھتی ہے۔''

''بس مجھے لگا۔'' اس نے پُر خمار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''شہباز تم میں نہ جانے کیا بات ہے۔ میں کبھی دل کے ہاتھوں اس طرح مجبور نہیں ہوئی۔''

میں چونک گیا اس کا ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔ ''تمہارا ہاتھ گرم ہے تمہیں بخار تو نہیں ہے۔''

''پتا نہیں لیکن جسم میں بہت پیاری سی گرمی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی جو معمول سے ذرا تیز تھی۔

''میرا خیال ہے تمہیں بخار ہی ہو رہا ہے۔''

''شاید۔'' اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے سر صوفے سے ٹیک لیا۔

''زرین اٹھو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا۔'' اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بستر تک لے چلو۔''

ذرا سی دیر میں اس کا جسم تپنے لگا تھا اور شاید وہ واقعی اٹھ نہیں پا رہی تھی میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا وہ کھڑی بھی نہیں ہو رہی تھی اس کا سارا بوجھ مجھ پر آ گیا تھا۔ شاید یہ رات بھر سردی میں بھٹکنے اور سرد ترین پانی

میں بھیگنے کا ردِ عمل تھا جو ذرا دیر سے ظاہر ہوا تھا۔ میں اسے کمرے میں لایا اور بستر پر لٹا کر کمبل اوڑھا دیا۔ اس پر غشی سی طاری وہ رہی تھی میں نے جلدی سے انٹر کام اٹھا کر ایک نمبر دبایا۔

''یس سر؟''

''میری وائف کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ ان کو تیز بخار ہو گیا ہے۔''

''میں ڈاکٹر کو انفارم کرتا ہوں سر۔'' اس نے مشینی انداز میں کہا اور انٹر کام بند کر دیا۔ باتھ روم کی میڈیسن کیبنٹ میں تھرما میٹر بھی رکھا تھا میں نے اس سے زرین کا بخار چیک کیا۔ اسے ایک سو دو بخار ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اتنا تیز بخار ہونا خطرے کی علامت تھی۔ کوئی پانچ منٹ بعد ڈاکٹر توفیق دستک دے کر اندر آیا اس نے ڈاکٹروں والا مخصوص بیگ اٹھا رکھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے زرین کا بلڈ پریشر اور درجہ حرارت چیک کیا۔ پھر اسٹیتھو اسکوپ سے اس کی سانس دیکھی۔ زرین ہوش میں تھی لیکن اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ میں نے پوچھا۔

''اسے کیا ہوا؟''

''میرا خیال ہے موسم کا اثر ہے لیکن سانس کلیئر ہے۔ انفکشن کے آثار نہیں ہیں البتہ احتیاط نہ کی گئی تو نمونیا کا خطرہ ہے۔'' ڈاکٹر توفیق نے کہا اور بکس سے ایک انجکشن نکال کر سرنج میں بھرا اور اسے زرین کے بازو میں انجکٹ کر دیا۔ ''میں نے انجکشن دے دیا ہے ایک سے دو گھنٹے میں بخار اتر جائے گا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ''شکر ہے آپ موجود ہیں ورنہ......''

''ڈونٹ وری اور ابھی انہیں آرام کرنے دو۔'' اس نے بیگ بند کیا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ ایک بات کرنی ہے۔''

وہ مجھے نشست گاہ میں لے آیا۔ ''کوئی خاص بات ہے ڈاکٹر؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''آئی تھنک شی از ان ہائی فرٹائل ڈیز۔''

''جی۔'' میں اس کے جملے پر ششدر رہ گیا تھا۔

''سوری ٹو سے لیکن یہ اہم ہے۔ میرا خیال ہے ان کی حالت اسی وجہ سے اتنی جلدی خراب ہوئی ہے۔ اسے نارمل بخار نہیں کہہ سکتے ان دنوں میں عورت کا جسم ویسے ہی گرم ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مرد کی قربت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اگر کسی وجہ سے یہ قربت نہ ملے تو بخار سچ مچ بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ ان کے ساتھ ہوا ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں کیونکہ میں زرین کا شوہر تو نہیں تھا اور وہ مجھے ازدواجی زندگی کی باریکیاں سمجھا رہا تھا آخر میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں یہ سب باتیں سمجھتا ہوں لیکن آپ جانتے ہیں ہم ایک پریشان کیفیت میں گھر سے دور ہیں اور ہمارے گھر والوں کو ہمارے بارے میں علم نہیں ہے اس لیے ہمارا دھیان کسی اور طرف کس طرح جا سکتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اب یہاں رکنا تمہاری مجبوری بن گیا ہے اور جب تم رک رہے ہو تو بہتر ہے اپنی بیوی کی طرف اس لحاظ سے توجہ دو۔ اس سے وہ جلدی کور کر لے گی میری بات سمجھ رہے ہو نا۔'' اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ ''او کے ایک گھنٹے میں اگر بخار نہ اترے تو مجھے پھر بتانا۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں کمرے میں آیا تو زرین شاید سو گئی تھی کیونکہ کمرے میں اس کی گہری سانسوں کی گونج بسی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس کرسی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ بخار کی حدت سے اس کا گلابی چہرہ آتشیں رنگ اختیار کر گیا تھا۔ مجھے عبداللہ اور دوسرے لوگوں کا خیال آیا جو یقیناً ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم کہاں تھے میں نے عبداللہ والی گاڑی چھوڑتے ہوئے اس کے کاغذات نکال لیے تھے تاکہ دشمن گاڑی کی مدد سے اس کا پتا نہ چلا سکے۔ گاڑی کے نمبر معلوم کرنے میں کچھ دیر لگتی مجھے امید تھی کہ اگر عبداللہ یا راجا عمر دراز کے کسی اور ملازم کے نام پر بھی یہ گاڑی تھی تب بھی اس کا پتا کوٹھی کا نہیں ہوگا۔ پھر مجھے شاہین خان کا خیال آیا جسے میں ہم نالے میں ڈوبی کار میں چھوڑ آئے تھے لیکن مجھے امید تھی کہ وہ ڈوب کر نہیں مرا ہوگا۔ اول تو وہ غیرت مند نہیں تھا اور دوسرے نالے میں اتنا پانی نہیں تھا۔ ہاں سردی سے اکڑ کر مر جائے تو الگ بات تھی لیکن اس کا امکان بھی کم تھا کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں اب آزاد تھے اور نالے کا سرد پانی اسے ہوش میں لے آیا ہوگا اس لیے وہ کار سے تو نکل گیا ہوگا۔ بشرطیکہ کار الٹنے پلٹنے میں اس کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو یا وہ فاضلی کے ہاتھ نہ آ گیا ہو۔ اگرچہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ظاہر ہے فاضلی اس کی بات پر اتنی آسانی سے یقین نہیں کرے گا۔ وہ اس سے اپنے طریقے سے پوچھے گا اور شاہین خان صاحب کو یقیناً عبرتناک حالات سے گزرنا پڑا ہوگا۔ بہر حال وہ میری طرف جہنم میں جاتا۔

زرین سو رہی تھی اور اب میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے میں سوچنے لگا۔ اب تک مجھے حالات کے تجزیئے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نہیں جان سکا تھا کہ خاموشی سے میرا پیچھا کرنے یا مجھے دبوچ لینے کے بجائے فاضلی اور اس کے ساتھی مجھے بھگاتے کیوں رہے تھے۔ انہوں نے یقینی طور پر سڑک تک میرا پیچھا کیا ہوگا جہاں ہمیں خوش قسمتی سے ڈاکٹر توفیق مل گیا اور اس نے ہمیں لفٹ بھی دے دی۔ یہی نہیں وہ پوری طرح ہماری مدد پر آمادہ تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھے اس کی بات مان کر رکنا نہیں چاہیے تھا بلکہ اسی وقت اپنی راہ لینی چاہیے تھی۔ اس وقت ہم اسلام آباد میں ہوتے لیکن رکنے کی وجہ سے ہم کئی دن کے لیے اس جگہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اتنی آسانی سے ڈاکٹر کی بات کیوں مان لی۔ پھر زرین جس نے شروع میں اسے ناپسند کیا تھا وہ بھی اس کی تجویز کی تائید کرنے لگی تھی اور یوں ہم نے جانے کے بجائے رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پھر میرے اور زرین کے ساتھ جو ہوا تھا وہ بھی کچھ کم انوکھا نہیں تھا۔ یہ درست ہے اس وقت حالات دوسرے ہو گئے تھے۔ زرین کو خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ مجھے بھی بے قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ مجھے کیا ہوا تھا اور میں کیوں اس طرح بے قابو ہوا تھا۔ میں اپنی کیفیت کو معمول کے مطابق نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ غیر معمولی کیفیت تھی۔ پھر زرین کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ اپنی سابقہ کیفیت پر شرمندہ تھی۔ تب اس کی یہ

حالت کیوں ہوئی تھی؟ اس قسم کے سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ کیا یہ ان حالات کا نتیجہ تھا جن سے ہم گزر رہے تھے یا اس میں کچھ اور عوامل کارفرما تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکا تھا۔

''کون ہے؟''

''سر۔'' باہر سے شیف کی آواز آئی۔ میں نے اٹھ کر باہر دیکھا۔ ''سر کھانا لگنے میں کچھ وقت ہے اس دوران میں آپ چائے، کافی یا کچھ اور لینا پسند کریں گے؟''

''کافی لے آؤ...... اگر پہلے جیسی ہو؟''

وہ پہلی بار مسکرایا۔ ''آپ کو میری کافی ہر بار ایک جیسی ملے گی سر۔''

میں نے کافی کا کہا تو وہ کچھ زیادہ ہی خوش ہو گیا تھا حالانکہ میں نے اسے ہمیشہ سپاٹ سی صورت کے ساتھ دیکھا تھا۔ پہلی بار کچھ تاثرات نظر آئے تھے۔ میرے کافی پینے سے اسے کون سی خوشی مل گئی تھی۔ میں نے اندر آتے ہوئے سوچا۔ میں نے زرین کا بخار چیک کیا۔ اسے انجکشن لگے نصف گھنٹہ ہونے کو آیا تھا لیکن بخار کی شدت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا اس کا چہرہ ویسے ہی سرخ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر توفیق نے ایک گھنٹے بعد مطلع کرنے کو کہا تھا۔ میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ گھڑی کی سوئیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ دس منٹ بعد دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی اور شیف نے کافی ٹرالی اندر کر دی۔ وہ ٹرالی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے اپنے لیے کافی بنائی تھی اور اسے لے کر کرسی کی طرف آیا تھا کہ اچانک زرین کھانسنے لگی اور ایسا لگا جیسے اسے الٹی ہو رہی ہو۔ میں کپ رکھ کر اس کے پاس آیا۔

''کیا ہوا...... کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''پیاس لگ رہی ہے اور متلی کی کیفیت ہو رہی ہے۔'' اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ذرا سی دیر میں جیسے وہ نچڑ گئی تھی۔ میں نے سرہانے رکھے جگ سے اس کے لیے پانی نکالا لیکن پانی پیتے ہی اسے الٹی آ گئی تھی۔ وہاں ٹب بن تھا میں نے وہی اس کے سامنے کر دیا۔ وہ الٹی کر کے نڈھال سی ہو کر پڑ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز ایسا لگ رہا ہے جیسے میری جان نکل رہی ہو۔''

''بخار میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ڈاکٹر توفیق نے تمہیں انجکشن دیا ہے کچھ دیر میں تم بہتر محسوس کرو گی۔''

''نہیں۔'' وہ تکیے پر سر پٹختے ہوئے بولی۔ ''میں اچھا محسوس نہیں کر رہی ہوں پلیز مجھے یہاں سے لے چلو۔''

''اس وقت ہم کہیں نہیں جا سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو باہر موسم بہتر نہیں ہے۔''

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز مجھے لگ رہا ہے اگر میں یہاں رہی تو مر جاؤں گی۔''

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے ایسے خیالات آ رہے ہیں۔ تم سونے کی کوشش کرو۔''

''میں نہیں سو سکتی۔'' اس نے اپنا سینہ مسلتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے اندر آگ بھر گئی ہے مجھے پانی دو۔''

میں نے اسے پھر پانی دیا اس بار اسے الٹی نہیں آئی تھی اور وہ نڈھال سی لیٹ گئی۔ میں نے اس کا درجہ

حرارت لیا۔ اس بار بخار ایک سو تین تھا۔ انجکشن دیئے ہوئے پون گھنٹہ ہو گیا تھا لیکن اب تک اس کی حالت میں بہتری کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ لیٹنے کے کچھ دیر بعد زرین پھر غشی کی کیفیت میں چلی گئی تھی۔ میں نے اس کا دہکتا ہوا چہرہ دیکھا اور بے چین ہو کر انٹر کام اٹھا کر ایک نمبر دبایا لیکن دوسری طرف سے بیل جانے کے بجائے مجھے ڈاکٹر توفیق کی آواز سنائی دی۔

''تم اپنا کام دھیان سے نہیں کر رہے ہو۔''

''ڈاکٹر میں پوری توجہ سے کام کرتا ہوں لیکن یہ نہ جانے کیسے ہو گیا۔'' شیف کی آواز آئی۔ ''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ پوری خوراک زرین کی پیالی میں کیسے شامل ہو گئی تھی۔''

''اس کی حالت خراب ہو رہی ہے اور شاید اسے مزید ٹریٹ منٹ کرنا پڑے۔'' ڈاکٹر توفیق کا لہجہ الزام دینے والا ہو گیا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے ڈاکٹر۔'' شیف کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ ''اب غلطی نہیں ہو گی۔''

''تم نے شہباز کو مزید خوراک دے دی ہے؟''

''ہاں ابھی کافی میں شامل کر کے دے کر آیا ہوں۔'' شیف نے جواب دیا۔ ''آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس نے کافی لی ہے یا نہیں۔''

میں یہ گفتگو سن رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے اس کا تجزیہ کر رہا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ڈاکٹر ہمارے خلاف کسی قسم کی سازش کر رہا تھا اور اس نے ہمیں کافی اور چائے میں کوئی چیز دی تھی۔ شیف کی غلطی سے اس چیز کی ساری مقدار زرین کی چائے میں شامل ہو گئی تھی اور وہ بیمار ہو گئی تھی جب کہ مجھے بھی اب کافی میں وہی چیز ملا کر دی جا رہی تھی۔ جب شیف نے مجھے دیکھنے والی بات کی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اس کی بات کا مطلب تھا کہ یہاں کہیں کیمرہ یا کیمرے لگے تھے اور ڈاکٹر براہِ راست ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے انٹر کام کا ریسیور واپس رکھ دیا اور بہت پھرتی سے کافی کا کپ ڈسٹ بن میں خالی کر دیا اور اس کے بعد ایسا تاثر دیا جیسے میں کپ سے کافی پی رہا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ ڈاکٹر نے مجھے کپ ڈسٹ بن میں خالی کرتے نہیں دیکھا ہو گا۔ کپ ختم کرنے کی اداکاری کرنے کے بعد میں نے ڈسٹ بن اٹھایا اور اسے باتھ روم میں لے کر پھینک دیا۔



پتا نہیں میری قسمت میں کیا تھا جو بھی ملتا تھا وہ کوئی انوکھا اور بالعموم خبیث آدمی یا عورت ہی نکلتا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شریف نظر آنے والا ڈاکٹر توفیق ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہا ہوگا۔ میں اور وہ پہلی بار ملے تھے اور ہمارے درمیان کوئی دشمنی نہیں تھی اس کے باوجود وہ ہمارے خلاف کچھ کر رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ سازشی مزاج کا شخص تھا اور اپنے کسی مفاد کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں کوئی دوا دینا چاہی تھی جو شیف کی غلطی سے ساری زرین کے حصے میں آگئی اور اس کے اثر سے وہ بیمار ہوگئی تھی۔ میں ڈسٹ بن پھینک کر اور اسے صاف کر کے کمرے میں آیا اور ایک بار پھر انٹر کام اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

''یس سر؟'' شیف نے کہا۔

''ڈاکٹر سے کہو کہ زرین کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب ہوگئی ہے۔''

''میں کہتا ہوں سر۔'' اس نے کہا۔

انٹر کام رکھ کر میں نے جیب میں موجود ریوالور چھوا اور آنے والے وقت کے لیے تیار ہونے لگا۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس سے پہلے بھی میں بہت سے خبیثوں اور سازشیوں سے نمٹ چکا تھا تو ایک اور سہی۔ زرین بے سدھ پڑی تھی۔ میرے اندر ابال سا آنے لگا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر زرین کو کچھ ہوا تو ڈاکٹر کو بہت برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے جیب میں ریوالور پر گرفت مضبوط کر لی تھی اور بلند آواز سے کہا۔ ''آجاؤ۔''

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر میری ریوالور پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر میں نے ہاتھ باہر نکال لیا۔ زرین کو دیکھنے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ میں نے بتایا ہے کہ اس کی طبیعت کوئی خاص خراب نہیں ہے۔''

''طبیعت تو خراب ہے اس نے الٹی بھی کی ہے اور سینے میں جلن کی شکایت بھی کر رہی تھی اور جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں یہ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور زرین کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے بخار دیکھا اور پھر بلڈ پریشر لیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس کا بلڈ پریشر لو ہو رہا تھا۔ یہ ستر اور سو تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک انجکشن اور برآمد کیا اور اسے سرنج میں بھرنے لگا۔ انجکشن کی شیشی پر کوئی نام یا ٹیگ نہیں لگا تھا۔ یہ صرف شیشی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر یہ کیسا انجکشن ہے۔''
''یہ بخار اور تکلیف کو کم کرنے والا انجکشن ہے۔''اس نے مبہم انداز میں کہا۔
''پھر بھی اس کا کوئی نام تو ہوگا۔ اس کی تو شیشی پر بھی کچھ نہیں لکھا ہے۔ میں نے آج تک کسی انجکشن کی شیشی ایسی نہیں دیکھی ہے۔''
میری جرح پر اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے تاثرات نظر آئے تھے۔''میں ڈاکٹر ہوں...... مجھے اس دوا کا علم ہے۔''
''صرف وائرلوجسٹ۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔''اور میرا خیال ہے آپ باقاعدہ پریکٹس بھی نہیں کرتے ہیں۔''
وہ خود پر قابو پانے لگا۔''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''
''کچھ بھی نہیں۔'' میں مسکرایا۔''میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ آپ کے دیئے ہوئے انجکشن کا اس پر اچھا اثر نہیں ہوا ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ جو انجکشن اب دے رہے ہیں اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔''
''تم چاہتے ہو میں اسے انجکشن نہیں دوں۔''
''میں چاہتا ہوں آپ اس کا صحیح علاج کریں۔ مجھے یہ بے نام دوا کا انجکشن مشکوک لگ رہا ہے۔''
''میرے پاس یہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی ایسا انجکشن نہیں ہے جو میں اسے دے سکوں۔''اس نے جھنجھلائے انداز میں کہا۔
''تب اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے سرنج بیگ میں ڈال دی۔
''ٹھیک ہے اگر تم اپنی بیوی کا علاج نہیں کرانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی لیکن اس کی حالت مزید خراب ہوئی تو تم مجھے الزام نہیں دے سکو گے۔''
''اس کی حالت کیوں خراب ہوگی۔'' میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔''آپ کا کہنا ہے اسے کوئی بیماری نہیں صرف موسم کا اثر ہے۔''
وہ چونکا پھر اس نے جلدی سے کہا۔''وہ تو ہے لیکن علاج کرنا ہے تب ہی یہ ٹھیک ہوگی۔''
''میرے خیال میں اس کی جو کیفیت تھی وہ پیناڈل یا ڈسپرین کی دو گولیوں سے بھی ٹھیک ہو سکتی تھی۔''
''اگر تمہارے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے؟'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔''تب میں تمہیں ڈسپرین اور پیناڈول مہیا کر دیتا ہوں تم اس کا علاج کر لو۔''
''ڈاکٹر اس کی طبیعت اب سچ مچ خراب ہے۔'' میں نے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ اسے اس کی اصلیت بتا دوں یا نہیں اور اگر میں اسے اس کی اصلیت بتا دیتا ہوں تو کیا یہاں سے ہمارا نکلنا ممکن ہوگا۔ خاص طور سے اس صورت میں جب زرین نیم بے ہوش تھی اپنے قدموں پر کھڑی ہونے کے قابل بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف میں ڈاکٹر کے سامنے خاصی حد تک کھل گیا تھا اور اس وقت میں اسے جانے دیتا تو ممکن ہے وہ پھر ہاتھ نہ آتا اور ہم پر کوئی اور حربہ استعمال کرتا۔ میں نے سوچا اور فوری فیصلہ کیا۔ یہ موقع پھر میرے ہاتھ نہیں آتا۔ میں نے اچانک ہی ریوالور نکال کر اس پر تان لیا۔

''ڈاکٹر مجھے افسوس ہے تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو تم ہمارے خلاف کوئی سازش کر رہے ہو۔''

ریوالور دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا تھا لیکن اس نے حوصلے سے تردید کی۔ ''میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے کیونکہ میں اتفاق سے انٹر کام پر تمہاری اور تمہارے شیف کی باتیں سن چکا ہوں اور اس کے بعد مجھے کوئی شبہ نہیں رہا ہے کہ تم ہم پر کسی دوا کا تجربہ کر رہے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''بہر حال ایک بات تمہارے ذہن میں بیٹھ چکی ہے۔''

''بالکل تم اسے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہو۔''

''او کے اس صورت میں تم کیا چاہتے ہو؟''

''ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس وقت جانا ممکن نہیں ہے تم موسم دیکھ رہے ہو اور پھر رات کا وقت ہو گیا ہے۔''

''بالکل ممکن ہے کیونکہ یہاں ایک ایسی گاڑی اور اس کا ڈرائیور موجود ہے جو ایسے موسم میں سفر کا بہت تجربہ رکھتے ہیں۔''

''میں نہیں جا سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس کے ہوتے ہوئے تم انکار نہیں کر سکتے ہو۔'' میں نے ریوالور ہلایا۔ ''کیا کر سکتے ہو؟''

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو کسی کو اس طرح ہتھیار سے دھمکانا جرم ہے۔''

''اور جو تم کر رہے ہو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''اگر کیا ہے تب بھی تم ثابت نہیں کر سکتے ہو۔''

''ڈاکٹر توفیق تم مجھے ابھی جانتے نہیں ہو۔'' میرا لہجہ بدل گیا۔ ''مجھے کہیں کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر زرین کو تمہاری وجہ سے کچھ ہوا تو سمجھ لو تمہاری جان بخشی نہیں ہو گی۔''

''تم مجھے دھمکا نہیں سکتے ہو۔''

''او کے میں صرف تین تک گنوں گا اس دوران میں تم نے ہمیں لے جانے کی حامی نہ بھری تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا اور اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔'' میں نے ریوالور اس کے سر پر رکھ دیا۔ ''ایک...... دو...... تین......''

اس نے میرے لہجے سے اندازہ کر لیا کہ میں بالکل سنجیدہ ہوں اور تین کہنے کے بعد اسے شوٹ کر دوں گا اس لیے اس نے تین کہتے ہی ہتھیار ڈال دیئے اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے میں تیار ہوں، لیکن یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''میں اکثر اچھا نہیں کرتا ہوں۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''لیکن ان لوگوں کے لیے جو میرے ساتھ اچھا نہیں کرتے ہیں۔ بس اب چلنے کی کرو۔''

''ایسے ہی؟'' اس نے اپنے عام سے کپڑوں کی طرف دیکھا۔

''تم نے شادی میں نہیں جانا ہے، اس لیے ایسے ہی چلو۔''

''باہر سردی بہت ہے۔''

''اس کے لیے تم اپنا اوورکوٹ لے سکتے ہو، آخر تمہیں گاڑی کی چابیاں بھی تو لینی ہوں گی۔''

اس نے سوچا اور سر ہلا دیا، وہ سمجھ گیا کہ فی الحال میرے سامنے مجبور ہے اور اسے میری ہر بات ماننا پڑے گی۔ ''ٹھیک ہے چلو۔''

میں اس کے ساتھ جانے لگا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ ''ایک منٹ رکو اور دونوں ہاتھ اوپر کرلو۔''

اس کا چہرہ جس طرح بگڑا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے پاس کچھ تھا اور جب اس نے بادلِ ناخواستہ تلاشی دی تو اس کے پاس سے ایک عدد چھوٹا سا پستول برآمد ہوا تھا۔ وہ میں نے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ ''تم نے دیکھ لیا تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے ہو اس لیے آگے بھی کوئی چالاکی مت دکھانا ورنہ عین ممکن ہے وہ تمہاری آخری چالاکی ہو۔''

''میں کوئی بدمعاش یا مجرم نہیں ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اس پستول کے ہوتے ہوئے بھی۔'' میں نے طنز کیا۔ ''اب تم اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے چل پڑو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اسے اس کے کمرے میں لایا۔ اس نے وہاں سے اپنا اوورکوٹ اور کار کی چابیاں لیں اور ہم واپس زرین کے پاس آئے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اسے اٹھاؤ۔''

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''میں اسے اٹھاؤں؟''

''تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''اٹھاؤ اسے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

مجبوراً اس نے زرین کو اٹھایا، وہ بدستور نیم غشی میں تھی۔ ہم باہر آنے لگے۔ حیرت انگیز بات تھی کہ ابھی تک کسی طرف سے مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ شاید کیمرے سے دیکھنے کا نظام صرف ڈاکٹر کے پاس تھا اور شیف یا کوئی دوسرا فرد اس نظام تک رسائی نہیں رکھتا تھا یا رکھتا تھا تب بھی وہ اس سے دور تھا۔ اس کے باوجود میں پوری طرح محتاط تھا اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہم باہر نکلے جہاں برف باری رکنے کے بعد ہلکی لیکن یخ ترین ہوا چل رہی تھی۔ گرم کپڑوں میں بھی میں ایک بار لرز اٹھا تھا۔ زرین کا پتا نہیں تھا کیونکہ وہ بے ہوش تھی۔ کار پورچ میں موجود تھی۔ یہ جگہ مین گیٹ سے نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے چابی لے کر کار کا عقبی دروازہ کھولا اور ڈاکٹر سے زرین کو اندر لٹانے کو کہا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور میری طرف دیکھا۔ ''شہباز اب بھی وقت ہے......''

''وقت ہی نہیں ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''خاص طور سے تمہارے پاس، مجھے ذرا سا بھی خطرے کا احساس ہوا تو میں تمہیں شوٹ کردوں گا اس لیے جلد از جلد یہاں سے نکل چلو۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''جیسی تمہاری مرضی میں نے تمہیں سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔''

اس کے لہجے سے مجھے خطرے کا احساس ہوا تھا لیکن اس سے پہلے میں کچھ سوچتا یا کچھ کرتا مجھے لگا میری پشت میں کوئی تیز اور نوکیلی چیز اتر گئی ہے، مجھے جھٹکا لگا اور میں نے ریوالور کا رخ ڈاکٹر کی طرف کرنے کی کوشش

الی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس کے کسی آدمی نے چھپ کر مجھے بے آواز ہتھیار سے نشانہ بنالیا ہے لیکن جب میں نے حرکت کرنا چاہی تو میرے جسم نے ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ میرے ہاتھ منجمد ہو گئے تھے پھر میرے گھٹنوں نے میرا بوجھ سنبھالنے سے انکار کر دیا تھا اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا اور ڈاکٹر نے اطمینان سے جھک کر میرے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید گولی کسی مہلک جگہ لگی تھی اور میری جان نکل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر دھند سی چھانے لگی تھی۔ میں نے اس دھند سے نکل کر شیف کو سامنے آتے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی اور موٹے دہانے والی بندوق تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ان دونوں کو اندر لے آؤ...... بیسمنٹ میں اور نمبر چار میں ڈال دینا۔''

ڈاکٹر کے آخری الفاظ بگڑ گئے تھے اور بمشکل سمجھ میں آئے۔ پھر وہ چلا گیا۔ میں نہیں دیکھ سکا کہ وہ کہاں گیا کیونکہ میں ساکت پڑا تھا اور سر بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ دھند کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے شیف کو اپنی طرف جھکتے دیکھا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ دھند پوری طرح مجھ پر حاوی ہوگئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا لیکن جب مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنا جسم و ذہن بہت ہلکے پھلکے محسوس ہو رہے تھے۔ جسم میں درد کا نام ونشان نہیں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ میں بچ گیا تھا اس وقت تو میری جان نکل رہی تھی۔ شاید آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی اور مجھے بھاری مسکن دوا دی گئی تھی جس کے اثر سے درد بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سفید چھت اور دیواروں والا کمرہ تھا۔ میں ایک فولاد سے بنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا جیسا کہ اسپتال میں ہوتا ہے۔ میرا جسم اب حرکت کر سکتا تھا کیونکہ میں نے نظر گھما کر دیکھا تو فوراً ہی مجھے زرین نظر آ گئی وہ برابر والے بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا لباس نہیں تھا بلکہ اس کے بجائے اسے ایک ہلکے نیلے رنگ کا کرتہ اور پاجامہ پہنا دیا گیا تھا۔ اس قسم کا لباس عام طور سے اسپتال میں داخل ہونے والے مریضوں کو پہنایا جاتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ معمول پر آ گیا تھا یعنی اب اس کی طبیعت ٹھیک تھی۔ مگر وہ بے ہوش تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

''زرین...... اے تم سن رہی ہو؟''

لیکن اس کے جسم میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی چہرے پر کوئی تاثر آیا تھا ایسا لگ رہا تھا وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ میں نے دو تین بار اسے آواز دی۔ پھر میری توجہ اس کے دائیں ہاتھ کے ساتھ بندھی چمڑے کی بیلٹ کی طرف گئی۔ یہ بیڈ کے ساتھ منسلک تھی اور شاید زرین کا بایاں ہاتھ بھی اسی طرح بندھا ہوا تھا وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر مجھے اس کے پیروں میں بھی ایسی ہی بیلٹیں بندھی نظر آئیں۔ ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا اور کون کر رہا تھا۔ میں نے سوچا تو مجھے ڈاکٹر کا خیال آیا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا لیکن نہیں میں اٹھا نہیں تھا بلکہ میں نے کوشش کی تھی اور تب انکشاف ہوا کہ میرے ہاتھ اور پیر اسی طرح بیلٹ سے بندھے ہوئے تھے اور میں حرکت نہیں کر سکتا تھا صرف میرا سر آزاد تھا۔ البتہ منہ کھلا ہوا تھا اور پہلے میں نے چیخ چیخ کر ڈاکٹر کو گالیاں دینے کا سوچا لیکن پھر میں نے خود کو روک دیا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس سے بہتر تھا کہ میں یہاں سے رہائی کی کوئی تدبیر کرتا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا مشکل سے دس بائی دس کا اور اس میں [illegible] ان دو عدد بیڈز کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہاں دو عدد ڈرپ اسٹینڈ تھے لیکن ان پر کچھ نہیں تھا۔ کمرے میں [illegible] دروازہ تھا نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ ہی کوئی روشن دان تھا۔

سب سے پہلے تو میں نے ہاتھوں میں بندھی بیلٹوں کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور ان سے زور آزمائی کی۔ جلد
ے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ بیلٹیں بہت مضبوط تھیں اور ان کو توڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ اس زور آزمائی کے دوران
ں جسم میں درد محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا اگر مجھے گولی لگی تھی تو لازمی زخم میں ٹیسیں اٹھنی چاہیے تھی لیکن ایسا
ھ محسوس نہیں ہوا تھا۔ شاید مسکن دوا بہت تیز تھی یا پھر مجھے گولی نہیں لگی تھی۔ میں نے یاد کیا کہ بے ہوش ہوتے
ت میں نے کیا محسوس کیا تھا تو مجھے لگا وہ گولی نہیں تھی۔ گولی کا زخم میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کی تکلیف اور
م پر اثر کا مجھے بہ خوبی علم تھا وہ تکلیف بالکل الگ تھی۔ کیا مجھ پر ڈارٹ گن آزمائی گئی تھی جو دوا والا بلٹ فائر
تی ہے اور اس کی سوئی جسم میں پیوست ہو کر دوا انجکٹ کر دیتی ہے۔ میں نے شیف کے پاس عجیب سی
خت کی بندوق بھی دیکھی تھی۔ یقیناً اس سے ڈارٹ فائر کیا گیا تھا۔

زور آزمائی کے دوران میں نے دیکھا کہ میرے جسم پر بھی وہی کسی قدر ریشمی اور ڈھیلا سا لباس تھا جو
ین نے پہن رکھا تھا۔ سردی کے موسم کے لحاظ سے یہ بالکل ناکافی تھا لیکن یہاں درجہ حرارت خوش گوار تھا۔
ر مجھے ڈاکٹر کے آخری الفاظ یاد آئے جو اس نے شیف سے کہے تھے کہ ہمیں بیسمنٹ کے نمبر چار میں پہنچا دیا
ئے۔ یعنی ہم کسی تہہ خانے میں تھے اور یہ تہہ خانہ یقیناً اس کوٹھی میں تھا۔ مجھے کوٹھی کی ساخت یاد آئی۔ یہ مین
یٹ سے اوپر تک کسی چھوٹی پہاڑی کی طرح پھیلی تھی اور یقیناً اس کی اوپری عمارت ایک دھوکا تھی اس کی اصل
رت تہہ خانے میں تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس تہہ خانے کی کئی منزلیں ہوں۔ ان چند منٹوں میں میرے ذہن
ے تجزیہ کر لیا تھا اور اس تجزیئے کے مطابق میں فی الحال بالکل بے بس تھا اور سوائے آنے والے حالات کے
ظار کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سر گھما کر ایک بار پھر زرین کی طرف دیکھا۔

''زرین...... ہوش میں آؤ...... زرین۔''

میں کچھ دیر اسے مستقل پکارتا رہا لیکن اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور وہ بے ہوش تھی۔
ک ہار کر میں نے کوشش ترک کر دی اور خود کو ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے ایک سانس کی مشق کرنے لگا۔
ں سے مجھے سکون ملا تھا اور میں آنکھ بند کر کے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کوئی اندر
ا تھا اور میرے پاس آیا۔ میں ساکت لیٹا رہا تھا۔ آنے والے نے کلائی پکڑ کر میری نبض دیکھی اور چند لمحے بعد
کٹر کی آواز آئی۔

''شہباز مجھے معلوم ہے تم ہوش میں آ گئے ہو۔''

میں نے آنکھ کھولی۔ ''ہاں میں ہوش میں ہوں لیکن افسوس کہ تمہاری گردن نہیں توڑ سکتا میرے ہاتھ
دھے ہوئے ہیں۔''

وہ ڈاکٹر کا مخصوص سفید کوٹ پہن کر کھڑا تھا۔ میری بات سن کر بھی اس کا چہرہ تاثرات سے عاری رہا تھا۔
تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''سکون اور بے حسی...... کیا مجھے کوئی سن کرنے والی یا مسکن دوا دی گئی ہے؟''

''نہیں یہ اس دوا کا اثر ہے جو ڈارٹ کی مدد سے تمہارے جسم میں اتاری گئی تھی یہ اتنی زود اثر ہے کہ سیکنڈ
ں انسانی جسم کو مفلوج کر دیتی ہے اور دس سیکنڈ کے اندر وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔''

گویا میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور سر سے اپنے بندھے جسم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا مقصد ڈاکٹر؟''

''ابھی تو نہیں لیکن جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''البتہ تم بے فکر رہو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس لیے آزاد ہونے کی بے سود کوشش میں اپنی توانائیاں ضائع مت کرنا۔''

''تم نے جس طرح ہمیں قید کیا پھر کسی دوا کا تجربہ کیا اور پھر دھوکے سے بے ہوش کر کے یہاں تک پہنچا دیا ہے اس کے بعد میں کس طرح تمہارے الفاظ پر یقین کر سکتا ہوں؟''

''تمہاری مرضی۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''مت یقین کرو لیکن ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔''

''میری بیوی کی طبیعت کیسی ہے یہ مکمل طور پر بے ہوش ہے۔''

''اب یہ ٹھیک ہے اور اسے ذہنی الجھن سے بچانے کے لیے میں نے بے ہوش رکھا ہے لیکن دو گھنٹے میں جاگ جائے گی اور تب تم اسے سمجھا سکو گے کہ وہ بلاوجہ کے شور شرابے سے گریز کرے۔''

''کیا اس نے شور کیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ تعاون پر آمادہ نہیں تھی اس لیے مجبوراً اسے بے ہوش کرنا پڑا۔ بہر حال اب یہ ٹھیک ہے۔''

''ڈاکٹر تم نے ہمیں کون سی دوا دی تھی جس کا سارا ڈوز زرین کی چائے میں چلا گیا تھا اور اس کے اثر سے وہ بیمار پڑ گئی تھی۔''

''یہ ایک مخصوص دوا ہے اس کے اثر سے انسان کی قوت ارادی غیر محسوس انداز میں ختم ہو جاتی ہے اور وہ دوسروں کی بات یوں مانتا ہے جیسے یہ اس کا اپنا خیال ہو۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ تم اور تمہاری بیوی میری باتیں کتنی آسانی سے مان رہے تھے جب کہ عام حالت میں تم لوگ میری یہ باتیں کسی صورت نہیں مانتے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا جب میں اس کی نہ ماننے والی باتیں بھی آسانی سے مانتا جا رہا تھا تب میرے لاشعور میں یہ بات کھٹک رہی تھی اور مجھے اپنی فرماں برداری پر تعجب ہو رہا تھا۔ تو یہ وجہ تھی میں نے سوچا اور پھر مجھے ایک خیال آیا۔ ''کیا اس دوا کے اثر سے انسان میں جنسی تحریک بھی پیدا ہوتی ہے؟''

''اسی وجہ سے مجھے آسانی ہوئی تھی کہ تم میاں بیوی ہو اور اگر تمہیں ایسی تحریک محسوس ہوگی تو تم اسے فطری خیال کرو گے۔''

میں اندر سے چونک گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب ہمارے کمرے میں کیمرہ تھا تو یہ بھی ممکن تھا کہ ہماری باتیں سنی جا رہی ہوں اور اس صورت میں ان کو پتا چل جانا چاہیے تھا کہ ہم میاں بیوی نہیں تھے لیکن ڈاکٹر کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یعنی جب مجھ پر اور زرین پر دوا کا اثر ہو رہا تھا اور میں اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ حصہ ڈاکٹر کسی وجہ سے دیکھ یا سن نہیں سکا تھا۔ اس کی وجہ فنی بھی ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ڈاکٹر اس وقت کنٹرول روم میں موجود نہ ہو۔ معاملہ صاف ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اور زرین بہک نہیں تھے۔ حالانکہ اس قسم کی دواؤں کے اثر کے خلاف مزاحمت کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ یہ خدا کا احسان تھا کہ اس نے ہمیں ہمیشہ کی شرمندگی سے بچا لیا۔

''ڈاکٹر کیا تم کوئی نفسیاتی مریض ہو یا انسانیت سے عاری شخص جو دوسروں کو اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔''

وہ مشتعل ہوئے بغیر اطمینان سے بولا۔ ''تم جو چاہے سمجھ سکتے ہو۔ اب تم آرام کرو۔''

میں کسمسایا۔ ''اے سنو...... ہمیں اس طرح باندھ کر رکھا ہے کیا ہمیں کچھ ضروریات نہیں ہوں گی۔''

''فی الحال نہیں ہوں گی۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''لیکن تم فکر مت کرو جب تمہیں کوئی ضرورت محسوس ہو گی تو تمہیں کھول دیا جائے گا۔''

وہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔ میں اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف کا منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہم ایک اور مصیبت میں پھنس چکے تھے اگرچہ یہ مرشد نامی مصیبت کا تسلسل نہیں تھا۔ یقیناً ڈاکٹر کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے کسی مفاد کے لیے ہمیں استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو گا لیکن میں اسے طفل تسلی سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اجنبی ہونے کے باوجود ہمارے خلاف سازش کر کے اور پھر اس طرح قید کر کے اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ دشمن تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ابھی وقت کیا ہوا تھا اور میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا لیکن اس وقت مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی اب یا تو میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا یا اس دوا کے اثر نے بھوک کو مٹا دیا تھا یا پھر مجھے بے ہوشی کے دوران میں کسی اور طریقے سے طاقت کی کوئی دوا دی گئی تھی۔ مجھے اپنی توانائیوں میں بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں جس بستر پر لیٹا تھا اس پر زیادہ موٹا گدا نہیں تھا یہ چار انچ موٹا تھا اور بس اتنا نرم تھا کہ چبھ نہیں رہا تھا۔ میں سر ٹکا کر سوچنے لگا۔ ڈاکٹر کی مہربانیوں کے پس پشت یہ چکر تھا۔ نہ جانے وہ ہم پر کس قسم کا تجربہ کرنا چاہ رہا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا پھر میں زرین کی کراہ سن چونکا۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے گداز ہونٹ نیم وا تھے۔ بہ ظاہر ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی غلط حرکت کی گئی تھی اور نہ ہی میں نے ڈاکٹر کو اس قسم کا آدمی محسوس کیا تھا جو عورتوں میں دلچسپی لیتا ہو اس نے زرین کو بالکل معمول کے مطابق لیا تھا اس کے باوجود وہ بے ہوشی کی حالت میں اس کے قابو میں تھی اور وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔

''زرین۔'' میں بلند آواز سے کہا۔ ''تم میری آواز سن رہی ہو؟''

وہ چونکی اور اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چند لمحے خالی سی رہی تھیں پھر ان میں شناسائی کی چمک ابھری اور اس نے کہا۔ ''شہباز ہم کہاں ہیں؟''

''ہم ڈاکٹر کی قید میں ہیں، تمہیں یاد ہے تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی اور تم الٹی کر کے بے سدھ ہو گئی تھیں؟''

اس نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ''ہاں...... اتنا تو یاد ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟''

''نہیں اس کے بعد بالکل یاد نہیں ہے۔''

''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''بالکل ٹھیک لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا اور اس دوران میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اس نے اٹھنے اور آزاد ہونے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر بولی۔ ''یہ...... یہ کیا ہے؟''

''ہم اس وقت ڈاکٹر کی قید میں ہیں وہ کمینہ دشمن نکلا ہے۔''

زرین گھبرا گئی تھی۔ ''مرشد کا آدمی؟''

''بہ ظاہر تو ایسا نہیں لگ رہا ہے لیکن کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''اس نے اس طرح کیوں باندھ رکھا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میں نے اسے روکا۔

''بے کار ہے تمہارے ہاتھ دکھ جائیں گے۔ یہ بہت مضبوط بیلٹس ہیں۔''

لیکن زرین نے ہاتھ نکالنے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ وہ پریشان اور مشتعل ہو رہی تھی اور دبی آواز میں ڈاکٹر کو گالیاں بھی دے رہی تھی۔ میں نے پھر منع نہیں کیا اور خاموشی سے اسے جدوجہد کرتے دیکھ رہا پھر وہ تھک گئی۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز کچھ کرو۔''

''فی الحال تو کچھ نہیں کر سکتا میں بھی تمہاری طرح بے بس ہوں۔ میں نے ان کی سازش کے بارے میں جان لیا تھا اور اس کے بعد تمہیں لے کر فرار کی کوشش کی تھی لیکن کوشش ناکام رہی۔''

''کیسی سازش؟'' وہ چونکی۔

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میں نے کس طرح ڈاکٹر اور شیف کی باتیں انٹرکام پر سن لی تھیں اور پھر اس کے علاج کے بہانے ڈاکٹر کو بلا کر ہینڈز اَپ بھی کر لیا تھا لیکن کمند اس وقت ٹوٹ گئی جب دو چار ہاتھ لب بام رہ گئے تھے۔ ''پتا نہیں اس بدبخت شیف نے کس دوا کی گولی ماری کہ میں فوراً ہی بے حس ہو گیا تھا اور چند سیکنڈ کے اندر بے ہوش بھی ہو گیا۔''

''اسے کیسے پتا چلا کہ تم نے ڈاکٹر کو ہینڈز اَپ کرا لیا ہے؟''

''میرا خیال میں یہاں کیمرے اور مائیک لگے ہیں اور اس نے کیمرے پر دیکھ لیا تھا پھر چھپ کر مجھ پر وار کر دیا۔''

میں نے زرین کو پہلے دی جانے والی دوا کے بارے میں نہیں بتایا جو انسان کی قوت ارادی ختم کرتی ہے اور اس کے ضمنی اثرات میں جنسی جذبات کی تحریک بھی شامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس طرح بات کھلتی اور اگر وہ یہاں کی باتیں سن رہے تھے تو ان کو پتا چل جاتا کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات ان کو معلوم بھی نہ ہو۔ زرین سوچ رہی تھی اس نے کہا۔ ''کیا یہاں بھی کیمرے اور مائیک ہوں گے؟''

''بالکل یہ ہماری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوں گے۔'' میں نے زور دے کر اور زرین کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔ پتا نہیں وہ سمجھی یا نہیں سمجھی تھی۔ مجھے فکر تھی کہ کہیں اس کے منہ سے نہ نکل جائے کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس سے ہماری جو حالت تھی اس پر خاص فرق نہیں پڑتا لیکن دشمن سے جو بات چھپائی جا سکتی ہے اسے چھپانا چاہیے نہ جانے کب اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے۔

''شہباز مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' زرین نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''پلیز ان سے کہو ہمیں بے شک اس کمرے میں بند کر دیں لیکن یوں باندھ کر نہ لٹائیں۔''

''تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے؟''

''نہیں مجھے اس طرح بندھے ہونے سے وحشت ہو رہی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے چیخ چیخ کر روؤں۔''

''تو رو ممکن ہے اس کا کوئی اثر ہو جائے۔'' میں نے اسے اجازت دے دی۔ اس نے سچ مچ بلند آواز سے رونا شروع کر دیا اور ساتھ ہی چلانے لگی۔

''ہمیں کھول...... جانوروں کی طرح باندھ رکھا ہے...... تم لوگ سن رہے ہو...... کتو کمینو......'' وہ گالیوں پر اتر آئی تھی۔ دوسری خواتین کی طرح اس کی آواز بہت ہائی پچ تھی اور یقیناً دور تک سنائی دے رہی ہوگی۔ اگر چہ یہاں مائیک نہیں لگے تھے تب بھی اس کمرے سے باہر سنائی دے رہی ہوگی لیکن کسی طرف سے کوئی ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔ چند منٹ بعد زرین تھک گئی تھی۔ اب وہ خاموشی سے رو رہی تھی اور میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی میں چاہتا تھا اس کے دل کا غبار نکل جائے اور وہ پُر سکون ہو جائے۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد وہ چپ ہو گئی۔ پھر اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے چپ نہیں کرایا۔''

''میں چاہتا ہوں تم اپنا دل ہلکا کر لو ورنہ اس طرح سوچیں انسان کو پاگل کر دیتی ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''اب میں بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

''زرین اپنا حوصلہ بلند رکھو...... خدا نے چاہا تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے اور یہ ہمیں قید نہیں رکھ سکیں گے لیکن یہ کام اپنے وقت پر اور اس صورت میں ہوگا جب ہم حوصلہ رکھیں اور مایوسی کو اپنے قریب نہ آنے دیں۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔ ''میرا لباس کس نے تبدیل کیا ہے؟''

''ظاہر ہے ان ہی لوگوں نے۔'' میں نے جواب دیا اور کوشش کی کہ میرے لہجے سے اشتعال جھلکے تاکہ وہ سن رہے ہوں تو ان کو میرا لہجہ ایک باغیرت شوہر کا لگے۔ زرین کا شرم اور غصے سے برا حال ہو گیا اور اس بار اس نے ذرا زیادہ وزنی گالیاں ان لوگوں کو دی تھیں۔

''ذلیل، کمینے۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میرے ہاتھ آزاد ہوں اور یہ میرے سامنے آجائیں تو ان کی آنکھیں نوچ لوں۔''

''حوصلہ رکھو ہمیں بھی موقع ملے گا۔''

''شہباز یہ کیا چاہتے ہیں؟'' زرین کا لہجہ تشویش زدہ ہو گیا۔ ''انہوں نے کیوں اس طرح ہمیں باندھ رکھا ہے۔''

اس کا جواب تو تھا کہ شاید صورت سے نفیس نظر آنے والا یہ خبیث ڈاکٹر ہمیں کسی تجربے کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا لیکن میں نے زرین سے نہیں کہا۔ ''پتا نہیں ان کے کیا مقاصد ہیں۔''

''شہباز میری طبیعت جو خراب ہوئی تھی اس کی وجہ بھی یہی ڈاکٹر ہوگا میرا خیال ہے اس نے کھانے یا پینے کی کسی چیز میں مجھے کچھ دیا تھا جس سے میری طبیعت خراب ہو گئی اور اس کا مقصد بہر صورت ہمیں یہاں روکنا

تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے اور جب اس نے دیکھا کہ اس کا بھانڈہ پھوٹ گیا ہے تو یہ کھل کر سامنے آ گیا اور اس نے دھوکے سے ہمیں قابو کر کے اس طرح یہاں قید کر دیا ہے۔"

"کاش کسی طرح میرا ایک ہاتھ آزاد ہو جائے۔" اس نے پھر کوشش شروع کر دی۔ یہ بکل اور سوراخ رکھنے والی بیلٹیں تھیں۔ جو سخت موٹے اور مضبوط ترین چمڑے سے بنی تھیں ان کو کلائی کی موٹائی کے لحاظ سے بڑھایا جا سکتا تھا اور یہ بالکل سخت بھی نہیں ہوتی تھیں کہ دوران خون روک دیں۔ ان میں ذرا گنجائش رکھی جاتی تھی لیکن اس کے علاوہ یہ پھیلنے کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں رکھتی تھیں اور ان کے ساتھ کتنی زور آزمائی کر لی جاتی یہ ٹس سے مس بھی نہ ہوتیں۔

"زرین تمہارا ہاتھ زخمی ہو جائے گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "لیکن یہ ڈھیلی نہیں ہوں گی۔ انہوں نے یہ انتظام عارضی طور پر نہیں کیا ہے بلکہ یہ پہلے سے ہے۔"

زرین نے کوشش ترک کر دی اور اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "تمہارا مطلب ہے یہ ہم سے پہلے دوسرے لوگوں کو بھی یہاں قید کر چکے ہیں؟"

"ظاہر ہے ورنہ تم دیکھو یہ خاص طور سے مضبوط فولادی پائپس سے تیار کرائے بیڈ ہیں جو عام نظر نہیں آتے ہیں۔ ان پر بیلٹس لگانے کی جگہ ہے اور یہ خاص لوگوں کو بے بس کر کے لٹانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں اور یہ فوری نہیں بن سکتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس کا لہجہ ڈوبنے والا ہو گیا تھا۔ "اس کا مطلب ہے یہ مجرم ذہن لوگ ہیں جو انسانوں کو قید کر کے نہ جانے ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟"

میں خود کو ذہنی طور پر بدترین حالات کے لیے تیار کر رہا تھا لیکن یہ بات زرین کو نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ نازک عورت تھی اور ان حالات کی عادی بھی نہیں تھی اگر اسے احساس ہو جاتا کہ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک ہونے والا ہے تو وہ پہلے ہی حوصلہ ہار جاتی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے اچھی امید دلائی جائے۔ "بہتری کی امید رکھو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ہمارا سب سے بڑا اور واحد سہارا خدا ہے۔"

"ہاں ان حالات خدا کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"صرف ان حالات میں نہیں بلکہ کسی بھی حالت میں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "یہ بتاؤ تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟"

"کیوں کیا ہمارے لیے کھانا لگایا جانے والا ہے؟" اس نے طنز کیا۔

"کھانے کا تو نام مت لو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن تم نے محسوس نہیں کیا ہم نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اس کے باوجود مجھے بھوک نہیں لگ رہی ہے۔"

اس نے غور کیا۔ "ہاں بھوک تو مجھے بھی نہیں لگ رہی ہے۔ اگر ہم چند گھنٹے بھی بے ہوش رہے ہیں تب بھی ہم کو بھوک تو لگنا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''ممکن ہے ہمیں بے ہوشی کے دوران طاقت کی کوئی دوائی دی گئی ہو۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''اس وجہ سے ہمیں بھوک اور پیاس محسوس نہ ہورہی ہو۔''

''اس مہربانی کی وجہ؟''

''اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اگر ہمیں باقاعدہ خوراک دی جائے تو واش روم کا مسئلہ بھی پیدا ہوگا اور کھانا کھلانے کے لیے بھی کھولنا ہوگا جب یہ کسی صورت ہمیں کھولنا نہیں چاہتے ہیں۔ انجکشن یا کسی اور ذریعے سے طاقت کی دوا دے کر انہوں نے یہ مسئلہ حل کرلیا ہے اگر ہم ان سے پانی مانگیں گے تو یہ پانی بھی نہیں دیں گے۔''

''پانی مانگنا تو الگ رہا یہ ہماری بات ہی نہیں سن رہے ہیں۔''

''دو گھنٹے پہلے ڈاکٹر آیا تھا اور اس نے کہا ہے کہ اس کا مقصد ہمیں نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ جلد ہمیں پتا چل جائے گا کہ اس نے ہمیں یہاں کیوں قید کر رکھا ہے۔''

زرین کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''شہباز مجھے لگ رہا ہے تم اس مسئلے کو بہت کم کر کے دکھا رہے ہو ورنہ میرے اندر سے کوئی کہہ رہا ہے کہ ہمارے ساتھ بہت خوفناک بات ہونے والی ہے۔''

''فی الحال اس مسئلے پر مت سوچو کیونکہ ہم آنے والے وقت سے بے خبر ہیں اور اس کے بارے میں جتنا سوچیں گے ہمارا دماغ اتنا ہی الجھتا جائے گا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہے اس میں زیادہ دماغ مت کھپاؤ۔''

''کیا کروں اس حالت میں ایسی ہی سوچیں آسکتی ہیں۔''

''پھر بھی اپنے ذہن کو قابو میں رکھو۔''

''گھر والے ہمیں تلاش کررہے ہوں گے؟'' اس نے عبداللہ یا کسی کا نام لیے بغیر کہا۔

''بالکل وہ ہماری تلاش جاری رکھے ہوں گے اور مجھے یقین ہے جلد یا بدیر وہ یہاں آنے میں بھی کامیاب ہوجائیں گے۔''

زرین نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ یہاں بھی آسکتے ہیں؟''

''تم جانتی تو ان کو...... وہ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''اور ایک بار وہ یہاں پہنچ تو دیکھ لینا ان سب کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دیں گے۔''

زرین کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اس نے کہا۔ ''تم ایسی باتیں کیوں کررہے ہو ان کو بھلا کیا پتا؟''

''تم دیکھ لینا۔'' میں نے یقین بھرے انداز میں کہا۔ میری نظر دروازے کی طرف تھی اور میری توقع کے مطابق کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر اندر آیا۔ اسے دیکھتے ہی زرین ابل پڑی تھی اس نے بے نقط سناتے ہوئے کہا۔

''ذلیل شخص تمہاری جرأت کیسے ہوئی ایک اجنبی عورت کا لباس تبدیل کرنے کی؟''

''خاتون...... خاتون۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''مجبوری تھی لیکن ہم نے تمہیں ایک مریض کے طور پر

لیا ہے اور یقین کرو تمہیں اس حوالے سے ذرا بھی نقصان نہیں ہوا ہے۔"

"نقصان نہیں ہوا ہے۔" زرین زہریلے انداز میں بولی۔ "ایک عورت کو بے لباس کر کے کہتے ہو کہ اسے کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔"

ڈاکٹر نے شانے اچکائے۔ "مرضی تمہاری..... مت یقین کرو۔ فی الحال تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ اب کیا ہوگا؟"

زرین کی زبان رک گئی تھی اور اس نے خوف زدہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ "کیا کرو گے تم لوگ ہمارے ساتھ؟"

"اس کا جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔" وہ بولا اور اس نے جھک کر زرین کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تمہارا علاج کر دیا گیا ہے اور اب تم بالکل ٹھیک محسوس کر رہی ہو گی؟"

"مجھے بیمار بھی تم نے کیا تھا۔"

"مجھے اعتراف ہے۔" وہ بولا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ "تمہارے ایسے کون سے ساتھی ہیں جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ سکتے ہیں؟"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہمارے کچھ ساتھی ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔" میں نے انجان بن کر کہا۔

"میں نے تمہارے منہ سے سنا ہے۔"

"یعنی جب میں کہہ رہا تھا تو تم دروازے کے باہر موجود تھے۔" میں نے مزید بھول پن سے پوچھا تو وہ چڑ گیا۔

"تم اتنے بے وقوف نہیں ہو جتنا کچھ خود کو ظاہر کر رہے ہو۔"

"او کے تم بتا دو تم کو کس طرح پتا چلا؟"

"یہاں خفیہ مائیک لگے ہیں اور تمہارے سانس لینے کی آواز بھی ہم سن سکتے ہیں۔"

"یعنی ہم میں سے کوئی سانس روک لے تو تم سمجھ جاؤ گے کہ وہ اس دنیا سے گزر گیا ہے۔" میں نے ا‌س کر کہا۔ "ڈاکٹر تمہارے ذہین ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا اور وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے اشتعال دلا رہا ہوں۔ اس نے میری طرف جھکتے ہوئے ذرا پھنکار کر کہا۔ "تم بہت شوخ ہو رہے ہو اور بالکل بھول گئے ہو کہ اس وقت تم میرے قبضے میں بالکل بے بس ہو میں تم دونوں کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔"

"میں ڈر گیا۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ اگر میں شوخی نہ دکھاؤں تو کیا تب ہمارے خلاف کچھ نہیں کرو گے اور ہمیں جانے کی اجازت دے دو گے؟"

"نہیں یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔ "لیکن تمہاری زبان آوری کا صلہ تمہیں ل اضافی تکلیف کی صورت میں مل سکتا ہے۔"

زرین خوف زدہ ہو گئی۔ "شہباز خدا کے لیے اس کے منہ مت لگو۔"

میں زرین کا خوف سمجھ رہا تھا۔ وہ عورت تھی اور اسے خوف تھا کہ یہ لوگ کہیں اس سے کوئی زیادتی نہ

جائیں۔ میں اور وہ بالکل بے بس تھے۔ اگر وہ کچھ کرنے پر اتر آتے تو ہم ان کو نہیں روک سکتے تھے۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا۔ ''اگر ہم ان کے منہ نہ لگیں تب بھی انہوں نے ہمارے خلاف جو کرنا ہے وہ تو کریں گے۔''

''کرنے دو۔'' زرین نے التجا کی۔ ''لیکن ابھی اس کے منہ مت لگو۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر میں اپنی بیوی کی بات نہیں ٹال سکتا اس لیے میں نے جو جملے بازی کی ہے اسے ریکارڈ سے حذف کر سکتے ہو۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر جھٹکے سے مڑ کر چلا گیا۔ شاید وہ اس رویے کا عادی نہیں تھا جو میں نے اس کے ساتھ برتا تھا وہ بھول گیا تھا کہ مجھ سے میرے ساتھیوں کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ اس کی زبان سے اگلوا سکوں کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا میرا خیال تھا وہ اشتعال میں آ کر کہہ جائے گا لیکن اس نے اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں مائیک لگے تھے اور یہاں بولا جانے والا ایک ایک لفظ کہیں اور سنا جا رہا تھا۔ البتہ ڈاکٹر نے کیمرے کا ذکر نہیں کیا تھا تو اس کا امکان تھا کہ یہاں کیمرے نہیں تھے۔ اگر ہم خاموشی سے کچھ کرتے تو ان کو خبر نہ ہوتی۔ اگرچہ ابھی ہم کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے چرمی بیلٹوں اور ان فولادی پائپوں کا جائزہ لیا جن سے یہ بیلٹس منسلک تھیں۔ پاؤں والی بیلٹس اس طرف فولادی پائپ سے منسلک تھی جب کہ ہاتھوں والی بیلٹس دائیں بائیں بستر کے ساتھ لگے فولادی پائپوں سے بندھی ہوئی تھیں اور ان کو اوپر آنے سے روکنے کے لیے اوپر اور نیچے کے پائپوں میں چھوٹے پائپ جوڑے ہوئے تھے۔ اس لیے میرے یا زرین کے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہم ہاتھ اوپر لا سکیں۔ یہ اہتمام شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ کوئی منہ کی مدد سے بیلٹ کے بکل کا ہک نکالنے کی کوشش نہ کرے۔ گویا انہوں نے ہر زاویے سے اس بات کا سدِباب کر لیا تھا کہ کوئی اس بیڈ کی قید سے آزاد نہ ہو سکے۔ صرف ہمارے سر آزاد تھے اور وہ بھی کسی حد تک اوپر اٹھانے کے لیے۔

''شہباز۔'' زرین نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا یہ ہم پر ڈاکٹری کا کوئی تجربہ کرے گا؟''

''کیا کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کہانیوں میں پڑھا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس قسم کے نفسیاتی مریض ڈاکٹر ہوتے ہیں جو زندہ انسانوں پر تجربات کرتے ہیں لیکن دیکھا پہلی بار ہے۔''

زرین ڈر گئی۔ ''یعنی یہ ہم پر تجربہ کر سکتا ہے؟''

''ہمیں بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ''ممکن ہے اس کے مقاصد کچھ اور ہوں۔''

''کہیں یہ مرشد......''

''نہیں۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میرا نہیں خیال کہ اس کا تعلق اس سے ہے اور اب تم چپ کر کے آرام کرو۔''

زرین سمجھ گئی کہ اس کی بے احتیاطی مجھے پسند نہیں آئی ہے۔ وہ مرشد کا ذکر کرنے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اس

کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن وہ بار بار ہم سے اس کا نام سنتا تو شاید اسے تشویش لاحق ہو جاتی۔ زرین نے معذرت خواہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہوگئی۔ مجھے ہوش میں آئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور مجھے ڈارٹ گن کے ذریعے جو دوا دی گئی تھی اس کا اثر اب ختم ہو رہا تھا تو جسم سے سن کرنے والی سکون آور کیفیت بھی ختم ہو رہی تھی درد جاگ اٹھا تھا یہ درد دو جگہوں پر تھا ایک پشت میں جہاں ڈارٹ آ کر لگی تھی اور دوسرا بازو میں جہاں یقیناً انجکشن لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زرین کو یہی دوا دی گئی تھی یا اسے کسی عام خواب آور دوا کے زیر اثر رکھا گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں بازو میں کہیں تکلیف ہو رہی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پہلے نہیں ہو رہی تھی لیکن اب ہونے لگی ہے جیسے بازو میں انجکشن لگایا گیا ہو۔''

''میری بھی یہی کیفیت ہو رہی ہے۔''

''اس سے مجھے لگ رہا ہے کہ یہ ہم پر کوئی تجربہ کرنے والا ہے ورنہ اسے ہمارا اتنا خیال رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

زرین کا خیال درست لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ ہم کمزور نہ ہوں۔ بلکہ سچی بات ہے مجھے اپنے اندر اضافی توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید وہ ہمیں طاقتور دوا انجکشن کے ذریعے دے چکا تھا۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ہم جسمانی طور پر کمزور نہ ہوں اور وہ ہم پر کوئی تجربہ کر سکے۔ پتا نہیں ہم کس جنونی کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کمرے میں آیا۔ وہ ایک ٹرالی دھکیل کر لایا تھا جس پر انجکشن اور مختلف چیزیں رکھیں تھیں۔

''یہ کس لیے لائے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے فکر ہوئی تھی اور زرین بھی خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔

''تم دونوں کو خوراک دینی ہے۔'' اس نے ایک بڑے سائز کی شیشی اٹھائی جس میں زرد سیال بھرا ہوا تھا۔ ''اس کا ایک پچاس ملی لیٹر کا انجکشن تمہیں آنے والے بارہ گھنٹے کے لیے بھوک پیاس کی ضرورت سے بے نیاز کر دے گا۔''

''ہم یہ انجکشن نہیں لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی نہیں لوں گی۔'' زرین بولی۔

''تم انکار نہیں کر سکتے ہو۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''لیکن پہلے مجھے تمہارا بلڈ سیمپل لینا ہے۔'' اس نے ایک خالی سرنج اٹھائی۔

میں کسمسایا۔ ''تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں نے کہا نا تمہیں مجھ سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''بھاڑ میں گئی تمہاری یقین دہانی۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''تم میرے جسم سے ایک قطرہ خون نہیں نکال سکتے ہو۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر زرین کی طرف بڑھا۔ وہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر سہم کر سمٹنے لگی لیکن

بندھے ہونے کی وجہ سے اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے آرام سے آدھی آستین کے نیچے سے اس کا سنہری بازو پکڑا اور سرنج کی سوئی اس کی ابھری رگ میں داخل کر دی۔ اس نے سسکی لی لیکن مزاحمت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر نے آدھی سرنج بھر لی تھی۔ پھر اس نے سرنج واپس کھینچ کر اس کا بازو روئی سے صاف کر کے روئی کو کچھ دیر تک دبا کر رکھا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔''

''میں اتنی آسانی سے تمہیں اپنے جسم سے خون نہیں نکالنے دوں گا۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''اگر آسانی سے نہیں دو گے تو مشکل سے دو گے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم پسند کرو گے میں تمہاری بیوی کو بے لباس کر دوں؟''

''نہیں۔'' زرین چلائی۔ ''اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو.....''

''تو تمہارا شوہر توپ چلا دے گا اور مجھے اُڑا دے گا۔'' اس نے ہنس کر زرین کی بات کاٹی اور اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''ٹھیک ہے ذلیل آدمی تم جو چاہے کرو۔''

وہ میری طرف آیا۔ ''اب کی نا تم نے عقل کی بات ویسے مجھے خود بھی یہ دھمکی دے کر کوفت ہوئی ہے لیکن اس کام کے لیے تم نے مجھے مجبور کیا ہے۔''

''بہتر ہو گا تم اپنا کام کرو۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''فضول باتوں سے گریز کرو۔''

''تم میرے قبضے میں ہو اور تمہیں میری بات سننا ہو گی۔''

''بولتے رہو۔'' میں نے یوں کہا جیسے اسے بھونکتے رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر نس ابھاری اور ٹرالی سے دوسری سرنج اور روئی اٹھائی اس نے جگہ صاف کی اور پھر سرنج نس میں اتار دی۔ اس نے اتنا ہی خون نکالا جتنا کہ زرین کا نکالا تھا۔ اس نے دونوں سرنجیں ٹرالی پر برابر برابر رکھیں تھیں جس سرنج سے زرین کا خون نکالا تھا اس کے اندر سکشن ربڑ سیاہ رنگ کا تھا اور جس میں میرا خون تھا اس کا ربر سبز رنگ کا تھا۔ اس کے بعد اس نے طاقت والے انجکشن کی شیشی اٹھائی اور اسے ہلایا۔ پھر اس نے ایک اور سرنج لی اور چھوٹا انجکشن اٹھا کر اس کی سیل توڑی اور اس کی دوا سرنج میں بھر کر اسے طاقت کے انجکشن کی شیشی میں منتقل کر دیا۔ اس کے اوپر ربر کی مخصوص سیل تھی جس سے سرنج کی سوئی گزر جاتی ہے۔ اس نے سرنج خالی کر کے ایک بار پھر شیشی کو ہلایا اور پھر ایک بڑے سائز کی سرنج اٹھا کر دوا اس میں منتقل کرنے لگا۔ ساری دوا اس نے سرنج میں منتقل کر دی۔ اس کے بعد پہلے زرین کی طرف گیا اور سوئی اس کے بازو میں اتار دی یہ گوشت میں لگنے والا انجکشن تھا جو بہت تکلیف دیتا ہے اسی لیے زرین کی کراہ نکل گئی تھی۔ نصف سرنج اس کے بازو میں خالی کر کے اس نے سوئی نکال لی اور اس جگہ ایک چھوٹا سا ٹیپ لگا دیا تا کہ دوا دباؤ کی وجہ سے باہر نہ نکل جائے۔ وہ میری طرف آیا تو میں نے پوچھا۔

''تم نے طاقت کے انجکشن میں دوسری دوا کون سی ڈالی ہے؟''

''یہ نیند کی دوا ہے۔ تمہارا سو جانا بہتر ہے ورنہ یہ انجکشن در حقیقت بہت تکلیف دیتا ہے اور یہ تکلیف تین چار گھنٹے سے پہلے نہیں جاتی ہے۔ اسے برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا ہے تو بہتر ہے یہ وقت سو کر گزار لیا

جائے۔"

"اس طرح تمہیں بھی نگرانی کے چکر سے نجات مل جائے گی۔" میں نے طنز کیا۔

"چلو ایسا ہی سمجھ لو۔" اس نے مسکرا کر کہا اور سوئی میرے بازو کے پٹھے میں اتاری۔ بڑی سائز کی سوئی کی تکلیف خاصی تھی لیکن جب اس نے دوا انجکٹ کرنا شروع کی تو کوشش کے باوجود میں اپنی کراہ نہیں روک سکا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈاکٹر نے دوا نہیں کوئی زہر انجکٹ کر دیا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ زرین کس طرح یہ تکلیف برداشت کر رہی تھی لیکن میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر ڈھلکا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے تصدیق کی۔ "وہ سو چکی ہے۔ یہ دوا صرف ایک منٹ میں اثر کرتی ہے۔"

جب تک ڈاکٹر نے پوری سرنج میرے بازو میں خالی کی تو میرا سر چکرانے لگا تھا اور آخری احساس یہ تھا کہ وہ انجکشن والی جگہ پر ٹیپ لگایا جا رہا تھا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ اگلی بار میں جاگا تو وہی کمرہ تھا اور وہی منظر تھا حد یہ کہ زرین اسی طرح سو رہی تھی۔ شاید میں پہلی بار بھی اس کے مقابلے میں جلد ہوش میں آ گیا تھا لیکن میں نے آنکھیں کھولنے یا کوئی آواز نکالنے سے گریز کیا جس سے ان کو پتا چل جائے کہ میں ہوش میں آ گیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی ہماری دیکھ بھال کے لیے آتا ہے اس لیے دل پر جبر کر کے ساکت پڑا رہا تھا جیسے بدستور سو رہا ہوں۔

اس طرح ساکت لیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ میرا اندازہ تھا لیکن یہ کام دشوار ہوگا لیکن اتنا دشوار ہوگا یہ مجھے اُس روز پتا چلا تھا۔ ہوش میں ہوتے ہوئے خود کو بے ہوش ظاہر کرنا بہت مشکل ثابت ہوا تھا اور وہ بھی ایک ایسے کمرے میں جہاں زرین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ ہلوں لیکن دل پر جبر کر کے لیٹا رہا۔ وقت رو رو کر گزر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں بے ہوشوں کی سی طرح گہرے سانس لینے لگا۔ اگرچہ خدشہ تھا کہ ڈاکٹر پہلے کی طرح نبض دیکھ کر جان جائے گا کہ میں بے ہوش نہیں ہوں۔ پھر بھی میں بے ہوشی کی اداکاری جاری رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی اس طرح مجھے کچھ پتا چلے گا کہ ہمیں یہاں اس طرح قید کیوں رکھا گیا تھا اور ہم پر کیا تجربہ کیا جانے والا تھا۔ قدموں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ آنے والے دو ہیں۔ پہلے مجھے شیف کی آواز آئی۔ "کیا یہ بے ہوش ہیں؟"

"ہاں ابھی دوا کا اثر ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"لیکن یہ پہلے بھی ہوش میں آ گیا تھا۔" شیف بولا اس کا اشارہ یقیناً میری طرف تھا۔

"اس وقت دوا ڈارٹ گن سے دی گئی تھی۔ تم جانتے ہو ڈارٹ گن سے دوا پوری طرح جسم میں انجکٹ نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اسے وقت سے پہلے ہوش آ گیا تھا۔"

"ڈارٹ گن میں دوا معمول سے زیادہ ہوتی ہے۔" شیف نے اصرار جاری رکھا۔ اگر وہ ڈاکٹر کا ماتحت بھی تھا تو خاصا منہ چڑھا ماتحت تھا میں نے دل ہی دل میں اسے سنائیں وہ ڈاکٹر کا ذہن مشکوک کر رہا تھا کہ میں ہوش میں آ گیا تھا۔ "انجکشن میں نپی تلی مقدار دی جاتی ہے۔"

"یہ بات میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔" ڈاکٹر نے ناگواری سے کہا۔ "دو گھنٹے میں ان کی بلڈ رپورٹ آ جائے گی اس کے بعد ان کو چیمبر میں منتقل کرنا ہوگا۔"

''وہ منتقلی ہوش میں ہوگی یا اسی حالت میں؟''

''میرا خیال ہے اسی حالت میں بہتر رہے گی۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔''نہ جانے کیوں مجھے یہ آدمی شہباز خطرناک لگ رہا ہے۔''

''عام سا آدمی ہے...... ممکن ہے کسی طرح جرم سے تعلق ہو یا کوئی دشمنی کا چکر ہو اس وجہ سے مسلح پھر رہا ہو لیکن آپ نے دیکھا تھا کتنی آسانی سے میرے قابو میں آ گیا تھا۔''

''ڈارٹ گن سے تو تم ہاتھی بھی قابو کر سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے طنز کیا تو وہ کھسیا کر چپ ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شیف ڈاکٹر کا ماتحت ضرور تھا لیکن اس کی بھی کوئی حیثیت تھی۔ اس نے موضوع بدل دیا۔

''آپ کا کیا خیال ہے ان کی بلڈر پورٹ ٹھیک ہو گی؟''

''جیسی ان کی عمومی صحت ہے اس لحاظ سے تو ٹھیک ہونی چاہیے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''فرض کریں ایسا نہیں ہوا تو؟''

''اگر ایسا نہیں ہوا تو تمہارا کام بڑھ جائے گا۔'' ڈاکٹر کا لہجہ سرد ہو گیا۔''ان کو ڈسپوز آف کرنا ہوگا۔''

میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ ہمیں ٹھکانے لگانے کی بات کر رہا تھا۔ یعنی وہ ہمیں کسی صورت چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ شیف بولا۔''کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ تو بعد میں بھی کرنا ہوگا...... آدمی اتنی آسانی سے نہیں ملتے ہیں...... شاہ صاحب بھی آنے والے ہیں۔ ان کو پروگریس چاہیے۔''

''اس معاملے میں ہم مجبور ہیں پچھلے تین تجربات ناکام گئے ہیں مطلوبہ صحت کے لوگ نہیں ملے اور جو دو ملے تھے ان پر تجربہ ناکافی رہا ہے۔''

میری خواہش تھی کہ وہ تجربے کی نوعیت یا اس شاہ صاحب پر روشنی ڈالیں جس کا ذکر شیف نے کیا تھا لیکن انہوں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور اپنے کچھ معاملات پر بات کرنے لگے اور اس جگہ کے انتظامی امور پر تبادلہ خیال کیا جانے لگا۔ شیف کسی سامان کے بارے میں بتا رہا تھا جس کی عنقریب یہاں ڈلیوری کی جانے والی تھی۔ ڈاکٹر اسے کہہ رہا تھا کہ وہ سارا کام اپنی نگرانی میں کرائے کیونکہ آنے والا سامان بہت قیمتی اور حساس نوعیت کا ہے۔''پچھلی مرتبہ تمہاری لاپروائی کی وجہ سے کیمیکلز کے دو قیمتی ڈرم ضائع ہو گئے تھے۔''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ لانے والے اس قدر احمق ہوں گے کہ ڈرم اتار کر سیدھا کھڑا کرنے کے بجائے ان کو لٹا دیں گے اوپر سے گیٹ کے گارڈ نے گیٹ بند ہی نہیں کیا تھا ڈرم لڑھک کر باہر جا گرے۔'' شیف نے اپنی صفائی پیش کی۔

''اسی وجہ سے کہہ رہا ہوں بے شک کئی گھنٹے لگ جائیں لیکن ایک ایک چیز اپنی نگرانی میں اتروا کر اندر پہنچانا۔ اپنی غیر موجودگی میں سب کو سختی سے منع کر دینا کہ کوئی چیز چھیڑنے سے گریز کریں۔''

''ٹھیک ہے جناب میں ایسا ہی کروں گا۔'' شیف نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔''یہ بتائیں کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''بلڈر پورٹ آتے ہی ان کو چیمبر میں منتقل کر دو تاکہ کام شروع کیا جا سکے۔'' ڈاکٹر نے اسے حکم دیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے تھے۔ ان کے کہے ہوئے تمام الفاظ میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے تھے اور میں ان کا

تجزیہ کررہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی محفوظ جگہ منتقل کر کے مجھے اور زرین کو کسی تجربے کا نشانہ بنایا جانے والا تھا۔ چیمبر سے مراد ایک ایسی جگہ جگہ یا خانہ ہے جس میں باہر سے کوئی چیز اندر نہ جا سکے اور اندر سے کچھ باہر نہ آ سکے۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے کچھ اور لوگوں کو پکڑ کر اسی طرح اپنے غیر انسانی تجربے کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی لیکن ان کی بلڈ رپورٹ ٹھیک نہیں آئی تھی اس لیے ان کو مار کر کہیں دفن کر دیا گیا۔ ان کو شاید دو افراد اپنے مطلب کے ملے تھے لیکن وہ تجربے کے لیے ناکافی تھے۔ اب ہماری باری تھی۔

ایک اور اہم بات کسی شاہ صاحب کا ذکر تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر توفیق ہی اصل آدمی ہے اور وہی سب کچھ کر رہا ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی شاہ صاحب بھی ہے اور وہی اس مکروہ کھیل کا اصل کردار ہے۔ ہمارے ملک میں سائنسی اور خاص طور سے طبی تحقیق کا یہ حال ہے کہ اعلیٰ درجے کی یونیورسٹیز اور تجربہ گاہوں میں بھی کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ نجی طور پر تحقیق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس تحقیق کے لیے نہ تو سرمایہ میسر تھا اور نہ ہی اس کا آگے کوئی صلہ ملنے کا امکان ہوتا ہے لیکن اس جگہ یہ کام کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر کو کہیں سے سرمایہ مل رہا تھا۔ وائرس پر تجربات کرنا سستا کھیل نہیں ہے اس میں کروڑوں نہیں اربوں روپے درکار ہوتے ہیں۔ شاید ڈاکٹر کو کہیں باہر سے پیسہ مل رہا تھا تب ہی تو یہ کام ہو رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں کیمرے لگے ہیں یا نہیں۔ میں اب تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے جسم کو حرکت دی اور آنکھیں کھول کر دیکھا۔ زرین بدستور بے ہوشی والی کیفیت میں گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کا سینہ ڈوب ابھر رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ لوگ انسانیت کے مجرم سہی لیکن انہوں نے اب تک زرین کو غلط نظر سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی غلط حرکت کی تھی۔ ایسا شاید اس تجربے کے لیے بھی تھا جس میں انہیں مکمل طور پر صحت مند اور فٹ افراد درکار تھے۔ اگر وہ زرین کے ساتھ کوئی زیادتی کرتے تو اسے جسمانی اور ذہنی نقصان ہو سکتا تھا اور یہ بات ان کے تجربے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی۔ بہرحال وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ زرین بچی ہوئی تھی۔

مجھے اس مظلوم عورت کی تقدیر پر افسوس ہو رہا تھا جس نے کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ جوان ہوتے ہی مرشد جیسے درندے کے ہتھے چڑھ گئی اور اب تک اس کی قید میں تھی۔ اس کی قید سے چھوٹی تب بھی اس کے مصائب کم نہیں ہوئے تھے۔ مرشد کے آدمیوں نے اسے بے آبرو کیا اور اب بھی وہ میرے ساتھ اس مشکل میں موجود تھی۔ اگرچہ یہاں وہ اکیلی نہیں تھی جو مجھ پر گزرتی وہی اس پر گزرتی۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ اس مشکلات میں اس کا حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ صرف اس لیے یہاں پھنس گئی تھی کہ میرے ساتھ تھی۔

میں نے اپنا دایاں ہاتھ کھینچ کر چمڑے کی بیلٹ سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش میں پہلے بھی کر چکا تھا اور اسی وقت مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام ممکن نہیں ہے لیکن اب میں اسے ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ کو اوپر تک لانے سے روکنے کے لیے فولادی پائپوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا فولاد کا ٹکڑا رکاوٹ کے طور پر لگایا گیا تھا اور یہ ٹکڑا مجھے کمزور لگ رہا تھا۔ میں بیلٹ کے فولادی کڑے کو کھینچ کر اس ٹکڑے تک لایا اور پھر زور لگایا۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ مناسب زاویہ نہیں بن رہا تھا میں بیڈ پر چت لیٹا ہوا تھا اور جب میں نے ہاتھ اوپر کھینچنے کے لیے زور لگایا تو ردِعمل میں میرا جسم نیچے کی طرف جانے لگا اور میں سرک کر وسط بیڈ تک آ گیا۔

بیڈ کوئی ساڑھے چھ فٹ لمبا تھا اور پاؤں کی طرف والے فولادی پائپ مزید دور تھے جب میں نے ان پر پاؤں ٹیک کر خود کو مزید نیچے جانے سے روکا تو پائپوں کے درمیان میں لگا ٹکڑا تقریباً میری کلائی کے ساتھ آ گیا تھا اور اس صورت میں ہاتھ کو اوپر کی طرف کھینچنا بہت ہی دشوار تھا۔ لمبائی کے تناسب سے بیڈ کی چوڑائی زیادہ یعنی پانچ فٹ تھی اس میں چار فٹ کا گدا تھا اور پھر چھ چھ انچ کے خلا کے بعد فولادی پائپ تھے۔ اگر چہ اس طرح قید کرنے والوں کو انجکشن اور دوسری طبی امداد دینے میں دشواری ہو سکتی تھی کیونکہ اسپتال میں بیڈ بس اتنے چوڑے ہوتے ہیں کہ مریض ان پر آرام سے لیٹ سکے اور ان کو آسانی سے طبی امداد دی جا سکے لیکن یہاں مریضوں کا علاج نہیں کرنا تھا بلکہ ان کو قید رکھنا مقصود تھا۔ اس لیے بیڈ کو جان بوجھ کر چوڑا رکھا گیا تھا تاکہ باندھا جانے والا شخص منہ سے اپنے ہاتھ کی بیلٹ کھولنے کی کوشش نہ کرے۔

اس کے باوجود میں نے یہ کوشش کی تو میرے لمبے قد کی وجہ سے منہ بیلٹ کے بکل کے پاس تو پہنچ گیا تھا لیکن میں دانتوں سے بیلٹ کو گرفت نہیں کر سکا تھا۔ اس دوران میں یہ انکشاف ہوا کہ بیڈ کے وسط میں آ جانے کے بعد میں اب اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا اگر چہ اس طرح میرے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے لیکن بہر حال میں بیٹھ گیا تھا۔ مگر بیٹھ کر بھی کوشش کر لی پر بات نہیں بنی۔ اتنی دیر میں کوئی نہیں آیا تھا۔ میرے کان دروازے کی طرف سے آنے والی آہٹوں پر مرکوز تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ بیڈ پر کوئی چادر نہیں تھی ورنہ اس جدوجہد میں وہ سمٹ چکی ہوتی اور کوئی آ جاتا تو پھر میں ساکت ہو کر لیٹتا تب بھی ان کو معلوم ہو جاتا کہ میں ہوش میں ہوں۔ میں نے انتہائی حد تک کوشش کر لی لیکن میرا منہ بکل کو نہیں چھو سکا تھا یہ تو دو چار ہاتھ لب بام سے بھی کم تھا۔ ایک دو انچ کا فاصلہ رہ جاتا تھا میرے منہ اور بکل کے درمیان۔

جب میں تھک گیا تو لیٹ گیا۔ بکل کھولنے کی کوشش کے دوران میں خیال رکھا کہ آواز نہ ہو۔ مگر کچھ نہ کچھ آوازیں پیدا ہوئی تھیں۔ خاص طور سے پائپ میں پڑے کے حرکت کرنے سے آہنی آواز سے پیدا ہوتی رہی تھی۔ اس کے باوجود ان کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے مائیک کے بارے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ مائیک اتنا طاقتور نہیں تھا کہ معمولی آواز بھی کیچ کر لیتا۔ وہ صرف انسانی آوازوں کو واضح طور پر سنواتا ہوگا۔ دوسرے انسان بے ہوشی یا نیند کے دوران میں بھی تھوڑی بہت حرکت کرتا ہے اور اس دوران میں آہنی کڑے کی آواز پیدا ہوتی ہوگی۔ شاید اس لیے بھی انہوں نے کڑا کھنکنے کی آواز پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں تھا۔

ان لوگوں کا منصوبہ سننے کے بعد میرے اندر بے چینی سے بھر گئی تھی۔ وہ ہمیں کسی غیر انسانی تجربے کی بھینٹ چڑھانے جا رہے تھے اور اگر میں اسی طرح پڑا رہتا تو وہ کامیاب ہو جاتے۔ اس بات کا پورا امکان تھا کہ اس تجربے کی کامیابی یا ناکامی کی صورت میں ہمیں موت ملے گی۔ اگر اس آنے والی موت سے بچنا تھا تو کچھ نہ کچھ کرنا تھا اس قید سے آزاد ہونا تھا۔ میں نے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر کوشش شروع کی۔ میں الٹے ہاتھ والی بیلٹ کو جھٹکے دے دے کر ڈھیلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ میرا منہ دائیں طرف کی بیلٹ تک پہنچ جائے لیکن یہ نہایت اعلیٰ درجے کا سخت چمڑہ تھا جس میں پھیلنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ الٹا میرا ہاتھ اس کی رگڑ سے زخمی ہونے لگا تھا۔ مگر مجال ہے جو بیلٹ کی گرفت ذرا سی بھی نرم پڑی ہو۔ اب میں بستر پر یوں بیٹھا تھا کہ میرے

دونوں ہاتھ دائیں بائیں بندھے ہوئے تھے اور پاؤں سامنے بندھے ہوئے تھے۔

گزشتہ چوبیس گھنٹے میں میرے منہ میں خوراک کا ایک ذرہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں گیا تھا۔ اس کے باوجود نہ تو مجھے بھوک لگ رہی تھی اور نہ ہی پیاس کا خاص احساس تھا۔ بس معمولی سا گلا خشک ہو رہا تھا اور پیاس ناقابلِ توجہ تھی۔ انجکشن سے بھوک کا مسئلہ حل ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن پیاس کو یہ کس طرح ختم کرسکتا تھا کیونکہ جسم معمول کے مطابق پانی استعمال کرتا ہے اور گردے خاص طور سے سب سے پانی استعمال کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے ڈاکٹر نے کوئی ایسی دوا انجکشن میں شامل کی ہو جس سے گردے اپنا فنکشن روک دیں اور انسان کو دیر تک پیاس محسوس نہ ہو۔ ورنہ نارمل میں انسان کو اتنی دیر میں پیاس لگ ہی جاتی ہے بے شک موسم سرد کیوں نہ ہو جب کہ یہاں تو موسم سرد بھی نہیں تھا۔

میں کوئی تدبیر سوچ رہا تھا کہ کسی طرح ایک ہاتھ کی بیلٹ کھل جائے۔ ان لوگوں کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہمارے خون کی رپورٹ دو گھنٹے میں آجائے گی اور اس کے بعد ہماری قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ گویا اب ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ مجھے جو کرنا تھا اسی ایک گھنٹے میں کرنا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی اور اپنا سارا زور لگا دیا۔ میرا بایاں ہاتھ بالکل پیچھے چلا گیا تھا اور میرا منہ دائیں ہاتھ کے بکل تک رسائی کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ اس بار میرے دانتوں نے بکل کو چھو لیا تھا لیکن اسے گرفت میں نہیں لے سکے تھے۔ میں نے خود کو اتنا کھینچ لیا تھا کہ جب میں نے سیدھا ہونا چاہا تو کسی اسپرنگ کی طرح واپس گیا اور سنبھلتے ہوئے بھی سجدے کے انداز میں اپنے پیروں پر گر گیا۔ میں پہلے ہی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا اس لیے منہ سیدھا پیروں سے لگا اور تب مجھے اپنی عقل پر ماتم کرنا پڑا۔

میں ہاتھ کے بکل تک پہنچنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا جب کہ پیر کے بکل تک پہنچنے کا مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا جو میرے منہ کے بالکل سامنے تھا۔ کسی قدر دقت سے سہی لیکن میرا منہ یہاں تک جا تو رہا تھا۔ میں نے جھک کر دانت سے پکڑ کر رنگ سے بیلٹ کو نکالنے کی کوشش کی اور تھوڑی میں اسے نکال لیا اب اگلا مرحلہ اسے بکل سے نکالنے کا تھا اور یہ مشکل کام تھا۔ میں نے کوشش شروع کر دی۔ بیلٹ کے سرے کو دانتوں سے پکڑ کر اوپر کھینچنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ ایک بار بکل کا ہک سوراخ سے نکل جائے تو وہ دوبارہ سوراخ میں نہ جانے پائے۔ بالآخر میں اس کوشش میں بھی کامیاب رہا اور ہک نکل گیا۔ اب آخری مرحلہ بیلٹ کو بکل سے نکالنے کا تھا ہک نکل جانے کے بعد یہ کام آسان ثابت ہوا تھا۔

دس منٹ کے اندر میں اپنے دونوں پاؤں آزاد کرا چکا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں آزاد ہونے میں کامیاب رہا تھا ابھی ہاتھ آزاد کرانے تھے اور یہی اصل مرحلہ تھا۔ منہ سے تو ہاتھوں کی بیلٹ کو ابھی کھولنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے بیڈ کی ساخت پر غور کیا پھر ہاتھ سے ٹٹول کر گدے کی موٹائی دیکھی۔ یہ کوئی چار انچ موٹا اور بہت سخت گدا تھا اور اس کے نیچے سہارا دینے کے لیے فولادی پٹیاں لگی تھیں۔ گدا بستر سے الگ کیا جا سکتا تھا۔ اگر گدا الگ ہو جاتا تو میں نیچے ہونے کی وجہ سے اپنا منہ بکل تک لے جا سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنے نیچے سے گدا کیسے نکالوں۔ یہ کام بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ اس کی موٹائی اتنی تھی کہ اسے موڑنا بھی ممکن نہیں تھا۔

ذرا غور کرنے کے بعد میں نے پاؤں والی طرف سے اسے ہاتھوں سے ممکنہ حد تک اٹھایا لیکن اس سے

زیادہ ممکن نہیں تھا کیونکہ گدے پر تو میں خود بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق ہماری بے ہوشی کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ یعنی زرین کو ابھی ہوش میں آنے میں اتنا وقت تھا اور میں اس سے دو گھنٹے پہلے ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ میں اسے آواز نہیں دے سکتا تھا ورنہ وہ لوگ سن لیتے اور جان جاتے کہ میں وقت سے پہلے ہوش میں آ گیا ہوں۔ اب میرے پاس انتظار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا زرین ہوش میں آتی تب ہی کچھ کیا جا سکتا تھا۔

مجھے ایک خیال آیا اور میں نے بیٹھے بیٹھے بیڈ کو جھٹکا دیا تو وہ اس طرح ہلا جیسے اس کے نیچے پہیے ہوں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ تمام پہلوؤں کا خیال رکھنے والے اس معاملے میں مار کھا گئے تھے انہیں اپنے قیدیوں کو پہیوں والے بستر نہیں دینے چاہیے تھے۔ میں نے زرین کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اسے پکارا۔ ''زرین ہوش میں آؤ پلیز اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے ہوش میں آؤ۔''

زرین بے ہوش تھی یا گہری نیند میں تھی اس کے بدن کے دل کش زاویے سانس کی آمد و رفت کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ اپنے طور پر میں نے جتنی کوشش کرنی تھی وہ کر لی تھی۔ ہاں دعا کر سکتا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بد بخت نہ آ جائے اور میری ساری محنت پر پانی پھر جائے۔ وقت سُست روی سے گزر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دو گھنٹے گزر چکے تھے یا گزرنے والے تھے اور میں زرین کے چہرے پر نظر جما کر بیٹھا تھا۔ خدا خدا کر کے اس کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ چونکنے اور ہلنے جلنے لگی تھی۔ اسے مزید متوجہ کرنے کے لیے میں نے کراہنا شروع کر دیا جیسے آدمی نیند میں کراہتا ہے۔ ویسے میرا بازو جہاں ڈاکٹر نے بڑا انجکشن ٹھونکا تھا ابھی بھی اچھا خاصا درد ہو رہا تھا اور اس تکلیف سے کراہنے میں حق بجانب تھا۔

آخر زرین نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے تعجب کا اظہار نہ کرنے کو کہا تھا لیکن اسے حسبِ معمول ہوش میں آنے کے بعد کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز......''

''ہاں میں ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور اشارے سے اسے منع کیا شاید اسی لیے وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''تم......''

''میں ٹھیک ہوں تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔''

''درد تو مجھے بھی ہے لیکن یہ غنیمت ہے کہ اب تک زندہ ہیں پتا نہیں ہم کن درندوں کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔'' یہ جملہ میں نے بلند آواز سے کہا اور اس دوران میں بستر کے پاؤں والے طرف سے کود کر نیچے اتر آیا۔ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میرے دونوں ہاتھ بندھے تھے مگر اکڑوں ہو کر میرے پاؤں فرش پر ٹک گئے تھے میں نے جھک کر دیکھا۔ بیڈ کے نیچے پہیے لگے تھے۔ عمل کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے گھوم کر زرین کو سر کے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں بیڈ کھینچ کر اس کے پاس لاؤں گا اور وہ بلند آواز سے بات کرے تاکہ بیڈ کے کھینچنے سے جو آواز ہو وہ ان لوگوں کے کانوں تک نہ جائے۔ کئی بار سمجھانے پر بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔

''شہباز...... یہ ہمیں مار دیں گے۔''

''حوصلہ رکھو زرین...... اللہ ہمیں محفوظ رکھے گا۔'' میں نے بیڈ کھسکانا شروع کر دیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ بیڈ خاصا وزنی تھا اور پہیوں کے باوجود اسے سرکانا آسان نہیں تھا۔ میں جھٹکے دے دے کر اسے کھسکا رہا تھا اور اس دوران میں میرے ہاتھوں پر بے پناہ دباؤ آ رہا تھا۔ بائیں کلائی پہلے ہی زخمی تھی اور اب اس سے خون نکلنے لگا تھا۔ سخت چمڑے کی رگڑ نے کھال اتار دی تھی۔ میرے اور زرین کے بستر کے درمیان مشکل سے دو فٹ کا فاصلہ تھا لیکن یہ فاصلہ کم کرنے میں مجھے کئی منٹ لگ گئے اور جب دونوں بیڈ آپس میں ملے تو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ زرین رو کر اور بول کر میری مدد کر رہی تھی اور میں بھی حتیٰ الامکان آوازیں نکال رہا تھا۔ اس طرح اگرچہ ان کے کانوں تک دوسری آوازیں جانے کا امکان کم تھا لیکن یہ امکان تھا کہ ہمیں ہوش میں پا کر وہ یہاں آ جائیں۔ زرین کسی حد تک سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کر رہا تھا لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے اشارے سے اسے اٹھنے کو کہا۔ وہ نہیں سمجھی اور کئی بار سمجھانے پر بھی نہیں سمجھی تو مجبوراً مجھے منہ سے کہنا پڑا تھا۔

''تم اٹھ کر بیٹھ سکتی ہو۔ اس طرح تمہیں شاید سکون ملے گا۔''

''کیسے بیٹھوں؟''

''جیسے میں بیٹھا ہوں۔ دیکھو یہ بیلٹیں تمہیں بستر پر قید رکھ سکتی ہیں لیکن تم ہاتھ آگے کر کے بیٹھ سکتی ہو۔''

لیٹے لیٹے اس کا جسم اکڑ گیا تھا اس لیے وہ بڑی مشکل سے بیٹھی۔ اس دوران میں، میں واپس بیڈ پر آ گیا تھا اور میں نے بائیں ہاتھ والی بیلٹ پیچھے کی۔ زرین نے دیکھ لیا کہ میری کلائی سے خون رس رہا ہے اس نے بے ساختہ کہا۔ ''تمہارے ہاتھ سے خون نکل رہا ہے۔''

میں نے جلدی سے اسے اشارے سے مزید بولنے سے روکا کیونکہ اس نے صرف ہاتھ کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے بات بنائی۔ ''ہاں پتا نہیں اس جاہل ڈاکٹر نے کیسے انجکشن دیا تھا ابھی تک خون رس رہا ہے۔'' کہتے ہوئے میں اس کی طرف جھکا اور اسے بھی اشارے سے اپنے طرف آنے کو کہا۔ اس طرح کوشش کر کے ہمارے سر ایک دوسرے سے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ میں نے بنا آواز کے ہونٹوں کی مدد سے کہا۔

''ہاتھ میری طرف کرو۔''

کئی بار کہنے پر وہ سمجھ گئی اور اس نے جھک کر اپنا دایاں ہاتھ میرے بائیں ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔ اگرچہ اس کا قد و قامت مختصر تھا لیکن اسے اپنے لچکیلے جسم کا فائدہ تھا اور وہ آسانی سے میری طرف جھک گئی لیکن کلائی تو اتنی ہی آ سکتی تھی جتنی کہ بیلٹ نے اجازت دی ہوئی تھی۔ اس کا ہاتھ بمشکل میرے ہاتھ تک آیا تھا۔ میں نے ہاتھ ممکن حد تک آگے کیا اور زرین کی بیلٹ کا بکل تھام لیا۔ اس وقت مجھے جو خوشی ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا ہوں میری دو گھنٹے کی محنت رنگ لانے والی تھی۔ میں نے بیلٹ پکڑ کر رنگ سے نکالی اور پھر اسے بکل کے ہک سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کا ہک سختی سے پھنسا ہوا تھا اور اسے شاید انگلیوں سے نکالنے کی ضرورت تھی اور میں بیک وقت دونوں کام نہیں کر سکتا تھا یعنی بیلٹ کو تھامے رکھوں اور اس کا ہک بھی نکالوں۔ مجھے زرین کی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے اشارے سے اسے سر آگے لا کر بیلٹ کا سرا دانتوں سے پکڑنے کو کہا۔ وہ سمجھ کر جھکی اور اس

بار بھی اسے بدن کے لچکیلے ہونے کا فائدہ ہوا اس نے آسانی سے گردن موڑ کر بیلٹ کا سرا دانتوں سے تھام لیا۔ میں نے بیلٹ چھوڑی اور انگلیوں سے ہک کو کھینچ کر نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ہک زیادہ سختی سے پھنسا ہوا تھا میں نے زرین کو بیلٹ کھینچنے کو بھی کہا اس نے زور لگایا اور پھر میں نے پوری قوت سے ہک کھینچا اور وہ بیلٹ سے نکل گیا۔ اسے گھما کر پیچھے کیا کہ وہ پھر بیلٹ کے کسی سوراخ میں نہ چلا جائے اور بیلٹ بکل سے نکال دی۔ ایک ہاتھ آزاد ہوتے ہی زرین تیزی سے حرکت میں آئی اور اس نے گھوم کر اپنے بائیں ہاتھ کو بھی آزاد کرا لیا۔ پھر اس نے واپس گھوم کر میرا بایاں ہاتھ آزاد کرایا۔

اس وقت مجھے ناقابلِ بیان خوشی ہوئی اور فوراً ہی یہ خوشی کافور بھی ہوئی کیونکہ دروازے کے باہر آہٹ ہوئی تھی کوئی اندر آ رہا تھا۔ آنے والا میرا ہاتھ کھلنے سے پہلے آ جاتا تو اسے میرے خلاف کارروائی کا موقع مل جاتا۔ ڈاکٹر یا شیف کے پاس ہتھیار بھی ہو سکتے تھے اور اگر وہ دروازہ ہی باہر سے بند کر دیتے تو ہم پھر قید ہو کر رہ جاتے۔ ایک بار قید کرنے کے بعد ہم پر قابو پانے کے دس طریقے تھے۔ آنے والے کے اندر آنے سے پہلے ہی مجھے کچھ کرنا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ کی بیلٹ بھی کھولی اور اسی اثنا میں دروازے کا ہینڈل گھوما تھا۔ میرے پاؤں پہلے ہی آزاد تھے اس لیے ہاتھ کھلتے ہی میں نے بستر سے چھلانگ ماری اور اُڑتا ہوا کھلنے والے دروازے سے ٹکرایا۔ مجھے شیف کی ایک جھلک نظر آئی جو اندر آ رہا تھا۔ اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے مجھ دیکھا تھا اور اس کے فوراً بعد بند ہوتا دروازہ اس کے منہ سے ٹکرایا تھا۔ میرے کانوں نے اس کی کرب ناک چیخ سنی تھی۔

دروازے سے ٹکراتے ہوئے میں فرش پر گرا اور اسی رفتار سے اٹھا تھا۔ یقیناً مجھے بھی چوٹیں آئی تھیں لیکن یہ اب ۔ کبھی نہیں والا معاملہ تھا اس لیے مجھے چوٹوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک طرف ہوتے ہوئے دروازہ کھولا اور کھڑے ہو کر نکلنے کے بجائے فرش پر سلپ ہوتا ہوا باہر آیا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ باہر موجود شیف یا کسی اور شخص کے پاس کوئی ہتھیار ہوگا۔ اگر میں کھڑے ہو کر باہر آتا تو گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ اس لیے میں فرش پر پھسلتا ہوا باہر نکلا۔

لیکن مجھے کسی گولی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ سامنے شیف فرش سے اٹھ رہا تھا اور اس کا منہ خونم خون ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ایک طرف موجود تھا اور یہ کمرہ ایسا تھا جیسا کسی آپریشن روم کا ہوتا ہے وہاں چاروں طرف سرجری کے آلات اور اوزار سجے ہوئے تھے۔ ایسی ٹرالیاں تھیں جن را دویات اور دوسرا سامان رکھ کر لایا اور لے جایا جاتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر جلدی سے ایک ایسی ٹرالی کے پیچھے ہو گیا تھا۔ اتفاق سے شیف اور وہ دونوں نہتے تھے کیونکہ اگر ان کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ اسے نکالنے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر شیف زمین سے اٹھ رہا تھا اور ڈاکٹر نے اپنے دفاع کے لیے ایک کٹر اٹھا لیا تھا جس سے آپریشن کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کو دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا تھا اور میں زمین سے اٹھ کر غراتا ہوا ڈاکٹر کی طرف لپکا تھا لیکن شیف نے بروقت مداخلت کی اور میرے پاؤں کے آگے ٹانگ کر دی میں اس سے الجھ کر گرا تو وہ عقب سے مجھ پر سوار ہو گیا اور میری گردن پر گھونسے بازی کی مشق کرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں بہت جان تھی اور وہ یقیناً لڑنے لڑنے کے فن سے واقف تھا کیونکہ اس کے قیامت خیز گھونسے میرے گردن پر برس رہے تھے اور پھر اس نے

تاک کر ایک گھونسہ سر پر مارا اور سر فرش سے ٹکرایا۔ اس دوہرے تصادم نے چند لمحوں کے لیے میری آنکھوں تلے اندھیرا طاری کر دیا تھا

کمرے کا دروازہ بہت زور سے شیف کے منہ پر لگا تھا۔ اس چوٹ نے اسے مشتعل کر دیا تھا اور وہ ایک انتقامی جذبے کے ساتھ میرے خلاف کارروائی کر رہا تھا اور اسی انتقامی جذبے کی وجہ سے اس نے حماقت کی تھی۔ بجائے اس کے کہ میرا سر دو تین بار مزید فرش سے ٹکراتا اس نے میرے بال ہاتھ میں جکڑ کر سر اوپر کیا اور میرے کان میں غرایا۔ ''اب پتا چلا کس سے ٹکر لی ہے؟''

میرا سر بال کھنچنے سے کسی قدر گھوم گیا تھا اور آنکھ کے گوشے سے مجھے ڈاکٹر اپنی طرف جھپٹتا دکھائی دیا اس کے ہاتھ میں دھاتی پائپ جیسی کوئی شے تھی۔ وہ اس نے گھما کر میرے سر پر مارنے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش سے شیف بے خبر تھا۔ اس لیے جب میں نے اچانک کروٹ لی تو وہ اس طرف ہو گیا جہاں سے ڈاکٹر وار کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ گھما دیا تھا اور اسے روکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے جو وار میری کھوپڑی پر پڑنا چاہیے تھے وہ شیف کی گردن پر پڑا اور میں نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ شیف کے منہ سے نکلنے والی چیخ ادھوری رہ گئی تھی اور فوراً ہی اس کا جسم بے جان سا ہو کر مجھ پر گرا اور بری طرح لرزنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ عالم نزع میں پھڑک رہا ہو۔ میرا سر ابھی تک چکرا رہا تھا اور شاید ماتھے سے لہو بھی بہہ رہا تھا۔

اس سے پہلے ڈاکٹر دوسرا وار کرتا میرا اٹھ جانا ضروری تھا۔ میں نے وزنی شیف تلے بمشکل کروٹ لی جو جلد لاش میں بدلنے والا تھا اور جیسے ہی اسے اپنے اوپر سے جھٹکا میں نے دونوں ہاتھ دفاع کے لیے سامنے کر لیے تھے لیکن مجھے جھٹکا لگا۔ ڈاکٹر وہاں نہیں تھا۔ شیف کو خود پر سے ہٹانے میں مجھے مشکل سے پانچ سیکنڈ لگے تھے اور اتنی دیر میں وہ غائب ہو گیا تھا لیکن وہ گیا کہاں تھا؟ میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اس میں داخل ہونے والا دوہرے پٹوں پر مشتمل چوڑا دروازہ تھا جیسا کہ آپریشن روم میں ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا دروازہ ایک اور طرف تھا۔ اس طرف جانا مشکل تھا کیونکہ درمیان میں بہت کچھ پڑا ہوا تھا۔ دوہرے پٹوں والا دروازہ خود بہ خود بند ہو جاتا تھا اور وہ بالکل ساکت تھا اگر ڈاکٹر اس سے نکلا ہوتا تو یقیناً وہ ہل رہا ہوتا۔ میری نظر اس دروازے کی طرف گئی جس سے میں نکلا تھا۔ کیا ڈاکٹر اس میں گھس گیا تھا لیکن کیوں؟

اس سوال کا جواب مجھے زرین کی چیخ نے دیا اور میں اچھل کر اندر کی طرف بھاگا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی میں ساکت ہو گیا کیونکہ ڈاکٹر نے زرین کو عقب سے یوں جکڑ رکھا تھا کہ اس کا دایاں بازو زرین کی گردن پر تھا اور اس میں تیز دھار سرجری والا چاقو تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی دھار ریزر سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے اور ڈاکٹر کو صرف اپنے ہاتھ کو معمولی سی جنبش دینا تھی اور زرین کی گردن کٹ جاتی۔ ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا تھا بس خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔

''ڈاکٹر اسے چھوڑ دو۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں تم سے کوئی تعرض نہیں کروں گا بس اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟''

''اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ تم اسے قتل کر دو لیکن کیا اس کے بعد تم میرے ہاتھ سے بچ جاؤ گے؟''

''ممکن ہے نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔''مگر کیا تم اپنی بیوی کی موت برداشت کرلو گے؟''

''تم اس کے اور میرے ساتھ جو کرنے جا رہے ہو وہ ہماری موت ہی ہے تو میں تمہیں کیوں چھوڑوں کیونکہ دوسری صورت میں بھی موت ہمارا مقدر ہوگی۔''

''شہباز۔'' زرین بولی۔''اس کی بات پر توجہ مت دو یہاں سے نکل جاؤ۔''

میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔''تم نے سن لیا یہ بھی جانتی ہے کہ تم ہمیں نہیں چھوڑو گے۔ اس لیے میں آخری بار کہہ رہا ہوں اسے چھوڑ دو۔''

''اگر ساؤنڈ سسٹم خراب نہ ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔'' اس نے جیسے خود سے کہا۔

''ڈاکٹر تم وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے اسے للکارا اور آگے بڑھا تھا۔''اسے چھوڑ دو اسے مار کر تم نہیں بچ سکو گے۔ دوسری صورت میں، میں تمہیں یہاں سے یرغمال بنا کر لے جاؤں گا اور باہر نکلتے ہی چھوڑ دوں گا اس کے بعد تم اپنی جان بچا کر کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہو گے۔''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔''سچ میں...... کیا ایسا ہی ہوگا؟''

''ہاں یہ میرا وعدہ ہے۔'' میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

زرین چلائی۔''شہباز اس کی بات کا اعتبار نہ کرو اور اسے پکڑ لو میری پروا مت کرو۔''

''اگر اس نے مجھے پکڑا تو تم مر جاؤ گی۔'' اس نے زرین کے سر کو جھٹکا دیا اور سانپ کی طرف پھنکار کر بولا تھا۔''کیا کہتے ہو شہباز اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھ سکتے ہو؟''

''دیکھ سکتا ہوں۔'' میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔''کیونکہ یہ میری بیوی نہیں ہے صرف دوست ہے اور مجھے اس کے مرنے کا دکھ ہوگا لیکن میں پاگل نہیں ہوں گا۔''

اسے جھٹکا لگا تھا لیکن اس نے زرین پر اپنی گرفت نرم نہیں کی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔''چلو گرل فرینڈ ہی سہی...... لیکن کیا تم اسے مرتا دیکھ سکو گے اپنی وجہ سے جب کہ تم اس کی جان بچا سکتے تھے۔''

''شہباز یہ وقت گزار رہا ہے اس کے ساتھی یہاں آ جائیں گے اور......'' اس کی بات چیخ سے ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دی تھی اور زرین کی گردن پر کٹ آ گیا تھا ایک لمحے کو میرا دل رک گیا تھا کہ اس نے زرین کی گردن پر چاقو پھیر دیا ہے لیکن یہ معمولی سا کٹ تھا جس سے ذرا سا خون بہہ نکلا تھا ڈاکٹر نے زرین سے کہا۔

''پتا چلا کہ گردن پر معمولی سا کٹ لگے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے اور اگر پوری گردن کٹ جائے تو کتنی تکلیف سے جان نکلتی ہے اس بارے میں تم کچھ نہیں جانتی ہو۔''

''شہباز...... پلیز۔'' زرین نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔''یہاں سے چلے جاؤ۔''

''ڈاکٹر میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔'' میں نے مزید ایک قدم بڑھایا تو بیڈ کے پاس آ گیا تھا۔ اب مزید آگے جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ درحقیقت میں کسی صورت زرین کو یوں مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف مجھے قدرت نے جو موقع دیا تھا اس سے دست بردار ہونے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے اتنے قریب دیکھ کر ڈاکٹر چوکنا ہو گیا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔''بس اب تم نے آگے آنے کی کوشش کی تو میں بلاتاخیر اسے مار دوں گا۔''

میں تذبذب میں آ گیا ڈاکٹر کے عزائم سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرے گا۔ کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ میں اسے معاف کروں گا۔ اسی چکر میں وہ قیمتی لمحات گزر گئے جن کو میں اپنی اور زرین کی آزادی کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اچانک مجھے عقب سے آہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی زرین بھی چلائی۔ ''شہباز...... ہوشیار۔''

لیکن ہوشیار ہونے کا وقت گزر گیا تھا جب تک میں پلٹ کر دیکھتا کوئی سخت چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ وار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ یک لخت میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا اس اندھیرے میں، میں نے زرین کی چیخ سنی اور پھر ڈاکٹر کا قہقہہ سنائی دیا تھا اس نے کسی سے کہا۔ ''جانی تم نے خوب کام کیا ہے۔''

''کام ابھی مکمل نہیں ہوا ہے ڈاکٹر۔'' جانی نے جواب دیا اور اسی چیز سے میرے سر پر پھر ضرب لگائی اور اس بار میں ناک آؤٹ ہو گیا۔ اگر میں تذبذب میں پڑنے کے بجائے کوئی کارروائی کر گزرتا تو شاید وہ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے شدت سے افسوس ہوا تھا میں نے وقت گنوا دیا تھا۔



مجھے ہوش آیا تو پہلا احساس سردی کا تھا میں منہ کے بل لیٹا ہوا تھا اور میرا رخسار سرد فرش پر رکھا تھا اور اس کی ٹھنڈک براہِ راست مجھے لگ رہی تھی۔ میرا سر دُکھ رہا تھا۔ یہ دُکھن ایسی تھی جیسے درد پوری کھوپڑی میں تیر رہا ہو کبھی ایک جگہ جاتا تھا اور کبھی دوسری جگہ جاتا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تب بھی سر میں شدت کا درد اٹھا تھا میں نے آنکھیں بند کر لیں اور درد کے کم ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور میں کہاں تھا؟ پھر رفتہ رفتہ مجھے یاد آنے لگا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے زرین کی چیخ سنی تھی۔

زرین کا خیال آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا اور سر کے درد نے ایسا کوندا مارا کہ ایک لمحے کو میں پھر بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ اس جھٹکے نے جسم ہی سن کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے زرین کو کچھ فاصلے پر فرش پر پڑے پایا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لبادے نما لباس تھا جو مشکل سے اس کی رانوں تک آ رہا تھا۔ اس کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا کیونکہ لبادہ باریک تھا اور اس میں اس کے جسم کا ایک ایک نقش واضح ہو رہا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ گالی نکل گئی تھی اور پھر میری نظر خود پر گئی۔ میرے جسم پر صرف ایک کسی قدر لمبی نیکر تھی جو گھٹنوں سے ذرا اوپر ختم ہو رہی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے ایک طرف دیوار میں گول دروازہ لگا تھا۔ پورا کمرہ بالکل سفید تھا۔ حد یہ کہ فولادی دروازہ بھی سفید تھا۔ یہ مشکل سے آٹھ بائی آٹھ کا کمرہ تھا جس کی ساخت چوکور کے بجائے ہشت پہلو تھی اور اس کی اٹھی ہوئی چھت میں سفید شیشے کے پینل کے پیچھے کوئی تیز روشنی والا بلب لگا تھا کیونکہ یہاں اتنی روشنی تھی کہ زمین پر چلنے والی معمولی سی چیونٹی بھی صاف نظر آتی۔ اگرچہ وہاں چیونٹی نہیں تھی۔ ہشت پہلو دیواروں کا اوپری حصہ بھی چھت کی نوک تک ہشت پہلو ہو کر جا رہا تھا یعنی چھت سیدھی نہیں تھی اور روشنی اسی نوک سے پھوٹ رہی تھی۔ بہت عجیب سا کمرہ تھا اور اس کا معائنہ کرتے ہوئے اچانک مجھے ایک دہشت ناک خیال آیا۔ کہیں یہ وہی چیمبر تو نہیں تھا جس میں مجھے اور زرین کو ڈالا جانا تھا۔ سر درد کے علاوہ جسم میں عجیب سی اینٹھن بھی

ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ٹھیک نہیں ہوں میرے جسم کے ساتھ کوئی گڑ بڑ ہوئی تھی۔ زرین بے سدھ پڑی تھی اور اس بار بھی مجھے اس سے پہلے ہوش آ گیا تھا۔

فرش ٹھنڈا تھا لیکن اتنا بھی ٹھنڈا نہیں جتنا مجھے ہوش میں آتے ہوئے محسوس ہوا تھا۔ کمرہ سرد تھا اور یہ سردی قابلِ برداشت تھی۔ صرف نیکر میں بھی میں اسے برداشت کر سکتا تھا لیکن ہمیں یہاں کیوں ڈالا گیا تھا اور ڈاکٹر نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا؟ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر کے درد نے مجھے روک دیا۔ ایسا شدید چکر آیا تھا کہ میں دوبارہ بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنا سر ٹٹولا جو پشت کی جانب سے دو مقام سے زخمی تھا۔ اس سے پہلے سامنے ماتھے پر بھی چوٹ لگی تھی ان سے خون نکل کر جم گیا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ زخموں کو صاف کرنے یا ان کی مرہم پٹی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ شاید غصے میں ڈاکٹر نے ہمیں اسی حالت میں اپنے تجربے کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اٹھنے کے بجائے زمین پر بیٹھے بیٹھے کھسک کر زرین کے پاس پہنچا اور اس کا سر سہلایا۔

”زرین......زرین۔“

میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا اس بار بھی میں جلدی ہوش میں آ گیا تھا اور اس پر یقیناً کوئی دوائی استعمال کی گئی تھی جس کے اثر سے وہ دیر سے ہوش میں آتی۔ بے ہوشی میں اسے لاپروائی سے لا کر یہاں ڈال دیا گیا تھا اور ڈالنے والوں کو اس کے لباس کی پروا نہیں تھی اس کا لبادہ ایک طرف سے ذرا اوپر ہو رہا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کر کے لٹایا اور اس کا لبادہ کھینچ کر ممکن حد تک اس کی ٹانگوں پر کر دیا لیکن یہ ابھی بھی اس کے گھٹنوں سے اوپر ہی تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پتا نہیں ڈاکٹر نے ہمارے کپڑے کیوں چھین لیے تھے۔ اس کا مقصد طبی تھا یا پھر وہ ہمیں ذہنی اذیت دینا چاہتا تھا۔

اس ذرا سی محنت نے مجھے تھکا دیا تھا اور مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ میرے ساتھ کچھ ہوا تھا کیونکہ یہ کمزوری نہیں تھی بلکہ ایسا لگ رہا تھا میں بیمار ہوں۔ پورے جسم میں ہلکی سی تکلیف تھی۔ منہ کا ذائقہ خراب تھا اور متلی کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی کیفیت میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب مجھے ملیریا ہوتا تھا لیکن اب تو اس بات کو بھی برسوں گزر چکے تھے۔ میں ذرا پیچھے سرکا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ چیمبر مکمل طور پر بند تھا لیکن اس کے باوجود یہاں گھٹن کا نام و نشان نہیں تھا اور ہوا میں ہلکی سی کسی جراثیم کش دوا کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے زرین کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشبہ ان حسین ترین عورتوں میں سے تھی جن کو میں نے اب تک دیکھا تھا۔ دل کش ترین نقوش، آنکھیں، ریشمی بال، نازک سی گلابی جلد اور سانچے میں ڈھلا ہوا بدن، لیکن میں نے اسے ان تمام حسین ترین عورتوں کی طرح بدقسمت بھی پایا تھا۔ قدرت نے اسے حسن اور سراپا فراخدلی سے دیا تھا لیکن جہاں خوشیوں کا تعلق تھا تو اس کا کوٹا بہت ہی کم تھا۔ اس سے کہیں کم صورت بلکہ بعض بدصورت عورتیں اس سے کہیں زیادہ خوشیاں پا لیتی ہیں۔ شاید یہ قدرت کا اندازِ توازن ہے وہ کسی کو کہیں زیادہ دے دیتی ہے تو کہیں اس کا حصہ کم کر دیتی ہے۔ اس نے محبت کی تو ایک ایسے شخص سے جو کسی صورت اس کا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی قریبی رشتہ نہیں ہے کوئی گھر نہیں ہے۔ جوانی کے قیمتی سال اس نے مرشد جیسے خبیث شخص کی قید میں گزار دیئے اور اب یہاں اور ایک شخص کی بدفطرتی کا نشانہ بنی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے سر کا درد کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے پہلی بار صورتِ حال کا جائزہ لیا۔

چیمبر کی ساخت بتاتی تھی کہ اس میں نگرانی کے لیے یقیناً کیمرے اور مائیک لگے ہوں گے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ''ڈاکٹر توفیق کیا تم میری آواز سن رہے ہو۔''

کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے معلوم ہے تم کسی مانیٹر کے سامنے بیٹھے ہمارا معائنہ کر رہے ہو گے۔ شاید تمہیں تعجب ہو گا کہ میں اس صورتِ حال میں بھی تم کو گندی گالیوں سے کیوں نہیں نواز رہا ہوں تو اس کی دو وجوہات ہیں ایک میری اپنی عزت اصل میں میری اپنی نظر میں ہے اور میں سوچ سمجھ کر گالی دینے سے گریز کرتا ہوں ہاں منہ سے بے اختیار نکل جائے تو الگ بات ہے۔ دوسرے میں تمہیں گالیوں کے قابل بھی نہیں سمجھتا ہوں۔ تم سن رہے ہونا؟'' آخری جملے پر میں چیخ اٹھا تھا۔ شاید جسم کی طرح میرے اعصاب بھی بیمار پڑ گئے تھے۔

''ہاں سن رہا ہوں۔'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''یہ جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا لیکن فی الحال تمہارا بے خبر رہنا ضروری ہے۔''

''تم نے ہمیں بیمار کرنے والی کوئی دوا دی ہے؟'' میں نے اپنے اندر سے ابھرتے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ میں ہر مصیبت کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اپنے جسم میں گھس آنے والے کسی بیماری کے عفریت کا کیسے مقابلہ کرتا جب کہ یہ عفریت قدرت کی طرف سے نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر میرے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔

''تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا اس سے ہماری موت بھی ہو سکتی ہے؟''

''اگر تم اس کے خلاف لڑو تو شاید ایسا نہ ہو۔'' اس نے چالاکی سے واضح جواب دینے سے گریز کیا تھا لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے ہماری موت کا سامان ہمارے جسم میں داخل کر دیا تھا اور اب ہمارے مرنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر اس کے خاندان کی خواتین سے ناجائز رشتوں کا اعلان کروں لیکن یہ بلاوجہ کی جذباتیت ہوتی جس کا اسے کوئی نقصان نہیں تھا اور مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اس وقت مجھ سے بات کر رہا تھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر میں اس سے کچھ نہ کچھ اگلوا سکتا تھا۔

''تم نے ہمارے کپڑے کیوں اتار لیے؟''

''کیونکہ اس تجربے کے اثرات تمہارے جسم پر بھی ظاہر ہوں گے اور وہ دیکھنا ضروری ہے۔ میں چاہتا تو تم دونوں کو مکمل طور پر برہنہ کر دیتا لیکن مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی اس لیے میں نے کچھ لباس رہنے دیا۔''

''میں تمہارا یہ احسان مرنے کے بعد بھی نہیں بھولوں گا۔'' میرا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ ''میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ لیکن یہ ضرور پوچھوں گا کہ ہم پر جو تجربہ کیا گیا ہے اس کے مکمل اثرات کتنی دیر میں ظاہر ہوں گے؟''

''تمہیں انجکشن دیئے ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں اور ابھی تمہیں مزید بارہ گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا اس کے بعد ہی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پر اثرات نہ ہوں؟''

''ہو بھی سکتا ہے کیونکہ جسم کی قوتِ مدافعت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، بعض اوقات یہ نزلے زکام سے بھی ہار مان جاتا ہے اور بعض اوقات ایڈز کا وائرس بھی اس پر اثر نہیں کرتا ہے۔ کئی افراد ایسے ہیں جن کے خون میں ایچ آئی وی پوزیٹو نکل آیا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ برسوں زندہ رہے اور ان کو ایڈز کا مرض لاحق نہیں ہوا۔''

''کیا تم نے ہم پر کسی ایسے ہی وائرس کا تجربہ کیا ہے؟'' مجھے یہ سوال کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے خوف سے لڑنا پڑا تھا۔

''میں نے کہا نا تم اس مرحلے پر کچھ بھی سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔ ابھی میں تم کو نہیں بتا سکتا کہ تم پر کیا تجربہ کیا گیا ہے کیونکہ اس سے ممکن ہے تجربے کے پیرامیٹر درست طور پر سامنے نہ آئیں۔''

میں نے چیمبر کی طرف دیکھا۔''اس جگہ کی ساخت بتاتی ہے کہ اسے اس لیے بنایا گیا ہے کہ یہاں موجود کوئی چیز باہر نہ جا سکے اور ظاہر ہے تم لوگ جراثیم پھیلنے سے روکنا چاہتے ہو۔ یعنی ہمیں کسی ایسے وائرس سے انفیکٹ کیا گیا ہے جو ہوا کے ذریعے بھی پھیل سکتا ہے۔''

اس بار اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے دو تین بار پکارا مگر وہ غائب ہو گیا تھا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ مجھ پر غصہ نہیں تھا کہ میں نے آزاد ہونے کی کوشش کی اور اس کے ایک آدمی کو اس کے ہاتھوں ہی مروا دیا تھا یا اسے غصہ تھا تو اب رفع ہو چکا تھا کیونکہ اسے ہمارے ساتھ جو کرنا تھا وہ اس نے کر دیا تھا۔ اچانک زرین کی مدہم آواز آئی۔

''شہباز بے کار ہے۔''

وہ ہوش میں آ گئی تھی اور ساکت لیٹی تھی میں بے ساختہ اس پر جھکا۔''زرین کیا محسوس ہو رہا ہے؟''

''جسم میں درد اور متلی کی کیفیت۔'' اس نے کمزور لہجے میں کہا۔''شہباز ایسا لگ رہا ہے اس ذلیل شخص نے ہمیں کوئی جان لیوا بیماری لگا دی ہے۔ اب ہم نہیں بچ سکیں گے۔''

''زرین جان لینا اور دینا اللہ کا کام ہے اگر ہماری زندگی ہے تو اس جیسے ہزاروں لوگ مل کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ اس لیے مایوس مت ہو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

''وہ تو ہے۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔''اس نے اس بے کار زندگی میں تم جیسے شخص سے ملوا دیا۔ یہ اس کا احسان ہے لیکن شہباز کوئی میرے اندر سے کہہ رہا ہے میرا آخری وقت آ گیا ہے۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔''زرین تمہیں بہت عرصے زندہ رہنا ہے۔''

''نہیں بہت عرصے زندہ رہ لی۔'' اس نے گہری سانس لی۔''اب بس ایک آخری خواہش ہے۔''

''وہ کیا؟''

''اگر میری عمر کا کچھ وقت باقی ہے تو میری خدا سے دعا ہے کہ وہ تمہیں مل جائے اور تم یہاں سے زندہ نکل جاؤ۔''

''میں نہیں جانتا کہ میں کتنا عرصے زندہ رہوں گا لیکن زرین جب تک زندہ رہا تمہیں ضرور یاد رکھوں گا۔''

وہ مسکرائی۔ ''میرے لیے یہی کافی ہے۔''
میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ''فرش بہت سرد ہے تم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ۔''
چیمبر میں سردی کا ذرا دیر سے اندازہ ہوا تھا یا ڈاکٹر نے ایسا کوئی کام کیا تھا جس سے یہاں سردی میں اضافہ ہوا تھا کیونکہ اچانک ہی مجھے اور زرین کو سردی لگنے لگی تھی۔ اس نے شکایت بھی کی تھی لیکن جب میں نے اسے فرش سے اٹھانا چاہا تو وہ بولی۔
''مجھ میں بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے۔''
''ٹھیک ہے پھر ایک کام کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور یہ کیا کہ خود دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس کی پشت اپنے سینے سے لگا کر اسے سہارا دے دیا۔ وہ خوش ہوگئی تھی۔ ''یہ تم نے اچھا کیا؟''
''کیا اچھا کیا؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔
''اس طرح ہی سہی اور سہارا دینے کے بہانے ہی سہی، مجھے تمہارا لمس تو ملا۔'' وہ جان بوجھ کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا جسم مجھ سے زیادہ سے زیادہ لگنے لگا اور حسرت سے بولی۔ ''کاش یہ کوئی اور موقع ہوتا۔''
میں نے اس کے گرد باز وحمائل کر لیے۔ ''کیسا موقع؟''
اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ ''کوئی اور موقع ...... کوئی بھی ہوتا بس ہم یہاں نہ ہوتے۔''
''اگر ہم یہاں نہ ہوتے تو شاید ایک ساتھ بھی نہ ہوتے۔ قدرت نے ہمیں اسی جگہ ایک دوسرے کے ساتھ رکھنا تھا۔''
''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ بولی۔ ''اب میری خواہش ہے کہ مجھے اسی حالت میں موت آجائے۔''
''مرنے کی باتیں کرنے کے بجائے جینے کی بات کرو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''تم جانتی ہو میں امید پرست آدمی ہوں اور مجھے آخری وقت تک حوصلہ رکھنا پسند ہے۔''
''میں جانتی ہوں، لیکن میں ایسی نہیں ہوں میں بہت چھوٹے دل کی اور جلد ہمت ہار جانے والی لڑکی ہوں۔''
''میرے حساب سے تو تم بہت ہمت والی اور بہادر لڑکی ہو۔''
''کاش کہ میں ہوتی۔'' اس نے سرد آہ بھری۔
میں نے اس کی چپکنے کی کوششوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ اس سرد چیمبر میں ہمیں حرارت کی ضرورت تھی اور وہ ایک دوسرے سے ہی مل سکتی تھی۔ اس نے ایک پاؤں اٹھا کر میرے پاؤں پر رکھ لیا تھا اور شاید ڈاکٹر کو ہمارا یہ پوز بہت رومانٹک لگ رہا ہو لیکن یہ ہم ہی جانتے تھے کہ اس کا رومان سے کوئی واسطہ نہیں تھا کم سے کم میرے ذہن میں دور دور تک ایسا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس وقت زرین میرے لیے ایک حسین عورت نہیں بلکہ صرف ایک ساتھی تھی جو اس مصیبت میں میرے ساتھ شریک تھی اور ہم ایک دوسرے کی مدد سے اپنے مصائب کسی قدر کم کر سکتے تھے۔ اس کی جگہ کوئی مرد ساتھی ہوتا تب بھی ہم اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر خود کو گرم کرنے کی کوشش کرتے۔ نہ جانے چیمبر سرد ہوگیا تھا یا بیماری کے اثر سے ہمیں سردی لگ رہی تھی۔ زرین کچھ دیر تو پشت لگا کر لیٹی رہی پھر گھوم کر میرے سینے پر سر رکھ لیا اور آہستہ سے گنگنائی۔ ''شہباز تم بہت اچھے ہو...... وہ

عورت خوش نصیب ترین ہوگی جس کا تم نصیب ہو گے۔"

"میں اتنا اچھا بھی نہیں ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "صرف اچھا بننے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"وہی تو اچھا ہوتا ہے جو اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے اور وہ برا ہوتا ہے جو اچھا بننے کی کوشش نہیں کرتا۔"

"یہ تو تم نے بہت گہری بات کی ہے۔"

"جب موت سامنے ہوتی ہے نا تو انسان کے آگے سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایسی ہی گہری باتیں کرتا ہے۔"

"تم اتنی ناامیدی کی باتیں مت کرو۔"

"میں ناامیدی کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے تو کوئی امید ہی نہیں تھی اس کے باوجود خدا نے مجھے اتنا دے دیا۔"

"اب چپ کر کے کچھ دیر آرام کرو تمہاری سانس پھول رہی ہے۔" واقعی اس کی سانس پھول رہی تھی اور کچھ ہی باتیں کر کے وہ یوں ہانپنے لگی تھی جیسے میل بھر کی دوڑ لگائی ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ پھول جیسا بدن جلد مٹی کے ڈھیر میں بدل جائے گا اور جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو میں لرز اٹھا تھا۔ زرین نے محسوس کر لیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں سردی لگ رہی ہے۔"

"میرے یوں لگ کر بیٹھنے کے بعد بھی؟" اس نے لہجے میں شوخی لانے کی کوشش کی۔ "ایسے تو میں کسی برف کی سل کے ساتھ بیٹھ جاؤں تو وہ بھی گرم ہو جائے۔"

"باتیں نہیں۔"

اس نے سر دوبارہ سینے پر ٹکا لیا۔ "تمہیں میرا ایسی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا ہے نا۔"

"ہاں مجھے واقعی اچھا نہیں لگتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ میرے لیے تم ایک عورت یا بدن نہیں ایک ساتھی اور ایک شخصیت ہو۔"

"مجھے معلوم ہے میں تو بس تمہیں چھیڑنے کے لیے ایسا کرتی ہوں۔"

"مجھے بھی معلوم ہے تم چھیڑنے کے لیے ایسا کرتی ہو اس لیے میں تمہیں کچھ کہتا نہیں ہوں۔"

"شہباز مجھ پر تمہارا بہت سارا قرض جمع ہو گیا ہے کاش میں تمہیں آزاد کرا سکتی تو اپنی جان دے کر بھی آزاد کرا دیتی۔"

"مجھے تمہاری جان کی نہیں زندگی کی ضرورت ہے۔"

"زندگی اب رہی کہاں ہے؟" اس نے حسرت سے کہا۔ "تمہارے لیے اس کی قدر اب ایک کھوٹے سکے جتنی بھی نہیں رہی ہے۔"

"پلیز ایسی باتیں مت کرو۔" میں نے اس سے التجا کی۔ "میرے نزدیک تمہاری بہت قدر ہے اور یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوگی۔"

''اور میری درخواست ہے مجھے بولنے دو۔'' اس نے کہا اور پھر بولنے لگی۔ لایعنی اور بے معنی باتیں، اپنے بچپن کے قصے اور باتیں، جب وہ آزاد تھی اور اس کے وجود پر کسی کا تسلط نہیں تھا۔ ''پتا ہے تیرہ سال کی عمر میں، میں نے اچھا خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا پوری جوان لڑکی لگتی تھی۔ ویسے بھی پہاڑوں میں لڑکیاں جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ گاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا لڑکا ہو جو میرا دیوانہ نہ ہو اور مجھے اس وقت پتا ہی نہیں تھا کہ محبت اور خاص طور سے جنسِ مخالف کی محبت کیا ہوتی ہے۔''

''اس وقت تم بہت چھوٹی تھیں۔''

''ہاں لیکن بے وقوف تھی کیونکہ میرے جتنی عمر والی لڑکیاں جو بہ ظاہر جوان بھی نہیں تھیں مجھ سے کہیں زیادہ جانتی تھیں۔ جب ہم لڑکیاں ملتی اور چپکے چپکے ایسی باتیں کرتیں تو مجھے ان پر بالکل یقین نہیں آتا تھا کہ بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے پتا چل گیا اور جب مرشد کی نظر بد پڑی اور مجھے اس کی کوٹھی میں آنا پڑا تو ایک ہی رات میں جو اس کے ساتھ گزاری میں سب جان گئی تھی۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''مرشد کے جو مجھ پر قرض ہیں ان میں تمہارا قرض بھی شامل ہو گیا ہے اور اگر قدرت نے موقع دیا تو میں یہ قرض بھی اس سے وصول کروں گا۔''

''میری خواہش ہے کاش ایسا ہی ہو۔'' وہ مدہم آواز میں بولی اور پھر آنکھیں بند کر کے سر سینے پر رکھ لیا۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ کچھ دیر میں وہ سو گئی تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ سو جائے۔ یوں مل کر بیٹھنے سے ہمارے جسم کسی قدر گرم ہوئے تھے اور سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ زرین کا جسم اتنا گرم نہیں تھا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا شاید اس کی حرارت ضائع ہو رہی تھی۔

''یہ عورت تمہیں بہت چاہتی ہے؟'' اچانک ڈاکٹر کی مدہم آواز آئی۔

''شاید۔'' میں نے جواب دیا۔

''شاید نہیں یقیناً۔'' زرین نے آنکھیں موندے موندے کہا۔ ''اپنی جان سے زیادہ۔''

ڈاکٹر ہنسا۔ ''سنا تم نے...... اور تم کہہ رہے ہو شاید...... مجھے افسوس ہے تم دونوں ایک ساتھ یہاں ہو۔''

''تو ہمیں کہاں ہونا چاہیے تھا؟''

''کسی اچھے سے مکان میں جہاں تم ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارتے۔''

''اس سے کہو یہ ممکن نہیں ہے۔'' زرین نے اسی انداز میں کہا۔ ''اس لیے ہم یہاں ہیں۔''

''سنو ڈاکٹر...... ایک درخواست ہے اگر تم مان لو تو؟''

''کہو۔''

''اس کے لیے کوئی مکمل لباس مہیا کر دو۔''

''اس سے مت کہو۔'' زرین نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''اس سے لباس مانگنے سے بہتر ہے میں بے لباس رہوں۔''

''یہاں سردی بڑھ رہی ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

وہ تڑپ کر بولی۔ ''غلط تم اس لیے اس سے لباس مانگ رہے ہو کہ تمہیں میرا اس طرح نیم عریاں رہنا

گوارا نہیں ہے لیکن یقین کرو اس کی اور اس کے آدمیوں کی حیثیت میرے لیے جانوروں سے زیادہ نہیں ہے۔ جیسے کسی جانور کے سامنے مجھے لباس میں ہونے یا نہ ہونے سے کسی فرق نہیں پڑتا ہے۔ بالکل ایسے مجھے یہ سب محسوس ہو رہے ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے بالکل بھی شرم نہیں آ رہی ہے۔''

''زرین لیکن مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''لیکن مجھے اچھا لگ رہا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔ وہ زرین کی بات سن کر طیش میں آ گیا تھا۔ ''اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے اس کو یہ لباس بھی کیوں دیا۔ اگر اس چیمبر کو کھولا جا سکتا تو میں یہ کپڑا ابھی اتروا لیتا۔'' وہ کمینگی پر اتر آیا۔

''فی الحال تو کوئی یہاں آیا تو وہ اپنے کفن دفن کا بندوبست کر کے آئے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''وہ آئیں گے اور تمہاری لاشوں کو کہیں دفنائیں گے اور تم سے میرا وعدہ ہے۔'' اس نے زرین سے کہا۔ ''تمہاری لاش بھی بے لباس ہی دفن کراؤں گا۔''

''بھونکتے رہو کتے کی طرح۔'' زرین نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں ذرا سی بات کر کے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے اور رنگت میں گلابیت کے بجائے کسی قدر سفیدی آ گئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''ڈاکٹر تم نے چیمبر کا درجہ حرارت کم کیا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اس پر اثر ہو رہا ہے اس لیے سردی لگ رہی ہے۔''

''ڈاکٹر مجھے خالی دھمکیاں دینا پسند نہیں ہیں لیکن تم سے میرا وعدہ ہے اگر تم میرے قابو میں آ گئے تو میں تمہیں اپنے ہاتھ سے ماروں گا اور تم آسان موت نہیں مرو گے۔''

وہ ہنسا۔ ''تم سے پہلے بھی کئی لوگ اس قسم کی باتیں کر چکے ہیں اور اس وقت ان کی لاشیں بھی قبروں میں گل سڑ چکی ہوں گی۔''

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ میں اپنا وعدہ پورا کر سکوں گا یا میری لاش بھی قبر میں پڑی ہو گی۔''

''تم خود کو لاش سمجھ سکتے ہو۔'' اس نے پہلی بار کھل کر کہا۔ ''تم دونوں کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

''اگر ہمیں علاج میسر آ جائے تب......؟'' میں نے اسے ٹٹولا۔ ''میرا مطلب ہے آج کل سوائے کینسر اور ایڈز کے ہر مرض کا علاج ممکن ہے۔''

''تب بھی نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اگر میں تم کو بچانا چاہوں تب بھی نہیں بچا سکتا۔''

''انسان اور خدا میں یہی فرق ہوتا ہے۔''

''مجھے فضول بحث میں مت الجھاؤ۔'' وہ خشک انداز میں بولا۔ ''میں وہ کر رہا ہوں جو کر سکتا ہوں اور ان کاموں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا جو میں نہیں کر سکتا ہوں۔''

''تمہارے نزدیک انسانوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے؟''

''صرف اتنی کہ وہ میرے کام آتے رہیں۔''

''کچھ لوگ یقیناً تمہارے کام آ رہے ہیں پر تم کس کے کام آ رہے ہو؟'' میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔

''میں کسی کے لیے کام نہیں کر رہا ہوں اس پروجیکٹ کا سربراہ میں ہوں۔'' اس نے کہا تو اس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔

''تب یہ شاہ صاحب کون ہے جس کا شیف نے حوالہ دیا تھا؟''

یہ سن کر ڈاکٹر کو چپ لگ گئی تھی اور اس کے بعد اس نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ زرین بولی۔

''بے کار ہے یہ کتا چپ رہے گا۔''

''تم جاگ رہی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''جسم میں تکلیف بڑھ رہی ہے اس تکلیف میں کیسے سو سکتی ہوں۔''

''زرین مجھے بہت افسوس ہے میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

''یہ جو کر رہے ہو اس سے زیادہ مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں...... ہاں، ایک فرمائش ہے اگر تم مانو تو......لیکن تم انکار کر دو گے تب بھی مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔''

میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا فرمائش کر سکتی ہے۔ میں نے کہا۔ ''میں مانوں گا تمہاری ہر بات مانوں گا۔''

''شہباز مجھے پیار کرو۔'' اس نے جھجک کر اور شرما کر کہا۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ''بس اتنی سی فرمائش؟''

''یہ میرے لیے اتنی سی نہیں ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''میری زیست کا حاصل ہوگا۔''

میں نے اسے سہارا دے کر سیدھا بٹھایا اور اس کا زرد پڑ جانے والا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ سرد اور بے جان ہو رہا تھا پھر میں اس کے ہونٹوں پر جھک گیا وہ بھی اس کی طرح سرد اور بے جان ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں جب میں اس سے جدا ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں ان میں آنسو چمک رہے تھے۔

''شہباز تھینک یو۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اسے دوبارہ خود سے لپٹا کر لٹا لیا۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے اس امر کی معافی مانگی مجھے امید ہے کہ وہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ میری نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ زرین کو روتے دیکھ کر مجھے اپنا اندر پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا اور پھر یہ لاوا آنسو بن کر آنکھوں سے پھوٹ نکلا۔ میرے آنسو اس کی گردن پر گرے تو وہ چونک گئی۔

''شہباز تم رو رہے ہو؟'' وہ بے قرار ہو گئی۔

''نہیں۔'' میں نے آنکھیں صاف کیں۔ ''بس ایسے ہی پانی آ گیا تھا۔''

''شہباز تم روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے ہو مردوں کو رونا نہیں چاہیے۔''

''کیا مرد انسان نہیں ہوتے ہیں؟''

''ہوتے ہیں لیکن مرد رونے لگے تو اس دنیا کا نظام کون چلائے گا۔ رونا شکست اور آخری وقت کی علامت ہے۔''

''یہ وہ رونا نہیں ہے۔ میرے اندر ایک بوجھ سا آ گیا ہے شاید وہی پانی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا تھا اب

میں ٹھیک ہوں۔''

زرین نے مجھ سے جدا ہونے کی کوشش کی۔''تم کب سے اس طرح بیٹھے ہو تھک گئے ہو گے۔''

''نہیں ابھی میں نہیں تھکا ہوں۔''میں نے اسے روک دیا۔''جب تھکوں گا تو تمہیں بتا دوں گا۔''

''وعدہ کرو جب تھکو گے تو بتا دو گے۔''اس نے کہا۔''پھر میں تم کو اپنے زانوں پر لٹاؤں گی۔''

''تم بیٹھ نہیں سکتی ہو۔''

''میں بیٹھ جاؤں گی تمہاری خاطر......پلیز اسے بھی میری ایک چھوٹی سی خواہش سمجھ لو۔''

میں نے بادلِ ناخواستہ سر ہلایا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس کی یہ خواہش پوری ہو سکے گی۔ میں دیکھ رہا تھا اس کی حالت تیزی سے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ پر نیم دراز تھی تو اس کے لیے بھی میں نے اسے سہارا دے رکھا تھا ورنہ وہ یوں بھی نہیں لیٹ سکتی تھی۔ میرے ذہن نے آنے والے لمحات کو قبول کر لیا تھا اس لیے میں بہت زیادہ تشویش میں تو نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں زرین کی حالت اتنی تیزی سے خراب ہوتے دیکھ کر مجھے اب فکر ہونے لگی تھی۔ اس خبیث شیطان صفت ڈاکٹر نے نہ جانے ہمیں کس بیماری کا جرثومہ لگا دیا تھا جو اتنی سرعت کے ساتھ ہمیں اندر سے تباہ کر رہا تھا۔ ہمیں جاگے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس دوران میں، میں نے اپنی حالت میں اتنی زیادہ ابتری محسوس نہیں کی تھی لیکن میرے مقابلے میں زرین کی حالت تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی اور اس کے واضح آثار اس کے وجود پر بھی نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسنے لگی تھیں اور رنگت سفید ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

جب ڈاکٹر چپ ہوا تو مجھے لگا جیسے وہ اب ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے لیکن وہ موجود تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی آواز آئی۔''میں دیکھ رہا ہوں اپنی ساتھی کی نسبت تمہاری توانائی ابھی برقرار ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''میں نے آہستہ سے کہا۔''ویسے بھی اس کی طبیعت پہلے بھی خراب تھی۔''

''نہیں میں نے اس کا علاج کر دیا تھا اور یہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ تم دونوں کی بلڈ رپورٹ بھی صحت مند ہے۔''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے تمہارے اندر قوتِ مدافعت زیادہ ہے۔''

''ڈاکٹر تمہیں اس کا کیا فائدہ ہے؟ میرا مطلب ہے تم یہ سب مالی مفاد کے لیے کر رہے ہو یا اپنی کسی ذاتی تسکین کے لیے۔''

''مالی مفاد کے لیے۔''اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''تب تم بین الاقوامی طاقتوں کے ایجنٹ ہوئے کیونکہ جہاں تک میرے علم میں ہے ہمارے ہاں اس قسم کے انسانیت سوز تجربات نہیں ہوتے ہیں۔''

''تم نے درست کہا......لیکن میں ایجنٹ نہیں ہوں میں آزادانہ کام کر رہا ہوں مجھے رقم کے عوض یہ پروجیکٹ ملا ہوا ہے۔ پروجیکٹ دینے والوں کو صرف نتیجہ درکار ہے۔''

''کیا یہ کوئی بایولوجیکل ویپن پروجیکٹ ہے؟''

''ایسا ہی ہے لیکن اس کی تفصیل مت پوچھنا وہ میں کسی کو نہیں بتا سکتا اپنے سائے کو بھی نہیں۔''

''تمہاری مرضی......لیکن یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو۔''

وہ چونکا۔''کیا مطلب؟''

''جب تم نے ایک باران لوگوں کے لیے کام کرنے کی ہامی بھر لی تو اب ان کے غلام ہو۔''

''یہ بکواس ہے۔'' وہ ذرا بھڑ کا تھا۔

میں آہستہ سے ہنسا۔''اگر ایسا ہے تو کبھی کسی موقع پر ان کو انکار کر کے دیکھنا......اس وقت تمہیں پتا چلے گا تم کتنے مجبور اور بے بس ہو۔ شاید ہم سے بھی زیادہ بے بس ہو۔''

''ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

میں کچھ سوچ رہا تھا۔''جب تم اس قسم کے بایولوجیکل ویپن پر کام کرتے ہو تو تمہارا مقصد ان کو اتنا طاقتور بنانا ہوتا ہے کہ کسی دوا یا علاج سے پہلے آدمی مر جائے میں نے ٹھیک کہا؟''

''تم نے ٹھیک کہا ہے۔''

''لیکن ساتھ ہی ان کا توڑ بھی تو تیار کیا جاتا ہوگا کیونکہ بایولوجیکل ہتھیار استعمال کے بعد ختم نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ پھیلتے ہیں اور اپنی تباہ کاری کا دائرہ وسیع کرتے ہیں۔''

''درست ہے جب ان کو تیار کیا جاتا ہے تو ان کا توڑ بھی تیار کیا جاتا ہے تا کہ جب ان سے کام لے لیا جائے تو ان کو ختم کیا جا سکے۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''یعنی تمہارے پاس اس جرثومے کا علاج ہے جو ہمیں لگایا گیا ہے؟''

''علاج نہیں توڑ ہے۔'' اس نے تصحیح کی۔''ایک بار یہ انسان کو لگ جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ہاں اسے پہلے ختم کیا جا سکتا ہے۔ ویسے اس کے علاج پر بھی کام جاری ہے لیکن فی الحال اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہاں ہم اس کی قید میں تھے اور اسے کسی طرح اپنے علاج پر مجبور نہیں کر سکتے تھے اگر اس بیماری کا کوئی علاج ہوتا تب۔ اس کا جواب سن کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کیا اس بار موت سچ مچ آنے والی تھی۔ اس سے پہلے بارہا ایسا ہوا جب موت بالکل سامنے تھی اور اس سے ملاقات کا یقین بھی ہو جاتا تھا لیکن اس وقت بھی میرے اندر کی وہ کیفیت نہیں ہوتی تھی جو میں اس وقت محسوس کر رہا تھا۔ پہلے حالات کتنے ہی بدترین کیوں نہ ہوتے بچنے کا موہوم سا سہی لیکن امکان باقی ہوتا تھا۔ اب تو وہ موہوم سا امکان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر نے تسلیم کر لیا تھا اس نے ہمیں ایسا جرثومہ لگا دیا تھا جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اگر اسی وقت سے ہمیں دنیا کے بہترین ڈاکٹر اور بہترین طبی سہولتیں بھی میسر آ جاتیں تب بھی بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے اندر مایوسی محسوس ہوئی تھی لیکن میں اس حالت میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ مایوسی کفر ہے۔ اپنی توجہ اس کیفیت سے ہٹانے کے لیے میں نے ڈاکٹر سے بات جاری رکھی۔

''ڈاکٹر یہ کام تو ترقی یافتہ ممالک کی انتہائی خفیہ تجربہ گاہوں میں کیے جاتے ہیں پھر ایک ایسے ملک میں

ان پر کام کیوں کیا جا رہا ہے جو تیسری دنیا میں ہے اور یہاں امن و امان کی صورتِ حال بھی تسلی بخش نہیں ہے۔''

''اس کی کئی ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو بین الاقوامی طور پر بایولوجیکل ویپن پر بَین ہے اور ترقی یافتہ ممالک میں رازداری ایک مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ اب میڈیا بہت تیز اور جدید طریقوں سے لیس ہو گیا ہے وہ اندر کی خبریں نکال لاتا ہے۔ دوسرے دنیا میں اب تعلیم عام ہو گئی ہے اور خاص طور سے سائنس کے ماہر ہر ملک میں ملتے ہیں۔ تیسری وجہ ان ممالک کا کرپٹ سسٹم ہے جو اس قسم کے پروجیکٹس کو سہارا دیتا ہے۔''

''ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تم لوگوں کو تجربات کے لیے زندہ انسان بھی مل جاتے ہیں جن کے بارے میں بعد میں کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے اور ان کے والی وارثوں کی کہیں شنوائی بھی نہیں ہوتی ہے۔''

''درست ہے۔'' اس نے ایک بار پھر بلا جھجک تسلیم کر لیا۔ ''اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے اور مقامی طور پر پروجیکٹ دینے والے مغربی ممالک ہر ذمے داری سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔''

''درست۔'' میرے انداز میں تلخی آ گئی۔ ''ان کے صرف ڈالرز خرچ ہوتے ہیں اور جان ہماری جاتی ہے۔ پھر مستقبل میں یہ ہتھیار ہم پر ہی تو استعمال ہونے ہیں۔ اس لیے وہ ان کا تجربہ بھی ہم پر ہی کر رہے ہیں۔ کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ تم کن لوگوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہو جو تمہیں کیڑے مکوڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں۔''

''مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں لاپروائی آ گئی۔ ''مجھے اس کام کا جو معاوضہ مل رہا ہے اس سے میں بہت مطمئن ہوں۔''

''شاید تم سوچ رہے ہو اس دولت سے لطف اندوز ہو سکو گے لیکن مجھے نظر آ رہا ہے تم مرتے دم تک ان لوگوں کی غلامی کرو گے اور تم ان کو انکار نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تمہیں بلیک میل کریں گے اور تمہاری دولت بھی ضبط کر لیں گے۔''

وہ کچھ دیر چپ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''اول تو ایسا نہیں ہوگا اور جب ایسا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔''

''اوکے تم اتنے خوش فہم ہو تو ٹھیک ہے، ویسے ہم پر جس جرثومے کا تجربہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً ابھی مکمل ہلاکت خیز نہیں ہوا ہے۔''

''نہیں ہلاکت خیز تو ہو گیا ہے لیکن یہ جان لینے میں بہت وقت لگاتا ہے۔ انسان ایک ہفتے میں جا کر مرتا ہے اور بایولوجیکل پیمانے پر یہ وقت بہت زیادہ ہے اور اس میں دشمن کو جوابی کارروائی کرنے کا بہت سارا وقت مل جاتا ہے۔''

''یعنی تمہارے آقا چاہتے ہیں کہ انسان جھٹ پٹ مر جائے؟''

''اس قسم کے ناقابلِ علاج جرثومے جو یقینی موت کا سبب بنتے ہیں وہ دیر لگاتے ہیں۔ ایسے بایولوجیکل ایجنٹ بھی ہیں جو گھنٹوں میں جان لے لیتے ہیں۔ مگر وہ خود بھی کمزور ہوتے ہیں اور بہت آسانی سے ختم ہو جاتے ہیں ان کو پھیلنے سے روکنا بھی آسان ہوتا ہے جب کہ دیر سے جان لینے والے ایجنٹس خود بہت مضبوط اور سرعت سے پھیلنے والے ہوتے ہیں اگر ایک بار یہ فضا میں آزاد ہو جائیں تو ان کو روکنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ٹیکنیکل چیزیں ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ یوں سمجھ لو کہ سو فی صد محفوظ بایولوجیکل ویپن بنانا تقریباً ناممکن

ہے کیونکہ ان کی تباہ کاری کا دائرہ لامحدود ہوتا ہے یہ سرحد پار کر کے اس ملک میں بھی پہنچ سکتا ہے جس نے اسے استعمال کیا ہو۔''

''اس کے باوجود ان کی تیاری کا کام پورے زور وشور سے جاری ہے۔''

''ہاں کیونکہ طاقتور بننے کا خناس انسان کے ذہن سے کبھی نہیں نکل سکتا ہے اور اس کے لیے وہ پوری دنیا کی تباہی قبول کرنے کو بھی تیار ہے۔'' اس نے سچ بیانی کی۔

میں اس موضوع سے اب بور ہو گیا تھا لیکن ساتھ ہی اس سے بات بھی جاری رکھنا چاہتا تھا اس لیے میں نے پوچھا۔ ''ہم سے پہلے تم کتنے لوگوں کو اس جرثومے کا نشانہ بنا چکے ہو؟''

''صرف دو افراد کو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کیونکہ باقی افراد صحت کے معیار پر پورے نہیں اترے تھے۔''

''وہ کتنے دن زندہ رہے تھے؟'' میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

''پانچ دن، لیکن میں اس سے مطمئن تھا اس لیے جرثومے کو مزید طاقتور بنایا گیا ہے اور تم دونوں کو اسی طاقتور جرثومے سے انفیکٹ کیا گیا ہے۔''

''اس کے وقت کے بارے میں کیا اندازہ ہے؟''

''تین دن۔'' اس نے پھر صاف گوئی سے جواب دیا اور پھر اضافہ کیا۔ ''زیادہ سے زیادہ۔''

''تم نے کہا تھا کہ علامات چوبیس گھنٹے میں ظاہر ہوں گی۔ اس میں کتنا وقت رہ گیا ہے؟''

''چھ گھنٹے۔'' اس نے بتایا تو میں حیران ہوا تھا یعنی ہمیں ہوش میں آئے ہوئے چھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو تین گھنٹے پہلے ہوش میں آئے تھے۔ میرے سر کا زخم اب بہتر حالت میں دکھن ہو رہی تھی لیکن پہلے جیسی نہیں تھی۔

''ہاں چھ گھنٹے بعد اس کے آثار نمایاں ہوں گے اور ایسا ہونے کے بعد صرف اڑتالیس گھنٹے کا وقت باقی رہ جائے گا۔''

''یعنی کل چون گھنٹے؟''

''ہاں تمہاری زندگیاں بس اتنی باقی رہ گئی ہیں۔'' وہ بے رحمانہ انداز میں بولا۔ ''ویسے میں دیکھ رہا ہوں تمہاری حالت اتنی خراب نہیں ہے تم اندر سے کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''درد اور عجیب سی اینٹھن محسوس ہو رہی ہے اور یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میری حالت بہتر ہے۔ میں بہر حال زرین کے مقابلے میں ایک سخت جان مرد ہوں۔''

''تمہاری باتوں کے دم خم سے، لیکن ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو بہر حال تمہاری مدد سے مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سخت جان لوگوں پر یہ کتنی دیر میں اثر کرتا ہے۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''ڈاکٹر انسان بہت سخت جان ہوتا ہے اسے مارنے کے کتنے ہی طریقے ایجاد کر لیے جائیں تب بھی یہ زندہ رہنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔''

''لیکن اس چیمبر میں زندہ رہنے کا کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔ یہاں سے صرف تمہاری روحیں نکل سکتی

ہیں۔'' اس نے پرغرور انداز میں کہا۔

''تم سے پہلے بھی کئی ایسے دعوے کرنے والے گزرے ہیں۔''

''دیکھتے ہیں تمہاری زندگی کب تک برقرار رہتی ہے۔''

''جب تک خدا چاہے گا تب تک تو برقرار رہے گی۔'' میں نے یقین سے کہا تھا۔

ڈاکٹر سے بات کرنے کے بعد مجھے اپنی کیفیت جاننے کا خیال آیا اور میں نے آہستہ سے زرین کو فرش پر لٹا دیا وہ سو رہی تھی یا غشی میں چلی گئی تھی۔ اسے لٹا کر پیروں پر اس کا لبادہ ٹھیک کیا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی پہلے بھی شاید جب میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی اور مجھے چکر آنے لگے تھے تو اس کی وجہ سر کی چوٹ تھی نہ کہ انفکشن تھا۔ میں نے چہل قدمی کی۔ جسم میں درد ہو رہا تھا لیکن یہ بہت زیادہ بے چین کرنے والا نہیں تھا۔ میرے مقابلے میں زرین کی حالت بہت تیزی سے خراب ہوئی تھی۔ اس کا چہرے کا رنگ اب مردے جیسا سفید ہو گیا تھا اور آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ وہ ان اٹھارہ گھنٹوں میں اس حد تک کمزور ہو گئی تھی کہ اس وقت بے ہوشی کی نیند سو رہی تھی۔ اچانک ڈاکٹر نے کہا۔

''اسے جگاؤ۔''

''نہیں اسے سونے دو۔'' میں نے اختلاف کیا۔

''بکو مت جگاؤ اسے۔'' وہ غرایا۔

''مگر کیوں؟''

''یہ میرا حکم ہے اسے جگاؤ۔''

''کیا تم مجھے اس کام کے لیے مجبور کر سکتے ہو؟''

''میں یہ کام خود کر سکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کچھ دیر بعد چیمبر میں کسی بڑے کتے کے بھونکنے کی بھیانک آواز گونجی۔ یہ آواز اتنی تیز تھی کہ اس نے کان کے بجائے دل پر اثر کیا تھا اور ایک لمحے کو میں بھی اچھل پڑا تھا۔ زرین نے سوتے سے چیخ ماری اور اچھل کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے پاس آیا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی اس کا بدن بری طرح لرز رہا تھا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی اور جیسے کان کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔

''کتے اپنی آواز بند کر۔''

لیکن ڈاکٹر نے اسپیکر پر اپنی ریکارڈنگ جاری رکھی تھی۔ زرین نے دونوں ہاتھوں سے کان دبا لیے تھے۔ بھونکنے کی آواز جیسے مجسم ہو کر چیمبر میں گھس رہی تھی۔ زرین خود بھی چیخ رہی تھی اور اس کے بدن کی لرزش بڑھتی جا رہی تھی پھر جیسے اچانک آواز شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک گئی۔ خاموشی ہوئی تو چند لمحے آواز دل و دماغ میں گونجتی رہی تھی یہ بہت بھیانک تجربہ تھا اس سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آواز انسان کے اعصاب پر اتنا خوفناک اثر ڈال سکتی ہے۔ زرین کو کچھ دیر میں احساس ہوا کہ آواز رک گئی ہے اس نے کان سے ہاتھ ہٹا لیے اور چیخ چیخ کر ڈاکٹر کو گالیاں دینے لگی۔ میں اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے چپ ہوئی تھی۔ اس کا جسم اب تک لرز رہا تھا اور منہ سے آدھی ادھوری گالیاں نکل رہی تھیں۔

''بی ایزی...... بی ایزی۔'' میں اسے تھپک رہا تھا۔
کچھ دیر بعد ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''کیسا رہا یہ تجربہ؟''
میرے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی چند کلاسک گالیاں نکل گئی تھیں پھر میں نے دھاڑ کر کہا۔ ''تم نہایت ذلیل انسان ہو...... انسانیت سے گرے ہوئے۔''
''تم کچھ بھی کہہ لو لیکن تمہیں اندازہ ہو گیا ہے اس چیمبر میں تمہیں میری ہر بات ماننا ہو گی۔ جب تک تمہارے جسموں میں روح ہے ورنہ میں تمہاری زندگی کو اسی طرح عذاب بنا سکتا ہوں۔ یہ مت سمجھنا میرے پاس صرف آواز کا عذاب ہے۔ میں چاہوں تو اس چیمبر کا درجہ حرارت منفی بیس ڈگری سینٹی گریڈ یا پچاس درجے سینٹی گریڈ کر سکتا ہوں اور یہ دونوں تم برداشت نہیں کر سکو گے۔''
''اس صورت میں تمہارے تجربے کے پیرامیٹرز بگڑ سکتے ہیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''
''نہیں۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے ایک نمونہ تم نے دیکھ لیا ہے۔''
''تم کیوں چاہتے ہو کہ یہ جاگتی رہے۔''
''سونے سے انسان کے جسم میں تبدیلی آتی ہے اور اس کی قوتِ مدافعت بڑھ جاتی ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ سو کر وقت گزارو۔''
''کیا مطلب ہم جب تک زندہ ہیں ہمیں جاگتے رہنا ہو گا؟''
''ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ تم دونوں آرام کر سکتے ہو لیکن سونے کی کوشش نہیں کرو گے اور اگر سوئے تو میں یہ آواز دوبارہ کھول دوں گا۔''
''ٹھیک ہے اس عذاب سے بچنے کے لیے ہم پوری کوشش کریں گے لیکن ہم نیند کے آگے بے بس بھی ہو سکتے ہیں۔''
''صرف چند گھنٹے کی بات ہے اس کے بعد تمہیں خود نیند نہیں آئے گی۔'' اس نے یقین سے کہا۔
''میں نہیں جاگ سکتی۔'' زرین بولی۔ ''مجھے لگ رہا ہے میرے جسم سے جان نکل رہی ہو۔''
''یقیناً تمہیں ایسا ہی محسوس ہو رہا ہو گا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں یہ صرف آغاز ہے۔'' اس معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آگے تمہیں اس سے کہیں زیادہ تکلیف سہنا پڑے گی۔''
''خدا کے لیے کیا تم چپ نہیں رہ سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح ذہنی اذیت دینے کا مقصد۔''
''یہ...... ثابت کرنا...... چاہتا ہے...... یہ نہایت گھٹیا...... اور ذلیل شخص...... ہے۔'' زرین نے رک رک کر کہا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ''حالانکہ...... اسے ثابت کرنے...... کی ضرورت نہیں ہے۔''
''تم مجھے کچھ بھی کہہ لو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' ڈاکٹر نے پُرسکون آواز میں کہا۔ ''مجھے صرف اپنے تجربے سے دلچسپی ہے۔''
''شاید تم نے اپنی ماں پر بھی کوئی تجربہ کیا ہو گا۔ تمہاری بہن اور شاید بیٹی بھی ہو گی ان کو اپنے تجربات میں استعمال کر لو۔'' زرین مشتعل ہو گئی تھی۔

''زرین پلیز چپ ہو جاؤ۔'' میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اس شخص کو گالیاں دے کر ہم سوائے اپنی اذیت میں اضافے کے اور کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔''

وہ رونے لگی۔ ''اس نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے اور ہم اسے گالیاں بھی نہ دیں۔''

''اس کا کوئی فائدہ جو نہیں ہے۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''ورنہ گالیاں تو مجھے بھی بہت آتی ہیں۔''

ڈاکٹر ہنسا۔ ''مجھے لگتا ہے تم میرے جیسا ذہن رکھتے ہو کوئی کام بے فائدہ نہیں کرتے ہو۔''

میں نے بھڑک کر کہا۔ ''خدا کے لیے مجھے کوئی گندی گالی دے لو لیکن خود سے مت ملاؤ...... بے شک کسی ناپاک جانور سے ملا دو۔''

اس کی ہنسی کافور ہو گئی اور اس نے خشک انداز میں کہا۔ ''بہت بول رہے ہو جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔''

زرین دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں پاؤں موڑ کر زانوں سامنے کیے ہوئے تھے۔ ''مت لگو اس سور کے منہ تم لیٹ جاؤ کب سے مجھے لیے بیٹھے تھے۔''

میں ہچکچایا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''پلیز۔'' اس نے التجا کی۔ ''میں صرف تمہارے لیے اس طرح بیٹھی ہوں۔''

میں دیکھ رہا تھا وہ بہت مشکل سے بیٹھی تھی اور یقیناً میرے لیے بیٹھی تھی۔ وہ ہماری موت کو سامنے دیکھ رہی تھی اور مرنے سے پہلے میرے حوالے سے اپنے دل کی خواہشات پوری کر لینا چاہتی تھی۔ میں فرش پر بیٹھا اور پھر اس کے زانوں پر سر رکھ لیا۔ اس کے مرجھا جانے والے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ اس نے ذرا جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''شہباز...... آئی لو یو۔''

''میں جانتا ہوں...... اور میں تمہاری محبت کا احترام کرتا ہوں۔''

وہ ہنسی۔ ''چالاک آدمی صرف احترام کرتے ہو۔''

''ہاں کیا احترام کافی نہیں ہے؟''

''نہیں...... یہ کافی سے بہت زیادہ ہے سچ تو یہ ہے کہ میں اس لائق نہیں ہوں۔''

''ایسا مت کہو، تم قابلِ احترام ہو۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''کیا تم سچ مچ ایسا ہی سمجھتے ہو؟''

''ہاں تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

میرے خفا لہجے پر وہ ہنسی۔ ''مجھے یقین ہے میں تو بس چھیڑ رہی تھی۔''

''تم ایسا مت سوچا کرو۔''

''اب سوچنے کے لیے رہ کیا گیا ہے۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''تم نے سنا یہ منحوس کیا کہہ رہا ہے ہمارے پاس گھنٹوں کا وقت رہ گیا ہے۔''

''زرین زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ مت سوچو کہ ہمارے پاس وقت ہے یا نہیں۔''

''میں اس کی وجہ سے یہ بات نہیں کہہ رہی ہوں میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے اندر سے کوئی

کہہ رہا ہے میرا آخری وقت آ گیا ہے اور یہ بات میں نے ابھی نہیں اس وقت محسوس کر لی تھی جب اس نے مجھے کوئی دوا دی تھی اور میری طبیعت خراب ہوئی تھی۔''

''ہمارے مقدر میں جو لکھ دیا گیا ہے وہ تو ہو کر رہے گا تو ہم پہلے سے سوچ سوچ کر خود کو ٹینشن کیوں دیں؟''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس کا لہجہ تھک گیا۔ ''لیکن کیا کروں انسان ہوں نا۔''

میں دیکھ رہا تھا اس کے لیے اس انداز میں بیٹھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میرے سر کا بوجھ اس کی گداز رانوں پر تھا اور اسے برداشت کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے اٹھنے دو تم تھک رہی ہو لیٹ جاؤ۔''

''نہیں لیٹے رہو۔'' وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ''تم میرے پاس لیٹے ہو مجھے سکون مل رہا ہے۔''

''زرین اس طرح تمہاری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہونے دو اب طبیعت ٹھیک رکھ کر کرنا بھی کیا ہے۔'' وہ ضدی انداز میں بولی۔ ''پلیز مجھے خوش ہونے دو۔''

بادلِ ناخواستہ میں نے سر ہلایا۔ ''جیسے تم خوش رہو۔''

''تمہیں میری خوشی کی پروا ہے؟''

''ہاں اسی لیے تو جیسے تم کہہ رہی ہو میں کر رہا ہوں۔''

''تب مجھے ایک بار اور پیار کرو۔ بس ایک بار اس کے بعد میں پھر نہیں کہوں گی۔''

''تم جتنی بار کہو گی اتنی بار کروں گا۔'' میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ اس کے گرم آنسو میرے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ اس کے ہونٹ پہلے سے زیادہ خشک، سرد اور مرجھائے ہوئے ہو رہے تھے لیکن آنسوؤں کی گرمی اس کا ازالہ کر رہی تھی۔ اچانک اسے کھانسی آئی اور اس نے سر اوپر کر لیا۔ کھانسی بے قابو تھی اور میں جلدی سے اٹھ گیا۔ اسے تھام کر اس کی پشت سہلائی اور اسی لمحے اسے شدت کی کھانسی آئی تھی۔ اس نے ہاتھ منہ پر رکھ لیا تھا اور جب ہاتھ ہٹایا تو وہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چیخ اٹھی۔ ''شہباز...... یہ دیکھو...... میرے منہ سے خون آ رہا ہے۔''

خون دیکھ کر میرا دل ایک لمحے کو رکا تھا اور پھر میں نے چیخ کر ڈاکٹر کو آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں موجود ہوں۔'' اس کی آواز آئی۔

''زرین کے منہ سے خون آ رہا ہے۔''

''میں دیکھ رہا ہوں۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ علامات کا آغاز ہو گیا ہے۔''

''آگے کیا ہوگا؟''

''مزید خون آئے گا...... صرف منہ سے نہیں بلکہ ہر جگہ سے نکلے گا۔''

''کمینے آدمی تم نے ہمیں کون سا وائرس لگایا ہے؟''

''اب بتانے میں حرج نہیں ہے۔ یہ ڈیڈلی ایبولا وائرس ہے۔ ایک بار یہ کسی شخص کو لگ جائے تو اس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے صرف تقدیر ہی اسے بچا سکتی ہے۔ میں نے اس پر کام کیا اور اسے انسانوں کے لیے مزید مہلک بنا دیا۔ پہلے یہ ایک ہفتے میں جان لیتا تھا اور اس کا شکار بعض اوقات بچ بھی جاتا تھا لیکن اب یہ صرف تین دن میں جان لیتا ہے اور جسے ایک بار لگ جائے اس کے بچنے کا امکان لاکھ میں سے ایک بھی نہیں رہتا ہے۔''

''کاش تم ایک بار میرے ہاتھ آ جاؤ۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''یہ ممکن نہیں ہے اس چیمبر کی دیواریں اور دروازہ اتنا مضبوط ہے کہ کوئی ہاتھی بھی اسے نہیں توڑ سکتا اور تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ ابھی تم میں علامات نمودار نہیں ہوئی ہیں لیکن اس میں زیادہ دیر بھی نہیں ہے۔''

میں زرین کو سنبھالنے لگا جو کھانس کھانس کر بے حال ہوئی جا رہی تھی اور ہر بار کھانسنے پر اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اُڑتے تھے۔ جو اس کے اور میرے لباس اور فرش کو سرخ کر رہے تھے۔ ''زرین کھانسی روکنے کی کوشش کرو۔''

''نہیں...... رک...... رک...... رہی۔'' وہ کھانسی کے دوران میں بولی۔ ''شہباز میں نے کہا تھا نا کہ میں نہیں بچوں گی۔''

میں اس کی پشت سہلانے لگا۔ اس چیمبر میں ہم گنی پگ کی طرح قید تھے۔ گنی پگ ان سفید چوہوں کو کہتے ہیں جن پر لیبارٹریز میں مختلف تجربات کیے جاتے ہیں۔ یہاں کھانا تو ایک طرف پانی کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر کہہ چکا تھا کہ یہ چیمبر صرف ہماری لاشیں اٹھانے کے لیے کھولا جائے گا۔ بڑی مشکل سے زرین کی کھانسی قابو میں آئی لیکن اس دوران میں اس کے منہ سے ڈھیروں خون نکل چکا تھا۔ اور وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو گئی تھی۔ اس کا لبادہ سامنے سے خون سے سرخ ہو رہا تھا اور فرش پر بھی جا بہ جا خون نظر آ رہا تھا۔

میں نے ایبولا وائرس کے بارے میں سنا تھا کہ اس کا تعلق بنیادی طور پر افریقہ سے ہے اور وہیں سے یہ ساری دنیا میں پھیلا ہے۔ جیسے ایڈز کا وائرس افریقہ سے پھیلا ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ دونوں وائرس اصل میں تخلیق کیے گئے تھے اور مغرب کی تجربہ گاہوں میں ان کو ناقابلِ شکست بنا کر افریقہ میں انسانوں پر ان کے تجربات کیے گئے تھے اور وہیں سے یہ ساری دنیا میں پھیل گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس شک کی تصدیق کر دی تھی۔ جب اس وائرس کو یوں بایولوجیکل ویپن میں تبدیل کیا جا رہا تھا تو یہ بھی ممکن تھا کہ کسی زمانے میں اسے سچ مچ کسی لیبارٹری میں تخلیق کیا گیا ہو۔

زرین کی حالت بتا رہی تھی کہ وائرس نے اس پر پوری طرح اثر کر لیا تھا اور اس کی خوفناک علامات نمایاں ہو رہی تھیں۔ یہ وائرس بخار اور شدید درد پیدا کرتا ہے اور بالآخر اندرونی و بیرونی جریان خون کا سبب بنتا ہے اور مریض کا اسی وجہ سے انتقال ہو جاتا ہے۔ زرین کو بخار نہیں ہوا تھا لیکن درد والی کیفیت تھی اور اب جریان خون شروع ہو گیا تھا۔ اس کا آغاز منہ سے خون آنے سے ہوا تھا۔ کھانسی رکنے کے بعد وہ نیم غشی کی حالت میں آ گئی تھی میں اسے بازوؤں میں لے کر بیٹھ گیا۔

''ڈاکٹر تم انسانیت کے مجرم ہو اور مجھے یقین ہے تم بچو گے نہیں۔''

''میرا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔'' اس نے رعونت بھرے انداز میں کہا۔''میں نے پہلے ہی بہت کما لیا ہے اور اس پروجیکٹ کی تکمیل پر مجھے ایک بڑی رقم ملے گی۔ اس کے بعد میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میری ساری دولت سوئیس بینکوں میں ہے اور میں یورپ میں مزے سے رہوں گا۔''

''شاید ایسا ہی ہو لیکن ڈاکٹر اگر ایسا نہیں ہوا اور تم یہیں مکافاتِ عمل کی گرفت میں آگئے تو تم نے سوچا ہے وہ تمام دولت ایسے ہی پڑی رہ جائے گی؟''

''میں بے کار کی باتیں نہیں سوچتا ہوں۔'' اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔''ویسے تم سے بات کر کے مزہ آرہا ہے اس سے پہلے جو دو افراد اس چیمبر میں ڈالے گئے تھے وہ بالکل جاہل دیہاتی تھے اور مرنے سے پہلے دن رات مجھے گالیاں دیتے رہے تھے۔''

''میری تعلیم نے مجھے کیا فائدہ دیا کہ میں دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال سکوں گا اور مر جاؤں گا۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔''مجھ سے اچھے تو وہ جاہل رہے جو تمہیں گالیاں دے کر مرے۔''

''ایک نے تو میرا دماغ اتنا خراب کر دیا تھا کہ میں چیمبر میں گھس کر اسے شوٹ کرنے والا تھا۔''

''حالانکہ میرا نہیں خیال کہ تمہارے اندر اتنی غیرت باقی ہوگی کہ تم کسی کی گالیوں سے بدمزہ ہو سکو۔''

''تم چاہو تو ایسا بھی کہہ سکتے ہو۔'' وہ اپنے تجربے کو خون رنگ لاتے دیکھ کر خوش تھا اس لیے اس کا موڈ اچھا تھا۔

میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے میرا جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا لیکن زرین کی حالت دیکھنے اور ڈاکٹر کی باتیں سننے کے بعد ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جلد تلے کوئی گرم گرم سی چیز سرسرا رہی ہو۔ کیا مجھے بھی اندرونی جریان خون شروع ہو گیا تھا؟ میں نے اپنے ہاتھ کا معائنہ کیا لیکن اس کی کھال پر ایسی کوئی علامت نہیں تھی۔ اندرونی جریان خون کی اولین علامت کھال پر نمودار ہونے والے سرخ دھبے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی دھبے زرین کے ہاتھ پر نمودار ہو رہے تھے۔ میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی اس لیے میں نے ہاتھ سے زرین کا منہ صاف کیا جو خون آلود ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟'' ڈاکٹر نے مزہ لینے والے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ہماری اور خاص طور سے زرین کی حالت دیکھ کر خوش ہو رہا ہو۔''یہ اس وقت بھی خاصی خوب صورت لگ رہی ہے۔'' اس نے زرین کے بارے میں اکسانے والے انداز میں کہا۔ میں اس بار بھی خاموش رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔''میں نے اتنی حسین عورتیں بہت کم دیکھی ہیں افسوس میں یہ ذوق نہیں رکھتا ہوں۔ ورنہ ممکن ہے اس چیمبر میں آنے سے پہلے یہ کچھ وقت میرے بیڈ روم میں گزارتی۔''

میری جلد تلے سرسراہٹ بڑھ رہی تھی اور سرسرانے والی چیز میں حدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اس کے بعد بھی دیر تک بکواس کرتا رہا تھا اور اس نے مجھے اکسانے کے لیے بعض ناقابلِ برداشت قسم کی باتیں بھی کی تھیں لیکن میں خاموش رہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تقدیر نے موقع دیا تو ایک بار ہی بولوں گا ورنہ یونہی چپ کر کے مر جاؤں گا۔ اس روز میں نے جانا کہ انسانیت دشمنی کوئی جرم نہیں بلکہ ایک سنگین نفسیاتی مرض ہے اور اس مرض میں مبتلا آدمی بہ ظاہر کتنا ہی پڑھا لکھا، مہذب اور شائستہ نظر آئے اصل میں وہ نفسیاتی مریض ہوتا ہے اس کی

تعلیم اور شخصیت اس کے پردے ہوتے ہیں جن کے پیچھے وہ اپنا مرض چھپاتا ہے۔ ان میں اور پاگلوں میں ایک فرق ہوتا ہے کہ پاگل شعوری نفسیاتی مریض ہوتا ہے اور یہ لاشعوری مریض ہوتے ہیں اپنے مرض کے بارے میں خود بھی نہیں جانتے ہیں۔ یہ خود کو دماغی طور پر صحت مند خیال کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ شدید قسم کے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔

زرین کی ناک سے بھی خون آنے لگا تھا۔ یہ قطرہ قطرہ کر کے ٹپک رہا تھا جسے میں ہاتھ سے صاف کرتا تھا اور ہاتھ زمین پر صاف کرتا تھا۔ بے حد سفید چیمبر میں خون کی سرخی نمایاں ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کتنا وقت گزر گیا تھا۔ ڈاکٹر تھک ہار کر چپ ہو گیا تھا۔ ایک بار اس نے شاید خاموشی کی سزا دینے کے لیے کتے کی آواز سنوائی تھی لیکن اب یہ آواز نہ تو زرین پر اور نہ ہی مجھ پر اثر کر رہی تھی۔ جب اس نے ریکارڈنگ روکی تو میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس سے اچھی اس کتے کی آواز تھی اسے سن کر کم اذیت ہوئی تھی لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔ زرین کو ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور اس بار بھی اس کے منہ سے بہت سارا خون آیا تھا۔ ناک سے آنے والے خون کی مقدار بھی بڑھ گئی تھی۔

زرین کے ہاتھ اور ٹانگوں پر دھبے نمودار ہو رہے تھے۔ اس کی گلابی جلد جو پہلے سفید ہوئی تھی اب سرخ دھبوں سے داغ دار ہوتی جا رہی تھی۔ کھانسی کے دوسرے دورے کے بعد وہ ہوش میں آ گئی تھی لیکن اس میں بولنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی جب کوشش کرتی تو اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلتے تھے۔ موت کی زردی اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھی۔ میں نے اسے بولنے سے منع کر دیا اور پہلے کی طرح بازوؤں میں لے کر بیٹھ گیا۔ وہ شدید تکلیف میں تھی کیونکہ اس کا جسم رہ رہ کر کانپ اٹھتا تھا اور اس کے منہ سے ضبط کے باوجود کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ اپنی موت سے پہلے بے بسی سے اسے مرتا دیکھتا رہوں۔ بہت دیر بعد جا کر اسے ذرا سکون ملا تو وہ سو گئی تھی۔ نہ جانے یہ سکون بھی کیسے ملا کیونکہ اس کی حالت تو ہر گزرتے لمحے خراب ہی ہو رہی تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ ہمیں انفیکٹ ہوئے ایک دن سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس چیمبر میں دن رات کا کوئی تصور نہیں تھا یہاں مستقل طور پر تیز روشنی تھی اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وقت کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ بس ایک اندرونی گھڑی کہہ رہی تھی کہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ علامات ظاہر ہونے کا وقت چوبیس گھنٹے بعد کا تھا لیکن زرین میں یہ علامات پہلے نمودار ہو گئی تھیں اور مجھ میں ابھی تک نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ زرین کا جسمانی دفاعی نظام مضبوط نہیں تھا اس نے وائرس کے آگے جلدی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ میرا جسم مضبوط تھا اور ابھی تک اس خوفناک جرثومے سے لڑ رہا تھا لیکن کب تک؟ بالآخر وہ حاوی ہو ہی جاتا کیونکہ یہاں علاج تو ایک طرف رہا کھانا پانی بھی میسر نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد جسم کچھ نہ کچھ کمزور ہوا تھا اور اس طرح وائرس کے لیے آسانی پیدا ہو رہی تھی۔ مستقل بیٹھے رہنے سے میرا جسم تھکنے لگا تھا اور اب میں زرین کو پہلے کی طرح لے کر نہیں بیٹھ سکتا تھا اس لیے میں اسے لے کر فرش پر دراز ہو گیا۔ وہ سو رہی تھی اور حرکت سے اس کی نیند خراب ہو گئی تھی اور اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''شہباز تم کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی اس نے ذرا اٹھ کر میرے چہرے

اور جسم کا معائنہ کیا اور دوبارہ لیٹ گئی۔

''شکر ہے تم میں علامات نظر نہیں آ رہی ہیں۔''

''کب تک نظر نہیں آئیں گی۔ میں ذرا مضبوط ہوں اس لیے اس بیماری کا دیر سے نشانہ بنوں گا۔''

''نہیں تم بچ جاؤ گے۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''پتا ہے میں نے ابھی خواب میں بھی دیکھا ہے۔''

''کیسا خواب...... کیا دیکھا ہے؟''

''بہت اچھا اور بہت مزے کا خواب ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور یقین کرو اسے دیکھنے کے بعد میرا درد کم ہو گیا ہے۔''

وہ جس کیفیت میں تھی ایسے میں انسان کا دماغ اسے بچے کی طرح بہلاتا ہے۔ انسان کو خواب دکھاتا ہے شاید اسے بھی دماغ نے کوئی ایسا ہی خوش کن خواب دکھایا تھا میں نے کہا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''پتا ہے میں نے کیا دیکھا۔'' وہ پُر جوش ہو گئی۔ ''میں نے ایک بہت بڑی وادی دیکھی جس میں پہاڑ، درخت، پودے اور زمین ہر چیز نور کی بنی تھی اور میں وہاں اکیلی ہوں۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی ایسا لگا جیسے میں مرنے کے بعد جنت میں آ گئی ہوں۔ میں وادی کے بالکل سامنے ہوں لیکن جب میں اس میں جانے کی کوشش کرتی ہوں تو میرے قدم رک جاتے ہیں۔'' وہ چپ ہو کر سانس درست کرنے لگی مارے جوش کے وہ نان اسٹاپ بول رہی تھی اس لیے سانس پھولنا لازمی تھا مجھے تو تعجب ہوا کہ اس حالت میں وہ بول کیسے رہی ہے؟ جب کہ پہلے اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ سانس بحال کر کے اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''میں نے پوچھا کہ مجھے کیوں نہیں جانے دیا جا رہا ہے تو ایک آواز آئی۔ ابھی تمہارے آنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں تو اس آواز نے بتایا کہ میں ابھی زندہ ہوں اس لیے یہاں نہیں آ سکتی۔ ہاں جب میں مر جاؤں گی تو یہاں آؤں گی۔ یقین کرو یہ سن کر میں مرنے کے لیے بے تاب ہو گئی تھی۔ میں اس وادی میں داخل ہونے کے لیے دس بار مرنے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ وہ جگہ اتنی خوبصورت تھی۔''

''تم نہیں مرو گی۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''شہباز اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن اس خواب کو دیکھنے کے بعد مجھے یقین آ گیا ہے کہ خدا نے مجھے معاف کر دیا ہے۔''

''زرین یہ صرف ایک خواب ہے......''

اس نے میری بات کاٹی۔ ''نہیں یہ صرف ایک خواب نہیں ہے شہباز میں نے جو دیکھا ہے مجھے یقین ہے یہ خواب نہیں ہے اور میں نے تم کو پورا تو سنایا ہی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے سناؤ۔''

''نہیں۔'' اس نے مچل کر کہا۔ ''پہلے تم مانو یہ خواب نہیں ہے۔''

''اچھا بابا میں نے مان لیا تم نے جو دیکھا ہے وہ خواب نہیں بلکہ سچ ہے۔'' میں مسکرایا۔ ''تم بالکل بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو۔''

''ہاں میں وہاں خود کو بچی ہی محسوس کر رہی تھی جو اپنے گھر آ گئی ہو۔ شہباز وہاں اتنا سکون اور قرار تھا کہ

میں تمہیں لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔ جو میرے سوالوں کا جواب دے رہا تھا وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی اتنی شفیق اور محبت بھری آواز میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی۔ میں نے اسے خود پر گزرنے والی سنائی اور اس شخص کی شکایت کی تو اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ دنیا میں، میں نے جو گزاری ہے اس کے صلے میں مجھے یہ جگہ دی جائے گی۔ پھر میں نے تمہارے بارے میں پوچھا۔''

''میرے بارے میں؟'' میں چونک گیا۔

''ہاں میں نے تمہارے بارے میں پوچھا تو پتا ہے اس شخص نے کیا جواب دیا؟''

''نہیں مجھے کیسے پتا ہوگا۔''

''اس نے کہا ابھی تمہارا وقت نہیں آیا ہے اور اس دنیا میں شہباز کو ابھی بہت سارے کام کرنے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے تعجب کا اظہار کیا۔ ورنہ مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ اس نے خواب دیکھا ہے اور خواب میں انسان وہی دیکھتا ہے جو اس کے لاشعور میں ہوتا ہے۔ ''اس شخص نے جو شاید کوئی فرشتہ تھا ایسا کہا؟''

''ہاں وہ کوئی فرشتہ ہی تھا اس وقت مجھے خیال نہیں آیا لیکن ابھی تم نے کہا ہے تو مجھے خیال آ رہا ہے وہ واقعی کوئی فرشتہ تھا اور اس نے ایک بہت عجیب سی بات کی اس نے کہا شہباز کو وہ شخص بچائے گا جسے وہ اپنا دشمن سمجھتا ہے اور پھر تم میرا بدلہ لو گے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' ڈاکٹر کا ذکر آنے پر میرا خون کھول اٹھا تھا اسے جہنم رسید کرنے کے لیے اگر مجھے مرشد سے ہاتھ ملانا پڑتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ ایسا شخص مرشد ہی تھا جسے میں اپنا دشمن سمجھتا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ میں جذباتی ہو کر زرین کے خواب کو سچ سمجھ رہا تھا حالانکہ خواب تو صرف خواب ہوتا ہے۔ زرین نے غور سے مجھے دیکھا۔

''تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے نا؟''

''نہیں تو......'' میں گڑبڑا گیا۔

''نہیں یہی بات ہے اور تم کیا کوئی بھی سنے تو مرنے سے پہلے اسے میرا دماغی ہذیان ہی سمجھے گا لیکن شہباز نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے ایسا ہی ہوگا۔''

''مجھے یہ تو یقین ہے کہ خدا تمہارے ساتھ بہت اچھا کرے گا کیونکہ تم نے زمانے کے مظالم برداشت کیے ہیں اور خود کسی پر ظلم نہیں کیا ہے لیکن اس پر یقین نہیں آ رہا......''

''کہ تم بچ جاؤ گے؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔

''جب کہ میری خواہش ہے کہ میرے خواب کا پہلا حصہ درست ہو یا نہ ہو لیکن دوسرا حصہ ضرور ٹھیک ہو۔''

''ایسا کوئی امکان نہیں ہے کہ میرا کوئی جانی دشمن مجھے بچا لے اور خود میرا ضمیر بھی گوارا نہیں کرے گا کہ اپنے دشمن سے مدد مانگوں۔''

''ممکن ہے یہ ڈاکٹر بچا لے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ بھی تو ہمارا دشمن بنا ہوا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دشمنی انسان سے کی جاتی ہے اور یہ شخص انسان نہیں ہے۔''

''اس طرح دیکھا جائے تو مرشد بھی انسان نہیں ہے لیکن تم اسے دشمن سمجھتے ہو۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا کہ اس کے انسان نما جسم میں کس قدر حیوانیت بھری ہوئی ہے۔''

زرین بات کر رہی تھی اچانک میری نظر اس کے پیروں کی طرف گئی وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کی رانوں کے پاس فرش پر خون جمع ہو رہا تھا یہ تازہ خون تھا جو اس کے جسم سے خارج ہو رہا تھا۔ میری نظر اور چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ چونکی اور پھر اس نے بھی خون دیکھ لیا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہوئی تب اسے پتا چلا کہ اس کے جسم کے نیچے خاصی مقدار میں خون جمع ہو چکا تھا اور اس کا مسلسل اخراج جاری تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے پیروں کے درمیان گیا اور جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو وہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے جسم کے دوسرے حصوں سے بھی خون کا اخراج شروع ہو گیا تھا اور یہ مقدار میں بہت زیادہ تھا۔

''شہباز۔'' اس نے سسکی لی۔ ''میں مرنے والی ہوں۔''

میں لرز اٹھا۔ ''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔''

اس نے خون آلود ہاتھ اوپر کیا۔ ''یہ دیکھو...... اب نیچے سے بھی خون آ رہا ہے۔ اسی رفتار سے خون بہتا رہا تو میں کتنی دیر زندہ رہوں گی۔'' وہ رونے لگی اور میں تھکے انداز میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ سوائے زبانی تسلی اور جسمانی سہارے کے میں اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ زرین نے جلد خود پر قابو پا لیا وہ ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی اور پھر اس خواب نے بھی اس کے ذہن پر اچھا اثر ڈالا تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ دنیاوی تکلیف کے بدلے خدا نے اسے معاف کر دیا ہے اور دوسری دنیا میں ایک اچھی زندگی اس کی منتظر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تکلیف اور کمزوری کے باوجود اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

''شہباز کیا وجہ ہے کہ اب تک تمہارے جسم پر علامات نمودار نہیں ہوئی ہیں؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں اندر سے تکلیف اور بے چینی والی کیفیت تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔''

''لیکن چوبیس گھنٹے سے کہیں زیادہ وقت گزر چکا ہے اور اس کا کہنا ہے اتنی دیر میں علامات لازمی نمودار ہو جائیں گی۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری طرف جھکی اور بہت آہستہ سے بولی۔ ''ممکن ہے تم پر اس کا جان لیوا اثر نہ ہوا ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے...... ڈاکٹر نے اس وائرس کو اتنا خطرناک بنا دیا ہے کہ یہ آدمی کی جان لیے بغیر نہیں رہتا۔''

''یہ درست کہہ رہا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''دیر سے سہی لیکن اس پر اثر ہوگا۔ جیسے تم پر وقت سے پہلے ہو گیا اس پر......''

''اپنی بکواس بند کرو۔'' زرین نے مشتعل ہو کر کہا۔

''آرام سے تمہیں پھر کھانسی نہ آ جائے۔''

''اب تو تمہاری دوسری جگہوں سے بھی خون آنے لگا ہے۔'' ڈاکٹر نے اذیت دینے والے انداز میں

کہا۔اس سے پہلے زرین اس پر کوئی ردِعمل ظاہر کرتی میں نے اس سے کہا۔

''زرین بھونکنے دو اسے اس پر توجہ دینے کا مطلب ہے قدرت نے ہمیں جو مہلت دی ہے اس قیمتی وقت میں سے اسے حصہ دیں اور یہ شخص اس قابل نہیں ہے اس لیے اس کی بات سنو ہی مت۔''

زرین نے سوچا اور سر ہلایا۔''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... واقعی ہمارے پاس بہت کم وقت رہ گیا...... نہیں ہمارے نہیں صرف میرے پاس اور میں اس کا ایک ایک لمحہ تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔''

مسلسل خون نکلنے سے زرین کا منہ اور ناک سوج گئی تھی اور آنکھیں جن کے گرد پہلے حلقے تھے اب متورم ہوگئی تھیں۔اس کی رنگت زیادہ سفید ہوگئی تھی اور اس پر نمودار ہونے والے خونی دھبے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ چند گھنٹوں کے اندر وہ بدل کر رہ گئی تھی۔لگ ہی نہیں رہا تھا یہ وہی حسین اور دل کش زرین ہے جسے دیکھ کر مجھ جیسے مضبوط آدمی کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ بیماری اور اس کے اثرات نے اس کی ساری دل کشی چھین لی تھی۔اس کی کھلی رانیں سرخ دھبوں سے بھر گئی تھیں اور ممکن ہے کوئی اور دیکھتا تو اسے ان سے گھن آتی۔

موت میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے میں نے اس سے پہلے بھی بے شمار انسانوں کو بے شمار طریقوں سے مرتے دیکھا تھا۔ان میں انسانی لاشوں کا حشر بھی دیکھا تھا لیکن زرین جس طرح لمحہ بہ لمحہ مر رہی تھی اسے دیکھنا بہت مشکل کام تھا۔شدید تکلیف اور کمزوری کے باوجود اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا اور حوصلے سے آنے والی موت کا سامنا کر رہی تھی اس کے باوجود میرے لیے بہت دشواری تھی۔ اس روز میں نے جانا کہ موت کے سامنے انسان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، امیر، غریب، فقیر، بادشاہ، گناہ گار اور ولی اللہ سب موت کے سامنے آکر برابر ہو جاتے ہیں۔اسے کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ جسے لے جا رہی ہے اس کی دوسروں کے لیے کیا حیثیت ہے اور وہ کسی کے لیے کتنا ضروری ہے۔زرین میرے شانے سے سر ٹکائے مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''تم دکھی ہو رہے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے گہری سانس لی۔''موت ایک حقیقت ہے آج ہم نے اور کل دوسروں نے مر جانا ہوتا ہے۔مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

''جب موت آتی ہے تو کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔'' اس نے ایک آفاقی حقیقت سادہ سے انداز میں بیان کر دی۔''ڈاکٹر، علاج اور دوائیں خود کو تسلی دینے والی بات ہیں اگر آدمی کی موت نہیں آئی ہے تو ان چیزوں کے بغیر بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''ہاں ہو تو جاتا ہے لیکن ان چیزوں کی بھی اہمیت ہے لوٹ پوٹ کر الٹا سیدھا ٹھیک ہونے اور ایک باقاعدہ علاج سے ٹھیک ہونے میں فرق ہوتا ہے۔''

''وہ تو ہے لیکن اس میں اصل اہمیت زندگی کی ہے۔''

''میرے نزدیک اصل اہمیت اس کی ہے کہ آپ زندگی گزارتے کس طرح ہیں۔''

''شہباز تمہاری سوچ بہت وسیع ہے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی میں بہت چھوٹی سوچ والی عورت ہوں اور یقین کرو میں نے زندگی اور موت کے بارے میں ساری عمر اتنا نہیں جانا ہے جتنا ان چند گھنٹوں میں جان گئی

ہوں۔''

اس کی سانس پھر پھولنے لگی تھی اور اس کے لہجے میں کمزوری غالب آتی جارہی تھی۔ وہ تھک کر چپ کر گئی۔ میں نے اس کی کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے مزید سہارا دیا تھا۔ اس کا خون جا بہ جا میرے جسم پر لگا تھا اور اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کا لبادہ جو پہلے آف وائٹ رنگ کا تھا اب خون سے مکمل طور پر سرخ ہو گیا تھا۔ بازو اور ٹانگیں مکمل طور پر دھبوں سے بھر گئی تھیں اور ان میں سے بعض دھبوں سے تو خون بھی رس رہا تھا۔ اس کا جریان خون انتہا کو پہنچ رہا تھا اور وہ کسی اسپتال میں ہوتی تو اب تک اسے کئی بوتل خون دیا جا چکا ہوتا۔

میں اسے لیے بیٹھا رہا اور جب تھک جاتا تو لیٹ جاتا تھا۔ پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا شاید دو دن ہو چکے تھے۔ یہ بات مجھے ڈاکٹر بتا سکتا تھا اور اس سے بات کرنے یا اس کی آواز سننے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی آواز سنائی دی تو میں خود پر ضبط کھو دوں گا اور وہ کچھ کہوں گا جو اپنی زبان سے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ زرین کے جسم کے نچلے حصے سے خون کا اخراج مسلسل جاری تھا اور وہ جہاں بیٹھی تھی وہ ساری جگہ خون سے سرخ ہو گئی تھی۔ اسے زیادہ دیر والی کھانسی تو نہیں آئی تھی لیکن جب بھی کھانستی تو منہ سے خون کے چھینٹے اُڑتے تھے۔ میں نے کہا۔

''تم سو جاؤ۔''

''شاید نیند نہ آئے۔''

''کوشش تو کرو۔'' میں نے اصرار کیا۔

اس نے انکار کر دیا۔ ''نہیں میں جب تک زندہ ہوں جاگتی رہنا چاہتی ہوں۔ اندر سے مجھے تکلیف ہے لیکن تمہاری قربت میں بہت سکون مل رہا ہے اگر میں سو گئی تو اس سکون سے محروم رہ جاؤں گی اس لیے مجھے جاگتے رہنے دو۔''

''یہ جھوٹ کہہ رہی ہے اس وقت آدمی شدید اذیت میں ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔ وہ مسلسل ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہماری باتیں سن رہا تھا۔ زرین نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

''یہ کتا بھونکا ہے یا ڈاکٹر بولا ہے۔''

''ایک ہی بات ہے۔''

''اس سے کہو یہ لیلیٰ بننے کا ناٹک بند کر دے۔'' ڈاکٹر کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ ''تم کو بتائے کہ یہ کتنی تکلیف محسوس کر رہی ہے۔''

''تم کچھ بھی کہتے رہو لیکن حقیقت یہ ہے مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔'' زرین نے جواب دیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ موت سے زیادہ تکلیف دہ چیز اور کوئی نہیں ہوتی ہے لیکن اگر یہ موت کی تکلیف ہے تو زیادہ نہیں ہے۔ اس میں تو میں بہت آرام سے مر سکتی ہوں۔''

''میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے بے یقینی سے کہا۔ ''میں نے اس وائرس کے شکار افراد کو مستقل سکون آور دواؤں کے زیر اثر رکھے دیکھا ہے ان سے اس کی اذیت برداشت نہیں ہوتی ہے کیونکہ ان کا پورا جسم زخمی ہو جاتا ہے۔''

''اس کی حالت دیکھ کر تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا کہ اس کا پورا جسم زخمی ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسی وجہ سے تو مجھے حیرت ہے۔''

''تمہیں حیرت ہو گی کیونکہ انسان کی قوتِ برداشت کے بارے میں بہت کم جانتے ہو۔ تم اسے اپنے پیمانے سے دیکھ رہے ہو کہ اگر ایسی تکلیف تم کو ہو تو تم اسے برداشت نہیں کر سکو گے۔''

''تم میں بیماری کی علامتیں نمودار نہیں ہوئی ہیں۔'' اس کا لہجہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ ''پہلے جن دو افراد پر اس کا تجربہ کیا گیا تھا ان میں سے ایک کی صحت تم سے بھی اچھی تھی اس کے باوجود اس میں علامات چوبیس گھنٹے میں نمودار ہو گئی تھیں۔''

''یہاں کتنا وقت گزر چکا ہے؟''

''دو دن اور دو گھنٹے۔''

''آج ہمیں یہاں تیسرا دن ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں یہ مرنے کے قریب ہے اور تم ٹھیک نظر آ رہے ہو۔''

زرین ہماری باتیں سن رہی تھی اور خوش نظر آ رہی تھی اس نے کہا۔ ''میں نے ٹھیک کہا تھا نا تم بچ جاؤ گے۔''

''فرض کرو ڈاکٹر اگر وائرس نے مجھ پر اثر نہیں کیا تو؟''

''ایسا ممکن نہیں ہے۔'' اس نے کہا لیکن اس کا لہجہ یقین سے عاری تھا۔ ''یہ وائرس اتنا خطرناک کہ اس سے بچنا ناممکن ہے۔''

''یہ تو تمہارا خیال ہے۔''

''میرا خیال نہیں۔'' وہ بھڑکا تھا۔ ''یہ حقیقت ہے۔''

زرین سے اب بیٹھا نہیں جا رہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز مجھے لٹا دو۔''

''فرش سرد ہے۔''

''اس کے باوجود لٹا دو۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''مجھ سے بالکل بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔''

اس کے اصرار پر میں نے اسے فرش پر سیدھا لٹا دیا۔ اس کے منہ، ناک اور کان سے سیاہی مائل خون رس رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں تازہ سرخ خون باقی نہیں رہا ہے۔ اس کا سانس بھی مدہم ہو گیا تھا اور سانس لینے کے لیے اسے باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز میرا آخری وقت آ گیا ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ایسی باتیں مت کرو تم......''

''مجھے جھوٹی تسلی مت دو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شہباز میری دو باتیں مانو گے؟''

''اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور مانوں گا۔''

''جب تم بچ جاؤ اور حالات بھی تمہارے قابو میں ہوں تو مجھے اپنے ہاتھ سے دفن کرنا۔''

میں کانپ گیا تھا لیکن اس سے وعدہ کر چکا تھا اس لیے سر ہلا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''اور دوسری خواہش یہ ہے کہ میری قبر گم نام ہو اس کے بارے میں کسی کو علم نہ ہو۔''

''میں کوشش کروں گا۔''

''یہ دونوں لازمی خواہشیں نہیں ہیں اگر تم کو مشکل ہو یا تم کو مناسب نہ لگے تو جیسا مناسب ہو ویسا کرنا۔'' وہ آہستہ آواز میں جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ اس کی سانس اب پھول نہیں رہی تھی بلکہ وہ سانس ہی بہت کم لے رہی تھی۔

''جیسا تم نے کہا ہے میں ویسا کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''شکریہ...... مجھے یقین ہے تم ایسا کرو گے اب میں مرجانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں میں اس کا ہاتھ ہاتھ میں لیے دوزانو اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اب اس کے مساموں سے بھی خون رسنے لگا تھا اور یہ مرض کی انتہا تھی جس کے بعد صرف موت کا مرحلہ رہ جاتا تھا۔ اس کا چہرہ سوج گیا تھا اور آنکھیں بھی اندرونی جریان خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے شکایت کی تھی کہ اسے ٹھیک سے نظر نہیں آرہا ہے۔

''تم آنکھیں بند کر لو۔''

اس نے فرماں برداری سے آنکھیں بند کر لیں اور بولی۔ ''شہباز تم مجھے پسند کرتے ہو؟''

''میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔''

''مجھے یاد رکھو گے۔''

''میں تمہیں بھولوں گا تو یاد کروں گا۔''

اس کے سوج جانے والے ہونٹ ذرا سے پھیلے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس نے مسکرانے کی کوشش کی ہے۔

''اب میں سکون سے مرسکوں گی۔''



اس کی حالت دیکھ کر میرے اندر سے کسی نے کہا کہ اب اسے مرجانا چاہیے۔ وہ اگرچہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن وہ اذیت میں تھی۔ جس لمحے میں نے سوچا اسی لمحے اس کا جسم ایک دو لمحے کو اینٹھا اور پھر نرم پڑ گیا۔ مجھے ذرا دیر سے احساس ہوا کہ اس کا سینہ ساکت ہو گیا تھا۔ وہ مرگئی تھی۔ میں نے سینے پر سر رکھ کر اس کی دل کی دھڑکن دیکھنا چاہی لیکن وہاں خاموش چھا چکی تھی۔ بدن کا پنجرہ روح کے پنچھی سے خالی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا وہ اتنی خاموشی سے مرگئی تھی۔ پھر جب یقین آیا تو میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔

''زرین مجھے معاف کر دینا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ میں تو شاید اپنے لیے بھی کچھ نہ کر سکوں۔''

''یہ مرگئی ہے۔'' میں سیدھا ہوا تو ڈاکٹر کی آواز گونجی۔ ''اسے مرنے میں دو دن دو گھنٹے اور چالیس منٹ لگے۔''

''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟'' مجھے اپنی آواز کا سکون اجنبی لگا تھا جیسے یہ میری نہیں کسی اور کی آواز ہو۔ ''میں کب تک مروں گا؟''

''مجھے یقین ہے تمہارا نمبر جلد آجائے گا۔''

''دعا کرو ایسا ہی ہو ڈاکٹر ورنہ تمہارے لیے بہت برا ہوگا۔''

''تم اگر نہ بھی مرو تو......'' ڈاکٹر کہتے کہتے رک گیا پھر اس کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ''سر یو آر......؟''

''یس آئی ایم......واٹس ہیپنڈ ہیراز۔'' ایک آواز آئی اور میں اسے پہچان کر دنگ رہ گیا تھا۔

ایسا لگا جیسے زرین کی موت کے صدمے اور مرض تے میرے جسم و ذہن پر قبضہ کر لیا تھا اور میری سماعت متاثر ہونے لگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ڈیوڈ شا کی آواز سنی ہو۔ اس ڈیوڈ شا کی آواز جو کچھ عرصے پہلے تک میرے پیچھے پڑا تھا اور جس نے انڈیا میں بھی مجھے قابو کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کام کے لیے خاص طور سے اس نے پاکستان سے فتح خان کو انڈیا بلوایا تھا اور اسے بدمعاشوں کی ایک پوری ٹیم ہائر کر کے دی تھی اس کے باوجود وہ مجھے پکڑنے میں ناکام رہا تھا لیکن اس کے بعد اچانک ہی خاموش ہو گیا تھا۔ ممکن ہے راجا عمر دراز سے اس کا ٹاکرا چل رہا ہو لیکن وہ مجھے اپنے آس پاس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے اچانک ہی غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر مجھے اپنی سماعت پر شک ہوا تھا۔ کیا وہ ڈیوڈ شا ہی تھا؟

''سر کام جاری ہے۔'' ڈاکٹر کی مؤدبانہ آواز آئی۔ ''ان دونوں پر تجربہ کیا ہے۔ لڑکی مر چکی ہے۔ وقت دو دن، دو گھنٹے اور چالیس منٹ رہا ہے۔ البتہ مرد ابھی زندہ ہے۔''

میں سر جھکائے بیٹھا تھا اس لیے آنے والا میری صورت نہیں دیکھ پا رہا تھا اس نے پوچھا۔ ''ہُو اِز ہی؟''

اس بار کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ ڈیوڈ شا ہی تھا میں نے اس کی آواز پوری توجہ سے سنی تھی اور میرے دماغ نے تصدیق کی تھی آواز ڈیوڈ شا کی ہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ''اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے تم خود دیکھ سکتے ہو میں کون ہوں اور تمہاری یادداشت کمزور نہیں ہے تو مجھے پہچان بھی سکتے ہو۔''

''شہباز؟'' ڈیوڈ شا کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تم...... یہاں؟''

''آپ اسے جانتے ہیں سر؟'' مجھے ڈاکٹر کے لہجے میں گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

''ہاں میں اسے جانتا ہوں۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ شاک سے گزرنے کے بعد دوبارہ سرد ہو گیا تھا میں نے اسے ہمیشہ اسی لہجے میں بات کرتے سنا تھا اس کے انداز میں شاذ ہی جذبات کی رمق آتی تھی۔ ''کیا یہ بھی انفکٹڈ ہے؟''

''یس سر یہ اور لڑکی مجھے ساتھ ہی ملے تھے اور میں نے ان کو ایک ساتھ انجکشن دیا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''کہاں ملے تھے؟''

''راستے میں...... میں اسلام آباد سے آ رہا تھا۔''

''یہ طریقہ بہت رسکی ہے۔''

''میں جانتا ہوں سر لیکن موقع ملا تو میں نے فائدہ اٹھا لیا۔''

ڈیوڈ شا کے ذہن میں کیا تھا اس کا اندازہ مجھے کیا اس کے سامنے موجود ڈاکٹر توفیق کو بھی نہیں تھا۔ ڈیوڈ شا نے مجھ سے پوچھا۔ ''شہباز تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''اگر تمہاری مراد اس مرض کی علامات سے ہے تو تم خود بھی دیکھ سکتے ہو میں اندر سے بہتر محسوس نہیں کر

رہا ہوں۔''

''اس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز ہے سر، دو دن گزرنے کے بعد بھی اس میں علامات نمودار نہیں ہوئی ہیں۔''

''میرا خیال ہے علامات نمودار بھی نہیں ہوں گی۔'' ڈیوڈ شا بولا۔

''یہ ممکن نہیں ہے سر...... وائرس اس کے جسم میں ہے۔ دیر سے لیکن اس پر بھی اثر......''

''تم اسے نہیں جانتے ہو۔'' ڈیوڈ شا نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہ بتاؤ اسے چیمبر سے نکالا جا سکتا ہے؟''

''ہاں اگر احتیاط کے ساتھ نکالا جائے۔'' ڈاکٹر نے ہچکچا کر کہا۔ ''لیکن سر اس کی کیا ضرورت......''

''تب اسے باہر نکالو اور اس کا معائنہ کرو۔''

ڈاکٹر توفیق پریشان ہو گیا تھا۔ ''کیا ایسا کرنا مناسب ہوگا سر۔ میرا مطلب ہے اٹ از ٹو ڈینجرس اینڈ رسکی۔''

''ہاں یہ میرا حکم ہے اگر یہ بچ سکتا ہے تو اسے ہر قیمت پر بچانا ہے۔''

اس بار ڈاکٹر توفیق کی الرٹ آواز آئی۔ ''یس سر آئی ٹرائی مائی بیسٹ فار ہم۔''

میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور میری نظر زرین پر مرکوز تھی۔ وہ زمین پر سیدھی دراز تھی۔ اس کے خون آلود ہاتھ پاؤں پھیلے ہوئے تھے اس نے خواب دیکھا تھا کہ ایک دشمن میری جان بچائے گا تو کیا اس کا خواب سچ ثابت ہونے والا تھا۔ وہ خود جان سے گزر گئی تھی اور مجھے زندگی کی نوید سنا گئی تھی اس کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے اور مجھے لگا جیسے اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی تھی جیسے کہہ رہی ہو، دیکھا میں نے کیا کہا تھا تم کو کچھ نہیں ہوگا تم بچ جاؤ گے۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا کیا ڈیوڈ شا تمہارا دشمن نہیں ہے۔ میں نے گہری سانس لے کر دل میں کہا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے ذرا آگے ہو کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

اچانک مجھے لگا کہ میرا سر چکرا رہا ہے تب میں نے آس پاس دیکھا۔ فرش کے پاس دیوار سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ چیمبر میں یقیناً کوئی گیس چھوڑی تھی۔ اس کے اثر سے میرا سر چکرانے لگا تھا میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن نہیں اٹھ سکا اور پھر اسی جگہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ڈیوڈ شا کی ہدایت پر عمل شروع کر دیا تھا۔ مجھے یہاں سے نکالا جانا تھا اور اس کے لیے سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ مجھے بے ہوش کر دیا جائے۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ ہوش میں ہونے کی صورت میں، میں اندر آنے والے کسی آدمی کو نہیں چھوڑوں گا چاہے وہ کتنا ہی مسلح ہو کر کیوں نہ آئے۔ اس لیے چیمبر سے نکالنے کا سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ پہلے مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بیڈ پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ ٹخنوں سے گردن تک میرا جسم چار مضبوط ترین بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا۔ بیڈ کے چاروں طرف پلاسٹک کی نیم شفاف چادریں لٹک رہی تھیں جیسی کہ قرنطینہ میں رکھنے والے مریضوں کے بیڈ کے گرد لگائی جاتی ہیں تاکہ مرض کا چھوت باہر نہ جانے پائے۔ میرے جسم سے کچھ آلات منسلک تھے جو مانیٹر پر میرے دل کی دھڑکن، نبض اور بلڈ پریشر بتا رہا تھا۔ میرا جسم اور ذہن سکون والی

کیفیت میں تھا ایسا لگ رہا تھا کہ بے ہوشی کے دوران مجھے کوئی ایسی دوا دی گئی تھی جس سے مجھے جسم کا درد محسوس نہیں ہو رہا تھا اور نہ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے درد محسوس ہو رہا تھا۔

درد کے ساتھ ہی بھوک اور پیاس کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی لیکن بندشیں بہت سخت اور مضبوطی سے بندھی تھیں۔ اس بار ڈاکٹر نے پہلے کی طرح ڈھیلا بندوبست نہیں کیا اگر چہ وہ بندوبست بھی اچھا تھا لیکن عام آدمیوں کے لیے میرے جیسے آدمی نے اس کا توڑ نکال لیا تھا۔ اس لیے اس نے پہلے سے زیادہ محفوظ انتظام کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی وہی تہہ خانہ تھا یا مجھے کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا یا سرے سے اس کوٹھی سے کہیں اور لے جایا گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ جگہ اسی تہہ خانے میں تھی۔

اگر میں یہاں تھا تو زرین بھی یہیں موجود تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میرا دل بوجھل ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کی موت کی حقیقت کو قبول کر لیا تھا لیکن ساتھ ہی میں اس کے لیے شدید دکھ محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان چند بدنصیب ترین افراد میں سے تھی جن سے میں ملا تھا۔ زندگی میں اسے کوئی خوشی کوئی رشتہ نہیں ملا اور اب ایک ظالم نے اس سے اس کی زندگی بھی چھین لی تھی۔ پتا نہیں ان لوگوں نے اس کی لاش کا کیا ہوگا؟ امکان تو یہی تھا کہ اسے کسی طرح سے ضائع کر دیا ہوگا کیونکہ اس سے دوسروں کو انفکشن کا پورا خطرہ ہوتا ہے۔ اس وائرس کی تباہ کاری میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے صرف دو دن میں زرین کی جان لے لی تھی۔ میرے جسم میں بھی وائرس موجود تھا۔ اگر چہ اس نے ابھی تک مجھے متاثر نہیں کیا تھا ورنہ میرے مساموں سے بھی خون نکلنا شروع ہو چکا ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ میں وائرس سے متاثر کیوں نہیں ہوا تھا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی اور پلاسٹک کے پردوں کے باہر کہیں کوئی ہلکی روشنی والا انرجی سیور روشن تھا اور اس کی روشنی پردوں سے جھلک کر اندر آ رہی تھی۔ ماحول پُراسرار سا نیم تاریک تھا۔ یہاں بھی وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے لیٹا رہا تھا پھر میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”یہاں کوئی ہے؟“

کوئی جواب نہیں ملا اس لیے میں نے سوال کو ایک ناقابلِ اشاعت لفظ کے ساتھ دہرایا۔ اس کا مثبت ردِعمل ہوا تھا اور چند منٹ بعد کہیں دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور چند لمحے بعد ایک طرف سے پردہ ہٹا اور ایک شخص اندر آیا۔ آنے والے نے سر سے پاؤں تک مخصوص قسم کا سفید لباس پہن رکھا تھا اس کے چہرے پر ماسک اور آنکھوں والی جگہ شیشہ تھا۔ اس کی شکل نہیں پہچانی جا رہی تھی لیکن جب وہ بولا ڈاکٹر توفیق ثابت ہوا تھا۔

”شہباز ملک کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”یہ تو تم بہتر جانتے ہو گے ڈاکٹر تم ہو اور دوسرے میں اس وقت وہ سکون محسوس کر رہا ہوں جو کسی دوا سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اصل حالت کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

ماسک کے پیچھے سے اس کی آواز پُرشور سانسوں میں دب رہی تھی شاید یہ کسی قسم کا فلٹر تھا اور اس سے ہوا کھینچنا پڑتی تھی۔ شور اسی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا۔ ”حیرت انگیز تم انفکٹڈ نہیں ہوئے ہو حالانکہ تم کو بھی اسی مقدار میں انجکشن دیا تھا جتنا اس لڑکی کو دیا تھا۔“

اس کی بات سن کر مجھے کوئی خوشی یا ردِعمل محسوس نہیں ہوا تھا میں اندر سے پُرسکون رہا تھا۔ ”تم نے بھی سنا

ہو گا جب اس نے مجھے اپنا خواب سنایا تھا کہ میرا ایک دشمن مجھے بچائے گا؟''

''ہاں مجھے حیرت ہے۔ اس نے درست کہا تھا اب میں تمہاری جان بچانے پر مجبور ہوں۔''

میں ہنسا۔ ''اول تو تم میری جان نہیں بچا رہے ہو کیونکہ میں وائرس سے متاثر نہیں ہوا ہوں دوسرے میرے دشمن تم نہیں ہو۔ وہ دشمن ڈیوڈ شا ہے۔ اور وہ مجھے وائرس سے نہیں اصل میں تم سے بچا رہا ہے کیونکہ اگر میں انفکٹڈ نہ بھی ہوتا تو تم مجھے نہیں چھوڑتے اور کسی دوسرے طریقے سے مار دیتے۔''

''وہ تمہارے دشمن ہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''تب انہوں نے تم کو بچانے کا حکم کیوں دیا ہے؟''

''یہ بات تو تم اس سے جا کر پوچھو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے کیا تم ڈیوڈ شا کے لیے کام کرتے ہو؟''

''میں تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' اس نے انکار کر دیا۔

''مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں جانتا ہوں ڈیوڈ شا جہاں بھی ہوتا ہے کمانڈر وہی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سیٹ یقینی طور پر اس کے لیے کام کر رہا ہے۔''

''تم جو چاہے سمجھتے رہو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور مڑ کر عقب میں موجود ٹرالی سے ایک سرنج اٹھائی۔ اس میں دوا پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سرنج سے ہوا نکالی اور میرے بندھے بازو پر انگلیاں مار مار کر نس ابھارنے لگا۔ اس کے ہاتھوں پر بھی دستانے تھے۔ وہ مکمل حفاظتی بندوبست کے ساتھ آیا تھا۔

''یہ کیسا انجکشن ہے؟''

''یہ وائرس کا توڑ ہے اسے ختم کرتا ہے۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ میں انفکٹڈ نہیں ہوں۔''

''وائرس تمہارے جسم میں موجود ہے اس نے تمہیں متاثر نہیں کیا ہے لیکن کسی دوسرے کو لگ گیا تو وہ ضرور جان سے جائے گا اس لیے اسے ختم کرنا ضروری ہے۔ یہ انجکشن وائرس کو ختم کرنے کے لیے ہے۔'' اس نے کہا اور سوئی میری نس میں اتار دی۔ اس نے اسپرٹ لگی روئی سے جگہ کو صاف کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ انجکشن دینے کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا اور خالی سرنج پلٹ کر ٹرالی پر رکھ دی۔ پھر گھوم کر میری طرف جھکا۔ ''تم حیرت انگیز آدمی ہو اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں قید میں رکھ کر اس وائرس کے مزید تجربات کرتا۔''

''لیکن یہ تمہارے بس میں نہیں ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔ ''ویسے تمہیں یاد ہے میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔''

''مجھے یاد ہے لیکن مجھے امید نہیں ہے تم اسے پورا کر پاؤں گے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ امید تمہیں کیوں ہے؟'' میں نے غور کیا۔ ''تمہارے خیال میں اب بھی امکان ہے کہ میں اس وائرس کا شکار بن جاؤں؟''

''امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''ہاں اس کا امکان ہے کہ تم پر توڑ کام نہ کرے اور وائرس اگر ختم نہیں ہوا تو کبھی نہ کبھی تم پر اثر کرے گا۔''

''لیکن اس صورت میں تم اپنے آقا کو کیا جواب دو گے جس نے مجھے بہر صورت بچانے کا حکم دیا ہے۔''

''میں خدا تو نہیں ہوں جو کسی کو مارنا یا بچانا میرے اختیار میں ہو۔'' وہ عیاری سے بولا۔ ''اگر میری کوشش کے باوجود تم نہ بچ سکے تو میرا قصور نہیں ہوگا۔''

''لیکن جب میں اور زرین ڈیتھ چیمبر میں تھے تب تو تم سمجھ رہے تھے کہ ہماری زندگی اور موت تمہارے اختیار میں ہے؟''

''اس وقت تھی اب نہیں ہے۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ وہ جانے کے لیے مڑا تھا کہ میں نے اس سے سوال کیا۔

''کیا ایک انجکشن سے یہ وائرس میرے جسم سے ختم ہو جائے گا؟''

''نہیں اس کے لیے تمہیں مزید چار انجکشن اور دینا ہوں گے۔ ایک تمہیں بے ہوشی کے دوران دیا جا چکا ہے۔ ممکن ہے اس دوران میں تمہاری طبیعت خراب ہو لیکن تمہیں برداشت کرنا ہوگا کیونکہ تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں کوئی پین کلر نہیں دیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن ابھی تو مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی ہے۔''

''تم اسی دوا کے زیر اثر ہو جو تمہیں چیمبر میں اور اس سے پہلے بلٹ کے ذریعے دی گئی تھی۔'' اس نے کسی قدر فخریہ انداز میں کہا۔ ''یہ خاص دوا میری اپنی ایجاد ہے۔ اسے کسی بھی طرح انسانی جسم میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ ٹھوس صورت میں منہ سے کھلائی جا سکتی ہے۔ مائع صورت میں انجکٹ کی جا سکتی ہے اور گیس کی صورت میں دی جا سکتی ہے اور اتفاق سے تمہیں تینوں صورتوں میں دی جا چکی ہے۔''

مجھے زرین کا خیال آ رہا تھا۔ ''تم نے میری ساتھی کی لاش کے ساتھ کیا کیا؟''

''جلا دیا۔'' اس نے نارمل انداز میں بتایا۔ ''اس قسم کی انفکٹڈ ڈیڈ باڈیز کو جلا دیا جاتا ہے۔''

مجھے یہی خدشہ تھا۔ اس سے کچھ کہنا بے کار تھا کیونکہ وہ انسانی حس سے عاری شخص تھا وہ کسی کے لیے کسی دوسرے آدمی کے جذبات کو کیا سمجھتا۔ وہ پردے سے باہر نکل رہا تھا کہ میں نے اسے روکا۔ ''ایک بات اور بتاتے جاؤ...... ڈیوڈ شا سے ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں؟''

''میں ان سے کہہ دیتا ہوں۔ اب ان کی مرضی کہ وہ تم سے ملتے ہیں یا نہیں۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا۔

وہ ٹرالی سمیت کمرے سے چلا گیا تھا۔ یہ کوئی کمرہ تھا جسے شاید ایئر ٹائٹ طریقے سے بند کیا ہوگا تاکہ میرے جسم میں موجود ایبولا وائرس کسی صورت باہر نہ نکل سکے۔ ڈاکٹر توفیق نے کہا تھا کہ وائرس کے توڑ والے انجکشن سے مجھے تکلیف ہوگی۔ پھر مجھے اس کے لہجے سے شرارت کی بو آ رہی تھی۔ شاید میرے معاملے میں وہ ڈیوڈ شا کو بھی بے وقوف بنا رہا تھا اس کا مجھے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ ایک بار میں اس کے قبضے سے نکل جاتا تو اس کی خیر نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا میں اسے کسی صورت نہیں بخشوں گا۔ فی الحال تو میں بے بسی سے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اپنی مرضی سے اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ مگر مجھے خدا پر بھروسہ تھا میں فی الحال بے بس تھا آنے والا وقت میرا ہوگا اور تب میں اس وقت کا ازالہ کر سکوں گا۔ مجھے صبر و تحمل سے اس وقت کا انتظار کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے جسم میں بے چینی محسوس ہوئی۔ سکون والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ شاید انجکشن کا اثر ہو رہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا بھول گیا تھا کہ انجکشن کتنی دیر بعد لگے گا۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ بے ہوشی کے دوران

میں ہی مجھے ایک انجکشن دیا جا چکا تھا۔ اور ہوش میں آنے کے بعد دوسرا انجکشن دیا گیا تھا۔ شاید ہر چھ گھنٹے بعد انجکشن دیا جانا تھا۔ اس صورت میں مکمل کورس تیس گھنٹے میں ختم ہو جاتا جس میں سے شاید چودہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ یعنی مزید سولہ گھنٹے بعد اس بات کا پتا چل جاتا کہ میرے جسم سے وائرس ختم ہوا ہے یا نہیں۔ اگر ڈاکٹر مجھے اس کے توڑ کا انجکشن ہی دے رہا تھا تو۔ کیونکہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے توڑ کے بجائے کچھ اور دے رہا ہو۔ ڈیوڈ شاباس سہی لیکن وہ ان معاملات کا ماہر تو نہیں تھا۔ مگر دوسرے معاملات کی طرح میں اس معاملے میں بھی بے بس تھا۔ یعنی ڈاکٹر توفیق کے اوپر تھا وہ میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا اور ایسی ہی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی جیسی ہوش میں آنے کے بعد ڈیتھ چیمبر میں محسوس ہوئی تھی۔ کیا ڈاکٹر نے مجھے دوبارہ وائرس لگایا تھا بجائے اس کا توڑ لگانے کے۔ جسم میں بھینچا ہوا درد ہو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جسم کھینچ رہا ہو۔ کبھی کبھی موسم سرما کے آغاز میں جب موسم بدلتا تھا تو مجھے ہلکا سا بخار ہو جاتا تھا اور اس میں کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ جب حویلی میں تھا تو موڈ بہت خراب ہو جاتا تھا اور اس وقت میں کمرے میں پڑا رہتا تھا لیکن جب اسلام آباد میں اکیلا ہو گیا تو ایسے وقت میں کہیں ڈرائیو پر نکل جاتا۔ ایک بار مونا کے گھر چلا گیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ آئندہ جب بھی مجھے ایسا محسوس ہو تو میں اس کے گھر چلا آیا کروں وہ میری دیکھ بھال کرے گی لیکن میں نے اس کی پیش کش سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نہ جانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ مونا اکیلی رہتی تھی اور میں تعلق میں رکھ رکھاؤ کا قائل ہوں۔ اس لیے میرے دل میں اس کے لیے کتنے ہی برادرانہ جذبات سہی میں نے کبھی اس کے گھر بلا وجہ جانے یا وہاں دیر تک رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ وہ پاگل لڑکی مجھے بالکل بھائیوں کی طرح چاہتی تھی۔ پھر بھی میرا اور اس کا خون کا رشتہ نہیں تھا اور جہاں تعلق منہ بولے رشتوں کا ہو وہاں آدمی کو رکھ رکھاؤ کا خیال رکھنا چاہیے ورنہ اس سے بہت خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

جسم میں بے چینی سے مجھے اپنا موسمی بخار اور اس سے مونا یاد آ گئی۔ پھر سب یاد آنے لگے۔ سفیر، وسیم، سادھنا اور بیتو یاد آئے۔ پھر وہ یاد آئی جس کی یاد دل میں ایسے رہتی تھی جیسے جسم میں روح رہتی ہے۔ میں اتنے دن سے غائب تھا نہ جانے ان سب پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اگر سفیر اور وسیم آ گئے تھے تو وہ پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کر رہے ہوں۔ بیتو تو سچ مچ پاگل ہو گیا ہو گا کیونکہ اس کا کہنا تھا اب اس دنیا میں اگر اس کا کوئی تھا تو وہ میں تھا۔ عبداللہ کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا وہ میرے لیے میرے ساتھیوں سے کم پریشان نہیں ہو گا لیکن وہ ایک ملازم تھا اور اس کے کندھے پر بہت ساری ذمے داریوں کا بوجھ تھا اسے میری فکر کے ساتھ ان سے بھی عہدہ برا ہونا تھا۔

جب آدمی تنہا ہو اور کچھ کرنے کے لائق نہ ہو تو اپنے پیاروں کے بارے میں سوچنے سے بہتر کوئی کام ہو نہیں کر سکتا ہے کیونکہ اس کے مقدر میں جو لکھا جا چکا ہے وہ تو ہونا ہوتا ہے۔ تقدیر کے آگے آدمی بے بس ہوتا ہے اگر اس قید خانے میں میری موت لکھی تھی تو اسے آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس لیے اس کے یا آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔ میں سوچتا رہا اور سب کو یاد کرتا رہا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ بھی مجھے یاد کر رہے ہوں گے۔ میں اس وقت چونکا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مجھے حیرت ہوئی کیا تیسرے

انجکشن کا وقت ہو گیا تھا؟ ابھی زیادہ وقت تو نہیں گزر اتھا۔ کم سے کم مجھے تو ایسا ہی لگ رہا تھا کہ ڈاکٹر کو گئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔ وہ ٹرالی سمیت آیا تھا یعنی انجکشن کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔

''کیا حال ہیں؟''

''میرے جسم میں درد اور بے چینی ہو رہی ہے۔ کہیں تم نے پھر مجھے وائرس والا انجکشن تو نہیں دیا ہے؟''

''میرے بس میں ہوتا تو یہی کرتا۔'' اس نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''لیکن باس کا حکم ہے اس لیے مجبور ہوں۔''

''تم اپنے باس کو بے وقوف بھی تو بنا سکتے ہو۔ ڈیوڈ شا ان معاملات کا ماہر نہیں ہے۔ اگر تم اسے بے خبری میں رکھ کر مجھے توڑ کے بجائے کوئی اور انجکشن دے دو تو اسے کیا پتا چلے گا؟''

اس نے سرنج تیار کی ہوئی تھی۔ ''تم نہیں جانتے ہو باس ماہر نہیں ہے لیکن اسے ان چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ معلوم ہے۔ کوئی اسے بے وقوف سمجھنے یا بنانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

میرے ذہن میں وائرس کے بارے میں ایک سوال دیر سے کلبلا رہا تھا موقع ملنے پر میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا۔ ''ایبولا وائرس کس طرح پھیلتا ہے؟''

''یہ انسان سے انسان کو لگتا ہے۔ یعنی کوئی انفکٹ شخص کے پاس جائے اور اسے چھوئے تب لگ سکتا ہے۔ مریض نے جس چیز کو چھوا ہو اس سے بھی لگ جاتا ہے۔ اس طرح انتقال خون سے بھی لگتا ہے۔''

''انسانی جسم میں یہ کہاں کہاں ہوتا ہے؟''

''سارے جسم میں ہوتا ہے۔ خون میں، تھوک میں اور حد یہ کہ جسم کی سطح پر بھی پایا جاتا ہے۔ کسی کو چھونے سے بھی لگ جاتا ہے۔'' اس نے کہا اور سرنج میری نس میں داخل کر دی۔ سرنج خالی کر کے اس نے واپس ٹرے میں رکھی۔ ''لیکن اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ تم سے یہ وائرس مجھے لگ سکتا ہے تو تم سو فیصد غلط سوچ رہے ہو کیونکہ اس لباس میں، میں مکمل محفوظ ہوں اور یہاں سے باہر جانے کے بعد اوزون اسپرے سے اس لباس کو صاف کیا جاتا ہے۔ یعنی تم سے کسی کو انفکشن لگنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔''

''اس وضاحت کا شکریہ ویسے مجھے کوئی خیال نہیں آیا کہ میں تمہیں انفکشن لگا سکتا ہوں۔ یہ تمہارے اپنے دل کا چور ہے۔''

اس بار وہ زیادہ دیر نہیں رکا تھا اور میں نے بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ اب میرا جسم ایک شدید قسم کے بے چین کرنے والے درد کا شکار ہو گیا تھا۔ شاید یہ وائرس کے توڑ کا اثر تھا جو میرے جسم پر مرتب ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی جب اس وائرس کا توڑ تھا تو اسے مریضوں پر کیوں استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ میں نے ایبولا وائرس کے بارے میں سنا ہے کہ عام طور سے اس کا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب آدمی وائرس کا شکار ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس کا کوئی نہ کوئی ٹیسٹ بھی تو ہوتا ہوگا جس سے پتا چل جاتا ہوگا کہ آدمی کو وائرس لگ گیا ہے لیکن ابھی متحرک نہیں ہوا ہے۔ اس وقت اس توڑ سے علاج کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر توفیق اب مجھے انجکشن دے رہا تھا اسی طرح کسی اور مریض کو بھی دیئے جا سکتے تھے لیکن میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی کہ ایبولا وائرس کا کوئی توڑ ایجاد ہو گیا ہے ایڈز کے وائرس کی طرح اس سے بھی صرف احتیاط سے بچاؤ ممکن تھا ایک بار یہ کسی کے

جسم میں داخل ہو گیا تو اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اگر بندے کی قسمت میں مزید زندہ رہنا ہے تو بچ جائے گا ورنہ اناللہ۔

درد اب جسم ٹوٹنے اور تڑخنے کی حد تک پہنچ گیا تھا اور میں ہلنا چاہتا تھا لیکن اتنی مضبوطی سے بندھا تھا کہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر تو میں برداشت کرتا رہا پھر میں نے چلا کر کہا۔ ''ڈاکٹر حرامزادے مجھے کھولو...... میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔''

ظاہر ہے کوئی جواب نہیں آیا اور میں نے بلند آواز سے گالیاں وینا شروع کر دیں۔ میں چلا رہا تھا اور سر پٹخ رہا تھا کیونکہ تکلیف میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میری اس چیخ و پکار کا ڈاکٹر یا کسی اور پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کے پاس میری اس تکلیف کا کوئی علاج نہیں تھا یا پھر ایک دشمن کی حیثیت سے وہ میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھے دونوں باتیں درست لگ رہی تھیں۔ مسلسل چیخنے سے میرا گلا بیٹھ گیا تھا اور اب بیٹھی بیٹھی سی بے سری آواز نکل رہی تھی۔ پھر میں نے نڈھال ہو کر سر ڈال دیا تھا۔ ویسے تو پہلے بھی سر ہلانے کے قابل نہیں تھا۔ تکلیف تھی کہ اس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی لیکن مجھ میں اب چیخنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ جسم کے رگ پٹھے بالکل یوں کھنچ رہے تھے جیسے میں ہیروئن کا عادی ہوں اور مجھے بہت دیر سے نشہ نہ ملا ہو۔ میں یوں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا جیسے ہوا میں آکسیجن کی کمی ہو گئی ہو اور مجھے ہوا سے آکسیجن کشید کرنے کے لیے اتنی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔

جیسے تکلیف بڑھی تھی اسی طرح اس میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی تھی اور نہ جانے کس وقت جا کر اس میں اتنی کمی آ گئی کہ اب میں ذرا سکون میں تھا۔ شاید انجکشن کا اثر کم ہو گیا تھا اور اس خیال سے میں کانپ اٹھا تھا کہ کچھ دیر میں مجھے ایک اور انجکشن دیا جائے گا اور مجھے پھر اسی اذیت سے گزرنا پڑے گا۔ میں نے پہلے کبھی ایسی تکلیف برداشت نہیں کی تھی۔ جب تکلیف کم ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا اور میرا لباس اس سے بھیگا ہوا تھا۔ پسینہ خارج ہونے سے جسم میں پانی کی کمی ہوئی تو گلا خشک ہو گیا اور وہ ویسے ہی چیخنے سے بیٹھا ہوا تھا اب خشک ہو کر زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے گزشتہ تین چار دن سے مجھے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا تھا اور اس کی جگہ انجکشنوں اور شاید ڈرپ سے کام چلا رہے تھے لیکن اب مجھے شدت سے پانی کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ مجھے پانی ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

اگر چہ یہاں سردی کی شدت نہیں تھی لیکن کمرے کو گرم بھی نہیں کہا جا سکتا تھا وہاں ایک قسم کی خنکی تھی اور اس خنکی نے میرا جسم رفتہ رفتہ خشک کر دیا لیکن گلے کی خشکی برقرار رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کیفیت میں، میں نے کئی گھنٹے گزار دیئے تھے اور اگلے انجکشن کا وقت قریب آ گیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب کچھ دیر بعد دروازہ ایک بار پھر کھلا تھا اور ڈاکٹر ٹرالی سمیت اندر آیا۔ اس نے پردہ ہٹایا اور اندر جھانک کر خوش مزاجی سے بولا۔ ''کیا حال ہیں دوست؟''

جواب میں، میں نے اسے وہ سب سنایا جو میں سنا سکتا تھا۔ حالانکہ میری آواز بیٹھی ہوئی تھی اور مجھ سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا لیکن میں نے دل کی بھڑاس نکال کر دم لیا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ پھر اس نے ٹرالی سے وہی بڑی سی سرنج اٹھائی اس میں طاقت کا انجکشن موجود تھا۔ اس نے وہ میرے بازو میں گھونپ

دیا۔ یہ بہت سخت انجکشن تھا لیکن اس کی سختی اس تکلیف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے میں نے برداشت کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ وہی انجکشن میرے جسم میں انجکٹ کرے گا اور مجھے پھر اسی اذیت سے گزرنا پڑے گا۔

''مجھے انجکشن مت لگاؤ۔'' میں نے کسمسا کر کہا۔

''یہ ضروری ہے ورنہ وائرس ختم نہیں ہوگا۔'' اس کے لہجے میں ہمدردی نہیں بلکہ خباثت تھی۔

''بکواس مت کرو، تم اس طرح مجھے اذیت دے رہے ہو۔''

اس نے میری بات اَن سنی کردی اور خاموشی سے میری نس تلاش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وائرس سے بچنے کے لیے یہ انجکشن ضروری تھا اس کے باوجود میں انجکشن سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر مجھے جکڑنے والی بیلٹ اتنی سخت تھی کہ میں ہل بھی نہیں سکتا تھا اس لیے مزاحمت بیکار گئی اور اس نے با آسانی انجکشن میری نس میں لگا دیا۔ اب مجھے تکلیف برداشت کرنا ہی تھی۔ وہ مسکرایا۔ ''مجبوری ہے دوست۔''

میں نے اس کی مجبوری کو بھی پس سنائیں اور بولا۔ ''ذلیل آدمی تم مجھے پانی تو دے سکتے ہو؟''

''شاید میں دے دیتا لیکن تمہاری اس بدزبانی کی سزا یہ ہے کہ تمہارا پانی بند ہے لیکن فکر مت کرو تم مرو گے نہیں البتہ پانی کی کمی سے اس انجکشن کی تکلیف یقیناً بڑھ جائے گی۔''

یہ سن کر میں لرز اٹھا تھا۔ ''ڈاکٹر...... میری بات سنو میں نے جو کہا وہ غصے میں کہا۔''

''ہاں ورنہ تمہارا ایسا کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' اس نے طنز کیا۔ ''ٹھیک میں مان لیتا ہوں کہ تم نے غصے میں کہا ہے لیکن کم سے کم اس انجکشن کی تکلیف تمہیں ایسے ہی برداشت کرنا ہوگی اور اگلی بار تمہارا رویہ بہتر رہا تو میں تمہیں پانی بھی دوں گا۔''

وہ بات مکمل کرتے ہی وہاں سے چلا گیا تھا اور میں اسے گالیاں دیتا رہ گیا۔ اس بار تکلیف کا آغاز تیزی سے ہوا تھا اور شاید انجکشن لگنے کے ایک گھنٹے کے اندر ہی مجھے تکلیف ہونے لگی تھی۔ ایک بار پھر میرا جسم اینٹھ رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ریشہ ریشہ الگ ہو جائے گا۔ جب جسم اینٹھتا تو لگتا کہ یا تو بیلٹ ٹوٹ جائے گی یا میری کھال پھٹ جائے گی لیکن دونوں میں سے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ اس بار ایک اچھی بات ہوئی کہ تکلیف نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا اور کچھ دیر کے لیے میں تکلیف سے غافل ہو گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کی طرف سے مکمل غافل ہوا تھا بلکہ اس کا احساس باقی تھا۔ خاص طور جب اندر سے شدید اینٹھن ہوتی تو میں ایک دو لمحے کے لیے غفلت سے نکل آتا تھا اور یہ ایک دو لمحے ہی قیامت بن جاتے تھے۔

جب مجھے مکمل ہوش آیا تو اس بار بھی جسم پسینے میں شرابور تھا اور حلق میں کانٹے سے اُگ آئے تھے۔ پیاس کی شدت ایسی تھی کہ اب تکلیف اس کے مقابلے میں کم ہو گئی تھی۔ بلکہ تکلیف سچ مچ کم ہو گئی تھی۔ شاید انجکشن کا اثر کم ہو رہا تھا۔ میں سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ مجھے جتنی آکسیجن کی ضرورت تھی میرے پھیپھڑے اتنی آکسیجن ہوا سے کشید نہیں کر پا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔ کمرے کی خنکی نے پسینہ خشک کر دیا تھا لیکن پیاس کی شدت مزید بڑھ گئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے جسم میں پانی کم ہوتا جا رہا تھا اور شاید ڈی ہائیڈریشن کا آغاز ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا لیکن کم ہوتی تکلیف بتا رہی تھی کہ انجکشن کا اثر ختم ہو رہا

ہے اور پانچویں انجکشن کا وقت قریب آ رہا ہے۔

اس خیال سے میرا رواں رواں لرزنے لگا تھا اور اب مجھ میں ڈاکٹر کو گالیاں دینے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس لیے دل ہی دل میں ڈیوڈ شا کو سنا رہا تھا جیسے اگر مجھ کو بچانا تھا تو اس جلاد ڈاکٹر کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی لیکن یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ وائرس کا توڑ ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا۔ میری سانس بھی اب معمول پر آتی جا رہی تھی اور مجھے ڈاکٹر کا انتظار تھا۔ تکلیف میں کمی ہوئی تھی لیکن کبھی کبھی جسم میں کھنچاؤ ہوتا تھا۔ اس وقت جھٹکا سا لگتا تھا ایسا لگتا تھا کہ درد کا عفریت اندر چھپا بیٹھا تھا اور وہ جھٹکا دے کر مجھے یاد دلاتا تھا کہ وہ گیا نہیں بلکہ اندر موجود ہے اور نیا انجکشن لگنے کے بعد وہ نئے سرے سے مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلائے گا۔

جب ڈاکٹر ٹرالی سمیت اندر آیا تو میرے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس نے پردہ ہٹا کر مجھے دیکھا۔ پھر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے میری کیفیت جاننے کے لیے مانیٹر کی طرف دیکھا۔ جس پر دل اور نبض کی کیفیت نارمل تھی۔ ''کیا ہو رہا ہے تمہیں؟'' اس نے جھک کر پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ درحقیقت مجھ میں جواب دینے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اس نے تشویش سے میری طرف دیکھا اور اگلا انجکشن لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے ٹرالی سے سرنج اٹھائی اور میرے بازو پر نس ابھارنے لگا۔ اس بار پانی کی کمی کی وجہ سے اسے دشواری پیش آئی تھی۔ خون میں پانی کی کمی سے نسیں دب جاتی ہیں اور آسانی سے نہیں ملتی ہیں لیکن اس نے انجکشن لگا دیا اس کے بعد اس نے ٹرالی سے ایک بوتل اٹھائی اور اس نے سائفن آگے کیا تو میرا منہ بے اختیار کھل گیا تھا۔ اس نے سائفن سے میرے منہ میں پانی کی پھواریں مارنی شروع کر دیں۔ ٹھنڈے پانی کا ذائقہ میرے منہ میں آیا تو میں جیسے پھر سے جی اٹھا تھا لیکن اس نے کوئی آدھا پون گلاس پانی دینے کے بعد بوتل واپس کھینچ لی۔

''بس اتنا کافی ہے ورنہ یورین کا مسئلہ ہو جائے گا اور فی الحال تم کو کھولنا ممکن نہیں ہے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو مجھے پانی دو۔'' میں نے پہلی بار کچھ کہا۔

''سوری۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''پانی دو۔'' میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ''مجھے کچھ ہو رہا ہے...... کمینے پانی دے......''

اچانک میرے جسم کو جھٹکے لگنے لگے اور میرا سر خود بہ خود اوپر اٹھنے لگا لیکن میرے گلے پر بھی بیلٹ بندھی تھی اور اس بیلٹ نے میرا سر مزید اوپر اٹھنے سے روک دیا تھا۔ اس کے باوجود میرا جسم اٹھنے کے لیے زور لگا رہا تھا اور نتیجے میں بیلٹ میرے لیے پھندہ بن گئی تھی اور میری سانس رکنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر اسے واپس تکیے پر دبانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مضبوط آدمی تھا اس کے باوجود وہ ایک ہاتھ سے زور لگا کر میرا اوپس نیچے نہیں کر سکا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا سر واپس نہیں جا رہا ہے اور میری سانس رک گئی ہے۔ یقیناً میرا چہرہ بھی سرخ ہو گیا ہوگا۔ اس لیے میری سانس بحال کرنے کے لیے مجبوراً اس نے دوسرا ہاتھ بھی میرے چہرہ پر رکھ کر پوری قوت سے نیچے دبایا۔ اس کام کے لیے اس نے پوری قوت استعمال کی تھی اس لیے جب اچانک ہی میرا سر ڈھیلا پڑ گیا تو وہ بھی بے اختیار آگے جھکا تھا اور اسی وقت اس کا ایک ہاتھ میرے منہ کے پاس آیا تھا۔ میں نے منہ کھول کر اس کا ہاتھ دانتوں میں چبا لیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن میری گرفت اتنی ہلکی نہیں تھی میرے دانت ربر کے دستانے

سے گزر کر اس کی کھال میں اتر گئے تھے اور میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا تھا۔ اس بار اس کے منہ سے زیادہ طویل چیخ نکلی تھی اور یہ تکلیف کی وجہ سے نہیں تھی کیونکہ اس میں اذیت سے زیادہ خوف تھا۔

اس نے پوری قوت سے اپنا ہاتھ میرے منہ سے واپس کھینچا اور میں نے اسے اچانک چھوڑ دیا۔ وہ سنبھل نہیں سکا تھا اور پلٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔ میں نے منہ میں آیا اس کا خون تھوکا اور اپنا سانس بحال کرنے لگا۔ سچ سانس رکنے سے میری حالت اچھی نہیں رہی تھی۔ میں لمبے سانس لے رہا تھا۔ ڈاکٹر فرش سے اٹھا تو کم روشنی میں بھی اس کے چہرے پر دہشت صاف نظر آئی تھی۔ مارے خوف کے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اس نے بہت تیزی سے جان لیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ دبا رکھا تھا۔ اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ میں نے گہرے سانس لیتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

''کیا خیال ہے ڈاکٹر میرے تھوک میں وائرس ہوگا یا نہیں؟''

''ذلیل شخص۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔''تم نے...... مجھے انفکٹ ......کر دیا ہے۔''

''اچھا...... محض کاٹنے سے تم انفکٹڈ ہو گئے ہو؟'' میں نے پھر تھوکا خون کا ذائقہ ابھی تک آ رہا تھا۔''ہاں اگر میرے تھوک میں ایبولا وائرس باقی ہوگا تو وہ یقیناً تمہارے جسم میں داخل ہو چکا ہے۔ تم جانتے ہو میں نے جہاں کاٹا ہے وہ جگہ نس والی ہے اور اگر تم چاہو تو اپنا ہاتھ جسم سے الگ کر دو لیکن خون کی روانی کے ساتھ وائرس تمہارے جسم میں پھیل چکا ہوگا۔''

وہ کانپنے لگا تھا۔'' بکواس کرتے ہو تم اتنی جلدی یہ نہیں ہو سکتا ہے۔''

''افسوس تم ڈاکٹر ہو کر اور جانتے بوجھتے ایسی بات کر رہے ہو۔'' میں ہنسا۔''اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے اگر تھوک میں وائرس تھا تو تم اس کا شکار ہو چکے ہو۔''

یہ بات وہ لاشعور میں تسلیم کر چکا تھا لیکن اس کا شعور ماننے سے انکاری تھا۔ وہ اچانک ہی پاگلوں کی طرح گالیاں دینے لگا...... ''تو کیا...... سمجھتا ہے...... کے، تُو بچ جائے گا......نہیں تجھے ابھی جہنم رسید کرتا ہوں۔''

اس نے پلٹ کر ٹرالی سے وہی سرنج اٹھائی جس سے مجھے انجکشن لگایا تھا۔ شاید اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی لیکن ایک بندھے ہوئے بے بس آدمی کو اس سے بھی قتل کیا جا سکتا تھا۔ وہ اسے میری آنکھ میں گھونپ دیتا تو اس کی سوئی دماغ تک پہنچ جاتی اور میں ایک لمحے میں مر جاتا۔ یہی شاید اس نے سوچا تھا۔ وہ میری طرف پلٹا تو اس کا چہرہ خوف و دہشت اور انتقام کے جذبے نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی سوبر اور خوش شکل نظر آنے والا شخص تھا (کم سے کم ظاہری طور پر نظر آتا تھا۔) اب اس کی وہ نقاب بھی جیسے اتر گئی تھی اور اس کی اصل صورت سامنے آ گئی تھی۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔''میں مروں نہ مروں لیکن تم اب نہیں بچو گے۔''

''اگر اللہ کی طرف سے میری موت کا وقت آ گیا ہے تو میں راضی بہ رضا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''تمہاری موت کا وقت آ گیا ہے۔'' وہ بولا اور اس نے سرنج ذرا بلند کی۔ اسے درست نشانہ لینا تھا۔ میں نے ڈر جانے والے انداز میں چہرہ اس کے ذرا پاس کیا اور اس نے پوری قوت سے سرنج میری آنکھ میں گھونپنے کی کوشش کی۔ میں نے چہرہ نہیں ہٹایا تھا۔ اور جب سوئی میرے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر تھی تو میرا سر کسی کھنچے اسپرنگ کی طرح مخالف سمت میں گیا اور سوئی میرے چہرے کو چھوتی تکیے میں اتر گئی۔ میں سیکنڈ کے سویں

حصے کے فرق سے بچا تھا۔ اندازے کی ذراسی غلطی مجھے کم سے کم میری آنکھ سے محروم کر دیتی۔ اس سے پہلے کہ وہ سرنج واپس کھینچتا میں نے دوبارہ سر واپس اس طرف کیا اور اس کے ہاتھ پر مارا۔ میں نے پوری قوت استعمال کی تھی سر پر چوٹ تو آئی لیکن اس ٹکر سے سرنج کی سوئی ٹوٹ کر تکیے میں رہ گئی تھی۔ اس نے چلا کر گالی دی اور اسی ہاتھ سے میرے سر پر مکا مارا۔ چوٹ تو خاص نہیں تھی لیکن ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اس نے بے کار ہو جانے والی سرنج پھینک دی اور خون خوار لہجے میں بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ اس طرح بچ جاؤ گے؟''

''شاید نہیں...... لیکن میں تمہیں اتنی آسانی سے اپنی جان لینے بھی نہیں دوں گا۔''

''میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا۔'' اس نے کہا اور میرے سرہانے والی طرف بیڈ کے نیچے گھس کر کچھ کرنے لگا۔ مجھے اس وقت سمجھ میں آیا جب میرے گلے پر بندھی بیلٹ سخت ہونے لگی۔ اسے یقیناً کسی میکنزم سے سخت اور ڈھیلا کیا جاتا تھا کیونکہ یہ لحہ بہ لحہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ میں یہ اتنی سخت ہو گئی تھی کہ میرا سر تکیے میں پیوست ہو گیا تھا اور گلے پر اس کی گرفت کی وجہ سے میرے لیے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ وہ باہر آیا اور میرا معائنہ کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

ظاہر ہے میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا بولنا تو بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔ اس نے بیلٹ اس طرح سخت کی تھی کہ میری سانس بہت مشکل سے آ رہی تھی۔ میں بہت زور لگا کر ہوا کھینچ رہا تھا۔ ایک منٹ میں میرے پھیپھڑے ہوا کی کمی سے پھٹنے لگے تھے۔ وہ ہوا کھینچنے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے اور اس زور میں میرا جسم بھی شامل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر توفیق اب دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ آکسیجن کی کمی سے میرا سر چکرانے لگا تھا اور حواس جواب دے رہے تھے۔ دو منٹ بعد پھیپھڑے جیسے پھٹنے کے قریب آ گئے تھے اور منہ ہوا کے لیے کسی مچھلی کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''تم زیادہ سے زیادہ چند منٹ زندہ رہ سکتے ہو۔'' اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے مرنے سے پہلے تم بہت ساری اذیت برداشت کرو گے۔''

اذیت میں تو میں اس وقت بھی تھا اور اس سے پہلے بھی بہت تکلیف جھیل چکا تھا لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا زخمی ہو جانے والا ہاتھ دیکھا اور بولا۔ ''اس وقت تم نے ڈرامہ کیا تھا اب تم سچ مچ مر رہے ہو۔''

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ موت اب کچھ دور رہ گئی تھی۔ میرے کانوں نے شاید فرشتے کے قدموں کی چاپ سنی تھی لیکن نہیں وہ فرشتہ نہیں تھا کیونکہ فرشتے انگریزی نہیں بولتے ہیں۔ میرے چکراتے ذہن نے زبان شناخت کی تھی لیکن بولنے والا کیا کہہ رہا تھا وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی میری گردن پر سخت بیلٹ کی گرفت ڈھیلی پڑی اور میں دیوانہ وار سانس لینے لگا۔ میرے حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگا تھا۔ تب میں نے ڈاکٹر توفیق کو ساکت کھڑے دیکھا اور اس کے عقب میں کوئی شخص ویسا ہی حفاظتی لباس پہنے کھڑا تھا۔ وہ بولا تو اس بار میں نے پہچان لیا وہ ڈیوڈ شا تھا اور ڈاکٹر توفیق سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے لیکن تمہیں اب سب سے الگ کرنا ہو گا۔''

''نہیں سر۔'' ڈاکٹر گڑگڑایا۔ ''آپ مجھے بچا سکتے ہیں۔''

''اگر وائرس نے اتنی دیر میں تم پر اثر نہیں کیا ہے تو تم بچ جاؤ گے لیکن اتنا تو تم بھی جانتے ہو علاج کے

لیے تمہیں الگ رکھنا لازمی ہے ورنہ یہ تم سے دوسروں کو بھی لگ سکتا ہے۔''

''پلیز سر۔'' ڈاکٹر چلایا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔''

''کوئی نہیں مرنا چاہتا ہے لیکن موت بہر حال آتی ہے۔ اب تم چل رہے ہو یا میں تمہیں شوٹ کر دوں۔'' ڈیوڈ شا نے اتنے آرام سے کہا جیسے اس سے کھانے کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہا ہو۔ میں جانتا تھا وہ اتنے ہی ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا۔ ڈاکٹر توفیق کو سچ مچ گولی مار سکتا تھا۔ شاید یہ بات ڈاکٹر بھی جانتا تھا اس لیے وہ بلا چوں چرا کیے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈیوڈ شا نے پردے کے اندر آنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ باہر ہی رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''شہباز تم ٹھیک ہو؟''

''مہربانی ہے تمہاری۔'' میں نے بیٹھی طنزیہ آواز میں کہا۔ ''ویسے تم نے آتے آتے کچھ زیادہ ہی دیر نہیں کی؟''

''ہاں یہ لباس پہننے میں کچھ دیر لگی۔'' اس نے کہا اور ڈاکٹر سمیت رخصت ہو گیا تھا۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا ایک تو گلے پر بیلٹ کی سخت گرفت نے نرخرے کو بری طرح متاثر کیا تھا اور دوسرے انجکشن کی تکلیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں ساکت لیٹ گیا۔ کئی بار کے تجربے کے بعد میں کسی حد تک اس تکلیف کا عادی ہو چلا تھا لیکن جیسے جیسے یہ عروج پر جانے لگی ویسے ویسے تکلیف ایک بار پھر میری برداشت سے باہر ہونے لگی تھی اور کچھ دیر بعد میں کراہنے لگا تھا۔ اس تکلیف کی وجہ سے مجھے پتا نہیں چلا کہ کب دروازہ کھلا اور ڈیوڈ شا اندر آیا تھا اس نے مخصوص حفاظتی لباس پہن رکھا تھا۔ جب اس نے ٹرالی ہلائی تو میں چونکا تھا۔ وہ پردہ ہٹا کر اندر آ گیا اور اس نے ایک سرنج اٹھا رکھی تھی۔

''کیا......تم...... مجھے زہر...... دے رہے ہو؟'' میں نے رک رک کر کہا۔

''اگر زہر دینا ہوتا تو میں تم کو بچانے کی کوشش کیوں کرتا۔'' اس نے سرنج سے ہوا کے بلبلے خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے میں نے ڈاکٹر پر اعتماد کیا اور اس نے تم کو جان بوجھ کر اذیت دینے کے لیے پین کلر نہیں دیا۔''

میں چونکا اور پھر چلا کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے وائرس کے توڑ والا انجکشن ہی دے رہا تھا مجھے شک ہوا تھا کہ وہ الٹا مجھے مزید وائرس انجکٹ کر رہا ہے۔''

''نہیں وہ تمہیں اس کا توڑ ہی دے رہا تھا لیکن اس کے ساتھ پین کلر نہیں دے رہا تھا اس وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔''

''تب تو میں نے اس کے ساتھ بہت کم کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسی تکلیف میں نے کبھی نہیں برداشت کی ہے۔''

''میں تمہیں انجکشن دے رہا ہوں تم سو جاؤ گے اور آخری انجکشن تمہیں نیند کے دوران میں دے دیا جائے گا اور ڈاکٹر اپنی حرکت کا شکار ہوا ہے اگر وہ تمہیں بے ہوشی کا انجکشن دے دیتا تو اس انجام کو نہ پہنچتا۔'' اس نے اطمینان سے کہا ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ڈاکٹر کے بارے میں کوئی فکر یا افسوس نہیں تھا حالانکہ وہ اس کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس نے انجکشن میرے بازو میں داخل کر دیا۔ اسے نس میں لگانا ضروری نہیں تھا۔ میں نے خوش ہو کر

پوچھا۔

''وہ وائرس کا شکار ہو چکا ہے؟''

''ننانوے فی صد امکان ہے۔ اگرچہ اس کا توڑ ہے لیکن یہ بھی زیادہ کارآمد نہیں ہے۔''

''تب یہ مجھ پر کیسے اثر کرے گا؟''

ڈیوڈ شا کسی قدر جھک کر بولا۔ ''شہباز میں نے سوائے تمہارے اور کسی شخص کو اس موت کے وائرس سے بچتے نہیں دیکھا ہے۔ جنوبی افریقہ میں اس توڑ کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور جن سات افراد کے جسم میں وائرس پایا گیا تھا ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا تھا۔''

میرے ذہن پر دھند طاری ہونے لگی تھی۔ اس سے لڑتے ہوئے میں نے کہا۔ ''لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کے شکار افراد بچ بھی جاتے ہیں؟''

''وہ عام ایبولا وائرس ہوتا ہے اور اسے خاص طور سے تجربہ گاہ میں طاقتور بنایا گیا ہے۔ اس کی تباہ کاری تم دیکھ چکے ہو۔''

''یعنی ڈاکٹر کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''وہ ایک عام آدمی ہے اور اس بات کا امکان نہیں ہے۔''

''مجھ میں کیا خاص بات ہے۔'' دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔

''تم بھول رہے ہو تمہیں حکیم قادس نے وہ خصوصی دوائیں استعمال کرائی ہیں جن میں وہ جزو ہے جو برف والے نے خاص طور سے تمہارے لیے دیا تھا۔''

مجھے جھٹکا لگا تھا۔ ''تت...... تم اس بارے میں جانتے ہو؟''

''میں بہت کچھ جانتا ہوں۔'' اس نے میرا شانہ تھپکا۔ ''اب سو جاؤ امید ہے تم چوبیس گھنٹے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے اور پھر تم سے اس موضوع پر تفصیل سے بات ہوگی۔''

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے برف والے کے بارے میں کیسے علم ہوا لیکن وہ چلا گیا تھا۔ انجکشن کی دوا نے میرے حواس پر پوری طرح قبضہ کر لیا تھا اور میں سوچتے سوچتے سو گیا کہ جو بات راجا عمر دراز نے صرف مجھے بتائی تھی وہ ڈیوڈ شا کے علم میں کس طرح آئی تھی۔ راجا عمر دراز نے بتایا تھا کہ اس پُراسرار وادی میں برف میں رہنے والے بوڑھے نے اسے خاص طور سے میرے لیے وہ پتھر دیا جس کا سفوف دواؤں میں شامل ہو کر ان کو معجزہ صفت بنا دیتا تھا۔ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کی بات ہے بلکہ اس وقت تو والد صاحب بھی بچے تھے۔ ڈیوڈ شا یہ بات کس طرح جانتا تھا؟ میں سو گیا اور اس کے لیے ڈیوڈ شا کا شکر گزار تھا اگر وہ مجھے بے ہوشی کا انجکشن نہ دیتا تو مجھے آخری دو انجکشنوں کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی۔ اسی بے ہوشی کے دوران مجھے آخری انجکشن بھی دے دیا گیا تھا۔



جب مجھے ہوش آیا تو جسم میں بے چینی اور تکلیف والی کیفیت کا نام و نشان نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس دوا کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی کچھ دیر قائم رہتا تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے اپنی اصل کیفیت کا پتا چلتا۔ میں

بدستور اسی بیڈ پر تھا اور میرا جسم اسی طرح بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا لیکن اس بار ہوش میں آنے کے بعد مجھے ایک مسئلہ شروع ہو گیا تھا میرے مثانے میں دباؤ بن رہا تھا اور مجھے جلد یا بدیر باتھ روم جانا تھا ورنہ میں بستر سے ہی باتھ روم کا کام لینے پر مجبور ہو جاتا۔ یہ تو میں بتانا بھول گیا تھا کہ یہاں لانے سے پہلے مجھے صاف کر کے اسپتال والے کپڑے پہنا دیئے گئے تھے کیونکہ میری لمبی نیکر اور جسم زرین کے خون سے بھر گیا تھا۔

زرین کا خیال آتے ہی میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ وہ خوش ادا اور گل بدن اب مٹی میں مل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسے جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا کیونکہ لاش میں موجود وائرس کو ختم کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اس کے مقدر میں یہی لکھا تھا۔ مجھے ایک بار پھر اس کا آخری خواب یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ دنیا میں اس کی تکالیف کے صلے میں خدا نے اسے معاف کر دیا تھا اور دوسرے جہان میں اسے اس کا بہت اچھا صلہ ملے گا میں نے دل سے دعا کی کہ اس کا خواب مکمل طور پر سچ ثابت ہو کیونکہ میرے معاملے میں تو وہ سچ ہی ثابت ہوا تھا۔

میرے دشمن ڈیوڈ شا نے ڈاکٹر سے میری جان بچائی تھی۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ ڈیوڈ شا نے ڈاکٹر کی طرف سے ناامیدی ظاہر کی تھی۔ وہ اس کا یہاں ایک اہم مہرہ تھا اور وہ اسے بچانے کی پوری کوشش کرتا اگر اس کے بس میں ہوتا۔ ڈیوڈ شا کا یہ ایک نیا روپ میرے سامنے آیا تھا۔ اس کے بارے میں ایک صحافی نے رپورٹ دی تھی کہ وہ مغربی طاقتوں کا ایک اہم مہرہ ہے اور افریقہ کے کئی ممالک میں انتشار پھیلا کر خانہ جنگی کرانے میں اس کا مرکزی کردار رہا ہے اور اس کی ملک میں آمد خالی از علت نہیں ہے۔ میں اس رپورٹر سے متفق تھا اگرچہ وہ راجا عمر دراز کی وجہ سے بھی یہاں آیا ہوگا تاکہ اس سے وہ تصویر اور پتھر حاصل کر سکے لیکن اس کے ساتھ اس کے دیگر کچھ مقاصد اور بھی ہوں گے۔ ممکن ہے وہ براہِ راست سیاسی مقاصد لے کر نہ آیا ہو لیکن اس کی آمد کو نیک شگون نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔

میں نے اس جگہ جو دیکھا تھا وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ بڑی طاقتیں اس سرزمین کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر رہی تھیں کیونکہ دنیا بلکہ تیسری دنیا کے اور کسی ملک میں ان کو وہ سہولتیں اور آزادیاں حاصل نہیں تھیں جو یہاں انہیں فراخدلی سے دے دی گئی تھیں۔ مجھے ڈاکٹر کی بات پر پہلے بھی شک تھا وہ اس پروجیکٹ کو اپنا قرار دے رہا تھا لیکن اس قسم کے پروجیکٹ بیرونی سرپرستی کے بغیر کام نہیں کر سکتے ہیں اور اصل میں تو اس کی ضرورت بھی ان ملکوں کو ہے جو کسی بھی ایجاد کا سب سے پہلے جنگی استعمال سوچتے ہیں۔ موت کی نیند سلا دینے والے جرثوموں کو بایولوجیکل ہتھیاروں میں تبدیل کرنا بھی مغرب کا ایجنڈہ ہے لیکن وہ اس کا الزام تیسری دنیا کے ممالک پر لگا کر ان پر حملے کرتے ہیں۔ ڈیوڈ شا یہ کام اپنے طور پر بھی کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس وسائل اور ٹیکنالوجی تھی یا پھر کسی بڑی طاقت کے لیے بھی کر سکتا تھا جو اس سے یہ ہتھیار خرید سکتی تھی۔

اچانک مجھے ایک خیال اور آیا۔ میں جان چکا تھا کہ ڈیوڈ شا یہاں کیا کر رہا تھا تو کیا وہ مجھے چھوڑنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا؟ مگر جب میں نے ذرا گہرائی سے سوچا تو مجھے اپنا خیال مہمل لگا تھا۔ میں بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ میں صرف اس ٹھکانے کو جانتا تھا اور یہ بھی اس کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر سے اس کا تعلق ثابت کرنا بھی مشکل تھا اور وہ ڈاکٹر کے مرنے کے بعد اسے بھی بھٹی میں جلا کر راکھ کر دیتا اور اس کے بعد سارے نشانات مٹا کر یہاں

سے جا سکتا تھا۔ کسی چیز سے اس کا تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا اور ثابت بھی اس صورت میں ہوتا جب وہ کسی معاملے میں پکڑا جاتا اور یہاں تو اس پر فردِ جرم بھی عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔ گویا ڈیوڈ شا کو اگر مجھ سے کوئی خطرہ تھا تو وہ براہ راست تھا۔ میں اسے نقصان پہنچا سکتا تھا اور اس کے لیے اس جگہ کو صاف کر کے چھوڑ جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

مجھے ہوش میں آئے ہوئے کوئی ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور اب میرے مثانے کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ''کوئی ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''مجھے باتھ روم جانا ہے...... ارے کوئی ہے۔''

میں وقفے وقفے سے چیخ وپکار کر رہا تھا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا مگر پھر جو ہوا وہ میرے لیے خاصا غیر متوقع تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص مخصوص لباس میں اندر آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ابھی تک کلیئر نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے لیے کوئی خاص ٹیسٹ کرنا تھا جو ابھی تک نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے ایک مخصوص برتن اٹھا رکھا تھا۔ وہ پردے کے اندر آیا تو میں اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ ''اے اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے کھول دو۔''

لیکن اس نے ان سنی کر کے میرا پاجامہ نیچے سرکایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میری گفتار بے کار ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اپنا کام کر کے میری طرف دیکھا یعنی اب میں اپنا کام کر سکتا تھا۔ مجبوری تھی اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا مجھے اسی برتن میں فارغ ہونا پڑا۔ بہر حال اس سے میرا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس نے احتیاط سے برتن اٹھایا اور واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اتنی مہربانی کی تھی کہ میرا پاجامہ اوپر کر دیا تھا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈیوڈ شا آ گیا۔

''کیا حال ہے کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''سکون کی کیفیت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شاید ابھی تک دوا کا اثر ہے؟''

''نہیں دوا کا اثر اب تک ختم ہو چکا ہوگا۔ اگر تم درد یا بے چینی محسوس نہیں کر رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وائرس ختم ہو چکا ہے۔''

''اس کا پتا کیسے چلے گا؟''

''اس کے لیے تمہارا ایک بلڈ ٹیسٹ ہوگا۔'' اس نے کہا اور ایک خالی سرنج لی۔ ''مجھے تمہارا بلڈ سمپل لینا ہے۔''

''لے لو میں تمہیں روک نہیں سکتا ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔

اس نے سرنج میری نس میں داخل کر کے خون کا نمونہ لیا۔ ''دو گھنٹے میں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''اس کے بعد تمہیں اوزون سے غسل دیا جائے گا اور پھر تم کلیئر ہو جاؤ گے۔'' اس نے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ ڈاکٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے اسے سارا کام خود کرنا پڑ رہا تھا۔ میں متجسس تھا کہ ڈیوڈ شا مجھ پر اتنا مہربان کیوں تھا لیکن میں نے اس سے پوچھا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ تھیلے میں جو بھی بلی ہے جلد باہر آ جائے گی۔ میں جس بستر پر لیٹا ہوا تھا وہ شاید چمڑے کا تھا اسی طرح تکیہ بھی چمڑے کا تھا۔ کپڑوں کے مقابلے میں چمڑے

سے جراثیم صاف کرنا آسان ہوتا ہے۔ اوزون آکسیجن کی ایک قسم ہے۔ یہ جرثوموں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے اور خاص طور سے بیکٹر یا اور وائرس اس سے فوراً ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانوں یا بڑے جانداروں کو نقصان نہیں ہوتا ہے۔ آج کل اسپتالوں اور اس قسم کی دوسری جگہوں پر جہاں جراثیم لگنے کا خطرہ ہوتا ہے صفائی کے لیے اوزون کو استعمال کیا جاتا ہے اس کی خشک پھوار تمام اقسام کے جرثوموں کو ختم کر دیتی ہے۔ دیگر جراثیم کش کے مقابلے میں یہ سستی پڑتی ہے اس کے سائیڈ ایفکٹ بھی نہیں ہوتے ہیں اور یہ ماحول کے لیے بھی بہتر ہے کیونکہ کرہ ہوائی میں اوزون کی موجودگی ہمیں سورج سے آنے والی مضر تابکاری سے محفوظ رکھتی ہے لیکن ہم نے اپنی اس محافظ گیس کو بے دریغ آلودگی پیدا کر کے ختم کرنے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ ڈیوڈ شا کا مجھے ایسا ہی غسل دینے کا ارادہ تھا۔

میں صبر سے انتظار کرتا رہا اور تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد دو افراد اسی حفاظتی لباس میں اندر آئے اور خاص بات یہ تھی کہ دونوں مشین گنوں سے مسلح تھے۔ ان میں سے ایک میرے سرہانے ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور دوسرے نے میرے جسم سے بیلٹس کھولنا شروع کیں۔ آخری بیلٹ کھولتے ہوئے اس نے مجھے وارننگ دی۔

''کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔''

بولنے والے کا لہجہ مقامی اور صاف تھا شاید وہ پڑھا لکھا تھا۔ مجھے کھولتے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا تھا اور اپنی مشین گن مجھ پر تان لی۔ ڈیوڈ شا نے انہیں میرے بارے میں کچھ زیادہ بریف کر دیا تھا اور وہ ڈرے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں پہلے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر بستر سے نیچے اتر آیا۔ انہوں نے پردے ہٹا دیئے تھے۔ اب یہاں زیادہ روشنی تھی۔ انہوں نے اشارے سے مجھے کمرے سے باہر چلنے کو کہا۔ مستقل بندھے رہنے سے میرا جسم سن ہو گیا تھا پھر دواؤں اور وائرس کا اثر بھی ہوا تھا اور میں کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے بمشکل بستر سے نیچے آیا تھا۔ چند لمحے تو مجھے زمین پر اپنے قدم جمانے میں لگے تھے۔ میرے پاس پیروں میں پہننے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میری حالت کے باوجود وہ میری طرف سے پوری طرح محتاط تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ مجھے کوئی موقع نہیں دینا چاہتے۔ میں اس کمرے سے باہر آیا تو دوسرا کمرہ بالکل خالی نکلا تھا اور اس میں چھت سے ایک شاور نما چیز لگی تھی۔ مجھے کھولنے والے نے حکم دیا۔

''اس کے نیچے کھڑے ہو جاؤ۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی اور فوراً ہی شاور سے کوئی چیز پھوار کی طرح برسنے لگی۔ مخصوص بو بتا رہی تھی کہ یہ اوزون تھی۔ یہ تقریباً گیس کی حالت میں تھی کیونکہ اس سے جسم یا لباس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں کوئی پانچ منٹ اس شاور کے نیچے رہا تھا۔ اس کے بعد باری باری دونوں مسلح افراد اس شاور کے نیچے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ اب جراثیم باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں رہا ہے۔ پھر وہ مجھے اگلے کمرے میں لائے۔ یہاں لباس تبدیل کیے جاتے تھے اور وہاں مجھے ایک عدد برقی بھٹی بھی نظر آئی تھی۔ مجھے کھولنے والے نے اگلی ہدایت دی۔

''اپنا یہ لباس اتار کر بھٹی میں ڈال کر جلا دو اور یہ دوسرا لباس پہن لو۔'' اس نے ایک طرف رکھے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں پوری آستین کی ٹی شرٹ تھی اور سیاہ رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ دونوں گرم کپڑے سے بنے

تھے۔ میں مجبور تھا کیونکہ وہ میری طرف پوری طرح نگران تھے اور میں ان سے کہتا بھی کہ بھائی صاحب ذرا منہ دوسری طرف کرلو تو وہ یقیناً یہ بات نہ مانتے اس لیے میں نے رخ بدل کر لباس اتارا اور اسے بھٹی میں ڈال کر اس کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے کپڑے پہن کر اب میں باہر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ میری رپورٹ کلیئر آئی تھی۔ ورنہ مجھے باہر نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ تینوں کمرے ایک لائن سے تھے اور میں جس کمرے میں تھا وہ سب سے آخر میں تھا۔ ہم تیسرے کمرے سے باہر آئے تو ایک گیلری میں تھے اور بالآخر یہ بھی اسی کوٹھی کا تہہ خانہ ثابت ہوا تھا۔ کوٹھی اندر سے اوپر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑی تھی اور اس کے شاید کئی فلور تھے کیونکہ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک اور فلور تک آئے اور اب بھی ہم تہہ خانے میں ہی تھے۔

اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ حرکت کرنے اور شاید کپڑے تبدیل کرنے سے یہ بہتری آئی تھی۔ سب سے اہم بات تھی کہ میں ایک خوف والی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک دروازے کے سامنے روکا اور پھر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے ڈیوڈ شا کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف ہوکر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی دوست کو اندر آنے کو کہہ رہا ہو۔ اس کے انداز میں اب لاپروائی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور دونوں مسلح افراد باہر ہی رہ گئے تھے۔ میں نے حیرت سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔

''تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟''

وہ اعتماد سے آگے بڑھ گیا اور ایک جھولنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے برابر میں تپائی پر ایک بوتل اور ایک عدد جام رکھا تھا۔ اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو۔'' اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں کرسی پر آ گیا۔ ''تمہاری رپورٹ آ گئی ہے تم کلیئر ہو۔''

''شکریہ۔'' میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔

اس نے اپنے لیے بوتل سے ایک جام بنایا اور میری طرف دیکھا۔ ''تم نہیں پیتے ہو۔ تمہارے لیے کیا منگواؤں؟''

مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی اس لیے میں نے کافی کا کہہ دیا۔ اس نے تپائی سے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی اٹھا کر کسی سے کافی لانے کو کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ''اگر چاہو تو کچھ کھانے کے لیے بھی منگوالو۔''

''کوئی ہلکی چیز منگوالو۔''

اس نے واکی ٹاکی پر یہی کہہ دیا۔ پھر اسے واپس تپائی پر رکھ دیا لیکن میں نے نوٹ کیا کہ اس نے اس کا بٹن نہیں دبایا تھا یعنی رابطہ برقرار تھا۔ اسے مجھ پر مکمل اعتماد نہیں تھا وہ صرف ظاہر کر رہا تھا۔ چند منٹ میں کافی اور گھر کے بنے بسکٹ آ گئے۔ مجھے اس وقت کسی ایسی ہی چیز کی ضرورت تھی اس لیے میں نے کسی تکلف سے کام نہیں لیا اور پلیٹ صاف کر دی۔ جب تک میں بسکٹ کھاتا رہا ڈیوڈ شا مے نوشی میں مصروف رہا تھا لیکن وہ بہت کم پی رہا تھا اتنی دیر میں اس نے مشکل سے آدھا پیگ ختم کیا تھا۔ جب میں کافی کا مگ سنبھالا تو وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میں نے تم کو کیوں بچایا جب کہ تم مجھے دشمن سمجھتے ہو؟''

''کیا تم دشمن نہیں ہو؟'' میں نے سادگی سے دریافت کیا۔

''ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں لوگ ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہیں۔''

''یعنی تمہاری مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ بس بعض جگہوں پر میں تمہارے مفادات کے آڑے آتا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟''

''ہاں یہی بات ہے۔'' اس کا لہجہ پُرسکون رہا تھا۔ ''حالانکہ تم اسے غلط سمجھ رہے ہو۔''

''کیا میرے سمجھنے سے کچھ ہوتا ہے۔''

''بہت کچھ ہوتا ہے اگر تم سمجھو تو۔'' اس نے کرسی جھلاتے ہوئے کہا۔ ''شہباز ملک میں صاف بات کرنا پسند کرتا ہوں۔''

''میں بھی صاف بات سننا پسند کرتا ہوں بغیر کسی لگی لپٹی کے۔''

''مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔'' اس نے کہا۔

''کس معاملے میں؟''

''مجھے اس وادی تک جانا ہے۔''

''میں اسے ایک فنطاسی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہوں۔'' میں نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ '' جس چیز کو میں اہمیت نہیں دیتا ہوں اس کی طرف جانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔''

''تم راجا عمر دراز کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے؟''

''درست ہے لیکن تم جانتے ہو راجا عمر دراز کی بات الگ ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے لیے ایک دشمن ہوں اور تم آسانی سے میرے لیے کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو گے۔''

''مشکل سے بھی نہیں۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ایسا مت کہو انسان بعض اوقات مجبور بھی ہو جاتا ہے۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ میں مسکرایا۔

''ہاں میں سمجھ رہا ہوں کہ انسان مجبور بھی ہو جاتا ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اگر ایسا ہوا بھی تو یہ بالکل عارضی ہو گا اور میں موقع ملنے پر وہی کروں گا جو ڈاکٹر توفیق کے ساتھ کیا ہے۔''

''میں تم کو اس انداز میں مجبور کرنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے گھٹیا انداز پسند نہیں ہے۔''

''او کے تم جس طرح چاہو مجھے مجبور کر سکتے ہو۔'' میں نے فراخدلی سے کہا۔ ''تب فیصلہ ہو جائے گا۔''

''فی الحال تم آرام کرو۔'' اس نے کہا۔ ''پھر تم سے بات ہو گی۔''

''یعنی ابھی مجھے تمہاری قید میں رہنا ہو گا؟''

''ہاں چاہو تو ایسا کہہ لو، بعض معاملات طے کیے بغیر میں تم کو آزاد نہیں کر سکتا ہوں۔''

''میری ساتھی کے بارے میں ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی لاش جلا دی گئی ہے؟''

''ہاں مجبوری تھی کیونکہ وہ انفکلڈ لاش تھی۔ اسے جلا دینا ہی بہتر تھا۔''

میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ دشمن تھے ان سے کسی اچھائی کی توقع ویسے بھی نہیں کی جاسکتی تھی پھر منطقی لحاظ سے انہوں ٹھیک کیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ میں زرین کی آخری خواہش پوری نہیں کر سکا تھا۔ ڈیوڈ شا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''کیا تم اپنی ساتھی کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتے ہو؟''

''اب یہ کہاں ممکن رہا ہے اس کی لاش ہی باقی نہیں ہے۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''یہ ممکن ہے۔ اب اس کا جسم راکھ کی صورت میں ہے۔ اس نے خواہش کی تھی کہ تم اسے دفناؤ اور کسی اور کو اس کے جائے مدفن کا علم نہ ہو تو تم اس کی یہ دونوں خواہشیں پوری کر سکتے ہو۔''

''اس کی راکھ دفنا کر؟'' میں نے اس کی بات پر غور کیا

''ہاں راکھ بھی تو اس کے جسم کی ہے اور اگر تم لاش بھی دفناتے تو کچھ عرصے بعد وہ خود مٹی میں مل جاتی۔ اس لیے کیا فرق پڑتا ہے۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی راکھ بھی زرین کی تھی اور میرے لیے اسے خود دفنانا اور اس طرح دفنانا کہ کسی اور پتا نہ چلے بہت آسان ہو گیا تھا لیکن یہ کام میں ڈیوڈ شا کی قید سے رہائی کے بعد ہی کر سکتا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے اس کی راکھ میرے حوالے کر دو۔''

''تمہیں مل جائے گی۔'' اس نے کہا۔ ''میں چھ گھنٹے بعد تم سے بات کروں گا۔ اس دوران میں تم سوچ سکتے ہو۔''

''کیا سوچ سکتا ہوں؟''

''یہی کہ تم دوبارہ اپنی پرانی نارمل زندگی میں واپس جانا چاہتے ہو یا نہیں۔'' ڈیوڈ شا نے کہا اور میری طرف دیکھے بغیر انٹر کام اٹھا کر کسی سے بولا۔ ''کم ان اینڈ گیٹ ہم۔''

اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ یہ خواب تو میں اس وقت سے دیکھ رہا تھا جب سے اس مصیبت میں پڑا تھا۔ پرانے دن سراب بن کر رہ گئے تھے ان کی جھلک تو نظر آتی تھی لیکن وہ حقیقت میں نہیں تھے۔ پھر جب سویرا سے ملا اور اس سے تجدید تعلق ہوا تو یہ خواہش مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اگرچہ میں نے مرشد اور دوسرے دشمنوں کے معاملے میں بہت ساری کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ان کو بہت سارے نقصان پہنچائے تھے اور ان کے بہت سارے عزائم کو ناکام بنایا تھا لیکن جہاں تک میرے مسائل کا تعلق تھا تو ان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اضافہ ہی ہوا تھا اور دشمنوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ مرشد پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا تھا اب وہ سیاستدان بھی تھا اور حکومت کا ممبر بھی تھا۔ گویا پہلے کریلا تھا تو اب نیم چڑھا بھی ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مرشد کو یہ جنگ ختم کرنے پر آمادہ کر سکوں جس میں اس کا بھائی اپنی صحت سے اور میرا بھائی جان سے ہاتھ گنوا چکا تھا۔ مگر اس کی طرف سے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے کہ وہ اس جنگ کو ختم کرنے پر آمادہ ہے۔ اس کے بجائے وہ اسے پھیلا کر میرے خاندان تک لے آیا تھا۔ طاقت حاصل کر کے وہ فرعون بن گیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل ہی فرعون

بن گیا تھا۔ میں کسی فلم کا کوئی اَنا کا مارا ہیرو نہیں ہوں جو دشمن سے ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنا چاہتا ہے اگر میرا دشمن مجھے آبرومندانہ طور پر زندہ رہنے دیتا ہے تو میں بھی اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہو سکتا تھا کیونکہ معاملہ صرف میری ذات کا نہیں تھا بلکہ مجھ سے منسوب میرے ساتھیوں اور میرے خاندان کا بھی تھا۔ یہ اور بات تھی کہ میری پرانی زندگی واپس ملنے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے جب ڈیوڈ شا نے یہ بات کہی تو میں چونک گیا اور اندر سے کچھ بے تاب ہو گیا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے لیکن وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے کر میری طرف سے بے نیاز بن گیا تھا۔

فوراً ہی دروازہ کھلا اور وہی دونوں مسلح افراد نظر آئے تھے۔ میں کمرے سے باہر آ گیا ان کو معلوم تھا کہ مجھے کہاں پہنچانا تھا مجھے اسی فلور ایک کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں سوائے ایک مضبوط دروازے کے اور کوئی کھڑکی یا روشن دان تک نہیں تھا۔ دروازے پر اوپر والے حصے میں ایک چوڑی پٹی میں صرف شیشہ لگا تھا جس سے اندر یا باہر دیکھا جا سکتا تھا۔ کمرے میں فرش پر فوم کا گدا پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہلکا کمبل تھا۔ وہاں ایک عدد پانی کی بوتل پہلے سے موجود تھی۔ ڈیوڈ شا کے سامنے میں خود کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ بیماری اور پھر اس کے علاج کے ساتھ مسلسل بندھے رہنے اور بے آرامی سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور مجھے شدت سے چند گھنٹے آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں پانی پی کر جیسے ہی بستر پر لیٹا نیند نے مجھے دبوچ لیا تھا اور میں ہر بات سے غافل ہو کر گہری نیند سو گیا تھا۔ حد یہ کہ میں نے پھر ڈیوڈ شا کی بات پر بھی غور نہیں کیا تھا حالانکہ جس وقت اس نے مجھ سے یہ بات کی تھی مجھے جھٹکا سا لگا تھا اور میں جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہو گا۔ میں بے خبر سوتا رہا تھا اور شاید سوتا ہی رہتا اگر مجھے جگایا نہ جاتا۔ جگانے والے نے کمبل ہلایا تھا۔

"اٹھو نواب کے بچے کیا یہاں سونے آئے ہو؟"

میں اٹھ بیٹھا تھا جگانے والا وہی مشین گن بردار تھا لیکن اب اس کے پاس مشین گن نہیں تھی۔ اس کے ساتھی کے پاس تھی۔ وہ میرے لیے کھانا لایا تھا۔ ٹرے میں ایک بڑے سائز کا پیالہ رکھا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی یہ نمکین دلیہ تھا کیونکہ اس میں گوشت کی بوٹیاں اور سرخ مرچ پاؤڈر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جاگنے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہوا تھا یعنی اب میں رفتہ رفتہ نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جگانے والے کی طرف دیکھا اور چھوٹی انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ "مجھے باتھ روم بھی جانا ہے۔"

"پہلے کھالو پھر تمہیں ایک ساتھ ہی لے جائیں گے چھوٹا بڑا ایک ساتھ کر لینا۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا اور باہر چلا گیا۔ دلیہ گرم لیکن کسی قدر پھیکا تھا۔ اسے حلق سے اتارنا آسان نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ قوت بخش چیز ہے اور میری توانائی جلد بحال کر دے گا۔ اس لیے میں نے پورا پیالہ کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار لیا تھا۔ پانی کی بوتل خالی کر کے میں ایک بار پھر بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ اب مجھے ان کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ مجھے باتھ روم لے جائیں لیکن وہ ایک گھنٹے بعد آئے جب میں خود بے تاب ہو کر دروازہ بجانے والا تھا۔ دونوں میں سے اب تک ایک ہی نے مجھ سے بات کی تھی اور اس وقت بھی وہی اندر آیا تھا۔ یہ لمبے قد اور فوجیوں جیسے مختصر بالوں والا جوان آدمی تھا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ تربیت یافتہ ہے لہجے سے وہ پوٹھوہار کا رہنے والا لگتا تھا۔

''چلو تم کو صاحب نے بلایا ہے۔''

''لیکن پہلے مجھے باتھ روم جانا ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایمرجنسی ہے۔''

اس نے واکی ٹاکی پر ڈیوڈ شا کو میری ایمرجنسی کی اطلاع دی اور اس سے تازہ ترین ہدایات حاصل کیں۔

''چلو لیکن زیادہ دیر مت کرنا۔''

''چلو تو......'' میں نے بے تابی سے کہا کیونکہ اتنے دن بعد پیٹ میں کھانا گیا تھا تو وہ کچھ گڑبڑا گیا تھا اور گڑگڑ کر رہا تھا۔ باتھ روم اسی حصے میں تھا۔ وہاں سے فارغ ہوتے ہی مجھے سیدھا ڈیوڈ شا کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ اس بار بھی دونوں افراد باہر ہی رہے تھے۔ دروازہ ڈیوڈ شا نے خود کھولا تھا وہ نائٹ گاؤن میں تھا اور آرام کے موڈ میں تھا لیکن اس وقت اس کے پاس مے نوشی کے لوازمات نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے بجائے اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور جب اس نے کتاب تپائی پر رکھی تو میں نے دیکھا یہ انگریزی زبان میں آسٹرولوجی کے موضوع پر تھی۔ اس کا نام تھا ''اے بریف ہسٹری آن آسٹرولوجی۔''

''تمہیں اس قسم کے موضوعات سے دلچسپی ہے؟'' میں نے کتاب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں...... تمہیں بھی ہے؟''

''نہیں لیکن میں نے اس بارے میں تھوڑا بہت پڑھ رکھا ہے۔''

''بیٹھو۔'' اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے صرف اس موضوع سے دلچسپی ہی نہیں ہے میں اس کا ماہر بھی ہوں۔''

''اوہ۔'' میں ہنسا۔ ''گویا تم کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ستاروں اور قدرت کے اشارے دیکھتے ہو گے۔ شگون تلاش کرتے ہو گے۔''

''شگون کیا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سائن۔''

''ہاں ایسا ہوتا ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔

''لیکن تم نے محسوس تو کیا ہو گا کہ سب کچھ کرنے کے باوجود بہت سارا ایسا کچھ نہیں ہو پاتا ہو گا جو تم چاہتے ہو؟''

''ہاں ایسا ہوتا ہے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''اسی کا نام تقدیر ہے۔''

''تم تقدیر کو مانتے ہو؟''

''ہاں لیکن اس طرح نہیں جس طرح تم مانتے ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

''کس طرح۔'' میں نے ذرا چبھتے انداز میں کہا۔

''یعنی جو تمہاری مرضی کے مطابق کرے اس تقدیر کو مانتے ہو اس میں اپنا عمل دخل دیکھنا چاہتے ہو؟''

''تم چاہو تو ایسا بھی سمجھ سکتے ہو۔'' اس نے کسی قدر اکتائے انداز میں کہا۔ ''بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اسے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ تم نے میری بات پر غور کیا تھا؟''

''کون سی بات پر؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس کا چہرہ ایک لمحے کو سرخ ہوا تھا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اپنی پرانی نارمل زندگی میں واپس جانا چاہتے ہو؟''

''ظاہر ہے کیوں نہیں جانا چاہوں گا۔'' میں نے سرد انداز میں کہا۔ ''لیکن کیا یہ ممکن ہے۔ ایک طرف مرشد جیسا طاقتور شخص میرا دشمن ہو رہا ہے۔ پولیس مجھ پر مقدمات بنا کر شدومد سے مجھے تلاش کر رہی ہے اور شاید میں بھارتیوں کو بھی مطلوب ہو گیا ہوں۔ تمہارے پاس کیا الہ دین کا چراغ ہے جو میرے اتنے سارے مسائل حل کر دے گا۔''

''تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''اگر تم چاہو تو یہ سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے اگر آدمی کرنا چاہے تو۔''

''میں کیوں نہیں چاہوں گا؟'' میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہارے خیال میں کیا میں اس زندگی کا عادی ہو گیا ہوں جس میں ہمہ وقت مار دھاڑ اور قتل و غارت گری جاری رہتی ہے؟''

''نہیں میرا اندازہ ہے تم اس زندگی سے بالکل خوش نہیں ہو حالانکہ تم نے بڑی کامیابی سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا ہے۔ خاص طور سے تم نے انڈیا میں جو کیا ہے وہ تو کسی تربیت یافتہ کمانڈو کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔''

''میں نے وہاں جو کیا وہ صرف اپنے دفاع میں کیا۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''میرا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔''

ڈیوڈ شا میرے انداز پر مسکرایا۔ ''تم ڈر رہے ہو کہ شاید یہاں تمہاری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں؟''

''اگر ہو بھی رہی ہیں تب بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔''

''لیکن تم اعتراف کر چکے ہو کہ ڈاکٹر کو تم نے انفیکٹڈ کیا ہے۔'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''میں نے ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے وہ کہاں ہے؟''

''اسے دیکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلایا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

ہم کمرے سے باہر آئے جہاں دونوں گارڈز مستعد کھڑے تھے۔ جب ہم آگے بڑھے تو وہ ہمارے پیچھے تھے۔ وہ یقیناً ڈیوڈ شا کے محافظ تھے اور اسے کسی بھی وقت اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔ مجھے یقین تھا جب ڈیوڈ شا کمرے میں میرے ساتھ ہوتا تھا تب بھی وہ صرف ایک آواز دے کر انہیں بلا سکتا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے سو بار سوچوں گا کیونکہ اگر میں اسے مار دیتا یا خالی ہاتھوں قابو کر لیتا تب بھی میرے لیے اس جگہ سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ پھر ڈیوڈ شا مجھے سمجھتا تھا اور اسی بنا پر وہ پُرامید تھا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھا کر اپنے لیے مشکلات پیدا نہیں کروں گا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں اندر سے بالکل پُرسکون تھا۔ میرے اندر مختلف ابال تھے۔ خاص طور سے زرین اور

میرے ساتھ جو ہوا تھا اور ہمیں جس طرح ننگِ انسانیت تجربے کا نشانہ بنایا گیا۔ زرین نے کس طرح سسک سسک کر میرے سامنے جان دی تھی۔ جب یہ سب مجھے یاد آتا تو میرے اندر کا ابال تیز ہو جاتا تھا لیکن اس ابال کو میں نے اپنے اندر محدود رکھا تھا اور اس کا اثر میری ظاہری شخصیت پر نہیں آیا تھا۔ تجربات نے مجھے سکھا دیا تھا کہ ٹھنڈے لوہے پر چوٹ بے کار ہوتی ہے۔ ہاں جب گرم ہو تو ذرا دیر مت کرو اور دوسرے میرا خدا پر یہ پختہ ایمان ہے کہ وہ موقع ضرور دیتا ہے کیونکہ وہ سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہو اور خدا اس کا بدلہ لینے کا موقع نہ دے۔ بس ضرورت ذرا صبر کی ہوتی ہے۔

ڈیوڈ شا مجھ سے ذرا آگے تھا۔ اسی گیلری میں گھوم کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں آئے۔ یہاں میز پر چھوٹے چھوٹے کئی ایل سی ڈی مانیٹرز رکھے تھے اور یہ سب ایک کمپیوٹر سے منسلک تھے۔ ان پر اس چیمبر کی مختلف زاویوں سے ویڈیو دکھائی جا رہی تھی جہاں میں نے اور زرین نے دو ہولناک دن گزارے تھے۔ اگر چہ مجھے توقع تھی کہ وہاں مجھے ڈاکٹر نظر آئے گا اس کے باوجود وہ نظر آیا تو میں چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ انسان کی کیا اوقات ہے اور مکافات عمل کتنی تیزی سے اس کے سامنے آجاتا ہے اس بارے میں وہ کبھی نہیں سوچتا ہے خاص طور سے جب وہ حالات پر حاوی ہو۔ یہ سوچیں اسے اس وقت آتی ہیں جب حالات اس پر حاوی ہو جاتے ہیں اور جو ان چیزوں کو پہلے سوچ لے وہی اچھا انسان ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اور ڈاکٹر، مرشد اور ڈیوڈ شا جیسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر نے ہمارے جسموں پر لباس چھوڑا تھا لیکن اس کے آقا عالی مرتبت نے ایک انڈرویئر کا بھی تکلف نہیں کیا تھا اور ڈاکٹر اسی حالت میں چیمبر میں پڑا تھا جس حالت میں اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ وہ ایک دیوار سے لگا اور خود کو سمیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیوڈ شا میز کے سامنے رکھی واحد کرسی پر بیٹھ گیا میں اس کے پیچھے کھڑا تھا اور میرے پیچھے اس کے دونوں محافظ تھے۔ ڈیوڈ شا نے ایک مانیٹر کے کیمرے کو زوم کیا اور وہ ڈاکٹر تو فیق کو بہت قریب سے دکھانے لگا۔ یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اس کے عریاں جسم پر جا بہ جا ویسے ہی سرخ دھبے نمودار ہو رہے تھے جیسے کہ زرین کے بدن پر آئے تھے۔ وہ جس طرح ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ لگتا تھا اس کے اندر درد اور بے چینی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ شا نے آہستہ سے کہا۔

''صرف بیس گھنٹے میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے اور یہ شاید دو دن بھی زندہ نہ رہے۔''

''خالق اپنی تخلیق کا نشانہ بن رہا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''تم سے ایک سوال ہے۔ جب مغربی طاقتوں کے پاس دنیا کو مٹانے کے لیے کافی سے زیادہ ہتھیار موجود ہیں تو اس قسم کے ہتھیار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہ تو ان ملکوں کے کرتا دھرتا ہی بتا سکتے ہیں۔'' اس نے لاپروائی سے شانے اچکا کر خود کو اس پروجیکٹ سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ڈیوڈ شا ایسی باتیں تم ان کے سامنے کیا کرو جو تم کو نہیں جانتے ہیں میں تمہارے بارے میں سب کچھ تو نہیں لیکن بہت کچھ جان چکا ہوں۔ ڈاکٹر صرف ایک کارکن تھا یہ اس کا پروجیکٹ نہیں تھا۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ حسبِ معمول سپاٹ ہو گیا۔ ''میں صرف مڈل

مین ہوں اور ڈاکٹر ان لوگوں کے درمیان معاملات طے کراتا ہوں جو اس سے کام لے رہے تھے تم چاہو تو یہ بات ڈاکٹر سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ یہ اب تمہارے ہر سوال کا جواب دے گا۔"

"میں کس طرح بات کر سکتا ہوں؟"

ڈیوڈ شا نے سامنے رکھے کی بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور مائیک میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے مائیک پکڑ کر کہا۔ "ڈاکٹر توفیق تم میری آواز سن رہے ہو؟"

وہ بری طرح چونکا۔ "شہباز تم کنٹرول روم میں ہو؟"

"ہاں اور تم اس چیمبر میں ہو جہاں سے بقول تمہارے آدمی مر کر ہی نکلتا ہے لیکن میں اس میں سے زندہ نکل آیا اور اب تم یہاں ہو۔"

وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "مجھے معلوم ہے میں تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوں اور یہاں سے میری لاش ہی باہر جائے گی لیکن کیا تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟"

"نہیں میں حالات بدل جانے پر اپنی اوقات بھولنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"پوچھو۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں جانتا ہوں تو بتا دوں گا۔"

موت کو سامنے دیکھ کر اس کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ "ڈاکٹر تم یہ پروجیکٹ کن لوگوں کے لیے کر رہے ہو؟"

"میں نہیں جانتا ہوں یہ ایک نجی امریکی کمپنی ہے۔ میرا ان لوگوں سے تعارف ڈیوڈ شا نے کرایا تھا اور اسی نے معاملات طے کرائے تھے۔"

"تمہارے ذمے کیا کام لگایا گیا تھا؟"

"ایبولا وائرس کو اتنا طاقتور بنانا کہ جسے لگ جائے وہ کسی صورت موت سے نہ بچ سکے اور تین دن کے اندر مر جائے۔"

"تم نے اپنا کام خوب کیا ہے ڈاکٹر۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں اس کا عینی گواہ ہوں۔ آدمی صرف دو دن میں مر جاتا ہے۔ تمہیں اس کا معاوضہ کیا ملا؟"

"ویسے ایک لاکھ ڈالرز ماہانہ اور تمام اخراجات اور سامان امریکی کمپنی کے ذمے تھا اور پروجیکٹ کی کامیابی کی صورت میں مجھے ایک کروڑ ڈالرز اور امریکہ یا یورپ کے جس ملک کی چاہتا شہریت مل جاتی۔"

"افسوس کہ اب تم کو نہ ایک کروڑ ڈالرز ملیں گے اور نہ ہی کسی ملک کی شہریت ملے گی۔ تم نے کیا پایا اپنے بے گناہ ہم وطنوں کا خون کر کے؟"

"مجھے معلوم ہے میں نے سب کھو دیا ہے لیکن زندگی ایک جوا ہے اس میں انسان پاتا ہے تو کھوتا بھی ہے۔"

"وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کھوتا اور پاتا ہے لیکن تم نے انسانیت کی تمام حدیں پار کر لی تھیں۔"

"شاید میں اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے تمہارے اور تمہاری ساتھی کے

ساتھ جو کیا اس کا مجھے افسوس ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔''

ڈیوڈ شا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اسے اردو آتی تھی لیکن اتنی نہیں آتی تھی کہ غالب کی شاعری سمجھ لیتا جو آج کل اردو بولنے اور پڑھنے والوں کو بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ میں نے اسے ممکنہ حد تک اس کا ترجمہ کر کے بتایا۔ وہ مسکرانے لگا۔ ''تمہاری زبان کے شاعر بھی غضب کی بات کر جاتے ہیں۔''

''شاعر کسی بھی زبان کے ہوں وہ غضب کی بات ہی کرتے ہیں۔ ایک مصرع میں پوری کیفیت اور کہانی بیان کر دیتے ہیں۔'' میں نے کہا اور پھر ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ وائرس کا شکار ہو چکا ہے اور اس کی موت یقینی ہے؟''

''تقریباً اتنی ہی جتنی کہ ہزار فٹ کی بلندی سے گرنے والے کی ہو سکتی ہے۔''

''لیکن بعض اوقات بلندی سے گرنے والے بچ جاتے ہیں۔''

''ہاں میں نے بھی سنا ہے لیکن اس کا بچنا ناممکن سمجھ لو۔'' ڈیوڈ شا نے مضبوط انداز میں کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ دنیا کا کوئی بایولوجیکل ہتھیار اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا کہ یہ وائرس بن گیا ہے۔''

''تب تم اسے مار کیوں نہیں دیتے اس طرح سسک سسک کر مرنے کے لیے کیوں یہاں ڈالا ہے؟''

''میں اس وائرس کی تباہ کاری اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے کیا تمہاری خواہش نہیں ہے کہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھو۔''

''میں ایسی خواہش کیوں کروں گا؟''

''اس نے تمہیں اور تمہارے ساتھی کو انفکٹ کیا تھا۔''

''اس صورت میں تو مجھے موقع ملنے پر پہلے تمہاری گردن توڑنی چاہیے تھی اصل کرتا دھرتا تو تم ہو۔''

''میں صرف درمیان کا آدمی ہوں اور میری گردن توڑنا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''تم فکر مت کرو میں نے جب یہ کام کرنے کا ارادہ کیا تو اسے دنیا کا مشکل ترین کام سمجھ کر کرنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے میرا خیال ہے ڈاکٹر کا کام مکمل ہو چکا ہے اور اس وائرس کو ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو اسے ایک ہتھیار کی صورت میں بدل سکتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو بلکہ وائرس ان تک پہنچ چکا ہے۔'' ڈیوڈ شا نے مانیٹر کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم چاہتے ہو اسے کسی اور طریقے سے مار دیا جائے؟''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں نے صرف یہ کہا کہ اسے سسک سسک کر مرنے کے لیے یہاں کیوں ڈالا گیا ہے جب کہ یہ تو تمہارا اپنا آدمی ہے۔''

''ہمارا آدمی تھا۔'' ڈیوڈ شا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بے کار ہو چکا ہے۔''

''اس لیے تم نے مناسب سمجھا کہ اسے تجربے میں استعمال کر لیا جائے۔''

اس نے میرے طنز کا اثر لیے بغیر شانے اچکائے۔ ''اس میں حرج ہی کیا ہے اسے مرجانا تو ہے۔ تب کیوں نہ وائرس کی تباہ کاری کی مزید تصدیق کر لی جائے۔''

اس سے پہلے میں کچھ کہتا ڈاکٹر کو اچانک کھانسی آنے لگی اور پھر اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر سفید فرش کو سرخ کرنے لگے تھے۔ اسے بہت جلدی اندرونی جریان خون شروع ہو گیا تھا۔ میں ایک لمحے کو اندر سے ڈر گیا تھا اگر یہ وائرس کسی بھی طریقے سے عام لوگوں میں پھیل جائے تو یہ چیچک اور طاعون کی طرح لوگوں کا صفایا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ان دونوں بیماریوں نے آج سے دو سو سال پہلے تک دنیا میں تباہی مچا رکھی تھی اور ان کے ہاتھوں ہر سال دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں لاکھوں افراد موت کی آغوش میں چلے جاتے تھے پھر ان بیماریوں کا علاج اور ویکسین نکل آئی تھی اور اب دنیا میں ان بیماریوں کا نام ونشان نہیں تھا۔

لیکن یہ قدرتی بیماریاں تھیں اور ان کا علاج بھی قدرت نے خود سمجھا دیا تھا۔ اب جدید سائنس کی مدد سے تجربہ گاہوں میں بیماریوں کے عام سے جرثوموں کو طاقتور اور ناقابلِ شکست بنا کر ان سے بایولوجیکل ہتھیار تیار کیے جا رہے تھے۔ اگر یہ جرثومے حادثاتی طور پر بھی پھیل جاتے تو ان سے پھیلنے والی تباہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود بڑی طاقتیں اور کچھ ایسے ممالک جو بڑی طاقت بننے کا بخار رکھتے تھے اس قسم کے ہتھیاروں کی تیاری کر رہے تھے اور ان کو کوئی پروا نہیں تھی کہ اس قسم کے ہتھیاروں کو محفوظ طریقے سے رکھنا کتنا مشکل کام ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کے حادثاتی طور پر لیک ہو جانے، چوری ہو جانے اور دہشت گردوں کے ہاتھ لگ جانے کا کس قدر امکان تھا۔

کیونکہ میں نے ڈاکٹر کو آنے والی خوفناک موت سے نجات دلانے کے لیے کسی اور طریقے سے مارنے کی تجویز کی ذمے داری لینے سے انکار کر دیا تھا اس لیے ڈیوڈ شا نے چالاکی سے اس معاملے کو گول کر دیا اور مجھے لے کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ کوئی بہت آراستہ پیراستہ کمرہ نہیں تھا لیکن وہاں مناسب فرنیچر اور اس کی ضرورت کا سامان موجود تھا۔ اس میں ایک جدید قسم کا لیپ ٹاپ بھی تھا جو ایک میز پر رکھا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ اپنی پیش کش کے بارے میں مزید کیا کہتا ہے۔ میں اس کے زیادہ کھلنے کا منتظر تھا کہ اس کے ذہن میں اصل میں کیا ہے۔ وہ خود تو کرسی پر بیٹھ گیا تھا لیکن اس نے مجھے بیٹھنے کی پیش کش نہیں کی تھی۔ اس لیے میں ذرا پیچھے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر جھولنے کے بعد اس نے کہا۔

''شہباز میں بہت کم کسی کو آفر کرتا ہوں لیکن تمہیں میں نے آفر کی ہے اب اس سے فائدہ اٹھانا تمہارا کام ہے۔''

''اس آفر کے لیے میں شکر گزار ہوں۔'' میں سادگی سے کہا۔ ''لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم میرے اتنے سارے مسائل حل کر کے مجھے میری پہلے والی زندگی لوٹانے کی بات کس طرح کر رہے ہو۔''

''اس معاملے میں تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔''

میں ہنسا۔ ''ڈیوڈ شا کیا تم نے مجھے کوئی عقل سے پیدل تیسری دنیا کا پٹھو حکمران سمجھ رکھا ہے جو میں تم پر اعتماد کروں۔''

اس کے چہرے کے زاویے ایک لمحے کو بگڑے تھے۔ ''تب تم کیا چاہتے ہو؟''

''اگر تم کوئی سنجیدہ پیش کش کرنا چاہتے ہو تو اسے تفصیل کے ساتھ سامنے رکھو تب ہی بات ہو سکتی ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر یک دم مسکرایا۔ ''میں تمہیں تیسری دنیا کا کوئی پٹھو حکمران نہیں سمجھ رہا

ہوں تم یقیناً ان سے کہیں زیادہ ذہین ہو۔ اس لیے تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مجھ پر اعتماد کے سوا تمہارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"او کے فرض کرلو میں تم پر اعتماد کر لیتا ہوں اور مان لیتا ہوں کہ تم وہی کرو گے جو کہہ رہے ہو اس کے بعد کیا ہوگا تم مجھے رہا کردو گے؟"

"فوری طور پر تو یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔ "ویسے بھی اگر تمہیں مرشد سے اپنے معاملات طے کرنے ہیں تو تمہارا اور اس کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہے۔"

"ڈیوڈ شا اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مرشد اس معاملے میں تمہاری بات سچ مچ مان لے گا تو تم غلطی پر ہو جو شخص خدا کو دھوکا کی کوشش کرتا ہے وہ تمہیں کہاں خاطر میں لائے گا؟"

"میں خدا نہیں ہوں۔" ڈیوڈ شا کا انداز سپاٹ ہو گیا۔ "یہ بات مرشد بھی اچھی طرح جانتا ہے وہ مجھ سے بگاڑ کر نہیں کر سکتا کیونکہ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"یعنی تم ایک طرح سے اپنی ضمانت دے رہے ہو لیکن فرض کرو کہ کل کو تم انتقال کر جاتے ہو کیونکہ ایک تو تمہاری عمر کوئی پچپن کے آس پاس ہے اور پندرہ بیس سال مزید زندہ رہ سکو گے۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی مر جاؤ۔ تم جس فیلڈ میں ہو اس میں انسان بستر پر کم ہی مرتا ہے۔ تب تمہاری ضمانت کہاں رہے گی؟"

"میرا تعلق ایک معزز لارڈ فیملی سے ہے اور میری ضمانت کو تم ہمیشہ کے لیے سمجھ سکتے ہو۔"

ڈیوڈ شا یا تو خود بھولا بن رہا تھا یا مجھے بھولا سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ امکان یہی تھا کہ وہ مجھے بھولا سمجھ رہا ہے اس لیے میں نے بھولا بننے کا فیصلہ کر لیا۔ "یعنی ایک طرح سے سرکاری ضمانت دے رہے ہو۔ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

وہ خوش ہوا تھا۔ "تمہارے پاس سوچنے کے لیے وقت ہے۔"

اس کے حکم پر مجھے میرے قید خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کوئی چھ سات گھنٹے سویا تھا میری نیند کی ضرورت پوری ہو گئی تھی۔ اب میں اپنے جسم کو جانچنا چاہتا تھا۔ میں نے ہلکی پھلکی ورزش سے آغاز کیا اور پھر کچھ سخت ورزشیں کیں۔ اس سے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سانس بھی بے ترتیب ہوئی تھی لیکن یہ جان کر مجھے سکون ملا تھا کہ میری جسمانی کارکردگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اگر پہلے یہ سو تھی تو اب یہ نوے ضرور تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وائرس اور اس کے توڑ کے استعمال نے مجھے نقصان نہیں کیا تھا۔ کارکردگی میں کمی کی وجہ بھی مستقل آرام تھا۔ میں تقریباً ایک ہفتے تک لیٹا رہا یا بندھا پڑا رہا تھا۔ اس لیے کچھ نہ کچھ فرق تو پڑنا تھا۔ پانی کی بوتل ایک بار پھر بھر دی گئی تھی لیکن کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا سوائے صبر کے پھل کے۔ ورزش کر کے میں نے کچھ دیر آرام کیا اور دوبارہ ورزش کی۔ جب کرنے کو کچھ نہ ہو تو انسان کو یہ دو کام کرنے چاہئیں ایک تو سو جائے اور دوسرے ورزش کرے۔

اگلی بار مجھے کوئی چھ سات گھنٹے بعد کھانا ملا اور اس بار بھی دلیہ اور اس میں گوشت تھا۔ اس بار نمک مرچ کسی قدر بہتر تھا اور مقدار زیادہ تھی۔ کیونکہ مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے زہر مار نہیں کرنا پڑا۔ کھانے کے بعد مجھے ایک بار واش روم جانے کا موقع ملا اور پھر میں سو گیا۔ دن رات کا کچھ پتا نہیں تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے

رات ہوگئی ہے۔ میں دیر تک سویا تھا اور اس بار بھی مجھے جگایا گیا تھا۔ یہ وہی لمبا پوٹھوہاری تھا۔

''تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔''

میں نے انگڑائی لی۔ ''صبح سویرے ناشتے کے بغیر صاحب کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

''بکومت۔'' وہ غرایا۔ ''صاحب کے لیے ادب سے بات کرو۔''

''کیوں کیا وہ تمہارا مجازی باپ ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ توقع کے عین مطابق طیش میں آ گیا تھا اور اس نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھی نے روک لیا۔

''چھوڑ اسے......بس لے کر چل۔''

اسے بھی عقل آ گئی تھی۔ اس نے پیچھے ہٹ کر مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس کے ساتھی سے کہا۔ ''اچھا ہوا تم نے اسے روک لیا ورنہ میں اسے بتا دیتا میں اس کے مجازی باپ سے کسی طرح کم نہیں ہوں۔''

''بکواس کرنے کے بجائے اب چل دو ایسا نہ ہو صاحب کا موڈ خراب ہو جائے۔'' دوسرے گارڈ نے خبردار کیا۔ ''اس کا موڈ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔''

ڈیوڈ شا کا موڈ واقعی خراب لگ رہا تھا اور وہ تیار تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں سے آیا تھا یا کہیں جانے کی تیار تھا۔ اس نے مکمل سوٹ کے اوپر بھاری اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اس بار دونوں مسلح افراد میرے ساتھ ہی اندر آ گئے تھے۔ مجھے لگا کہ کوئی بات ہوئی تھی۔ کیونکہ ڈیوڈ شا تو نہیں لیکن باقی دونوں کچھ پریشان اور عجلت میں محسوس ہو رہے تھے اس کا اظہار ان کی جسمانی حرکات سے ہو رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے بلاتمہید کہا۔

''شہباز کیا یہاں تمہارے کچھ مددگار ہیں؟''

''ہاں ہو بھی سکتے ہیں لیکن ان کو یہ نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔'' میں نے شانے ہلائے۔ ''کیوں کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے۔''

''شاید ہمیں یہاں سے جانا پڑے۔'' اس نے کہا اور اچانک ایک پستول کوٹ سے نکال کر مجھ پر تان لیا اور اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''اسے باندھ دو۔'' پھر مجھ سے کہا۔ ''شہباز کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ میں گولی چلاتے ہوئے پروا نہیں کروں گا۔''

لمبا پوٹھوہاری ہاتھ اور پیروں میں پہنانے والی ہتھکڑی لے کر آگے آیا۔ میں نے ہاتھ آگے کر دیئے اور اس نے ان میں یہ ہلکی پھلکی لیکن بہت مضبوط ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ پھر دوسری ہتھکڑی جو اصل میں بیڑی تھی اس نے میرے پیر میں ڈال دی۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''کیا کسی نے مجھے رہا کرانے کی کوشش کی ہے۔''

ڈیوڈ شا نے جواب دینے کے بجائے واکی ٹاکی پر کسی سے پوچھا۔ ''صفائی کر دی ہے؟ کوئی نشان باقی نہیں رہنا چاہیے۔''

دوسری طرف سے سن کر اس نے واکی ٹاکی بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور میز سے اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر اسے لیدر کیس میں ڈالا اور میرے ساتھ آنے والوں حکم دیا۔ ''اسے گاڑی میں لے جاؤ۔''

اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ وہ یہاں سے کہیں جا رہے تھے۔ شاید یہاں سے سارے نشانات مٹا دیئے گئے تھے جن سے پتا چلتا کہ اس کوٹھی میں کیا ہو رہا تھا۔ ممکن ہے ان نشانات میں ڈاکٹر بذاتِ خود بھی ہو کیونکہ اس کا اتنی

جلدی مرنے کا امکان کم تھا مگر وہ اسے زندہ بلکہ لاش کی صورت میں بھی چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے اور اسے یقیناً بھٹی میں ڈال کر راکھ میں تبدیل کر دیا گیا ہوگا۔ اس سے پہلے وہ دونوں مجھے باہر لے جاتے میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ زرین کی راکھ میرے حوالے کرو گے۔''

ڈیوڈ شا ایک لمحے کو ٹھٹکا جیسے یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر الماری کھولی اور اس میں ایک پاؤچ نکال کر میری طرف اچھال دی یہ اچھی قسم کے چمڑے سے بنی پاؤچ تھی۔ میں نے کیچ کر کے اس میں موجود راکھ کو محسوس کیا۔ دکھ کی وہ کیفیت جو میں بھول رہا تھا ایک بار پھر مجھ پر حاوی ہونے لگی۔ زندہ اور زندگی سے بھرپور زرین اب ایک مٹھی خاک میں بدل گئی تھی ہر انسان کا بالآخر یہی مقدر ہوتا ہے۔ میں نے گہری سانس لی اور پاؤچ کو ٹراؤزر کی جیب میں رکھ کر ڈیوڈ شا سے کہا۔

''اس کے لیے میں سچ مچ تمہارا شکر گزار ہوں۔''

اس نے سر ہلایا اور کہا۔ ''ناؤ گو۔''

اس کے دونوں محافظ مجھے پہلے کوٹھی میں اوپر لائے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا صبح کا وقت تھا اور سورج بلند ہو رہا تھا۔ اندر کی گرمی اور عام کپڑوں کی وجہ سے باہر آتے ہی میں سردی سے لرز اٹھا تھا۔ برف باری جاری رہی تھی اور وہاں ہر طرف برف کے انبار لگے تھے اور اب ہوا چل رہی تھی اس کی کاٹ کسی ریزر سے کم نہیں تھی جہاں جہاں سے جسم کھلا تھا اس پر کسی ریزر کی طرح اپنی دھار آزما رہی تھی۔ پھر پورچ میں کھڑی ایک بڑی گاڑی تک لائے۔ اس کے تین حصے تھے۔ سامنے ڈرائیونگ کمپارٹ میں آگے پیچھے نشستیں تھیں اور پیچھے کا حصہ بالکل الگ اور بند ہونے والا تھا۔ اس کے دوہرے دروازے عقب میں کھلتے تھے۔ اس میں صرف فرش تھا۔ انہوں نے مجھے اس میں دھکیل دیا اور پھر دروازے بند کر دیئے۔ اندر کوئی ہینڈل نہیں تھا جس سے دروازے کھولے جاتے۔ روشنی بھی نہیں تھی دروازے کے اوپر لگے سیاہ شیشوں سے کسی حد تک روشنی آ رہی تھی لیکن ان کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا نے کس وجہ سے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی ورنہ اسے ایک اچھے خاصے محفوظ ٹھکانے کو یوں چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی۔

میرے اندر امید کی کرن چمکی تھی شاید میرے ساتھیوں نے اس کوٹھی کا سراغ لگا لیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ یہاں کوئی کارروائی کرتے ڈیوڈ شا نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے کوئی ناکام کارروائی کی ہو اور اس کے بعد انہوں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ کیونکہ ان کو عجلت تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ باہر کہیں محاصرہ ہو۔ وہ بنا کسی خوف کے جا رہے تھے۔ البتہ جانے سے پہلے وہ سارے نشانات مٹا رہے تھے اور اس کام میں یقیناً دیر لگتی۔ میں نے دیکھا تھا پورچ میں ڈاکٹر کی شاندار کار نہیں تھی اسے شاید پہلے ہی یہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔

مجھے اس جگہ بند کر کے دونوں وہاں سے چلے گئے تھے۔ کیونکہ آس پاس بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ کیونکہ یہ جگہ چھوٹی سی تھی اس لیے میں نے پشت دیوار سے ٹیک کر دونوں پاؤں دروازے سے لگا کر زور ڈالا لیکن دروازے بہت مضبوط اور خاص طور سے اسی لیے بنائے گئے تھے کہ زور ڈالنے پر بھی نہ کھلیں۔ میرے پاس وقت تھا اور ان کی آمد سے پہلے میں کوشش کر سکتا تھا۔ دوسری بار میں نے خود کو ذرا آگے کھسکایا اور کمر کے ساتھ ہاتھ بھی

دیوار سے ٹیک کر دروازے پر دباؤ ڈالا مگر اس بار بھی دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اندر باہر دونوں طرف سے فولاد کی موٹی چادر سے بنایا گیا تھا تھک ہار کر میں نے کوشش ترک کر دی۔ کوئی پندرہ یا بیس منٹ بعد میں نے ڈیوڈ شا کی آواز سنی۔ وہ کسی سے پوچھ رہا تھا۔ ''وائرز چیک کیے؟''

''لیس سر۔'' جواب دینے والا غیر ملکی لگا تھا لیکن وہ انگریز نہیں تھا۔ ''آپ جانتے ہیں میں کام سے مطمئن ہونے والا نہیں ہوں۔ تمام چیزیں اچھی طرح چیک کی ہیں۔''

''سنو اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم یہاں آنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔'' ڈیوڈ شا نے اسے خبردار کیا۔

''اب نہیں کہا جاسکتا ہے کہ باہر وہ لوگ ہیں یا نہیں۔''

''آل از اوکے سر۔'' دوسرے نے مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے چلو۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ اس پر دوسرے آدمی نے کسی سے پوچھا۔

''راستہ کلیئر ہے؟'' مجھے دوسرے آدمی کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ وہ شاید کہیں دور تھا اور اس سے واکی ٹاکی پر رابطہ تھا۔ غیر ملکی نے پھر کہا۔ ''اوکے راستہ کلیئر دیکھ کر ہمارے پیچھے آنا اور کچھ دور رہنا اگر کوئی روکنے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹنا۔''

کچھ دیر میں سب گاڑی میں آ گئے تھے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ گیٹ سے نکل کر گاڑی غیر متوقع طور پر دائیں طرف مڑی تھی یعنی وہ بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ جب کہ میں وہ سوچ رہا تھا کہ گاڑی نیچے کی طرف جائے گی۔ ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی یقیناً گھات سے فکرمند تھے جو کسی نے لگا رکھی تھی اور ڈیوڈ شا کا غیر ملکی ساتھی اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ گھات لگانے والوں کو چکما دینے کے لیے وہ الٹی سمت میں گئے تھے۔ یقیناً وہ آگے سے کسی راستے سے گھوم کر اسلام آباد کی طرف جاتے لیکن فی الوقت وہ اس سے دور جا رہے تھے۔ وین کا یہ خانہ بھی سرد خانہ بنا ہوا تھا اور یہاں گرمی نہیں تھی جب کہ اس قسم کی گاڑی میں ہیٹر لازمی تھا۔ اگر ہیٹر آن تھا تب بھی اس کا اثر پیچھے تک نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال یہ خانہ بند ہونے کی وجہ سے میں سرد ہوا سے محفوظ تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں خود میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد سے اگلے حصے سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی یا تو سب خاموش بیٹھے تھے یا پھر انجن کی آواز سے ان کی آوازیں دب گئی تھیں۔

جب گاڑی باہر نکلنے لگی تو مجھے امید تھی کہ کچھ دھوم دھڑکا ہوگا اور شاید باہر موجود ان کے دشمن اور شاید میرے ہمدرد کوئی کارروائی کریں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور گاڑی مزے سے نکلتی چلی گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں کچھ نہیں ہوا تو میری امیدیں بھی دم توڑ گئی تھیں کیونکہ اتنا لمبا گھات لگانا ممکن نہیں تھا۔ بے شک یہ پہاڑی علاقہ تھا لیکن یہاں راستوں کی کمی نہیں تھی اور نکلنے کے لیے کئی راستے تھے۔ اگر کسی نے ان لوگوں کو روکنا تھا تو اسے کوٹھی کے پاس ہی گھات لگانی پڑتی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شا کا اندیشہ غلط تھا یا وہ بروقت وہاں سے نکل آیا تھا۔

اب تک گاڑی اوپر کی طرف جا رہی تھی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کا رخ بدل گیا اور پھر وہ نیچے جانے لگی۔ مری اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اوپر جاتے ہوئے بھی بعض مقامات پر گہرائیاں آتی ہیں جن میں گاڑیاں نیچے اترتی ہیں لیکن یہ بہت مختصر دورانئے کی ہوتی ہیں۔ جب کہ چڑھائیاں زیادہ آتی ہیں اور گاڑیوں

کا منہ اکثر راتوں کو رونے والے کتے کی طرح اوپر کی طرف رہتا ہے۔ جب کہ واپسی کے سفر میں گاڑی کا منہ زمین سونگھتے کتے کی طرح نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ جب گاڑی کا رخ مستقل نیچے کی طرف رہا تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ اسلام آباد جا رہے تھے۔ زرین کی راکھ والا پاؤچ میرے ٹراؤزر کی جیب میں تھا۔ میں نے اسے نکال کر دیکھا۔ پاؤچ کے اندر سچ مچ راکھ تھی۔ اس سے جلی ہڈیوں والی بو آ رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے اس راکھ کو کہیں دفن کرنے کا موقع بھی ملتا یا نہیں۔ کم سے کم جب تک میں ڈیوڈ شا کی قید میں تھا تب تک تو یہ کام محال تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔

گاڑی کا سفر کوئی ایک گھنٹے جاری رہا تھا اور جیسے جیسے یہ نیچے جا رہی تھی سردی کا اثر بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم یقیناً اسلام آباد یا راولپنڈی پہنچ چکے تھے کیونکہ سردی تھی لیکن اس کی کاٹنے والی کیفیت باقی نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں، میں نے غور کیا تھا کہ ڈیوڈ شا مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتا تھا۔ وہ اس وادی تک جانا چاہتا تھا جو ہمالیہ میں کہیں ناقابلِ گزر قسم کے پہاڑوں کے بیچوں بیچ تھی اور ایک خاص دھند اسے دنیا والوں کی نظروں سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ راجا عمر دراز وہاں جا چکا تھا اور اس کا وہی حال تھا کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ ممکن ہے ڈیوڈ شا بھی وادی یاترا کر آیا ہو۔ ویسے وہ ایک حیرت انگیز جگہ ہے اور اس کے بارے میں سن کر ہی آدمی کو اسے دیکھنے کی خواہش ہو جاتی ہے۔ کئی بار مجھے بھی خیال آیا کہ اس وادی کو دیکھنا چاہیے۔ مگر فی الحال دوسری مشکلات اتنی تھیں کہ ان سے عہدہ برا ہونا جان جوکھم سے کم نہیں تھا وادی تک سفر کا پنگا لینے کا ارادہ نہیں تھا۔ یعنی میں راضی خوشی اس طرف جانے کے لیے تیار نہیں تھا ہاں کوئی زبردستی لے جاتا تو الگ بات تھی۔ ڈیوڈ شا یہی کوشش کر رہا تھا۔

نیچے آنے کے بعد گاڑی مشکل سے دس منٹ بعد کہیں رک گئی۔ وہ لوگ نیچے اترے اور میں نے ڈیوڈ شا کو کہتے سنا۔ ''اسے اندر لے آؤ۔''

''یس سر۔'' غیر ملکی نے کہا۔ اس کے ایک منٹ بعد گاڑی کا دروازہ کھلا اور اچانک نیم تاریکی سے روشنی ہوئی اور بہت تیز روشنی ہوئی تو آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔ سامنے تین افراد کھڑے تھے لیکن عقب میں سورج ہونے کی وجہ سے وہ صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے آنکھوں کے سامنے ہاتھ کر لیا تھا۔ ''باہر آؤ۔'' غیر ملکی نے اپنی بگڑی انگریزی میں کہا۔

میں اسی طرح ہاتھ سامنے کیے ہوئے نیچے اتر آیا تھا۔ اب کسی قدر بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ غیر ملکی سانولے رنگ کا اور کسی قدر موٹے نقوش والا نکلا تھا۔ وہ مقامی لگتا تھا لیکن مقامی نہیں تھا۔ ہمارے ہاں انگریزی اس طرح نہیں بولی جاتی ہے جس طرح وہ بول رہا تھا شاید وہ اسپینش تھا۔ باقی دو وہی مقامی افراد تھے۔ میں نے اس جگہ کا معائنہ کیا۔ یہ ایک بڑی کوٹھی تھی۔ جس کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی۔ گیٹ سے ایک اور گاڑی اندر آئی تھی اور گیٹ بند کیا جا چکا تھا۔ اس گاڑی سے بھی تین مسلح افراد اترے تھے۔ شاید یہ وہی پارٹی تھی جسے ممکنہ اسپینش نے ریکی اور حفاظت پر مامور کیا تھا اور وہ ڈیوڈ شا کی گاڑی کے پیچھے پیچھے آئے تھے۔ ان میں سے ایک گیٹ کی طرف چلا گیا تھا اور باقی دو ہماری طرف آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ممکنہ اسپینش آدمی سے پوچھا۔

''مارشل صاحب اب کیا حکم ہے؟''

مارشل نے ان سے کہا۔ ''تم چاروں کوٹھی کے باہر اور چھت پر رہو گے۔ کم سے کم ایک آدمی چھت پر رہے لیکن مسلح اور نمایاں نظر نہ آئے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟''

مقامیوں میں شاید اسی کی انگریزی اس قابل تھی ورنہ کوئی اور مارشل کی بات سمجھنے کے قابل نہیں تھا ویسے اس کی انگریزی خود انگریزوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتی۔ ''جی صاحب سمجھ گیا۔'' مقامی نے کہا۔

''چلو۔'' مارشل نے میری طرف دیکھا اور اندر کی طرف اشارہ کیا اور میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے ساتھ اندر کی طرف چل پڑا پیروں میں پڑی بیڑی کی گنجائش بس اتنی تھی کہ میں چھ سات انچ کے قدم اٹھا سکتا تھا۔ ہم اس کوٹھی کے پورچ میں تھے اور مارشل مجھے سامنے کے بجائے ایک بغلی دروازے سے اندر لایا۔ مقصد یہی تھا کہ میں سامنے والا حصہ نہ دیکھ سکوں۔ مارشل کے پاس بہ ظاہر کوئی اسلحہ نہیں تھا لیکن اس کا مسلح ہونا یقینی تھا شاید اسے اعتماد تھا کہ وہ میرے لیے خالی ہاتھ بھی کافی تھا جب کہ میرے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ دو طویل راہداریاں طے کرنے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لایا جہاں صرف ایک عدد صوفہ سیٹ تھا اور وہاں ڈیوڈ شا موجود تھا۔ اس نے اوور کوٹ اتار دیا تھا یہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے اشارے پر میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ مارشل میرے عقب میں موجود رہا تھا۔

''وہاں وقت نہیں تھا۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''ہمیں جلدی میں نکلنا تھا۔ اس لیے تم سے پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔ یہاں تمہارے کتنے ساتھی ہیں؟''

''صرف تین ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر تم میرے حالات سے واقف ہو تو تمہیں پتا ہوگا کہ میرے اصل ساتھی دبئی میں ہیں۔''

''وہ اب دبئی میں نہیں ہیں بلکہ میری اطلاعات کے مطابق ایران کے راستے پاکستان آ چکے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں دنگ رہ گیا تھا میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں اس کی معلومات حیرت انگیز طور پر اَپ ڈیٹ تھیں اور جو بات مجھے معلوم تھی بالکل وہی بات اسے بھی معلوم تھی لیکن میں نے اپنی حیرت ظاہر نہیں کی۔

''میں اس سے بے خبر ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس کوٹھی پر کسی نے حملہ کیا تھا؟''

''نہیں لیکن کچھ مشکوک افراد وہاں منڈلا رہے تھے اور جب کوٹھی کے گارڈ نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔''

''ممکن ہے وہ کوئی عام جرائم پیشہ ہوں اور لوٹ مار کے چکر میں ہوں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' ڈیوڈ شا نے تسلیم کیا۔ ''لیکن اگر وہ تمہارے ساتھی تھے اور دوبارہ وہاں جائیں گے تو ان کو وہاں کچھ نہیں ملے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس کوٹھی کی جگہ اب جلے ہوئے ملبے کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اسی ملبے میں ڈاکٹر کی راکھ شدہ لاش بھی ہوگی۔''

''تو تم نے نشان مٹانے کے لیے اس پوری کوٹھی کو تباہ کر دیا۔''

''مجبوری تھی۔'' اس نے جواب دیا۔''ورنہ وہ بہت اچھا ٹھکانہ تھا اسے تباہ کرنے کی اصل وجہ وہاں وائرس کی ممکنہ موجودگی ہے۔اس لیے اسے پوری طرح جلانا لازمی تھا۔''

''تم نے کیمیکل سے آگ لگائی ہوگی کہیں وہ آس پاس نہ پھیل جائے کیونکہ آس پاس گھنا جنگل ہے۔''

''اس موسم میں ممکن نہیں ہے درختوں پر برف ہے اس لیے ان میں آگ نہیں لگ سکتی۔'' اس نے کہا تو بات سمجھ میں آ گئی۔

''خیر چھوڑو یہ بات اب ماضی کا حصہ بن گئی ہے۔کام کی بات پر آؤ۔''

''کام کی بات کیا ہے؟''

''تم جانتے ہو۔'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔''اگر تم میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو تو میں ابھی ہی مرشد سے تمہارے سامنے بات کر لیتا ہوں۔وہ آنے والا ہوگا۔''

''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میں تمہارا ساتھ کس طرح دے سکتا ہوں۔''

ڈیوڈ شا نے گہری سانس لے کر مارشل کی طرف دیکھا اور وہ اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔اس نے جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈیوڈ شا کا ایک ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب کے پاس ہو گیا تھا جس میں کوئی بھاری چیز تھی۔ یہ بھاری چیز کوئی ہتھیار ہی ہو سکتی تھی۔ وہ مجھ سے پوری طرح ہوشیار تھا۔حالانکہ میں ہاتھ پاؤں سے جکڑا ہوا تھا۔ڈیوڈ شا کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''تمہیں راجا عمر دراز نے اپنے سفر کے بارے میں بتایا ہوگا؟''

''ہاں پہلے سفر کے بارے میں بتایا تھا لیکن ابھی وہ واپس آئے ہیں تو ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اس نے ایک برف والے بوڑھے کا ذکر بھی کیا ہوگا جو شدید سردی میں بھی عام سے کپڑوں میں رہتا ہے اور نہ کھاتا ہے اور پیتا ہے اس کی خوراک بس برف ہے۔اسی وجہ سے وہ برف والا کہلاتا ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔''

''یہ برف والا اس وادی کا نگران ہے اور اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی وہاں نہیں جا سکتا ہے۔''

''ایک سوال ہے۔ یہ بات تم اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہے ہو یا ولیم شا کے سفر سے حاصل شدہ تجربات کی بنا پر بتا رہے ہو؟''

''اپنا ذاتی تجربہ بیان کر رہا ہوں میں بھی اس وادی میں جانے کی کوشش کر چکا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر انکشاف کیا۔''عین اس وقت جب راجا عمر دراز وہاں جا رہا تھا۔''

''تم دونوں کی اس مہم جوئی کا نتیجہ کیا نکلا؟''

اس نے گہری سانس لی۔''بہت برا...... ہماری پارٹیاں آپس میں لڑ پڑی تھیں اور آخر میں ہمارے ساتھ بس ایک ایک آدمی بچا تھا سب سے اہم بات ہماری خوراک بھی تباہ ہو گئی تھی۔''

''تب تمہاری واپسی کیسے ہوئی؟''

''برف والے کی وجہ سے۔ ہمیں تو نیچے اترنے کا راستہ بھی نہیں مل رہا تھا۔''

میں چونکا۔ ''ہمیں...... کیا تم اور راجا صاحب ایک ساتھ تھے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''مجبوری تھی حالات نے ہمیں دشمنی بھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیونکہ اس ویرانے میں زندگی کے لیے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ میرے پاس محدود خوراک تھی اور عمر دراز وادی میں اترنے والا راستہ جانتا تھا۔''

''حالانکہ میری معلومات کے مطابق اس نے اترنے کے لیے غلط راستہ چنا تھا اور تین ہزار فٹ کی بلندی سے گرا تھا۔''

''ہاں لیکن واپسی اس کی ٹھیک راستے سے ہوئی تھی۔'' ڈیوڈ شا نے یاد دلایا۔ ''ہمیں اسی راستے کی تلاش تھی اور راجا عمر دراز نے اسے تلاش بھی کر لیا تھا۔''

اب مجھے اس داستان سے دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ ''پھر کیا ہوا تم لوگ نیچے اترے تھے؟''

''نہیں کچھ نیچے جانے کے بعد وہ راستہ غائب ہو گیا تھا۔ جب کہ راجا کا کہنا تھا کہ یہ وہی راستہ ہے۔''

''ممکن ہے بعد میں کسی وجہ سے راستہ ختم ہو گیا ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راستہ تھا لیکن برف والے نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''تمہارا مطلب ہے برف والے نے کوئی نظر بندی جیسا کام کیا تھا؟''

''ہاں وہ ذہنی طور پر بہت طاقتور ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں اس میدان میں بہت آگے ہوں لیکن جب میرا اس کا سامنا ہوا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔'' وہ بہت صاف گوئی سے بتا رہا تھا۔ ''وہ بہت عمر رسیدہ اور کمزور سا آدمی تھا لیکن میں اور باقی اس کے سامنے یوں مؤدب رہتے تھے جیسے ہم اس کے غلام ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے راستہ مل گیا تھا اور تم لوگ نیچے اترے تھے؟''

''نہیں اس کے برعکس ہم مرنے والے تھے کیونکہ رہی سہی خوراک بھی ختم ہو گئی تھی۔ ہمارے پاس ایندھن بھی ختم ہو رہا تھا اور اس کے بعد سردی اور بھوک سے موت سامنے تھی لیکن ایک رات اچانک ہی برف والا ہمارے سامنے تھا۔ اس وقت ہم میں اٹھنے کی سکت بھی نہیں تھی شاید ہم اس رات کی صبح تک زندہ نہ رہتے لیکن جب برف والے نے ہماری آنکھوں میں دیکھا تو نہ جانے ہم میں کہاں سے توانائی آ گئی اور ہم اس کے ساتھ چل پڑے۔ وہ اسی راستے سے ہمیں لے غاروں کے اس سلسلے تک آیا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے آگ اور خوراک سے ہمارا علاج کیا اور ہم چند دن میں ٹھیک ہو گئے۔''

''تم لوگ وادی میں اترے تھے؟''

''نہیں برف والے نے اس کی اجازت نہیں دی تھی اس نے راجا عمر دراز کو یاد دلایا کہ اس نے اس سے کیا کہا تھا کہ وہ ہاتھ والے کو لے کر آئے تبھی اسے وادی میں اترنے کی اجازت ملے گی۔''

''ہاتھ والا...... کون؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''تم اتنے انجان نہیں ہو۔ ہاتھ والے سے مراد تم ہو۔ کیا تمہارا ہاتھ صرف اس وجہ سے تمہارے جسم کے ساتھ نہیں ہے کہ حکیم قادس نے اس کا علاج اس پتھر کے سفوف سے کیا تھا؟ اور یہ پتھر اسے برف والے نے دیا تھا خاص طور سے تمہارے لیے۔''

''یہ درست ہے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ مفروضہ ہاتھ والا میں ہی ہوں۔''

''تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے یقین سے کہا۔ ''برف والے نے کہا ہے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اس سے پہلے تمہیں وادی تک پہنچنا ہوگا ورنہ پھر تم یا کوئی اور کبھی اس وادی میں داخل نہیں ہو سکے گا۔''

''کیوں کیا اس کے بعد وادی اس دنیا میں نہیں رہے گی یا کہیں اور منتقل ہو جائے گی؟'' میرا لہجہ کسی قدر استہزائیہ ہو گیا تھا۔

''مذاق مت اُڑاؤ۔'' اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تم ابھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''سوری۔'' میں نے معذرت کر لی۔ ''مگر سوال وہی ہے میں ہی کیوں ضروری ہوں۔ کیا برف والے نے مجھے اپنی جگہ دینی ہے۔''

یہ بات میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی بالکل مذاق میں کہی تھی مگر ڈیوڈ شا کا ردِعمل حیرت انگیز تھا اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے بھی یہی خیال آیا یقین کرو وہ تمہارے لیے بہت بے تاب ہے۔''

کیونکہ میرا صرف برف کھا کر کسی غار میں اکیلے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ کوئی بہت بڑی مجبوری نہ ہوئی تو میں اس وادی کے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''مگر اس نے راجا عمر دراز سے کہا کہ وہ ہاتھ والے شخص کو لے کر آئے تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''میرا خیال ہے جو تمہیں لے کر جائے گا صرف اسے ہی وادی میں اترنے کی اجازت ملے گی۔''

میں ہنسا۔ ''گویا میں کوئی پروانہ راہداری یا آج کی زبان میں ویزہ ہوں جس کے پاسپورٹ پر لگ گیا اسے جانے کی اجازت مل جائے گی۔''

''ہاں اس بوڑھے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوگی کہ تم کو کون لاتا ہے اسے صرف تم سے مطلب ہے۔''

''ممکن ہے وہ یہ بھی دیکھے کہ میں کس کے ساتھ آیا ہوں۔ ورنہ وہ راجا عمر دراز کے ساتھ تم سے بھی کہتا۔''

میرے سوال پر ڈیوڈ شا ایک لمحے کو چپ ہوا تھا پھر اس نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے ایسا ہی ہو اس کے باوجود میں چانس لینا چاہوں گا۔''

''کیونکہ اس کی قیمت تم نہیں کوئی دوسرا دے گا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ویسے ڈیوڈ شا آج کل تم اس دنیا کے حکمران بنے ہوئے ہو پھر اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہو اگر تم ایک فوجی دستہ لے کر براہِ راست اس وادی تک پہنچ جاؤ تب بھی میرے خیال میں کوئی تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''اس طرح میرے مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔ بات بھی کھل جائے گی اور تم جانتے ہو وادی اصل میں چین کی سرزمین پر ہے اور چین اسے اپنے معاملے میں مداخلت سمجھے گا۔''

''گویا کوئی بھی مہم صرف اس وقت ممکن ہے جب یہ چھپ چھپا کر جائے؟''

''یہی بات ہے۔''

''اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اس کے بدلے میں تمہارے تمام مسائل حل کرانے کا ذمہ لیتا ہوں۔''

''ڈیوڈ شا خدائی دعویٰ مت کرو۔ انسان کے مسائل وہی حل کر سکتا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔''

''اوکے...... میں کوشش کروں گا۔'' اس نے خلاف توقع مفاہمانہ انداز میں کہا۔ ''اگر تم راضی ہو تو میں پوری کوشش کروں گا اور مجھے یقین ہے میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ معاملہ صرف میرا ہی نہیں تھا بلکہ میرے ساتھیوں کا تھا۔ اگر مرشد کا کانٹا درمیان سے نکل جاتا تو باقی مسائل سے نمٹنا ہمارے لیے اتنا مشکل نہیں تھا۔ عدالتی معاملات ندیم کے ذمے ہوتے اور باقی سے ہم خود نمٹ سکتے تھے۔ ہمارے پاس اب دولت بھی تھی اور طاقت بھی تھی لیکن اگر میں ڈیوڈ شا کے لیے کام کرنے کو تیار ہو جاتا تو یہ میرے ضمیر کے خلاف ہوتا۔ میں ایک برے شخص کا برے کام کے لیے ساتھ دیتا۔ اس میں تو میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا کے عزائم نیک نہیں تھے۔ اس کا ارادہ وادی کے راز اور وہاں سے انوکھی چیزیں حاصل کر کے ان کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے انسانوں کا خون کیوں نہ بہانا پڑے۔ میں نے سوچ کر کہا۔

''ڈیوڈ شا میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ میں تمہارے خون آشام منصوبوں میں تمہارا ساتھ دوں۔''

''خون آشام؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ظاہر ہے تم کسی نیک مقصد کے لیے تو وادی کی طرف نہیں جا رہے ہو تمہارے اپنے مقاصد ہیں اور مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ اس سے بہت سارے بے گناہ لوگوں کو نقصان ہوگا۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اسے میری بات اچھی نہیں لگی تھی۔ ''تمہارے مسائل وہ ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے اور دوسرے میں تم سے ساتھ دینے کو نہیں صرف ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے میں صرف تمہارے ساتھ سفر کروں اور خود کو برف والے کے حضور پیش کر دوں تا کہ وہ تمہیں وادی میں اترنے کا پروانہ عطا کر دے۔''

''ظاہر ہے ورنہ جس طرح تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے ہو اسی طرح میں تم پر کس طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ ہوئے تو تمہاری حیثیت ایک قیدی سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''اس صورت میں غور کیا جا سکتا ہے مجھے اپنے ساتھیوں سے پوچھنا ہوگا۔''

''شہباز ملک فیصلہ تمہیں کرنا ہے اور ابھی کرنا ہے۔'' اس نے ذرا جھک کر کہا۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''فرض کرو میں انکار کرتا ہوں تب......؟''

''میں مرشد کو بلا چکا ہوں وہ اب سے ایک گھنٹے میں یہاں آ جائے گا اور اگر تم نے انکار کیا تو تمہیں اس کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔''

ڈیوڈ شا کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور میں اندر سے ہل گیا تھا۔ مرشد میرا ایسا دشمن تھا جو مجھے کسی صورت معاف نہیں کرتا۔ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا یقیناً اس کی سب سے بڑی خواہش تھی اگرچہ ایک بار وہ فتح خان کی وجہ سے مجھے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن ہر بار ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ فتح خان اسے مل چکا تھا۔ میں اس کے ہاتھ نہیں آنا

چاہتا تھا۔ ڈیوڈ شا نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''شہباز تمہارے پاس بھی وقت نہیں اس بار تم مرشد کے ہاتھ آ گئے تو کل کا سورج نہیں دیکھ سکو گے۔''

''مجھے بھی یقین ہے لیکن تم جانتے ہو میں اس قسم کی باتوں کی پروا ذرا کم کرتا ہوں۔'' میں نے نڈر ہونے کی کوشش کی۔

''بات صرف تم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ تمہارے بعد تمہارے ساتھیوں کی باری آئے گی اور پھر تمہارے خاندان کی باری آئے گی۔ اپنے ایک بھائی کی موت سے تمہیں کسی قدر اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔''

میرے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ ''میں اپنے بھائی کا خون اسے معاف نہیں کروں گا۔''

''ابھی تو مرحلہ اپنی جان بچانے کا ہے اور جہاں تک تمہارے بھائی کے مرڈر کا تعلق ہے اس میں کوئی درمیانی راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔''

''ڈیوڈ شا تم اسے ابھی درست طور پر نہیں جان سکے ہو وہ اس وقت تمہاری بات مان لے گا اور پھر جب موقع دیکھے گا تو مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر وار کر جائے گا۔''

''جب میں کہہ رہا ہوں کہ میری ضمانت صرف میری نہیں ہوگی اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ ضمانت کے خلاف جانے پر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔''

میں مرشد پر تو کسی صورت اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ مجھے ڈیوڈ شا پر بھی اعتماد نہیں تھا اس کا تعلق ایک دغا باز قوم سے تھا جو قانون اور اصولوں کو صرف اپنے ملک کی سرزمین پر مانتی ہے اور ملک سے باہر وہ ان سب باتوں سے ماورا ہو جاتی ہے۔ ڈیوڈ شا یقیناً اپنی قوم کی اسی ذہنیت کا نمائندہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں معاملے کو اس حد تک خراب نہیں کرنا چاہتا تھا کہ انجام کار وہ مجھے مرشد کے حوالے کر دے۔ میں نے سوچ کر کہا۔

''اگر میں تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا ہوں تو کیا تم ابھی مجھے رہا کر دو گے؟''

''ہاں میں تمہیں ابھی چھوڑ دوں گا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''مرشد سے بات ہونے کے بعد میرے آدمی تم جہاں کہو گے تمہیں چھوڑ آئیں گے۔''

''تب مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔

''گڈ۔'' اس نے کہتے ہوئے واکی ٹاکی نکالا اور بولا۔ ''عبدل کو لے آؤ۔''

میں چوکنا ہو گیا عبدل کون تھا اور اسے بلوانے کی کیا وجہ تھی؟ ڈیوڈ شا نے میری رضامندی پاتے ہی اسے کیوں طلب کیا تھا؟ اس کا جواب عبدل کے آنے پر مل سکتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ کوئی خاص بات ضرور تھی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور مارشل اندر آیا۔ اس کے ساتھ ایک نوکر نما آدمی اندر آیا اس نے سادہ سی شلوار قمیص اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ عمر چالیس برس تھی اور صورت سے زمانے کے سخت حالات عیاں تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینے پر کپڑے میں لپٹی کوئی چیز لگا رکھی تھی۔ جب میں نے غور کیا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ یہ قرآن مجید تھا جو عبدل نے سینے سے لگا رکھا تھا۔

''یہ تمہاری مقدس کتاب ہے۔'' ڈیوڈ شا نے میرے تاثرات سے لطف اندوز ہونے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے کوئی مسلمان جو خدا سے ڈرتا ہو اس کی جھوٹی قسم نہیں کھاتا ہے۔''

''تو تم اس مقدس کتاب پر مجھ سے قسم لو گے؟'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔
''ہاں کیونکہ اس کے بغیر میں کس طرح اطمینان کر سکتا ہوں کہ تم وہی کرو گے جو کہو گے۔''
''میں جھوٹا نہیں ہوں اور اگر جھوٹا ہوں تو اس کتاب پر ہاتھ رکھ کر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں۔ ہمارے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے لوگ بے دھڑک اس پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ بولتے ہیں اور ان کا ضمیر ذرا بھی ملامت نہیں کرتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں کرو گے۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''ہاں اگر تم اس پر قسم نہیں کھاؤ گے تو مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔''

میں نے بے بسی سے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''پلیز ایسا مت کرو میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''میں نے کہا نا جب تک تم اس پر ہاتھ رکھ کر قسم نہیں کھاؤ گے مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔ اگر مجھے اطمینان نہیں ہوا تو میں تمہیں مرشد کے حوالے کر دوں گا۔''

''ڈیوڈ شا یہ بلیک میلنگ ہے۔''

''تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے لاپروائی سے کہا اور کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ''تمہارے پاس دس منٹ ہیں اس کے بعد مرشد آ جائے گا اور میرے پاس وقت نہیں ہے کیونکہ اب سے ڈھائی گھنٹے بعد میری فلائیٹ ہے۔''

میں نے سوچا اور گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن پہلے میں وضو کرنا چاہوں گا۔ میرا مطلب ہے ہاتھ منہ دھونا چاہتا ہوں۔''

''مجھے وضو کا پتا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور مارشل سے بولا۔ ''اسے لے جاؤ۔''
مارشل مجھے ایک واش روم میں لایا جہاں میں نے بندھے ہاتھوں سے بمشکل وضو کیا کیونکہ مارشل نے ہاتھ کھولنے سے انکار کر دیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وضو کر کے میں اس کے ساتھ واپس آیا عبدل بدستور قرآن مجید سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ اس نے قرآن میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے ہاتھ میں لیا۔ ڈیوڈ شا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

''اب تم کہو کہ تم وادی کی طرف جانے والے سفر میں میرا ساتھ دو گے۔''
''میں تمہارے ساتھ ایک قیدی کی طرح سفر کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں سوائے سفر کرنے کے تمہارے ساتھ اور کسی قسم کا تعاون کرنے کا پابند نہیں ہوں گا۔''
''قیدی کی طرح۔'' اس نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ ''یعنی تم فرار ہو سکتے ہو۔''
''ایک قیدی کو فرار کا پورا حق ہوتا ہے اگر وہ ریاست کا قیدی نہ ہو۔''
''نہیں شہباز اس طرح کام نہیں چلے گا تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا اور تم فرار کی کوشش نہیں کرو گے۔''
میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''ٹھیک ہے میں فرار کی کوشش نہیں کروں گا لیکن مجھے ساتھ رکھنا تمہاری ذمہ داری ہوگی اگر کہیں میں تم سے بچھڑ گیا یا کہیں جان پر بن آئی تو میں اس عہد کا پابند نہیں رہوں گا یعنی اگر

مجھے جان کا خطرہ ہوا تو میں تمہارا ساتھ چھوڑ سکتا ہوں۔ بعد میں، میں تمہیں تلاش کرنے کا پابند بھی نہیں ہوں گا۔''

''منظور ہے بشرطیکہ خطرہ کسی اور طرف سے ہو۔'' ڈیوڈ شا مان گیا۔''اس کے علاوہ تم کسی صورت میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔''

''دوسرے جب تم برف والے تک رسائی حاصل کرلو گے تو میرا اور تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا اس کے بعد میں اپنا فیصلہ خود کرنے کا مجاز ہوں گا۔''

''مجھے یہ بھی منظور ہے۔'' وہ مان گیا۔

''ٹھیک ہے ان تمام کنڈیشنز کے ساتھ میں تمہارا ساتھ دینے کا عہد کرتا ہوں لیکن یاد رکھنا اگر مرشد نے میرے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا جس سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو کوئی نقصان ہوا تو میں اس عہد سے بری الذمہ ہوں گا۔'' میں نے کہا اور قرآن مجید عبدل کو واپس کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے خدا سے معافی مانگی میں نے اس کتاب کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا تھا جو میرے جیسے انسان کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ ڈیوڈ شا مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''اب مجھے یقین ہے تم میرا ساتھ دو گے۔''

''میں دوں گا لیکن تم نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ میں اللہ کی کتاب کے اس استعمال کے خلاف ہوں۔''

''مجھے بھی مذہب کو اس طرح سے استعمال کرنا پسند نہیں ہے لیکن مجبوری تھی۔'' اس نے کہا لیکن اس کے لہجے میں کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا اور جیب سے ایک موبائل نکال کر کسی کو کال کی۔ رابطہ ہونے پر اس نے صرف اتنا کہا۔ ''کہاں ہو تم میں انتظار کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے موبائل بند کر دیا اور مارشل سے کہا۔ ''مرشد آنے والا ہے اسے آتے ہی یہاں لے آنا لیکن اس کے کسی آدمی کو گاڑی سے مت اترنے دینا اور ان کی پوری طرح نگرانی کرنا۔''

عبدل قرآن مجید لیتے ہی واپس چلا گیا تھا۔ مارشل کے جانے کے بعد میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ ''ویسے مرشد خود تمہارا مرید بنتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے تم اس پر بھی اعتماد نہیں کرتے ہو؟''

''میں جس دنیا کا باسی ہوں اس کا اولین اصول یہ ہے کسی شخص پر اعتماد مت کرو جس پر اعتماد کرنے کو تمہارا دل نہ کہے۔''

''یعنی تم اندر سے مرشد پر اعتبار نہیں کرتے ہو؟''

''تم ایسا کہہ سکتے ہو۔'' اس نے سر ہلایا۔

''میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''میرے اندر سے خیال آتا ہے کہ میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں لیکن ظاہری طور پر ہم دوست نہیں ہیں۔''

میں مسکرایا۔ ''اس لیے تم مجھ پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے ہو۔ ڈیوڈ شا تم دل اور دماغ دونوں کی ماننے والے لگتے ہو اس طرح تو تم شاید ہی کسی پر اعتبار کرتے ہو۔''

''نہیں ایک شخص ہے جس پر میں اعتبار کرتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

''اور وہ شخص تم خود ہو۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ میں اس سے ایمن کے بار۔

میں پوچھنا چاہتا تھا مگر پھر سوچ کر خاموش رہا ممکن ہے اسے میرے اور ایمن کے حالیہ تعلق کا علم نہ ہو اور میں بات کروں تو اسے پتا چل جائے۔ چند منٹ ڈیوڈ شا کو اطلاع ملی کہ مرشد پہنچ گیا ہے لیکن وہ اپنے دو محافظوں کو ساتھ لانے پر مُصر ہے۔ ڈیوڈ شا نے واکی ٹاکی پر اس سے بات کرانے کو کہا۔

''مرشد تم مجھ سے ملنے آئے ہو اور مجھ سے جو ملنے آتا ہے وہ اکیلا ہوتا ہے...... مجھے معلوم ہے تم اب کوئی وزیر بن گئے ہو اور اچانک تمہاری جان کے دشمن پیدا ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی تمہیں اکیلے آنا ہوگا...... ٹھیک ہے تم واپس جا سکتے ہو......'' میں یہ سب سن رہا تھا اور مرشد کے مکالمے میرے کانوں سے دور تھے۔ واکی ٹاکی بند کر کے ڈیوڈ شا مسکرایا اس نے مجھ سے کہا۔ ''وہ آرہا ہے۔''

''شاید وہ تمہاری بات ماننے میں تامل کر رہا تھا۔ اب تم دیکھنا اس کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ فرعون بن گیا ہے۔''

مرشد کچھ دیر بعد اپنے مخصوص مرشدانہ حلیے میں ہمارے سامنے تھا۔ اس نے خونی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں بولا۔ ''جناب والا یہ...... اور آپ کے ساتھ۔''

''ہاں یہ میرے ساتھ ہے اب۔'' ڈیوڈ شا نے لفظ ناؤ پر زور دیا تھا۔ مرشد چالاک آدمی تھا سمجھ گیا۔ وہ اپنا لبادہ سمیٹتے ہوئے ڈیوڈ شا کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا اس سے آپ کی کوئی ڈیل ہو گئی ہے؟''

''تم ایسا ہی سمجھو۔'' ڈیوڈ شا نے جواب دیا اور پھر اپنی بات سامنے رکھ دی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اب تم دونوں صلح کر لو۔''

مرشد نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ ''صلح برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔''

''یہ صلح اصل میں تمہارے اور میرے درمیان ہو رہی ہے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''شہباز اب میرے ساتھ ہے۔''

مرشد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ڈیوڈ شا مجھے اپنا ساتھی قرار دے رہا ہے اور میری طرف سے وہ صلح کر رہا تھا۔ پھر اس نے سنبھل کر احتجاجی انداز میں کہا۔ ''جناب کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے کہ آپ میرے دشمن کو اپنا ساتھی قرار دیں؟''

''تمہاری خدمات کا تمہیں کیا صلہ ملا ہے یہ تم جانتے ہو یا میں اپنے منہ سے بتاؤں۔'' ڈیوڈ شا کے چیلنج پر مرشد کا سر مرغ کی کلغی کی طرح ڈھلک گیا تھا ویسے بھی اپنے رنگ برنگ لبادے میں وہ کوئی دیسی مرغ ہی لگ رہا تھا۔ اس کی خاموشی پر ڈیوڈ شا نے گھڑی دیکھی۔ ''میرے پاس صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے مجھے اس دوران میں یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔''

''جناب عالی آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔'' مرشد عیاری سے بولا۔ ''آپ کہاں ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں پڑ رہے ہیں۔''

''تم مجھے بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ مرشد نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میری اتنی جرأت کہاں جناب عالی۔''

''میں نے تم کو بحث کرنے کے لیےنہیں بلایا ہے۔صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ اب شہباز اور اس کے ساتھی میری ذمے داری ہیں اور اگر ان میں سے کسی کو نقصان ہوا تو اس کا ذمے دار تمہیں سمجھا جائے گا۔''

''کیا یہ آپ کا حکم ہے؟'' مرشد نے فوراً دم دبالی تھی لیکن مجھے اس کے انداز میں شرارت کی جھلک آرہی تھی۔

''ہاں تم اسے میرا حتمی فیصلہ سمجھ سکتے ہو۔''

''میں تو آپ کا خادم ہوں لیکن میرے خاندان والے اس بات کو نہ مانیں گے خاص طور سے میرا بھائی نادر اس کا سر اپنے سامنے دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہے۔'' مرشد نے میری طرف دیکھا۔

''لگتا ہے اسے بستر پر بھی چین نہیں ہے اور وہ اسے بستر مرگ میں بدلنا چاہتا ہے۔'' میں نے جواب دیا تو مرشد کی آنکھوں میں ایک لمحے کو شعلہ سا چمکا تھا۔

''شہباز تم سے ابھی بہت سارے حساب لینے ہیں۔''

''وہ تو مجھے لینے ہیں۔اپنے بھائی کا اور اپنے ساتھیوں کا۔'' میں نے لہجہ بدل کر کہا۔''تم صرف اس دن سے ڈرو جس دن میں نے تمہاری سطح پر آنے کا فیصلہ کرلیا تمہاری بربادی میں چند دن سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔''

مرشد نے زخمی سانپ کی طرح بل کھا کر ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔''آپ نے دیکھا یہ شخص دشمنی ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔''

''مرشد میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ قصور کس کا ہے اور کون اپنی حد سے تجاوز کر رہا ہے۔میں نے تم کو اپنا فیصلہ سنا ہے۔اس کی خلاف ورزی کے نتائج کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا اس لیے امید ہے کہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کروگے جو تمہیں عرش سے اٹھا کر فرش پر لے جائے۔''

مرشد کچھ دیر ساکت رہا تھا اس کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا نے اسے اس لیے بلایا ہوگا۔پھر اس نے بادلِ ناخواستہ کہا۔''ٹھیک ہے جناب اگر آپ کا حکم ہے تو ماننا پڑے گا لیکن کیا یہ میرے خلاف کچھ کرنے سے باز رہے گا؟''

''میں نے پہلے بھی تمہارے خلاف از خود کچھ نہیں کیا ہے اور آئندہ بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تم نے سن لیا۔''

''اس کے خلاف پولیس کیس بھی ہیں۔'' مرشد نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔''اگر اسے پولیس نے پکڑ لیا تو میرا......''

''میں اسی طرف آرہا تھا۔'' ڈیوڈ شا نے اس کی بات کاٹی۔''شہباز کے خلاف تمام کیسز ختم کرانا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔''

مرشد کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔''جناب عالی مجھ پر اتنا بوجھ ڈالیں جتنا میں برداشت کرسکوں۔''

''مرشد میں تم پر اتنا ہی بوجھ ڈال رہا ہوں۔ جتنا تم برداشت کر سکتے ہو ورنہ تم جانتے ہو اس ملک میں میرے ایک اشارے پر کیا ہو سکتا ہے مجھے تم سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے میں کسی سے بھی کہوں گا اور شہباز کے خلاف کیس دو دن میں واپس ہو جائیں گے لیکن میں یہ موقع تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ تمہاری گڈ وِل میں اضافہ ہو گا۔''

مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے ان پولیس حکام اور سرکاری افسران کے سامنے میری کیا ساکھ رہ جائے گی جب میں ان سے اپنے دشمن کے کیس ختم کرنے کو کہوں گا۔''

''تمہیں ان معمولی لوگوں کی پروا ہے۔'' ڈیوڈ شا کے لہجے میں حقارت آ گئی تھی۔ ''خیر تمہاری مرضی...... تم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس معمولی سے کام کے عوض میں تمہیں کیا فائدہ دینے والا تھا۔''

فائدے کے نام پر مرشد چوکنا ہو گیا تھا اور اس نے فوری پینترہ بدلا۔ ''نہیں جناب عالی میں انکار تو کر رہا ہوں اگر آپ کہیں تو......''

''نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم نے وقت گنوا دیا ہے اور تم چند دن میں سن لو گے کہ کیسز ختم ہو گئے ہیں۔''

ڈیوڈ شا کے انکار پر مرشد نے بھی تیور بدل لیے تھے۔ ''یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے جناب عالی۔''

''تمہارے لیے شاید مشکل ہو لیکن میرے لیے نہیں۔'' ڈیوڈ شا نے اعتماد سے کہا اور کھڑا ہو گیا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں کوئی بھی مسئلہ ہو تو تم ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکرٹری جانسن ہانز سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

میں نے شکریہ کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ وہ مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہا تھا۔ مرشد بھی کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے جاتے جاتے بھی شکوہ کیا تھا۔ ''آپ نے مجھے اچانک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔''

''انسان کی زندگی میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں سب اچھا نہیں ہوتا ہے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا اور باہر چلا گیا اس نے ہم سے ہاتھ ملانے یا کوئی رسمی الوداعی جملہ کہنے کی زحمت نہیں کی تھی اور ایسے ہی رخصت ہو گیا وہ جس قسم کا آدمی تھا اس سے مجھے ایسی ہی توقع تھی۔ اس کے جانے کے بعد مرشد نے میری طرف دیکھا۔

''تم نے اسے کیسے رام کر لیا؟''

''میں نے کوئی کوشش نہیں بلکہ میں تو تیار بھی نہیں تھا۔ اس نے جیسے تمہیں مجبور کیا اسی طرح مجھے بھی مجبور کر دیا۔''

اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''کیا تمہیں ڈیوڈ شا کی ضمانت پر اعتماد ہے؟''

''سچی بات ہے بالکل بھی نہیں کیونکہ میرا خیال ہے وہ تمہیں اتنی اچھی طرح نہیں جانتا جتنی اچھی طرح میں جانتا ہوں۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''اب شاید تم مجھے ٹھیک سمجھنے لگے ہو۔''

''مرشد جو شخص خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرے اس کے سامنے کسی انسان کی کیا حیثیت ہو گی بس اسی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تم وہ نہیں کرو گے جو ڈیوڈ شا تم سے چاہتا ہے۔''

اس کا منہ بگڑ گیا تھا۔ ''تم اپنی اوقات سے بڑھ کر بولنے لگے ہو۔''

''مرشد انسان کی کوئی اوقات نہیں ہوتی ہے اور تم بھی ایک انسان ہو اسے مت بھولا کرو۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ابھی تک میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو مرشد خوف زدہ ہو گیا۔ حالانکہ میرے ہاتھ پیر جکڑے ہوئے تھے اور ڈیوڈ شا نے ان کو نہیں کھلوایا تھا۔ مرشد جلدی سے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میں مسکرایا۔ ''فکر مت کرو میں عملی طور پر تمہیں تمہاری اوقات یاد نہیں دلا رہا ہوں۔''

اسی لمحے مارشل اندر آیا تھا اس نے سرسری سی نظروں سے مرشد کو دیکھا اور بولا۔ ''تم جا سکتے ہو۔''

''بہت بے آبرو ہو کر ہم تیرے کوچے سے نکلے۔'' میں نے گنگنا کر کہا تو مرشد مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ مارشل میرے پاس آیا اور ایک چابی سے ہاتھ اور پیر کی بندشیں کھول دی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں لیکن ظاہر ہے میں اس کی ہدایت کا پابند نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے میرے ہاتھ آزاد کیے میں نے اچانک اس کے جبڑے پر گھونسہ مارنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ غافل ہے لیکن اس نے نہایت پھرتی سے جھکائی دے کر میرا وار خالی جانے دیا۔ میں زور میں گھوم گیا تھا۔ اس نے عقب سے جھکا ہوا سر میری کمر پر مارا اور میں سامنے دیوار پر جا پڑا اگر ہاتھ آگے نہ کر لیتا تو میرا منہ ناک برابر ہو جاتے۔ دیوار سے ہاتھ ٹکاتے ہی عقب میں دولتی جھاڑی لیکن وہ یہ وار بھی بچا گیا اور جیسے ہی میرے پاؤں زمین سے ٹکے اس نے لات مار کر میرا توازن بگاڑ دیا تھا اور میں گر پڑا۔ وہ بہت تیز تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے فوراً ہاتھ اٹھا دیئے۔

''ٹھیک ہے میں نے ہار مانی تم یقیناً زیادہ اچھے فائیٹر ہو ویسے میں صرف پریکٹس کر رہا تھا۔''

اس نے ہاتھ آگے کیا۔ ''میں سمجھ گیا تھا...... اگر تمہارے عزائم خطرناک ہوتے تو تم کوئی فیصلہ کن وار کرتے۔''

''مثلاً کون سا وار؟'' میں نے پوچھا۔ تو اس نے جواب میں اچانک ہی کھڑی ہتھیلی میری گردن سے نیچے مارنے کی کوشش کی۔ یہاں دل سے آنے والی بڑی شریان ہوتی ہے اور اس پر ضرب آدمی کو کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیتی ہے۔ میں نے نیچے سے ہاتھ اوپر لاتے ہوئے اس کا وار روک دیا۔ میرے ہاتھ پر ہلکی چوٹ آئی تھی لیکن اس کا تباہ کن وار بے کار کر دیا تھا۔ وہ جواباً مسکرایا۔

''تم بھی کم پھرتیلے نہیں ہو جب کہ ابھی تم ایک خطرناک بیماری سے بچ کر آئے ہو۔''

''شکریہ...... میرا خیال ہے تم اسپینش ہو؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے میرا پورا نام جارجی مارشل ہے۔ اصل میں میرا دادا انگریز تھا اور اس کا تعلق ڈیوڈ شا کے خاندان سے تھا لیکن میرا باپ اسپین میں مقیم رہا تھا اور میں خود کو اسپینش ہی سمجھتا ہوں۔''

میں چونکا۔ ''اس لحاظ سے تم ڈیوڈ شا کے رشتے دار بھی ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہونے کی وجہ یقیناً اس سے تمہارا رشتہ نہیں ہے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

"کیونکہ ڈیوڈ شا رشتوں کا پاس کرنے والا شخص نہیں ہے میں نے سنا ہے اس نے اپنے گم ہو جانے والے کزن کی جائیداد اور خطاب پر قبضہ کر لیا ہے جب کہ اس کے کزن کی اولاد بھی موجود ہے۔"

مارشل نے سر ہلایا۔ "قبضہ نہیں کیا ہے اس کے گم ہونے والے کزن برٹ شا نے اسے اپنا وارث مقرر کیا تھا۔"

"لیکن برٹ شا کی بیٹی کا کہنا ہے کہ اس نے دھوکے سے یہ کام کیا ہے اور اصل میں اپنے باپ کی وارث وہ ہے۔"

مارشل نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تم اس کی بیٹی کو کس طرح جانتے ہو؟"

"بہت پہلے برٹ شا اور اس کی بیٹی ایمن مجھ سے شمالی پاکستان میں ملے تھے۔ میں وہاں راجا عمر دراز کا مہمان تھا اور پھر برٹ نے اس کے عجائب گھر سے کچھ نوادرات چوری کرائے تھے۔ تب سے میں اسے جانتا ہوں۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے ایمن غلط کہتی ہے اور ڈیوڈ شا نے مجھے میری صلاحیت کی وجہ سے جاب دی ہے۔"

"تم یہاں اس کے امور کے نگران ہو؟"

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔"

"اوکے میں نے سمجھ لیا اب یہ بتاؤ کہ مجھے رہا کرنے کا کیا پروگرام ہے؟"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کچھ دیر میں تمہیں تم جہاں کہو گے وہاں چھوڑ دیا جائے گا۔"

"مرشد واپس جا چکا ہے؟"

"یقیناً اس کی گاڑی اس وقت یہاں سے ایک کلومیٹر دور جا چکی ہوگی۔" اس نے یقین سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے مجھے رہا کرتے وقت وہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا؟"

"میں اس کی نیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "میرا کام تمہیں وہاں پہنچا دینا ہے جہاں تم کہو اس کے بعد جو ہو وہ میری ذمے داری نہیں ہے۔"

"لیکن ڈیوڈ شا نے ذمے داری لی ہے کہ مرشد میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔"

"اگر باس نے ایسی کوئی ذمے داری لی ہے تو تم بے فکر رہو مرشد یا کوئی بھی دوسرا شخص تمہارے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔" اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"تمہارا باس امریکہ کا صدر نہیں ہے جس کی ضمانت سب مانیں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "دوسرے تم مرشد کو نہیں جانتے وہ کتے کی دُم ہے جو کسی صورت سیدھی نہیں ہو سکتی ہے چاہے اسے ہزار سال نلکی میں رکھو۔"

"میں کہہ چکا ہوں میں یہ سب نہیں جانتا ہوں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں صرف یہاں ڈیوڈ شا کے معاملات کا نگران ہوں اور اس نے مجھے ایسی کوئی ہدایت نہیں کی ہے کہ میں مرشد یا کسی بھی دوسرے شخص سے تمہارا بچاؤ کروں۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا کی ضمانت اتنی کمزور ہوگی کہ اس کے آدمی

تک اسے تسلیم نہیں کریں گے۔''

''بکومت۔'' وہ غرایا۔ ''میں نے کہا نا ڈیوڈ شا نے مجھ سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی ہے۔ اگر اس نے کہا ہوتا تو میں اپنی جان کی قیمت پر بھی تمہاری حفاظت کرتا۔''

''چلو اس نے نہیں کہا اس لیے تمہاری جان بچ گئی۔'' میں نے طنز کیا۔ ''اب میں جاؤں گا۔''

''تم نے کہاں جانا ہے؟'' اس نے سوال کیا تو میں سوچ میں پڑ گیا تھا میں اسے عبداللہ والی کوٹھی پر نہیں لے جا سکتا تھا یہ تو دشمن کو خود اپنا گھر دکھانے والی بات ہوتی۔ باقی کسی دوسری جگہ کا میں نے سوچا نہیں تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں عبداللہ سے مدد لے سکتا تھا۔ میں نے مارشل سے پوچھا۔

''کیا میں ایک کال کر سکتا ہوں؟''

''کر سکتے ہو۔'' اس نے سر ہلایا اور ایک موبائل نکال کر میرے طرف بڑھا دیا۔ میں نے موبائل لے کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل پر اس نے کال ریسیو کی اور شاید اجنبی نمبر دیکھ کر محتاط انداز میں بولا۔

''ہیلو۔''

''عبداللہ...... اگر آواز سے مجھے پہچان لیا ہے تو نام مت لینا۔''

اس نے پہچان لیا تھا کچھ دیر بعد پھنسی سی آواز میں بولا۔ ''آپ...... آپ کہاں چلے گئے تھے ہم نے آپ کو کتنا تلاش کیا۔'' وہ بولا۔ ''ابھی آپ کہاں ہیں اور یہ کس کا نمبر ہے۔''

''ایک مہربان کا ہے۔'' میں نے مارشل کی طرف دیکھا۔ ''یہ بتاؤ گھر کے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم کسی سے مجھے ریسیو کر سکو اور وہاں کوئی تیسری پارٹی آسانی سے دخل اندازی نہ کر سکے۔''

عبداللہ ذہین آدمی تھا وہ میری بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''آپ فیصل مسجد کے سامنے آ سکتے ہیں۔ وہاں مرکزی دروازے پر یہ کام آسان ہوگا۔''

''تم کتنی دیر میں وہاں پہنچ سکتے ہو تیاری کے ساتھ؟''

''صرف آدھا گھنٹہ لگے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے مارشل سے پوچھا۔ ''تم کتنی دیر میں مجھے چھوڑنے جاؤ گے؟''

مارشل نے اشارے سے دو گھنٹے کا کہا تو میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''تم دو گھنٹے بعد آ جانا ٹھیک ہے؟''

''آپ بے فکر رہیں میں وہاں موجود ہوں گا۔''

''آس پاس نظر رکھنا مجھے مرشد سے خطرہ ہے۔'' میں نے خبردار کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''ٹھیک ہے جناب میں نکل رہا ہوں۔'' اس نے مسرت سے کہا۔

کال ختم کر کے اور موبائل مارشل کو واپس کر کے مجھے خیال آیا کہ میں نے وسیم اور سفیر کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں۔ بہر حال اب کچھ دیر کی بات تھی پھر میں اپنوں کے درمیان ہوتا۔ میں نے مارشل سے پوچھا۔ ''دو گھنٹے بعد لے جانے کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''کچھ انتظامات کرنے ہیں۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''تب تک تم آرام کر سکتے ہو۔'' اس نے کہا اور باہر نکل گیا جب باہر سے لاک ہونے کی آواز آئی تو میں نے بے ساختہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی

لیکن وہ اسے باہر سے بند کر گیا تھا۔ گویا میں بدستور ڈیوڈ شا کا قیدی تھا۔ جب تک کہ مجھے رہا کرنے کا حتمی وقت نہیں آ جاتا۔ دروازہ بند کرنے کا مقصد یہی تھا کہ میں سکون سے یہاں بیٹھا رہوں اور بلا وجہ گھوم پھر کر ان لوگوں کے لیے کوئی مشکل نہ کھڑی کروں۔

بہرحال یہاں مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ میرے پاس جوتے نہیں تھے اور اس کا امکان بھی نہیں تھا کہ یہاں میرے ناپ کے جوتے مل جاتے کیونکہ میرا پاؤں ذرا بڑا تھا مجھے نارمل سائز کے جوتے مشکل سے آتے تھے اور دوسرے ان لوگوں سے اتنی مہربانی کی توقع بھی نہیں تھی کہ وہ مجھے جوتے مہیا کرتے۔ صوفے پر دراز ہو کر میں نے ایک بار پھر پاؤچ میں موجود زرین کی راکھ کو محسوس کیا۔ وقت آ گیا تھا کہ میں اس کی آخری خواہش پوری کرتا۔ وقت گزرتا رہا تھا۔ اب شاید دوپہر کا وقت تھا اور مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی کیونکہ ناشتے کا موقع نہیں ملا تھا اور مجھے اٹھاتے ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے بند ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا پھر شاید دوسرا گھنٹہ بھی گزر گیا اور مارشل یا اس کے کسی آدمی کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ پیٹا اور پھر پیٹتا چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد مارشل کی آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے؟''

''میرا خیال ہے دو گھنٹے ہو گئے ہیں اور میرے آدمی مقررہ جگہ انتظار کر رہے ہوں۔''

''کرنے دو کچھ دیر اور انتظار کرنے سے وہ خشک نہیں ہو جائیں گے۔'' مارشل لاپروائی سے بولا۔

''مارشل مسئلہ کیا ہے تم واضح بات کرو۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ کہا نہیں لیکن دروازہ کھل گیا وہ سامنے کھڑا تھا۔ خلاف توقع اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا نا ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ تمہیں اس گاڑی میں لے جانا ہے جس میں ڈیوڈ شا ائیرپورٹ گیا ہے اور وہ گاڑی اب تک واپس نہیں آئی ہے اس میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ جیسے ہی ٹھیک ہو گی اور وہ آئے گی تب تمہیں لے جائیں گے۔''

''اس صورت میں مجھے اپنے آدمیوں کو بتانے دو؟'' میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے کچھ سوچا اور موبائل نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

''ایک منٹ سے زیادہ بات مت کرنا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' میں نے عبداللہ کا نمبر ملاتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ ''موبائل ریٹ کا مجھے بھی علم ہے۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں تھا۔ عبداللہ نے اس بار فوراً کال پک کی تھی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''مجھے ذرا دیر ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا لیکن تم وہیں رہنا۔''

''ٹھیک ہے آپ فکر مت کریں جب تک آپ نہیں آ جاتے ہم یہاں موجود رہیں گے۔''

اس سے پہلے میں مزید کچھ کہتا یا عبداللہ سے پوچھتا مارشل نے اچانک ہاتھ بڑھا کر موبائل چھین لیا۔

''ابھی ایک منٹ نہیں ہوا ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''تم نے...... کام کا بات...... کرلیا...... میں اردو جانتا۔'' اس نے اٹک اٹک کر اردو اور شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ تو یہاں آنے والے گوروں کی خاص بات ہے اردو جانتے ہیں لیکن انجان بنے رہتے ہیں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اور ضروری ہے کہ مجھے اسی گاڑی میں لے جایا جائے؟''

مارشل نے مجھے سرد نظروں سے دیکھا۔ ''یہ ہم بہتر جانتے کہ تمہیں کیسے لے جانا ہے اب دروازہ مت بجانا۔'' اس نے کہا اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر واپس صوفے پر دراز ہو گیا۔ اب مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ آخر مارشل مجھے اسی گاڑی میں لے جانے پر کیوں مُصر تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور پہلے عبدل اور پھر مارشل اندر آئے عبدل نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس میں سادہ دال چاول اور اچار کی کٹوری تھی۔ عبدل نے ٹرے سامنے میز پر رکھی۔ ''معاف کرنا صاحب...... آج یہی پکا ہے۔''

مارشل نے کہا۔ ''گاڑی آنے میں ابھی وقت لگے گا تب تک تم بھوکے رہتے۔''

''مہربانی ہے تمہاری۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ عبدل نے کہا۔

''صاحب آپ کھا لو تو میں آپ کے لیے چائے لے آتا ہوں۔''

''اللہ خوش رکھے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''لیکن پہلے پانی لا دو یار۔''

عبدل پانی لے آیا اور پھر وہ دونوں چلے گئے اور میں نے دال چاول اچار کے ساتھ کھانا شروع کر دیئے۔ سادہ ہونے کے باوجود یہ بہت مزے کے لگے تھے۔ جب تک میں نے کھانا ختم کیا عبدل چائے بھی لے آیا تھا۔ اس بار بھی مارشل اس کے ساتھ تھا۔ عبدل یقیناً یہاں ملازم تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے یہ بات اس کے انداز سے عیاں تھی۔ یہ اور بات تھی اس نے مجھ سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کھانا کھا کر اور چائے پی کر میں خود کو آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ حالات و واقعات کی فکر میں بھوک نہ لگنے کی علت میں بہت پہلے ترک کر چکا تھا کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ میں کتنے ہی فاقے کر لوں اس کا حالات پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں ہے۔ اس لیے بہتر تھا کہ جب، جہاں اور جیسا کچھ کھانے کو مل جائے تو ہرگز کفرانِ نعمت نہ کیا جائے۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور اس کمرے کی کھڑکی سے باہر دن شام میں بدل رہا تھا۔ شاید بارش ہو چکی تھی کیونکہ اب دھند بالکل صاف تھی لیکن سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں مارشل کی گاڑی کہاں اور کیسے بن رہی تھی۔ مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ کوئی چکر کر رہا تھا اور کسی وجہ سے مجھے رہا کرنے سے گریز کیا جا رہا تھا۔ اگر یہ کوئی چکر بھی تھا تو میرے پاس سوائے صبر سے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب شام تاریک ہونے لگی تھی تو دروازہ کھلا اور مارشل کی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ وہی لمبا پوٹھوہاری تھا اور حسبِ معمول مشین گن سے مسلح تھا۔ مارشل نے میری طرف دیکھا۔

''تیار ہو جاؤ ہم تمہیں چھوڑنے جا رہے ہیں۔''

''اس پروٹوکول کے ساتھ۔'' میں نے پوٹھوہاری کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ حفاظت کے لیے ہے اور بھی ہوں گے۔'' مارشل نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''چلو۔''

میں ان کے ساتھ اسی بغلی دروازے سے باہر پورچ تک آیا جس سے مجھے اندر لے جایا گیا تھا۔ باہر اب

روشن دن کے بجائے تقریباً تاریکی تھی اور اسی حساب سے سردی بھی تھی۔ جوان معمولی کپڑوں میں اور ننگے پاؤں کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ پورچ میں وہی بڑی گاڑی موجود تھی جس کے پچھلے حصے میں بند کر کے مجھے یہاں تک لایا گیا تھا۔ میں عبداللہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کا انتظار کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ وہ وہاں موجود ہو گا یا نہیں؟ میں نے مارشل کی طرف دیکھا۔

"میرے ساتھی نے تمہیں کال کرنے کی کوشش کی تھی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "کی تھی لیکن میں نے ریسیو نہیں کی۔"

"ٹھیک ہے مجھے اس کو اطلاع دینے دو۔" میں نے مطالبہ کیا۔ "ورنہ وہ پریشان ہو گا۔"

اس نے گاڑی کا عقبی خانہ کھولا اور بولا۔ "کچھ دیر پریشان ہونے سے اس کی صحت خراب نہیں ہو گی۔"

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "مارشل مجھے نہیں معلوم تم ایسا کیوں کر رہے ہو لیکن اگر تمہاری وجہ سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو کوئی نقصان ہوا تو تمہارے لیے بھی اچھا نہیں ہو گا۔"

جواب میں مجھے عقب سے دھکا لگا اور میں گاڑی کے خانے میں جا گرا اور فوراً ہی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ مارشل کی آواز آئی۔ "میرا پلان بدل گیا ہے اب ہم تمہیں اپنی طے کی ہوئی جگہ پر چھوڑیں گے اور تمہارے ساتھیوں کو تمہیں لینے وہیں آنا پڑے گا۔"

میں نے دروازے پر لات ماری اور چیخ کر بولا۔ "مارشل تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔ یہ ڈیوڈ شا سے کیے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔"

مارشل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ لوگ شاید گاڑی میں آ گئے تھے کیونکہ چند سیکنڈ بعد گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی اور پھر وہ اس جگہ سے باہر نکل کر سڑکوں پر دوڑنے لگی تھی۔ میں نے شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن شیشے بہت دھندلے تھے اور باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مارشل کا رویہ اچانک کیوں بدل گیا تھا؟ کیا اسے ڈیوڈ شا نے کوئی نئی ہدایت دی تھی یا پھر وہ مرشد سے مل گیا تھا؟ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا لیکن کچھ کہا بھی نہیں سکتا تھا۔ مرشد کے پاس دولت کی طاقت تھی اور اس سے مارشل جیسے دس افراد کو خریدا جا سکتا تھا۔ اگر مارشل بک چکا تھا تو وہ مجھے میرے ساتھیوں نہیں بلکہ مرشد کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کے اوپر لگے شیشوں کا جائزہ لیا یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبے اور کوئی آٹھ انچ چوڑے تھے۔ اگر میں ان کو توڑ دیتا تب بھی میں ان سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے میں ان کو توڑنے کی کوشش کرتا تو آگے والوں کو فوراً پتا چل جاتا اور میں فرار سے پہلے پکڑا جاتا لیکن مجھے کچھ تو کرنا تھا میں اب مزید کسی دشمن کی قید میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ گاڑی کے آس پاس سے گزرتی گاڑیوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ہم کسی سنگل سڑک پر سفر کر رہے تھے اور یہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ جب تک گاڑی کہیں رک نہیں جاتی اور یہ دروازہ نہیں کھولتے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ہمیں سفر کرتے ہوئے کوئی آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا تھا۔ اگر ہم راولپنڈی یا اسلام آباد سے

روانہ ہوئے تھے تو شہر میں کسی بھی جگہ جانے کے لیے اتنا وقت کافی تھا لیکن ایک تو ہمیں کسی جگہ ٹریفک جام سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی کوئی سگنل آیا تھا اس لیے ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے آبادی سے کہیں دور لے جایا جا رہا تھا۔ مزید دس منٹ گزرے اور سڑک پر تقریباً سناٹا محسوس ہونے لگا تو مجھے اپنا اندازہ درست لگا تھا یہ مجھے شہر سے باہر کہیں لے جا رہے تھے۔ اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ مارشل کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ وہ مجھے یا تو مرشد کے حوالے کرنے جا رہا تھا یا میرے حوالے سے ڈیوڈ شا کی کسی خفیہ پلاننگ پر عمل کر رہا تھا۔ مزید دس منٹ سفر کے بعد گاڑی کسی کچے راستے پر مڑی اور چند منٹ چلنے کے بعد رک گئی۔ مجھے ایسی مہک محسوس ہوئی جیسے پاس ہی کہیں پانی تھا۔ کیونکہ کسی جھرنے کے بہنے کی آواز نہیں آ رہی تھی اس لیے امکان تھا ہم کسی جھیل یا تالاب کے آس پاس تھے۔ یہ پورا علاقہ جھیلوں، تالابوں اور جوہڑوں سے بھرا ہوا ہے کیونکہ زمین اونچی نیچی ہے اور بارش خوب ہوتی ہے۔

گاڑی رکی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ میں منتظر تھا کہ کوئی دروازہ کھولے لیکن دروازہ کھلنے کے بجائے مجھے مارشل کے لیے پوٹھوہاری کی آواز سنائی دی۔ ''صاحب یہاں کیوں آیا ہے یہاں تو بالکل جنگل ہے۔''

''اسی لیے تو آئے ہیں۔'' مارشل بولا۔

''اس کا ساتھی اسے لینے کے لیے یہاں آئے گا؟''

''بالکل اسے یہیں آنا ہوگا۔'' مارشل نے کہا۔ پھر شاید اس نے موبائل سے کسی کو کال کی۔ ''میں تمہارے بندے کو لے آیا ہوں آ کر اسے لے جاؤ۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ کیونکہ اگر اس نے عبداللہ کو بھی کال کی تھی تو اس نے اس جگہ کا کیوں نہیں بتایا۔ یقیناً اس نے کسی اور کو کال کی تھی جسے معلوم تھا کہ کہاں آنا ہے؟ یہ بات اس پوٹھوہاری نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے مارشل سے کہا۔ ''صاحب اس کے آدمیوں کو اس جگہ کا تو پتا ہی نہیں ہے۔''

''تم اپنا منہ بند کر کے نہیں رہ سکتے؟'' مارشل نے غرا کر کہا۔ ''باس میں ہوں یا تم ہو؟''

''سوری سر۔'' پوٹھوہاری دب گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ ملازم تھا اور اسے اختیار نہیں تھا کہ مارشل کے کسی معاملے میں دخل دے شاید اس نے اس وجہ سے پوچھا تھا کیونکہ مارشل اسے ڈیوڈ شا کی ہدایت کے برعکس چلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' مارشل کا لہجہ خراب تھا۔ ''تم دونوں پوری طرح چوکس رہو۔''

گویا اس کے ساتھ صرف دو افراد تھے۔ میں نے دروازہ بجایا اور چلا کر کہا۔ ''مارشل۔''

وہ خانے کے پاس چلا آیا تھا۔ ''کیا ہے؟''

''تم نے کسے بلایا ہے؟''

''تمہارے ساتھیوں کو۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

''بکواس مت کرو ان کو اس جگہ کا علم نہیں ہے۔''

''او و یعنی تم نے سن لیا ہے۔'' وہ چونکا۔ ''میں نے تمہارے ساتھی کو ایس ایم ایس کر دیا تھا۔''

... مسلسل ... ہو۔ مجھے لگ رہا ہے تم مجھے ہی نہیں ڈیوڈ شا کو بھی دھوکا دے رہے

ہو۔"

"تمہارا وہم ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "کچھ دیر رک جاؤ ابھی تمہارے ساتھی آ جائیں گے اور تمہارے سارے شک دور ہو جائیں گے۔"

"اس کے برعکس میرا خیال ہے مجھے لینے میرے ساتھی نہیں بلکہ مرشد کے آدمی آ رہے ہیں اور تم نے ان سے میرا سودا کر لیا ہے۔"

وہ ایک لحہ چپ ہوا تھا جیسے میرے درست اندازے نے اسے ششدر کر دیا ہو پھر اس نے غرا کر کہا۔ "تم بکواس کرنے کے بجائے خاموش بیٹھو۔"

"تم بھول رہے ہو میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں جو تم شٹ اپ کہو تو میں شٹ اپ ہو جاؤں۔" میں نے دروازے پر پھر لات ماری۔ "اسے کھولو مجھے باہر آنے دو۔"

اس بار اس نے جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھی شاید گاڑی سے دور چلے گئے تھے اس لیے ہماری باتیں نہیں سن سکے تھے۔ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ مارشل حرامزادے نے ڈیوڈ شا کی ہدایات کے برعکس مجھے رہا کرنے کے بجائے مرشد سے میرا سودا کر لیا تھا اور اب اس کے آدمی مجھے لینے آ رہے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے مجھے کچھ کرنا ورنہ میں ایک بار پھر کسی قید خانے میں پڑا ہوتا۔ بلکہ اس کا امکان کم تھا اور زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ مرشد مجھے فوری طور پر دوسری دنیا کا ٹکٹ تھما دے کیونکہ اب اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں پہلے جیسا کمزور دشمن نہیں رہا تھا اور وہ طاقتور دشمن رکھنے کا قائل نہیں تھا لیکن میں اس قید خانے میں کیا کر سکتا تھا یہاں سے نکلنے کے بعد ہی مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع مل سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ میں نے پاٹھوہاری کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔

"سر ایک کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔"

"وہ آ گئے۔" مارشل نے کہا۔ "تم دونوں یہاں آ جاؤ...... جلدی۔"

میری چھٹی حس نے کہا کہ مارشل کچھ کرنے جا رہا ہے اور چھٹی حس نے درست کہا تھا کیونکہ فائر کی ہلکی سی آواز کے ساتھ پوٹھوہاری چلایا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

مارشل نے جواب میں ایک فائر اور کیا اور بولا۔ "یہ کیا۔"

مارشل نے یقیناً اپنے دونوں ساتھیوں کو گولی ماردی تھی۔ کیوں ماری تھی یہ کوئی بہت مشکل سوال نہیں تھا۔ وہ ڈیوڈ شا کو ڈبل کراس کرنے جا رہا تھا اور یقیناً اسے زندہ بھی رہنا تھا اس لیے وہ اپنے جرم کے عینی گواہوں کا وجود مٹا رہا تھا بلکہ مٹا چکا تھا۔ بعد میں وہ ڈیوڈ شا کے سامنے ان کی موت اور ذمے داری کو میرے ساتھیوں کے کھاتے میں ڈال سکتا تھا اور میرا بھی کوئی وجود باقی نہ رہتا جو اس کے جرم کا راز فاش کر سکتا تھا۔ اب وقت بالکل نہیں تھا۔ میں پشت والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور پھر پاؤں جوڑ کر پوری قوت سے دروازوں کے درمیان میں مارے۔ ایک دھماکہ ہوا اور دروازہ لرز گیا تھا۔ فوراً ہی مارشل کی دھاڑ سنائی دی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"دروازہ کھول رہا ہوں۔" میں نے کہا اور دوسری بار پاؤں مارے۔ اس بار دروازے زیادہ ہلے تھے۔

مارشل چلایا۔

''آرام سے بیٹھو ورنہ گولی ماردوں گا۔''

''ضرور مارو۔'' میں نے کہا اور تیسری ضرب لگائی اور اس بار دروازے ذرا باہر کی طرف ہو گئے تھے۔ چوتھی ضرب پر وہ مزید باہر نکلے تھے۔ مارشل دھاڑتا ہوا اسی طرف آرہا تھا اس کی زبان سے اسپینش میں یقیناً ناگفتنی نکل رہی تھی اور میں رک گیا۔ وہ دروازے کے سامنے آیا تھا۔ جیسے ہی اس نے ہینڈل گھمانے کی کوشش کی میں نے اس بار جسم و جان کی ساری توانائی استعمال کرتے ہوئے پاؤں دروازے پر مارے۔ وہ ہینڈل گھما چکا تھا اور میرا کام مزید آسان ہو گیا۔ دروازے ایک دھماکے سے کھلے اور مارشل سامنے تھا۔ بچنے کی کوشش کے باوجود ایک پٹ اس کو لگا اور وہ اچھل کر پیچھے جا گرا تھا۔ میں تڑپ کر باہر نکلا اور مارشل پر جا گرا تھا لیکن نہیں وہ میرے اندازے سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں گرا تھا۔ میں خالی زمین پر جا گرا اور تیزی سے پلٹا لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی وہ نہ صرف مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس نے اپنا پستول بھی اٹھا لیا تھا اور اس کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ اس نے دانت پیس کر کچھ کہا ایسا لگ رہا تھا وہ مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لمحے مجھے ایک ہیولہ سا اپنی طرف جھپٹتا دکھائی دیا۔



مارشل سر پر پستول تانے کھڑا تھا اوپر سے کتے کے بھونکنے کی آواز نے میرے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ مصیبت دوہری آئی تھی اگر میں مارشل کی چلائی گولی سے بچ جاتا تب بھی جھپٹنے والا کتا مجھے نہ چھوڑتا لیکن فی الحال خطرہ مارشل سے تھا۔ کتے کے دانت گولی کے مقابلے میں بہرحال کم مہلک تھے۔ میں نے تڑپ کر جگہ بدلی اور اسی لمحے مارشل نے گولی چلا دی جو میرے بالکل پاس زمین میں لگی تھی۔ کتا اب کچھ ہی دور تھا مارشل نے دیکھ لیا کہ میں بچ گیا ہوں اور اس نے پستول کا رخ پھر میری طرف کیا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے کام لیا تھا۔ ابھی میرے ہاتھ پاؤں زمین پر درست طور سے ٹکے نہیں تھے اور میں پھر تیزی سے جگہ تبدیل کر سکتا۔ اس بار گولی سے بچنا محال تھا لیکن اس سے پہلے مارشل دوبارہ گولی چلاتا کتے نے جست لگائی اور میرے اوپر سے ہوتا مارشل پر جا پڑا۔ اس نے مارشل کا پستول والا ہاتھ دبوچ لیا تھا۔ مارشل کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے فائر کیا مگر گولی کہیں اور گئی تھی۔

مارشل کتے سمیت زمین پر گرا اور اس کے جبڑوں سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں تو کتے کو دشمن کا ساتھی سمجھ رہا تھا اور وہ میرا مددگار نکلا اس نے مجھے یقینی گولی سے بچایا تھا۔ اگر وہ مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ نہ مارتا تو مارشل مجھے مار چکا ہوتا۔ میں قدرت کی اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھاتا تو احمق اور مرحوم کہلاتا کیونکہ مارشل کتے کے جبڑے میں پھنسے ہاتھ کو میری طرف گھما کر نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا اور کتا اس کی کوشش ناکام بنا رہا تھا وہ اس کے ہاتھ کو بھنبھوڑے دے رہا تھا۔ دونوں ایک سے انداز میں غرا رہے تھے۔

میں نے لیٹے لیٹے لات گھما کر مارشل کے پستول والے ہاتھ پر ماری اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے چلا کر اسپینش میں کچھ کہا۔ اگلی لات میں نے اس کی گردن پر مارنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے میرا ارادہ بھانپ کر اس طرح کروٹ لی کہ کتا سامنے آ گیا اور میری لات اس بیچارے کی تشریف پر لگی۔ اس لات کے پیچھے میرا سارا زور تھا۔ کتے نے ایک پُر درد آواز نکالی اور ظاہر ہے اس کے منہ سے مارشل کا ہاتھ نکل گیا تب ہی وہ آواز نکالنے کے قابل ہوا تھا۔ آزاد ہوتے ہی مارشل پیچھے کی طرف کھسکا اور یک دم اٹھ کر بھاگا۔

اس کی وجہ سامنے تھی اس کا پستول تاریکی میں کہیں غائب ہو گیا تھا اور اسے بیک وقت کتے اور میرا سامنا تھا۔ کسی طرف سے مدد کی امید بھی نہیں تھی کیونکہ اپنے ساتھیوں کو وہ خود مار چکا تھا۔ کسی نے اس سمت سے جہاں سے کتا آیا تھا میں نے مارشل کو لڑکھڑا کر جھاڑیوں میں گرتے دیکھا۔ اس دوران میں سڑک کی

طرف سے آنے والی گاڑی کی روشنی بھی قریب آ گئی تھی۔ پھر کسی نے گاڑی پر ایک طویل برسٹ مارا۔ ایسا لگا تھا جیسے خود کار رائفل یا ہلکی مشین گن کا پورا میگزین خالی کر دیا ہو۔ گاڑی کے شیشے ٹوٹ گئے اور سامنے کے دونوں ٹائرز بھی پھٹ گئے۔ کچھ چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ میں اٹھتے اٹھتے دوبارہ زمین پر گر گیا۔ کتا پہلے ہی زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے کسی عورت کی آواز سنی وہ چلا کر کہہ رہی تھی۔

''براؤن...... براؤن۔''

براؤن غالباً کتے کا نام تھا لیکن وہ میری لات کھا کر لیٹ گیا تھا اپنے محسن کے ساتھ اس سلوک کا مجھے افسوس تھا خاص طور سے اس لیے بھی کہ اس نے ایک منٹ پہلے ہی میری جان بچائی تھی لیکن میں اس کی مزاج پُرسی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا مجھ سے لات کھانے کے بعد اس کا جذبہ ہمدردی ماند پڑ گیا ہو اور وہ مارشل کے فرار کے بعد میری ٹانگ پکڑ لے۔ میں لیٹے لیٹے گاڑی کی طرف کھسک رہا تھا اس بار عورت کی آواز پاس سے آئی تھی۔ ''براؤن کہاں ہو تم؟''

میرا دل دھڑکا نہیں بلکہ تڑپا تھا کیونکہ میں نے عورت کی آواز پہچان لی تھی۔ میں اٹھ کر اندھا دھند بھاگا اور مرتے مرتے بچا کیونکہ کسی نے مجھ پر فائر کیا تھا اور گولی میرے کان کے پاس سے سیٹی بجاتی نکل گئی۔ اس کے باوجود میں رکا نہیں تھا۔ جو فائرنگ نشانہ بننے والی گاڑی کی طرف سے کی جا رہی تھی اگر اس رائفل کا رخ میری طرف ہو جاتا تو میں مارا جاتا میں اس طرف بھاگا جہاں سے عورت کی آواز آئی تھی اور وہ آواز سو فی صد مونا کی تھی میں نے چلا کر کہا۔ ''مونا۔''

''شوبی۔'' وہ جواب میں چلائی۔ ''میرے خدا شوبی ہے یہاں تو بی ہے۔''

کوئی تاریکی سے کسی بگولے کی طرح برآمد ہوا اور بھوت کی طرح چمٹ گیا۔ وہ سفیر تھا۔ وہ مجھ سے یوں چمٹا تھا جیسے میرے جسم کا ایک حصہ بن جانا چاہتا ہو۔ پھر کوئی تاریکی سے چلایا۔ ''سفیر...... شوبی پیچھے آئیں۔''

سفیر کو ہوش آ گیا۔ ''ہم خطرے میں ہیں۔'' اس نے میرے کان میں کہا اور مجھے کھینچ کر ان درختوں کے پیچھے لے گیا جہاں وسیم اور مونا موجود تھے۔ مشین گن وسیم کے ہاتھ میں تھی لیکن اس سے پہلے مونا مجھ سے لپٹ گئی۔ میں بوکھلا گیا۔ ''ارے یہ کیا...... اپنے مجازی خدا کے سامنے ایک نامحرم سے لپٹی جا رہی ہو۔''

''مت بولو مجھ سے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''کتنا تنگ کرتے ہو ہم سب کو۔''

''اچھا بابا...... تم سب نے بھی تو تنگ کیا تھا۔'' میں نے اس کا سر سہلایا اور پھر اسے چھوڑ کر وسیم کو گلے سے لگا لیا اس کی مشین گن سفیر نے سنبھال لی تھی۔ ''شہباز صاحب۔'' اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

''یہ کیا چکر ہے تم لوگ اچانک کہاں سے نازل ہو گئے؟''

''ہمیں تمہیں شہر بھر میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔'' سفیر نے کہا اور ایک طویل برسٹ مارا۔ میں اس کی بات سمجھا نہیں تھا۔

''کیا مطلب تم مارشل اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے نہیں آئے تھے؟''

''کون مارشل؟''

''وہی جس پر کتے نے حملہ کیا تھا۔'' میں نے کہا اور ابھی کتے کا نام لیا تھا کہ وہ تشریف لے آیا اور مونا سے

پیروں سے خود کو رگڑنے لگا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہی براؤن ہے؟''

''ہاں اور اسی نے تمہیں تلاش کیا ہے۔'' مونا بولی اس نے محبت سے کتے کا سر سہلایا۔ ''گڈ بوائے۔''

گڈ بوائے نے دکھی آواز نکال کر مونا کو بتانے کی کوشش کی کہ اسے میری ہمدردی کتنی اور کہاں مہنگی پڑی تھی۔ وہ سب کہاں سے اور اچانک کس طرح میری مدد کو آ گئے تھے اور یہاں تک ان کی رہنمائی کس نے کی تھی ایسے کئی سوال میرے ذہن میں مچل رہے تھے لیکن پہلا مرحلہ اس جگہ سے نکلنا تھا۔ تباہ ہونے والی گاڑی میں بچ جانے والے دشمن جوابی فائر کر رہے تھے اور میں نے دیکھ لیا تھا ان لوگوں کے پاس صرف ایک مشین گن اور ایک پستول تھا۔ جب کہ دوسری طرف سے کئی خودکار ہتھیار رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ آنے والوں کی نفری زیادہ لگ رہی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔

''تمہارے پاس بس یہی ہتھیار ہیں؟''

''ہاں اور ایمونیشن بھی محدود ہے۔'' اس نے جواب دیا وہ اب مشین گن کو سنگل موڈ پر کر کے استعمال کر رہا تھا۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' میں نے کہا تو وسیم بولا۔

''ٹھیک ہے آپ سب نکل جائیں میں ان کو روکتا ہوں۔''

''نہیں ہم سب ساتھ جائیں گے۔'' مونا بولی۔ ''شوبی یہاں سے کچھ دور ہماری گاڑی کھڑی ہے۔''

''ہم ہیں کہاں؟''

سفیر حیران ہوا۔ ''تم نہیں جانتے؟''

''نہیں بھائی میں یہاں قید ہو کر آیا تھا اور مجھے مرشدؔ کے آدمیوں کے حوالے کیا جانا تھا۔ میرا خیال ہے یہ مرشد کے آدمی ہیں۔'' میں نے تباہ شدہ گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم راول جھیل کے ایک کنارے پر ہیں۔'' مونا نے بتایا۔

''تم کس کی قید میں تھے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''ڈیوڈ شا کی...... لیکن اس سے میرا معاہدہ ہو گیا تھا۔ یہ اس کے آدمی مارشل کی بدمعاشی تھی اس نے مرشد سے میرا سودا کر لیا۔ عبداللہ بے چارہ اپنے آدمیوں سمیت فیصل مسجد کے سامنے انتظار کر رہا ہوگا۔''

اس دوران میں وسیم نے جائزہ لے لیا تھا اس نے ہم سے کہا۔ ''پہلے آپ تینوں پیچھے جائیں۔ میں ایک منٹ بعد آتا ہوں۔''

''نہیں تم بھی ساتھ چلو گے۔'' مونا نے پھر مداخلت کی۔

''تمہیں تولا کر غلطی کی۔'' وسیم بھنا گیا تھا۔ ''سفیر یار اسے لے جاؤ، ورنہ میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔''

مونا کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے اپنے کتے سمیت واک آؤٹ کرتے ہوئے وسیم کو بتایا کہ خراب ہونے کے لیے دماغ کا ہونا ضروری ہے اور اس کی باتوں سے لگ رہا ہے اس کے پاس اس نام کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔

سفیر نے فریاد کی۔ ''مروا دیا...... اب یہ تیرا بدلہ بھی مجھ سے لے گی۔''

''زن مرید۔'' وسیم نے کہا اور تاک کر گولی چلائی۔ دشمن کا کوئی آدمی کچھ زیادہ ہی بے تابی دکھا رہا تھا اور گولی کھا کر اس نے دل خراش ''ہائے'' کی تھی۔ ''بس اب نکل چلو۔''

وسیم نے درست وقت منتخب کیا تھا۔ میں پہلے ہی مونا کے پیچھے روانہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ مارے غصے کے اکیلے ہی روانہ ہو گئی تھی۔ براؤن یعنی بھورا اس کے ساتھ تھا۔ درختوں کا یہ جھنڈ زیادہ بڑا تھا جھیل کی قربت کی وجہ سے یہاں زمین میں جھاڑیاں اور اونچی گھاس اگ آئی تھی۔ اس اونچی گھاس میں ایک شاندار نئے ماڈل کی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ میں نے مونا کو روکا۔

''ایک منٹ اس گاڑی میں کوئی ہتھیار ہے؟''

''نہیں ہمارے پاس بس یہی دو ہتھیار ہیں۔''

''تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ میں غائب ہوں؟''

''وسیم نے عبداللہ سے رابطہ کیا تھا۔''

''تم لوگ عبداللہ سے رابطے میں ہو؟''

''وہ نہیں ہے ہم ہیں۔'' مونا نے جواب دیا۔ ''ہم اس سے الگ رہے تھے۔'' پھر اس نے میرا بازو تھام لیا۔ ''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے لیے ہم کتنے پریشان رہے۔''

''مجھے اندازہ ہے گڑیا...... کیونکہ غائب ہونے سے پہلے میں خود تم سب کے لیے کتنا پریشان رہا میں بتا نہیں سکتا۔ جب تم لوگ عبداللہ کے پاس نہیں ہو تو پھر کہاں رکے ہو اور سادھنا کہاں ہے۔''

''ہم نے ایک گھر کرائے پر لیا ہوا ہے اسلام آباد میں۔ سادھنا کو وہیں چھوڑا ہوا ہے۔''

اس سے پہلے میں اس سے پوچھتا کہ وہ دبئی سے کیوں نکلے وسیم اور سفیر بھی آ گئے تھے۔ ''نکلو یہاں سے وہ آ رہے ہیں۔'' وسیم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا اور ہم سب بھی اندر گھس گئے۔ شکر ہے بھورے صاحب کو سب سے پیچھے والے حصے میں بٹھایا گیا تھا۔ مجھے کتے کبھی اچھے نہیں لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا اس سے زیادہ وفادار ساتھی اور کوئی نہیں ہوتا ہے اس کے باوجود مجھے کتوں کے قرب سے وحشت ہوتی ہے چاہے اس کا انداز دوستانہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں وسیم کے برابر میں آ گیا تھا اور سفیر مشین گن سمیت پچھلی نشست پر چلا۔ تاکہ دشمن کی جانب سے اگر ہماری روانگی میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے تو وہ اس کا مناسب سدِباب کر سکے۔ وسیم نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اس کا طاقتور پیٹرول انجن بے آواز تھا۔

''پیچھے رہ جانے والوں کا کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''کم سے کم تین مارے گئے اور اتنے ہی باقی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تب فکر مت کرو مرشد کے آدمی بھی اس کی طرح بزدل ہیں خود کو کمزور پاتے ہیں تو مقابلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ ہمارے پیچھے نہیں آئیں گے۔''

میرا اندازہ درست نکلا تھا ہم آرام سے ان جھاڑیوں سے نکل کر مری ہائی وے کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے تھے اور کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا تھا۔ میں بار بار مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اگر مارشل بچ گیا تھا تو اس کی طرف سے خطرہ تھا وہ تعاقب کی کوشش کرے گا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے شدت کی پیاس تھی۔ ''گاڑی

میں پینے کا پانی ہے؟"

"سوری مجھے خیال نہیں رہا۔" مونا نے جلدی سے ایک منرل واٹر کی چھوٹی بوتل میری طرف بڑھائی۔ "اگر بھوک لگی ہے تو بسکٹ بھی ہیں۔"

"نہیں صرف پانی چاہیے اور اس میں سوری کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا اور پانی کی بوتل ایک ہی سانس میں خالی کر دی۔ "کسی کے پاس موبائل ہے؟"

سفیر نے موبائل نکال کر مجھے دیا۔ یہ آف تھا میں نے اسے آن کیا اور پھر سگنل دیکھ کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔ "سفیر صاحب؟"

"میں شہباز بات کر رہا ہوں۔"

"شہباز صاحب۔" وہ خوشی سے چلایا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں میں ٹھیک ہوں اور اب دوستوں کے درمیان ہوں۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ سفیر اور وسیم تم سے رابطہ کر چکے ہیں؟"

"ہر بار کال چھوٹی ہوتی تھی اور دوسرے آپ دشمن کے پاس تھے اس لیے میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"یہ تم نے ٹھیک کیا اب ایسا کرو اپنے آدمیوں کو واپس لے جاؤ۔"

"آپ آ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "زرین بی بی بھی آپ کے ساتھ ہیں؟"

"زرین۔" میں نے گہری سانس لی۔ "وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے موقع ملا تو اس کے بارے میں بتاؤں گا اور ابھی میں نہیں کہہ سکتا کہ آؤں گا یا نہیں۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ سفیر کو موبائل دیا تو اس نے اسے آف کر دیا۔ میں نے پوچھا۔

"موبائل آف کیوں رکھ رہے ہو؟"

"بھائی صاحب کی وجہ سے...... دماغ کھا لیا تھا انہوں نے۔" اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔

"تم عبداللہ سے الگ کیوں رہے؟"

"یہ وسیم کی تجویز تھی اس کا کہنا ہے کہ دشمن سے بچنے کے لیے ضروری ہے آدمی دوستوں سے بھی دور رہے۔ اسی لیے ہم اپنے طور پر آپ کو تلاش کر رہے تھے۔"

"کیسے تلاش کر رہے تھے گھوم پھر کر؟"

"یہ سچ ہے ہم گھوم پھر کر تلاش کر رہے تھے۔" سفیر ہنسا۔

"وہ کیسے؟"

"براؤن کی مدد سے۔" مونا فخر سے بولی۔ "یہ خاص نسل کا کتا ہے جو بو کے سہارے کسی کا بھی کھوج لگا سکتا ہے۔ ہم نے عبداللہ کے پاس سے تمہارا ایک استعمال شدہ لباس حاصل کیا اور اسے براؤن کو سونگھایا۔"

"اس کے بعد ہم سارا دن پورا اسلام آباد اور آس پاس کے علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔" وسیم نے کہا۔ "اس امید پر کہ شاید کہیں سے براؤن کو آپ کی بو ملے۔"

''آج کیا تاریخ ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''دو جنوری۔'' مونا نے بتایا۔ ''نیا سال مبارک ہو؟''
میرا اندازہ تھا کہ میں کوئی دس بارہ دن ان لوگوں کی تحویل میں رہا تھا لیکن اب پتا چلا میں دو ہفتے اور دو دن تک غائب رہا تھا۔ ان لوگوں نے عبداللہ سے گفتگو میں سن لیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی زرین بھی تھی اور جو اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ خاص طور سے مونا پُرتجسس تھی اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ''یہ زرین کون ہے؟''
''تھی ایک۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بارے میں سکون سے بتاؤں گا سفیر موبائل دینا۔''
سفیر سے موبائل لے کر میں پھر عبداللہ کو کال کی۔ ''عبداللہ میں عتیق کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔''
''اس کی حالت بہت بہتر ہے جناب...... آپ کے غائب ہونے کے ایک ہفتے اسے ہوش آ گیا تھا لیکن اسے بچانے کے چکر میں حکیم نے اتنی محنت کی کہ خود بیمار پڑ گیا اور اس وجہ سے علاج میں ذرا وقفہ آیا ورنہ وہ اب تک ٹھیک بھی ہو چکا ہوتا۔''
''شکر اللہ کا۔'' میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ ''جب واپس کوٹھی پہنچو تو اسی نمبر پر عتیق یا رفیق بھائی سے بات کرا دینا اور ہاں کسی کا فون تو نہیں آیا تھا۔''
''آپ کے والد صاحب اور ایک خاتون کا فون آیا تھا انہوں نے نام نہیں بتایا لیکن نمبر سے پتا چل رہا تھا کہ آپ کی حویلی سے کال آئی ہے۔''
میرا دل دھڑکا تھا۔ اسے یقیناً سویرا نے کال کی ہوگی۔ میں نے کچھ دیر اس سے بات کر کے کال کاٹ دی اور حویلی کا نمبر ملایا۔ کال بابا نے ریسیو کی۔ میری آواز سن کر وہ بے تابی سے بولے۔ ''شہباز پتر تو ٹھیک ہے کہاں تھا اتنے دن سے؟''
''بس بابا کچھ چکروں میں الجھ گیا تھا رابطہ بھی نہیں کر سکا۔'' میں نے معذرت کی۔ ان کی بے تابی مجھے اچھی لگی تھی کیونکہ زندگی کے بڑے حصے میں ان کا رویہ میرے لیے سرد رہا تھا۔ ''ماں جی کیسی ہیں؟''
''ٹھیک ہیں میں بات کراتا ہوں۔'' انہوں نے کہا اور کچھ دیر بعد ماں جی لائن پر تھیں۔ فون کا ایک ایکسٹینشن اندر بھی تھا۔ حال احوال اور ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ماں جی نے فون اچانک سویرا کو دے دیا اور اس نے بڑی مشکل سے کہا۔
''کیسے ہیں آپ؟''
''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیسی ہو؟''
''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ نمبر آپ کے پاس ہوتا ہے نا؟''
''نہیں لیکن سمجھ لو میرا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا ابھی میں نے اپنی خیریت کی اطلاع دینے کے لیے کال کی تھی میں پھر بات کروں گا۔''
اس وقت تک لینڈ کروزر مری ہائی وے سے گھوم کر اسلام آباد کی ایک پوش آبادی میں داخل ہو چکی تھی میں نے سیٹ سے سر ٹکا لیا تھا تھکن سے میرا برا حال تھا۔ ابھی تک میں نے خود کو سنبھال رکھا تھا لیکن اپنوں سے

درمیان آتے ہی تھکن غالب آ گئی تھی۔ وسیم اور سفیر نے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔ ماں جی نے بتایا تھا کہ آپا اور شمی ابھی تک رفیق بھائی کے گھر میں تھیں اور عتیق شاید دو تین دن میں گھر پہنچ جائے۔ موبائل کی بیل بجی تو میں نے کال ریسیو کی۔ عبداللہ تھا وہ کوٹھی پہنچ گیا تھا اور رفیق بھائی سے میری بات کرانا چاہتا تھا۔

''رفیق بھائی کیسے ہیں؟'' میں نے سلام دعا کے بعد کہا۔ ''عتیق کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بہت اچھی ہے یوں سمجھ لو کہ خدا نے میرے بیٹے کو دوسری زندگی دی ہے۔ شہباز میں تمہارا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔''

''پلیز رفیق بھائی آپ میرے بڑے ہیں اور میں نے جو کیا وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ عتیق کئی رشتوں سے میرا ابھی بہت کچھ لگتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن وہ شخص کسی کا کتنا شکر گزار ہو سکتا ہے جس کی ساری عمر کی کمائی اس کے سامنے لٹ رہی ہو اور کوئی آ کر اسے بچا لے۔''

''بچانے والی ذات اللہ کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''عتیق جاگ رہا ہے تو اس سے بات کرائیے۔''

''نہیں وہ سو رہا ہے اور حکیم کی دوا لے کر سو رہا ہے اس کا سونا لازمی ہے ورنہ میں تمہاری بات کرا دیتا۔''

''کوئی بات نہیں اسے میری طرف سے پوچھئے گا میں پھر کال کروں گا۔'' موبائل بند کر کے میں نے اسے آف نہیں کیا۔ مجھے سویرا کی بات یاد آئی تھی اس نے کسی وجہ سے پوچھا تھا کہ یہ موبائل میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ شاید اس کے پاس کئی موبائل آ گیا تھا اور وہ مجھے اس سے کال کرتی۔ میرا اندازہ درست نکلا جب کچھ دیر بعد ایک اجنبی نمبر سے کال آئی میں نے ریسیو کی۔ وہ سویرا ہی تھی۔

''کہاں تھے آپ اتنے دن سے۔'' وہ رو رہی تھی۔ ''کوئی کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ اتنے دن تک مر مر کر جیتی رہی ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے لیکن میں اس طرح پھنس گیا تھا کہ اطلاع کرنے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ اب اللہ کا شکر ہے میں آزاد ہوں۔''

''پلیز شہباز آپ اس ملک سے چلے جائیں یہاں آپ کی جان کے دشمن آپ کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیں گے اور آپ کو کچھ ہوا تو......'' وہ شدت سے رو دی تھی اور مجھے اسے چپ کرانے کے لیے خاصے جتن کرنے پڑے۔ مشکل یہ تھی کہ سب آس پاس بیٹھے تھے اور سب کچھ سن رہے تھے۔ اس لیے میں محتاط ہو کر بات کر رہا تھا۔ چپ ہونے کے بعد اس کا موڈ بہتر ہوا تو اس نے بتایا۔ ''وہ......میری عدت ختم ہو گئی ہے۔''

میں چونکا۔ ''کب؟''

''ابھی دو دن ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ وہ اصل میں مجھے بتا رہی تھی کہ اب وہ آزاد ہے میری ہونے کے لیے لیکن میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں اسے شادی یا نکاح کے بندھن میں باندھتا۔ دوسری طرف اس کی کچھ مجبوریاں بھی تھیں۔ اس کے رشتے دار اس کی زمین اور جائیداد پر دانت تیز کر رہے تھے اور وہ بابا سے اس کی حوالگی کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ اب وہ خود مختار اور آزاد تھی لیکن اس بات کی آڑ لے کر کوئی نیا فساد کھڑا کیا جا سکتا تھا اسی بنا پر بابا نے تجویز پیش کی تھی کہ اس کی عدت مکمل ہوتے ہی اس کا اور میرا نکاح کر دیا جائے۔ اس

وقت میں یہ بات مان گیا تھا لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس موقع پر میں شادی یا نکاح کے بندھن میں نہیں بندھ سکتا تھا۔

''سویرا میں گھر آنے کی کوشش کروں گا۔''

''کب؟''

''ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن امید ہے جلد آؤں گا۔''

سویرا سے بات کر کے میرا ذہن ہلکا ہو گیا تھا۔ پیچھے سے سفیر جو خاموش بیٹھا تھا بولا۔ ''لے بھائی یہ بھی گیا کام سے...... تیری طرح۔'' اس کا اشارہ وسیم کی طرف تھا۔ میں چونکا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب میں بتاتی ہوں شوبی۔'' مونا چہکی۔ ''ہم نے ان دونوں کی شادی کرا دی۔''

''وسیم اور سادھنا۔'' میں ہکا بکا رہ گیا۔ ''تم لوگوں نے مجھے اطلاع تک نہیں کی؟'' میرے لہجے میں برہمی آ گئی تھی۔

''اطلاع کہاں سے دیتے۔'' سفیر بھنا کر بولا۔ ''ہم راستے میں تھے اور تمہیں سرپرائز دینے آ رہے تھے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ تم نے پہلے ہی سرپرائز دیا ہوا ہے۔''

''کیا شادی راستے میں ہوئی؟'' میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ ''جناب ابھی صرف نکاح ہوا ہے۔ دراصل ان دونوں خواتین کو خطرہ تھا کہ میں رسا تڑا کر بھاگ نہ جاؤں۔''

''ہم نے ایسا تو نہیں کہا تھا۔'' مونا نے احتجاج کیا۔

''لیکن انداز تو ایسا ہی تھا۔ بلکہ یہ تو سادھنا کو بہکاتی تھی کہ میں دبئی میں جو گھومتا پھرتا رہتا ہوں تو مقصد سوائے ایک اور لڑکی کی تلاش کے کچھ نہیں ہے۔''

''اپنی طرف سے بولے جا رہے ہو۔'' مونا بھنائی پھر مجھ سے کہا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ سادی اپنوں سے بچھڑ کر بہت زیادہ ڈپریس ہو گئی تھی اور اسے عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر اس کے یہاں کے ڈاکومینٹس بھی بنوانے تھے۔ اس کی خاطر میں نے اور سفیر نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں کا نکاح کر دیا جائے۔ کیا ہم نے غلط کیا؟''

''نہیں بی بی تم دونوں اب ہمارے ماں باپ بن گئے ہو اور ماں باپ کو اولاد کے فیصلے کرنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ ''بہرحال جو ہو گیا اب اسے رونے کا فائدہ...... وسیم گاڑی یہاں روک لینا۔'' میں نے سڑک کے کنارے موجود جنگل کی طرف اشارہ کیا۔

وسیم نے گاڑی روک لی وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ ''سوری شہباز صاحب ہمیں آپ کے بغیر یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''کوئی بات نہیں دوست۔'' میں نے اس کا شانہ تھپکا اور جیب میں موجود زرین کی راکھ والی تھیلی نکالتا ہوا جنگل کے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں کسی قدر روشنی تھی۔ کوئی پچاس گز کے بعد میں ایک جگہ رکا اور درخت سے ایک

شاخ توڑ کر اس سے زمین کھودی۔ جب اچھا خاصا گڑھا بن گیا تو میں نے تھیلی کھول کر اس میں موجود راکھ گڑھے میں ڈال دی۔ اونچی لمبی زرین اب ایک مٹھی خاک رہ گئی تھی۔ بالآخر ہر انسان کا وجود اتنا ہی رہ جاتا ہے۔ تمام راکھ گڑھے میں ڈال کر میں نے مٹی برابر کی اور پھر اس کی مغفرت کی دعا کی۔ یہ اتفاق تھا کہ میں اس کی دونوں خواہشیں پوری کرنے میں کامیاب رہا تھا اس نے کہا تھا کہ صرف میں اسے دفناؤں اور کسی اور کو اس کی قبر کا پتا نہ چلے تو ایسا ہی ہوا تھا۔ اب اس کی قبر قیامت تک کے لیے چھپ گئی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان دو درختوں کے درمیان مختصر سی جگہ میں ایک گل بدن محو خواب ہے۔ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ جنگل سے باہر آ گیا۔ سفیر میرا مزاج شناس تھا وہ صورت دیکھ کر سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہے اور اس وقت مجھ سے بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ میرے بیٹھتے ہی وسیم نے گاڑی آگے بڑھا دی اور چند منٹ بعد ایک چھوٹی لیکن خوب صورت کوٹھی کے سامنے روکی تھی۔ ہارن بجانے پر بیتو نے دروازہ کھولا۔ جیپ کے تاریک شیشوں کے پیچھے وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے اسے معلوم نہیں ہوا کہ میں بھی تھا۔

''بیتو کب آیا یہاں؟''

''جب ہم آئے تھے۔ عبداللہ سے رابطہ کیا تو اس نے تڑپ کر ہم سے بات کی تھی۔'' مونا بولی۔ ''جب اسے سادھنا کے بارے میں پتا چلا تو پاگل ہو گیا تھا اور اس نے دھمکی دی اگر ہم نے اسے اپنے پاس نہیں بلایا تو وہ شہر میں نکل جائے گا اور ہمیں تلاش کرے گا چاہے اس کوشش میں دشمن کے ہاتھ کیوں نہ لگ جائے۔''

''یہ ایسا ہی پاگل ہے۔'' میں نے کہا اور نیچے اتر آیا۔ بیتو گیٹ بند کر کے واپس آ رہا تھا اور اسی لمحے اس نے مجھے دیکھا۔ وہ اُڑتا ہوا آیا تھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے بے تابی سے مجھے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

''شوبی یہ آپ ہے...... آپ ہے نا؟''

میں ہنسنے لگا۔ ''ہاں یہ میں ہی ہوں۔ گدگدی تو نہ کرو۔''

''آپ اس طرح بتائے بغیر غائب ہو گیا تھا۔'' اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ ''ہم پاگل ہو گیا تھا اگر عبداللہ بھائی نہ روکتا تو ہم مرشد کے گھر پہنچ جاتا۔''

''ملنا بچھڑنا ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے اس لیے کسی بھی حالت میں اپنے ہوش و حواس برقرار رکھا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''سادی کہاں ہے؟''

''اندر ہے دیدی۔'' اس نے چہک کر کہا۔ ''پلاؤ بناتا ہے۔''

بیتو کی چہکار بتا رہی تھی کہ پلاؤ اس کی فرمائش پر پک رہا ہے۔ میں نے پیٹ پکڑ لیا۔ ''اف کیا یاد دلا دیا...... کتنا عرصہ ہو مجھے کوئی ڈھنگ کی چیز کھائے ہوئے۔''

''اب ہمارے ہاتھ آئے ہو تو دیکھنا کیا کیا پکا کر کھلاتے ہیں۔'' مونا نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

''خدا خیر کرے۔'' میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے تجھ پر مشق ستم ہوتی رہی ہے۔''

سفیر نے دانت نکالے۔ ''انہیں تو سات خون معاف ہیں۔''

یہ ایک چھوٹی سی دو منزلہ کوٹھی تھی۔ باہر شدید سردی کے مقابلے میں اندر سے خوشگوار حد تک گرم تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر سینٹرلی ہیٹ کا سسٹم لگا ہو۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں طرف ایک بڑا ڈرائنگ روم تھا اور

دائیں طرف فرشی نشست والا لاؤنج تھا۔ جس میں وال ٹو وال دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں کے ساتھ تکیے اور کشن رکھے تھے۔ میں ڈھیر ہونے کے انداز میں لیٹ گیا۔ مونا میرے انداز پر گھبرا گئی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگلے آدھے گھنٹے کے اندر کچھ کھانے پینے کو نہیں ملا تو پھر کچھ ہوگا مثلاً انتقال پُر ملال۔''

''کیا فضول کی بول رہے ہو۔'' مونا خفا ہو کر بولی۔ ''کھانا کچھ دیر میں بن جائے گا۔''

بیتو نے اندر جا کر سادھنا کو بتا دیا تھا اور وہ دوڑی آئی تھی۔ حسبِ معمول اس نے بھی گلے لگ کر رونے دھونے کا شغل کیا اور میں نے اسے چپ کرایا۔ بہرحال آدھے گھنٹے بعد حالات معمول پر آ گئے تھے۔ سادھنا پلاؤ اور قورمہ بنا رہی تھی۔ یہ سب اس نے دبئی میں مونا سے سیکھا تھا اور اس سے بہتر بنانے لگی تھی۔ میٹھے میں زردہ تھا۔ وہ میرے پاس سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کھانا تیاری کے مراحل میں تھا اس لیے بادلِ ناخواستہ اسے جانا پڑا تھا۔ مونا کافی بنا لائی۔ اس نے کوشش کی کہ میں اسے ابھی سب کچھ بتا دوں جو مجھ پر گزری تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ''فی الحال تو بھوک سے بندہ ناتواں ہو رہا ہے اور دوسرے سادھنا بھی سننا چاہے گی اور اسے پھر سے سنانا پڑے گا۔''

''پھر کب؟'' مونا نے بے تابی سے کہا۔

''کھانے کے بعد...... تب تک ایسا کرو کہ تم بتاؤ یہ تم لوگوں کو کیا سوجھی اس طرح اچانک دبئی سے نکلنے کی۔ نہ تو تم نے مجھ سے مشورہ کیا اور نہ ہی کوئی اطلاع دی۔'' میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''یہاں کے حالات تم سب کے علم میں تھے اس کے باوجود تم وہاں سے نکل آئے۔''

''اس کی وجہ تھی یار۔'' سفیر نے کہا۔ ''تُو کیا سمجھتا ہے ہم بالکل ہی غیر ذمے دار ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔''

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا لباس گندہ ہو رہا تھا لیکن فی الحال میں اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس طرف مونا نے توجہ دی۔ ''یہ باتیں بھی کھانے کے بعد ہو سکتی ہیں ابھی تو تم نہا لو۔''

''سوری مجھ میں ہمت نہیں ہے اور ہمت ہو تو کپڑے نہیں ہیں۔''

''کپڑے وسیم کے ہیں اور ہمت تم کر سکتے ہو۔'' مونا نے جارحانہ انداز میں کہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا وہ مجھے غسل خانے کی سیر کرائے بغیر نہیں مانے گی اس لیے بادلِ ناخواستہ میں اٹھ گیا۔

''تم سخت ظالم خاتون ہو۔ تمہیں سفیر بھگت رہا ہے اور مستقبل کے مظلوموں پر تو مجھے ابھی سے ترس آ رہا ہے۔''

''مستقبل کے مظلوم۔'' مونا نے سادگی سے کہا۔ ''وہ کون ہیں؟''

''ابھی تو نہیں ہیں۔'' میں نے سر کھجایا۔ ''یہ تو تمہاری سُستی ہے کہ ابھی تک دنیا میں آئے ہی نہیں ہیں نکمی لڑکی۔''

مونا سرخ ہو گئی اور سفیر ہنس رہا تھا۔ مونا نے فرار میں عافیت سمجھی اور جاتے جاتے بولی۔ ''شوبی تم سخت واہیات ہو گئے ہو نہ جانے کس کی صحبت میں رہے ہو۔''

''تُو کیسے برداشت کرتا ہے چوبیس گھنٹے اسے؟'' میں نے سفیر سے کہا تو اس نے مجھے گھورا۔
''جب تُو شادی شدہ ہوگا تو یہ سوال تجھ سے پوچھوں گا۔''
''چل زن مرید مجھے باتھ روم دکھا۔'' میں کھڑا ہوگیا۔ کوٹھی میں تین بیڈ روم تھے اس کے علاوہ نیچے ایک گیسٹ روم بھی تھا۔ بیڈ روم مونا و سفیر، وسیم اور سادھنا میں تقسیم تھے جو فی الحال الگ کمروں میں سوتے تھے۔ بیتو گیسٹ روم میں تھا۔ سفیر مجھے بھی وہیں لے آیا کیونکہ اس میں دو الگ بیڈز تھے۔ اس کے ساتھ شاندار قسم کا باتھ روم بھی تھا۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''یہ فرنش گھر کہاں سے کرائے پر مل گیا؟''
''بس یار اپنی وزارت کا ایک دوست ہے اس کا ہے۔ مال کمانے کا ماہر ہے اور اسلام آباد کے ہر سیکٹر میں اس کی کوٹھیاں کھڑی ہیں۔ میں نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے یہ کوٹھی کرائے پر دے دی لیکن کرایہ لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔''
''اچھا ٹھکانہ ہے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ عبداللہ سے ہٹ کر اپنا کوئی سیٹ اَپ بناؤں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن عمل کرنے سے پہلے ہی دشمن پیچھے لگ گئے۔''
''تُو نہا لے کیونکہ کھانا بس تیار ہونے والا ہے اور صبح سے تیری تلاش میں سوائے دھکوں کے کچھ نہیں کھایا ہے۔''
''میں دیکھ رہا ہوں شوہر بن کر تجھے جھوٹ بولنے کی اچھی پریکٹس ہوگئی ہے۔'' میں نے کہا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں نہانے کے لیے تمام لوازمات موجود تھے اور میں بہت عرصے بعد دل کھول کر نہایا تھا۔ بہت ساری میل اور بہت ساری بری یادیں جسم سے چپک کر رہ گئی تھیں میں نے وہ سب صاف کر دیں۔ حالات نے مجھے سخت جان بنا دیا تھا اب سانحات مجھ پر زیادہ اثر نہیں کرتے تھے اور میں بہت جلد سنبھل جاتا تھا۔ یہ ضروری تھا ورنہ میں نے اب تک جو دیکھا اور سہا تھا وہ کسی عام آدمی کو مارنے یا کم سے کم پاگل کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ غسل کرتے ہوئے کتنی دیر گزر گئی ہے۔ جب سفیر نے دروازہ بجایا تو میں چونکا تھا۔
''سرکار باہر آ رہے ہیں یا دروازہ توڑ کر میت نکالنی پڑے گی۔''
''آپ کا دماغ درست ہے۔'' فوراً ہی مونا کے غرانے کی آواز آئی۔ ''جو منہ میں آتا ہے بولتے جاتے ہیں۔''
میں مسکراتا ہوا تولیہ باندھ کر باہر آیا تو مونا جا چکی تھی میں نے سفیر سے کہا۔ ''یہ بیویاں بھی خوب ہوتی ہیں شوہر کی ساری عزت آپ جناب کر کے اتار دیتی ہیں۔''
''تُو کہہ سکتا ہے ابھی شوہر جو نہیں بنا۔'' سفیر نے کمال ڈھٹائی سے کہا۔ ''اب جلدی سے کپڑے پہن کر آ جا ورنہ لنگر لُٹ چکا ہوگا۔''
یہ صرف دھمکی نہیں تھی کیونکہ بیتو سمیت وہاں سب ایک سے بڑھ ایک پیٹو بیٹھے تھے۔ سفیر بھی کھانے کا شیر تھا اس لیے میں نے عجلت میں کپڑے پہنے اور لاؤنج میں آ گیا جہاں قالین پر بڑا سا دستر خوان بچھا دیا گیا تھا۔ مونا اور سادھنا ڈشیں لا کر رکھ رہی تھیں سفیر، وسیم اور بیتو نے میرا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور شروع ہو گئے تھے میں ان کی صف میں شامل ہوا تھا کہ سادھنا نے کہا۔ ''آپ کی قمیص کے بٹن غلط لگے ہیں۔''

''بھاڑ میں گئی قیمی۔'' میں نے پلاؤ کی ڈش اپنی طرف کھینچی اور اس کے بعد ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ پانی پت کی تمام لڑائیاں بھی اس کے سامنے ہیچ تھیں۔ مونا اور سادھنا حفظِ مراتب کے لحاظ سے ہمیں ڈانٹتی رہیں لیکن ان کی کسی نے نہیں سنی تھی۔ شوہروں نے بھی نہیں جو ویسے اشارہ ابرو پر چلتے تھے۔ ڈشیں بار بار خالی ہو رہی تھیں اس لیے انہیں بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور جب موقع ملا تو کھانے کو بہت کم بچا تھا۔ وہ بے چاری وہی صبر شکر کر کے کھانے لگیں۔ سادھنا نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن مونا خفا تھی۔

''یہ بچایا ہے ہمارے لیے؟''

''تم لوگوں کا مقدر یہی ہے بچا کچا کھانا۔'' سفیر نے پُر خمار لہجے میں کہا وہ ذرا سا پیچھے سرک کر لیٹ گیا تھا وہی کیا جو جہاں تھا وہیں لمبا لیٹا ہوا تھا۔ خود میرا یہ حال تھا کہ سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا۔ سفیر کے جواب پر مونا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تو ڈھٹائی سے بولا۔ ''ہاں کیا ضرورت ہے تم کو زیادہ کھانے کی...... بس اتنا کھاؤ کہ اسی طرح سلم اور اسمارٹ رہو۔''

''بول لو۔'' مونا جل کر بولی۔ ''رہنا تو میرے ساتھ ہے نا ہر بار سادھنا کھانا نہیں بنائے گی۔''

سفیر نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے معلوم ہے تم نے کیا کدو کریلے کھلانے ہیں لیکن اس وقت اتنے اچھے کھانے کا مزہ مت خراب کرو۔''

''بالکل ٹھیک کہا تو نے۔'' میں نے سفیر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ''میں نہایت شرمندگی کے ساتھ تجھے دیا گیا زن مرید کا ٹائٹل واپس لیتا ہوں۔''۔

''شوبی آپ بھی......'' سادھنا نے احتجاج کیا

وسیم ہنسا۔ ''بروٹس یو ٹو۔''

اس پر سادھنا نے وسیم کو گھورا تھا۔ اس سے پہلے جنگ کا دائرہ پھیل جاتا میں نے ہاتھ اٹھا کر سیز فائر کا اعلان کیا۔ مونا نے چالاکی سے کہا۔ ''اب تو معاملہ ایک ہی صورت میں ختم ہو گا کہ کھانے کے بعد برتن اور دستر خوان آپ سب اٹھائیں گے۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''ٹھیک ہے میں یو این او کے کردار سے دست بردار ہوتا ہوں تم لوگ شوق سے لڑ سکتے ہو۔''

''تم فکر مت کرو مونا دیدی ہم اٹھائے گا۔'' بیتو نے کہا۔ ''بولے گا تو برتن دھلوائے گا۔''

''جی نہیں...... میرا بھائی کچھ نہیں کرے گا۔'' سادھنا نے کہا۔ ''ہم خود اٹھا لیں گے۔''

''سن لیا بھائی۔'' میں وسیم کی طرف دیکھا۔ ''ساری خدائی ایک طرف۔''

مونا کے پاس ابھی ایک چال تھی۔ ''زردہ وہی کھائے گا جو برتن اٹھائے گا۔''

ہم زردہ تو بھول ہی گئے تھے اور مونا نے یاد دلایا تو سب برتن دستر خوان اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن مونا اور سادھنا نے ہمیں روک دیا۔ یہ سب مذاق تھا اور ہنستے کھیلتے ہوئے ہم نے کھانا ختم کیا تھا۔ مونا نے سب کے لیے چائے اور کافی بنانے کی ذمے داری لی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں اس لیے اس نے وارننگ دی۔ ''اپنی کہانی سنائے بغیر تمہیں سونے نہیں دیا جائے گا۔''

''مجھے معلوم ہے اگر تم جلدی سے کافی بنالاؤ تو کہانی بھی جلدی سن سکو گی۔''

ابھی رات کے دس بجے تھے لیکن سب نے مصروف اور تھکن سے چُور کر دینے والا دن گزارا تھا اس لیے سب نیند کے جھونکے لے رہے تھے۔ مونا صرف دس منٹ میں کافی اور چائے بنالائی۔ سفیر کے اس راشی سرکاری ساتھی نے اس کوٹھی میں ضرورت اور آسائش کی ہر شے مہیا کر رکھی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ کافی کے پہلے تلخ گھونٹ نے نیند اُڑا دی اور میں اپنی کہانی سنانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں سے آغاز کیا جب میں زرین کو اس کی برتھ ڈے پر باہر لے گیا تھا اور وہیں سے ساری آفتوں کا آغاز ہوا تھا۔ مونا نے آغاز میں مداخلت کی۔ ''یہ مس زرین کون تھیں اور کہاں سے ہاتھ لگیں؟''

''سوری یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔'' میں نے کہا اور پہلے ان کو زرین کے بارے میں بتایا۔ بیتو اس کہانی سے واقف تھا اس لیے وہ اونگھنے لگا۔ وسیم اور سفیر بھی خاموشی سے سن رہے تھے لیکن سادھنا اور مونا نے زنانہ تجسس کے تحت بہت سارے غیر ضروری سوال کیے۔ سوالات زرین اور میرے تعلق کے بارے میں بھی تھے اور میں نے دامن بچا کر ان کے جوابات دیئے تاکہ یہ بعد میں میرے گلے نہ پڑ جائیں۔ زرین کے بارے میں بتا کر میں نے کہا۔ ''اب تم لوگ دل تھام کر سنو میری داستان۔''

سفیر نے وسیم کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''بھائی اسٹوری بنانے کے ماہر ہو گئے ہیں۔''

وسیم نے کچھ کہا نہیں صرف مسکرا دیا تھا۔ مونا نے سفیر کو گھورا۔ ''درمیان میں مت بولو۔''

''اور اتنی دیر سے تم دونوں کیا کر رہی ہو۔'' سفیر نے جواب دیا۔

ان کی لڑائی ختم ہوئی تو میں نے اپنی آپ بیتی سنانا شروع کی۔ یہ اتنی سنسنی خیز اور مار دھاڑ سے بھرپور تھی کہ وہ سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ فاضلی سے ٹکراؤ اور پھر ان سے بچتے ہوئے ڈاکٹر کے ہتھے چڑھنا، یہ سن کر وہ اچھل پڑے تھے کہ ڈاکٹر نے ہمیں ایبولا وائرس لگا دیا تھا۔ اس دوران میں، میں نے وہ حصہ ایڈٹ کر دیا تھا جس میں زرین اور مجھے جذبات کو برانگیختہ کرنے والی دوا دی گئی تھی اور خدا نے ہمیں گناہ سے بچا لیا تھا۔ سادھنا اور مونا ڈاکٹر کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ جب میں نے ان کو زرین کے ماضی کے بارے میں بتایا تو انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہوں نے زرین کو ناپسند کر دیا ہے۔ اگر میں نے اس کے مرنے کی خبر نہ سنائی ہوتی تو شاید وہ زبان سے بھی کہہ دیتیں۔ مگر جب زرین اور مجھے ایبولا وائرس لگانے کا سنا تو ان کے دل پگھل گئے تھے اور ان میں زرین کے لیے بھی ہمدردی آ گئی تھی۔ جب زرین کی موت کے بارے میں بتایا تو دونوں رو رہی تھیں۔ مونا نے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی حوصلہ مند عورت نکلے گی۔''

''خود مجھے بھی توقع نہیں تھی کیونکہ اس نے جوانی سے اب تک کوئی اچھی بات نہیں دیکھی تھی۔ مرشد جیسے درندے کی قید میں اس نے بہت تکلیفیں سہی تھیں۔ میں نے بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جنھوں نے زندگی میں اتنی تکلیفیں برداشت کی ہوں اور پھر جوانی میں مر گئے ہوں۔''

سفیر اور وسیم کے لیے ڈیوڈ شا کا ذکر حیران کن ثابت ہوا تھا۔ ''یہ کہاں سے آ گیا اچانک؟'' وسیم نے پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر توفیق کو یہ کام اصل میں ڈیوڈ شا نے دیا تھا اگرچہ دونوں نے اس کا اقرار نہیں کیا تھا۔ ڈیوڈ شا کا کہنا ہے اس نے صرف متعارف کرایا تھا اور ڈاکٹر کو کام دوسری پارٹی نے دیا تھا۔"

پھر میں نے انہیں ڈیوڈ شا کی پیش کش کے بارے میں بتایا۔ سفیر کسی قدر پُر جوش ہو گیا تھا۔ "واقعی ڈیوڈ شا مرشد سے معاملہ سیٹ کرا سکتا ہے۔"

"مجھے مرشد علی یا ڈیوڈ شا دونوں پر اعتماد نہیں ہے۔ تم نے دیکھا کہ ڈیوڈ شا کی ضمانت کتنی ناکارہ نکلی ابھی اس کا طیارہ پاکستان میں تھا کہ اس کا آدمی مرشد کے ہاتھوں بک گیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ مرشد کے ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رہا ورنہ مارا جاتا۔ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ہمیں بھی یہیں خدشہ تھا کہ تم مرشد کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہو۔" سفیر نے کہا۔ "ہم نے تمہیں مرشد کے ٹھکانوں پر دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس نے سیکورٹی سخت کر رکھی ہے۔"

"یہ براؤن کو استعمال کرنے والا آئیڈیا کس نے دیا تھا؟"

"وسیم نے۔" مونا بولی۔ "اسے کتوں کی بہت پہچان ہے اور اسی نے بتایا کہ براؤن کی نسل کے کتوں کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہوتی ہے اور یہ بو کے سہارے میلوں دور جا کر بھی آدمی کو تلاش کر لیتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے لے کر پورے اسلام آباد اور آس پاس کے علاقوں میں گھومتے رہتے تھے۔"

مجھے یاد آیا کہ جب میں ڈاکٹر توفیق کی کوٹھی میں تھا تو ڈیوڈ شا کسی کی مداخلت کے خدشے کے پیش نظر مجھے وہاں سے نکال لے گئے تھے اور کوٹھی کو تباہ کر دیا تھا میں نے وسیم سے پوچھا۔ "کیا کبھی تم لوگ مری کی طرف بھی گئے تھے۔ جو راستہ الگ سے بھوربن کی جانب کے لیے نکلتا ہے۔"

"نہیں ہم اس طرف نہیں گئے تھے کیونکہ ہمارا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا ہم تو میدانوں میں گھومتے رہے تھے۔" وسیم نے جواب دیا۔ "آج بھی ہم صبح سے راولپنڈی میں گھوم رہے تھے اور شام کو جب واپس آنے لگے تو اچانک ہی براؤن نے بھونکنا شروع کر دیا اور وہ جس طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا ہم نے گاڑی اس طرف گھما دی۔"

"اس کا مطلب ہے اس کی سونگھنے کی صلاحیت واقعی بے مثال ہے۔ ڈیوڈ شا مجھے نیچے کہیں لایا تھا اور پھر اس کے گُرگے مارشل نے مرشد سے میرا سودا کر لیا۔ وہ مجھے اس کے آدمیوں کے حوالے کرنے کے لیے راول جھیل کی طرف لے گیا تھا۔"

"براؤن ہمیں وہاں تک لے گیا۔ پھر فائروں کی آواز آئی اور یہ یک دم مونا سے زنجیر چھڑا کر بھاگ نکلا تھا۔"

"وہ فائر مارشل نے اپنے مقامی ساتھیوں پر کیے تھے تاکہ ڈیوڈ شا کے سامنے اس کے جرم کا کوئی گواہ باقی نہ رہے۔ میں نے اس دوران میں گاڑی کا دروازہ توڑ لیا تھا اور مارشل نے مجھے گولی مارنے کی کوشش کی جو براؤن نے ناکام بنا دی۔"

"دیکھا میرا کتا کتنا زبردست ہے۔" مونا نے فخر سے کہا۔

"بس جی ہم تو آپ کے حسنِ انتخاب کے قائل ہیں۔" سفیر نے عاجزی سے کہا تو سب مسکرانے لگے

تھے۔

"ویسے یہ مسٹر براؤن ہیں کہاں؟"

"اس کے لیے کوٹھی کے پچھلے حصے میں کتا گھر ہے۔" مونا نے بتایا۔ "وہیں ہوتا ہے دن میں سوتا ہے اور رات کو پہرہ دیتا ہے۔"

"یہ اچھا ہے وہ اندر نہیں آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ ملا کہاں سے؟"

"جب ہم پاکستان آ رہے تھے تو راستے میں ملا تھا۔" سفیر بولا۔ "خود ان خاتون کے آگے پیچھے ہونے لگا تھا۔"

"تمہاری طرح۔" وسیم بولا تو سب ہنس دیئے تھے میں نے محسوس کیا کہ وسیم اور سفیر میں قریبی دوستوں جیسی بے تکلفی آ گئی تھی جب کہ مجھ سے اس کا احترام آمیز انداز برقرار رہا تھا۔ سوالات کی وجہ سے ایک گھنٹے کی کہانی دو گھنٹے تک چلی تھی اور اب بارہ بج رہے تھے۔ مونا اور سادھنا کی آنکھوں میں خمار گہرا ہو چلا تھا اور بیتو پہلے ہی خراٹے لے رہا تھا۔ وسیم نے اس کی طرف دیکھا۔

"منا سو گیا ہے۔ میرا خیال ہے خواتین بھی سوئیں تا کہ کل ناشتہ وقت پر مل جائے۔"

"بس ہماری یہی اہمیت ہے۔" سادھنا نے منہ بنایا۔

"تو اور کیا۔" وسیم نے اسے ڈانٹا۔ "مجھے دیر تک پڑی سونے والی عورتیں بالکل اچھی نہیں لگتی ہیں۔"

"تو پھر لے آنا کوئی جلدی اٹھنے والی۔" سادھنا اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں کل صبح دس بجے سے پہلے کسی صورت نہیں اٹھوں گی۔"

"میں بھی۔" مونا نے اس کا ساتھ دیا۔

"بالکل میری طرف سے تم ایک گھنٹہ مزید سو سکتی ہو۔" سفیر نے خلاف توقع اس کی تائید کی اور آہستہ سے بولا۔ "اچھا ہے آفت جتنی دیر سوئی رہے۔"

"کیا...... کیا کہا آپ نے۔" مونا چلائی اس نے سن لیا تھا۔

"میں نے کہا تم سوتے ہوئے زیادہ خوب صورت لگتی ہو اس لیے زیادہ سویا کرو۔" سفیر نے جلدی سے بات بنائی لیکن مونا کو یقین نہیں آیا تھا وہ اسے گھورتی ہوئی چلی گئی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔

"اب تم بتاؤ کہ ایسی کیا مصیبت آ گئی تھی جو تم سب یہاں دوڑے آئے؟"

"مصیبت آ گئی تھی یار۔" سفیر نے گہری سانس لی۔ "تمہیں معلوم ہے سادھنا کا پاسپورٹ جعلی تھا اور دبئی والوں نے اس پر شک نہیں کیا تھا اسے باآسانی ورک ویزہ مل گیا۔ اس کے لیے اسے واپس بھی نہیں جانا پڑا تھا۔ ایرانی جزیرے سے ان سب کی ری انٹری ہو گئی تھی۔"

"تب مشکل کیا تھی؟"

"یہ میں بتاتا ہوں۔" وسیم نے کہا۔ "دبئی پہنچ کر ہم بالکل بے فکر ہو گئے تھے اور واحد فکر بس آپ کی رہ گئی تھی۔ صبح سے شام تک گھومتے پھرتے تھے اور رات گئے واپس آتے تھے کیونکہ کام تو کوئی تھا نہیں۔ سفیر نے کمپنی

بھی بس نام نہاد بنا رکھی تھی۔''

''نام نہاد کیوں۔'' سفیر نے احتجاج کیا۔ ''میں جاپان سے گاڑیاں منگوانے کا بزنس شروع کرنے والا تھا۔''

''لیکن ابھی شروع تو نہیں کیا تھا۔'' وسیم نے اس کا احتجاج مسترد کر دیا۔ ''اس وجہ سے ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ پیسہ بھی تھا اور گاڑی بھی تو آدمی آرام سے کتنی دیر گھر میں بیٹھ سکتا ہے؟''

''چند گھنٹے سے زیادہ نہیں۔'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

''چند گھنٹے۔'' سفیر بھنا کر بولا۔ ''یہ لوگ ایک گھنٹہ بھی سکون سے گھر میں نہیں گزارتے تھے کھانا بنانے کے لیے ٹماٹر بھی چاہیے ہوتا تو سب گاڑی میں لد کر سب سے دور دراز کے شاپنگ سینٹر کا رخ کرتے تھے اور عام طور سے کھانا بھی باہر کھا کر آتے تھے۔ ٹماٹر کی ضرورت بھی نہیں رہتی تھی۔''

''ان سب میں تم سب سے آگے ہوتے تھے۔'' وسیم نے یاد دلایا۔ ''اور شاپنگ کے لیے جگہ بھی تم منتخب کرتے تھے۔ ہمیں دبئی کا کیا پتا تھا۔''

''وہ تو میں جمہور کی رائے پر عمل کرتا تھا۔'' سفیر نے کھسیا کر کہا۔ ''اپنے ایمان سے کہو تم لوگوں کو سمجھاتا نہیں تھا کہ ہمارا زیادہ گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں سمجھاتے تو تھے۔'' وسیم نے اعتراف کیا۔ ''بہر حال ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔''

''تم دونوں بک بک کرنے کے بجائے اصل بات پر آؤ گے یا نہیں۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''اصل بات یہ ہے کہ ایک بد بخت انڈین نے سادھنا کو دیکھ لیا اور وہ سادھنا اور کنور فیملی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ہمارا پیچھا لے لیا۔ پریمیش کمار نامی یہ شخص وہاں بہت بڑا تاجر ہے اور اس کا اصل دھندہ پاکستان سے اسمگل ہو کر انڈیا آنے والا باسمتی چاول پیک کر کے مڈل ایسٹ کی مارکیٹ میں فروخت کرنا ہے۔''

''اگر اسے شک ہو گیا تھا تو یہ ایسی بات تو نہیں تھی جس کے لیے تم لوگ دبئی جیسی محفوظ جگہ چھوڑ کر یوں نکل جاتے۔''

''یار پوری بات تو سن لے۔'' سفیر چڑ گیا۔ ''کیا ہم بچے ہیں عقل سے پیدل۔''

''مجھے دوسری بات سے اختلاف نہیں ہے۔''

وسیم نے بات جاری رکھی۔ ''اس حرامزادے نے پہلے تو ہمارا پیچھا لیا اور سادھنا کو پہچاننے کا دعویٰ کیا اور جب میں نے اس کی تھوڑی مرمت لگائی اور اسے بتایا کہ سادھنا میری بیوی اور مسلم ہے تو اس نے دبئی امیگریشن کو اطلاع کر دی۔ وہ گھر آ گئے اور سادھنا کا پاسپورٹ قبضے میں لے لیا۔''

''یہ تو برا ہوا؟''

''نہیں برا ہونے والا تھا۔'' سفیر نے کہا۔ ''اس سے پہلے سچ مچ برا ہوتا ہم نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ قانونی راستے سے صرف میں اور مونا جا سکتے تھے۔ وسیم کا پاسپورٹ بھی دو نمبر تھا اور امکان تھا کہ پاکستان میں اسے روک لیا جائے گا۔ وقت نہیں تھا کیونکہ دبئی امیگریشن والے لازمی بھارت سے پاسپورٹ کی تصدیق کراتے اور جیسے ہی معلوم ہوتا کہ پاسپورٹ جعلی ہے سادھنا گرفتار ہو جاتی۔''

''ٹھیک ہے تم ہمیں بھی تو بتا سکتے تھے۔''

''نہیں یار موقع نہیں تھا اور یہ خوف بھی تھا کہ دبئی سے باہر جانے والی کالز ریکارڈ کی جاتی ہیں۔'' سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔''میں تیزی سے حرکت میں آیا سب سے پہلے اپنے مکان کا سودا کیا اور اسے ایک رئیل اسٹیٹ والے کو بیچ دیا۔ اس نے جو قیمت دی میں نے قبول کر لی ویسے نقصان میں نہیں رہا جتنے میں لیا تھا اس سے دوگنی قیمت مل گئی اور اگر آرام سے بیچتا تو تین گنا بھی مل سکتی تھی۔''

''بینک اکاؤنٹس کا کیا کیا؟''

''ان کو جنوبی افریقہ کے ایک بینک میں منتقل کیا اور اب میں اسے دنیا میں کہیں سے بھی آپریٹ کر سکتا ہوں۔ یہاں پاکستان میں بھی اس کی برانچیں ہیں۔''

''یہ اچھا ہوا کیونکہ دولت بہت بڑی طاقت ہے۔''

''میں نے اس کا نصف حصہ گولڈ بانڈ میں تبدیل کرا لیا ہے کیونکہ دبئی میں ایک جاننے والے جیولر نے بتایا کہ آنے والے تین سالوں میں سونے کی قیمت دوگنی سے زیادہ ہو جائے گی۔''

''یہ تم نے اچھا کیا؟'' میں نے اطمینان کا سانس لیا۔''تم لوگ کشتی لے کر ایران پہنچے اور پھر وہاں سے پاکستان آئے لیکن اتنی دیر کیوں لگا دی؟''

''اس میں بھی ایک مسئلہ ہو گیا تھا جناب۔'' وسیم بولا۔''سفیر نے جس آدمی کی خدمات حاصل کی تھیں وہ بدمعاش نکلا۔ جب ہم ایران پہنچے تو اس نے ایک طرح سے ہمیں یرغمال بنا لیا اور ایرانی پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکیاں دینے لگا۔''

''مجھے بھی یہی خدشہ تھا کیونکہ اس قسم کے کام آدمی اکیلا نہیں کرتا ہے میرا خیال تھا کہ تم لوگوں نے دو ملکوں کی سرحدیں عبور کرنے کے لیے اسمگلر ٹائپ کے جرائم پیشہ کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔''

''میں اسے دبئی سے جانتا ہوں کیونکہ گاڑیوں کا کاروبار کے لیے اس نے بھی مجھے پیش کش کی تھی۔ وہ اصل میں گاڑیاں بھی اسمگل کرتا ہے۔ دبئی سے گاڑیوں کو لانچوں میں لاد کر پاکستان اور ایران کے راستے افغانستان پہنچایا جاتا ہے جہاں ان کی بہت مانگ ہے ان دنوں۔''

''ہاں ان دنوں وہاں بارود کے ساتھ ڈالرز کی برسات بھی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شامل ہو جاؤں لیکن میں نے کام کی نوعیت بھانپ کر ہی اسے انکار کر دیا تھا۔ البتہ جب ہمیں دبئی سے نکلنے کی ضرورت پیش آئی تو مجھے اس کا خیال آیا اور میں نے اس سے رابطہ کیا تو وہ کشتی سے ہمیں پاکستان تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔''

''اس نے کہا ہو گا کہ تم لوگ خود اس کے دام میں آ رہے ہو اور اب وہ تم سے تمہارے انکار کا بدلہ لے سکتا ہے۔''

''تو نے ٹھیک کہا وہ کینہ پرور آدمی اسی انکار کو دل میں لیے بیٹھا تھا نادر شاہ درانی کی اولاد۔'' سفیر بولا

''نادر شاہ کی اولاد؟''

''وہ خود کو نادر شاہ درانی کی اولاد کہتا ہے نام بھی قادر شاہ درانی ہے۔''

''بکواس کرتا ہے اسے اپنے باپ کا نام بھی نہیں معلوم۔ اس کی ماں شاہ ایران کے زمانے میں ایران کی مشہور طوائف تھی اور جب خمینی حکومت آئی تو دوسری بدکردار عورتوں کی طرح وہ روپوش ہوگئی۔'' وسیم نے کہا۔

''تم اس کے بارے میں جانتے ہو؟''

''نہیں یہ تو مجھے ازابیل خان سے معلوم ہوا۔''

''ازابیل خان کون ہے؟''

''وہ پاکستان کا اسمگلر ہے۔ ایران اور افغانستان میں اس کا مال آتا جاتا ہے۔ جب ہم قادر شاہ درانی کی قید میں تھے تو اتفاق سے وہ وہاں آ گیا اور اسی کی وجہ سے ہماری گلو خلاصی ہوئی۔ ازابیل خان مجھے بہت پہلے سے جانتا ہے۔ ہم اس کے گروہ سے بھی اسلحہ خریدتے تھے۔''

''ازابیل خان نے پرانے تعلقات کا پاس کیا یا کوئی اور چکر تھا؟''

وسیم مسکرایا۔ ''آپ جانتے ہیں جرم کی دنیا میں تعلقات کی پاسداری نہیں کی جاتی ہے۔ ازابیل خان نے اس شرط پر رہا کرایا کہ ہم اس کا کچھ مال سرحد پار پہنچائیں گے۔''

''تم نے اس کی شرط مان لی؟''

''کیا کرتے قادر شاہ درانی کے پاس بری طرح پھنس گئے تھے لیکن اس نے بڑا مشکل کام دیا تھا۔ کوئی ۱۱ درجن اونٹوں پر مشتمل قافلہ تھا جس کی نگرانی ہمارے سپرد تھی۔ دوسرے کاموں کے لیے ازابیل خان کے آدمی تھے۔ ہم چار دن صحراؤں اور ویرانوں میں سفر کرتے رہے تھے اور ایک بار تو سرحدی محافظوں نے دیکھ بھی لیا تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ ایرانی تھے اور ہم اس وقت تک پاکستان کی سرحد عبور کر چکے تھے اس لیے ایرانیوں نے تعرض نہیں کیا۔''

''پھر بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں انہوں نے پاکستانی حکام کو اطلاع نہ کر دی ہو۔ بہرحال خیریت رہی اا ہم باحفاظت تافتان پہنچ گئے۔'' سفیر نے قصہ مکمل کیا۔

''شاید وہیں سے تم نے کال کی تھی؟''

''ہاں ایک سم لی تھی لیکن موبائل نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے ایک آدمی کا موبائل لے کر کچھ دیر کے لیے ال کی تھی۔ پولیس اور دوسرے اداروں کے ڈر سے ہم چھپ کر سفر کر رہے تھے کیونکہ صرف سفیر اور مونا کے پاس اا کے اصل کاغذات تھے۔ میرے اور سادھنا کے پاس کسی قسم کا کوئی کاغذ نہیں تھا۔''

''کوئٹہ پہنچ کر موبائل لیا تو اس وقت تک تُو غائب ہو چکا تھا۔'' سفیر نے بتایا۔ ''میں نے سنا تھا ا دوسرے شہروں کی نسبت کوئٹہ میں کاغذات بنوانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس لیے ہم وہیں رک گئے اور سادھنا وسیم کے نکاح کی ضرورت بھی وہیں پیش آئی تھی۔ وسیم کا شناختی کارڈ سرکاری ریکارڈ میں موجود تھا اس لیے اا آسانی سے بن گیا۔ اب سادھنا کا اس سے نکاح پڑھایا گیا اور اس کی بنیاد پر اس کا شناختی کارڈ بنایا گیا۔ اس میں ایک ہفتہ وہیں لگ گیا تھا۔ یہاں عبداللہ سے رابطہ تھا اور ہمیں رپورٹ مل رہی تھی۔ جیسے ہی وسیم اور ما کے شناختی کارڈ بنے ہم اسلام آباد پہنچ گئے اور تیری تلاش شروع کر دی۔''

باتوں میں احساس نہیں ہوا تھا لیکن ہماری نیند اُڑ گئی تھی۔ صرف بیتو سو رہا تھا۔ اندر ماحول خوشگوار

گرم تھا اس لیے وہ بغیر کمبل کے بھی آرام سے سو رہا تھا۔ میں نے کوٹھی کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ کب لی؟''

''یہاں پہنچتے ہی۔'' سفیر نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ہمیں مزید ٹھکانوں کی ضرورت ہے۔ کم سے کم دو جگہیں کرائے پر حاصل کی جائیں جو ایک دوسرے سے مختلف جگہوں پر ہوں اسی طرح ہمیں گاڑیوں کی ضرورت ہوگی۔ سب سے اہم ضرورت اسلحے کی ہے۔''

''اسلحے کی فکر مت کریں۔'' وسیم نے کہا۔ ''یہ میری ذمے داری ہے جو اسلحہ اور جتنی تعداد میں چاہیے مل جائے گا۔''

''مرشد پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا ہے اور اس نے چند قابل لوگوں کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ فاضلی ان میں سے ایک ہے مجھے یقین ہے مارشل بھی اس سے مل گیا ہوگا اور اب وہ بھی دشمنوں میں شامل ہے۔''

''مرشد سے مقابلے کے لیے ہمیں بھی قابلِ اعتماد ساتھیوں کی ضرورت ہے۔'' سفیر نے کہا۔

''ایک آدمی ہے۔'' میں نے کہا اور انہیں ایاز کے بارے میں بتایا۔ ''لڑائی بھڑائی کا ماہر ہے اور سب سے بڑھ کر گاڑیوں کا ماہر ہے۔''

''عبداللہ بھی ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''ہاں لیکن وہ راجا عمر دراز کا ملازم ہے۔ مخلص سہی پر ایک حد سے زیادہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم اس سے کام لے سکتے ہیں لیکن اس پر تکیہ نہیں کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا تو سفیر نے میری تائید کی تھی۔

''ہمیں جو کرنا ہے اپنے زورِ بازو پر کرنا ہے۔''

ہم ایک دوسرے کے حالات اور واقعات سے واقف ہو چکے تھے۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ ان لوگوں نے دبئی سے نکل کر بالکل صحیح قدم اٹھایا تھا اگر وہ دیر کرتے تو کم سے کم سادھنا پھنس جاتی اور دبئی کے سخت قوانین میں اس کے لیے نرمی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سفیر نے تیزی اور ذہانت سے کام لے کر ہمارے اثاثے بھی محفوظ کر لیے تھے۔ اب اگر دبئی نہ جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم یہاں بھی اس بینک سے رقم نکال سکتے تھے بلکہ سفیر نے پانچ لاکھ روپے نکلوائے تھے۔ اس پر مجھے یاد آیا۔

''رانا ویاس نے راجا عمر دراز کے توسط سے دس لاکھ روپے مزید بھجوائے ہیں اس کا کہنا ہے کہ یہ ہیروں کی قیمت میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔''

''اس نے تو پوری ادائیگی کر دی تھی۔'' سفیر نے یاد کیا۔

''لیکن مجھے عبداللہ کے توسط سے رقم ملی تھی اور میں نے اسے عبداللہ کے پاس ہی رکھوا دیا ہے کیونکہ میں تو آئے دن اٹھنے لگا ہوں اور جب دشمن کے ہاتھ لگتا ہوں تو سب چھن جاتا ہے۔''

''ہمیں بھی یہ کرنا چاہیے۔'' سفیر نے کہا۔ ''بینک میں اکاؤنٹ کھلوا لینے جائیں اور سب کے پاس اے ٹی ایم کارڈ ہوں اس سے سہولت ہو جائے گی کہ کیش کا چکر نہیں ہوگا اور جب ضرورت ہوگی تو کیش نکلوایا جا سکتا

ہے۔''

''تو طے ہے سب سے پہلے دو عدد مزید ٹھکانوں کی ضرورت ہو گی۔''میں نے کہا۔''دوسرے ہمیں گاڑیاں درکار ہیں گاڑیاں ایسی ہوں کہ سڑک کے علاوہ ناہموار راستوں پر بھی چل سکیں اور ریس میں اچھی ہوں۔''

''یہ دونوں کام میں کرلوں گا۔''سفیر نے کہا۔''اتنے عرصے میں غائب رہا ہوں اس لیے دشمنوں کے لیے اجنبی ہوں۔''

''اسلحہ میری ذمے داری ہوگی۔''وسیم بولا

''ٹھیک ہے بینک اکاؤنٹ مونا اور سادھنا کھلوالیں گی۔ دو بینک اکاؤنٹ کافی ہوں گے اور اے ٹی ایم بن جائیں گے تو کوئی بھی رقم نکلوا سکتا ہے۔''سفیر نے کہا۔

''بیتو کے لیے بھی آئی ڈی کارڈ کی ضرورت ہے۔''میں نے کہا۔''ایک کام اور کرنا ہے سب کے پاس پاسپورٹ ہوں۔''

''میرے اور مونا کے پاس ہیں۔''سفیر بولا۔''تم چاروں کے بنوانے ہیں۔''

''یہ سب کرنے کے بعد ہم آرام سے بیٹھ کر سوچیں گے کہ اب دشمنوں کے خلاف کیا کرنا ہے۔''میں نے کہا تو وسیم نے سر ہلایا۔

''بس توکل سے حرکت میں آجانا ہے۔''

''دشمن کے بارے میں تو سوچ سکتے ہیں لیکن راجا عمر دراز کا کیا کرنا ہے۔''سفیر نے نکتہ اٹھایا۔

''کیا مطلب؟''میں نے کہا۔

''بھائی وہ بلا وجہ تمہاری اور ہماری مدد نہیں کر رہا ہے اس کے پیچھے اس کی کوئی بہت بڑی غرض ہے۔''

''اس کی غرض میں سمجھتا ہوں۔''میں نے سر ہلایا۔''اگر موقع ملا تو اس کے کام آنے کی کوشش کروں گا لیکن فی الحال تو میرے سامنے میرے اپنے مسائل ہیں۔''

''اسی وجہ سے میں چاہتا ہوں ہم جو کریں وہ راجا عمر دراز سے ہٹ کر کریں اس کا اتنا زیادہ محتاج ہونا بھی ٹھیک نہیں ہے۔''سفیر نے کہا

''ہم کسی کی مدد مانگنے کے قائل بھی نہیں ہیں۔ یہ تو حالات ہیں جو ہمیں راجا عمر دراز تک لے جاتے ہیں یا اسے ہم تک لے آتے ہیں پھر وہ باظرف آدمی ہے جو احسان کر کے جتاتا نہیں ہے۔''میں نے کہا اور قالین پر دراز ہو گیا۔''کوئی ہلکی چیز مل جائے گی اوڑھنے کو؟''

''کیوں نہیں یہاں سب ملے گا یار۔''سفیر بولا۔ جب تک اس نے کمبل لا کر مجھ پر ڈالا میں سو چکا تھا۔ وسیم بھی وہیں لیٹ گیا تھا۔ وہ اپنے لیے کمبل لے آیا تھا لیکن صبح یہ صورتِ حال تھی کہ اس ایک کمبل میں وسیم اور میں دونوں لپٹے ہوئے تھے۔ رات کسی وقت سردی بڑھ گئی تھی۔ مونا سب سے پہلے اٹھی اور نیچے آ کر اس نے لاؤنج کی دیوار کا پردہ ہٹا دیا۔ یہ پوری دیوار شیشے کی تھی جس کے پار تحفظ کے لیے خوبصورت فولادی گرل لگی تھی۔ پردے کی وجہ سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ دیوار شیشے کی ہے اور شیشے کے پار سرسبز لان تھا جس پر پام نسل کے بوٹے

درخت لگے تھے۔ بے حد خوبصورت منظر تھا۔ میں نے دھوپ پڑنے پر کمبل سے سر نکالا تو مونا کشن اور تکیے درست کر کے رکھ رہی تھی۔ مجھے بیدار دیکھ کر مسکرائی۔

''گڈ مارننگ۔''

''خالی گڈ مارننگ؟''

''نہیں السلام وعلیکم بھی ہے۔'' اس نے چالاکی سے کہا۔

''میرا اشارہ بیڈ ٹی کی طرف ہے۔''

''میں بری چائے کی قائل نہیں ہوں۔ صبح سویرے منہ دھوئے بغیر چائے اچھی کہاں لگے گی۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''اچھا بی بی۔'' میں اٹھ بیٹھا۔ ''مت دو چائے پانی میں ابھی تمہارے میاں کو لے کر جا رہا ہوں اور ہم رات کا کھانا کھا کر آئیں گے۔''

''جی نہیں آج آپ کہیں نہیں جائیں گے۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اتنے عرصے بعد ہم ملے ہیں ایک پورا دن ہم گھر میں اور ساتھ گزاریں گے۔''

''ہم باہر تفریح کرنے نہیں جائیں گے۔ کچھ کام نمٹانے ہیں۔'' میں نے گیسٹ ہاؤس کے واش روم کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

مونا میرے پیچھے آئی۔ ''پلیز شوبی ایک دن سے کیا ہوتا ہے؟''

میں رک گیا اور پھر مونا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہوتا تو کچھ نہیں ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ دشمن ایک دن کی تاخیر سے فائدہ اٹھا کر ہمارے خلاف کوئی سازش تیار کر لے اور جب سازش سامنے آئے تو ہم اس کا سامنا کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اس کی وجہ ہے دشمن پوری تیاری کرتا ہے اور ہمارے خلاف ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتا ہے جب کہ ہم اس سے بچ نکلنے پر بس شکر ادا کرتے ہیں اور اگلی بار پھنسنے تک آرام کرتے ہیں۔ ہمیں بھی دشمن کے خلاف مکمل طور پر تیار رہنا چاہیے۔''

''تو کیا تیاری آج سے شروع کر دو گے؟'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو تم آئے ہو۔''

''ہاں اور میں دوبارہ اس کی گرفت میں نہیں جانا چاہتا۔'' میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''سفیر اٹھ گیا ہے نہیں تو اسے اٹھا دو اور اگر ناشتہ دینے کا ارادہ ہے تو تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔''

میں نے وسیم کی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ باتھ روم سے فارغ ہو کر میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ''شہباز صاحب آپ کہاں ہیں؟''

''ایک اور ٹھکانے پر ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بتاؤ کہ ایاز کہاں ہے؟''

''یہاں کوٹھی میں موجود ہے۔''

''گڈ اسے میرے کپڑے، دوسرا سامان اور رقم دے کر بھیج دو۔ اسے یہ نمبر دے دینا۔''

''آپ کا پتا؟''

''فون پر بتانا ٹھیک نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم اسے یہ نمبر دے کر روانہ کر دو اور اسے کہو کسی پی سی او

سے اس نمبر پر کال کرے۔"
"میں سمجھ گیا جناب۔" عبداللہ بولا۔ "کیا ساری رقم دے دوں؟"
"بالکل تم ساری رقم دے کر روانہ کرنا۔"
عبداللہ سے بات کر کے میں لاؤنج میں آیا تو وسیم اٹھ گیا تھا البتہ بیتو سو رہا تھا میں نے اسے سونے دیا اور کچن سے متصل چھوٹے سے ڈائننگ روم میں آیا۔ ناشتہ میز پر لگایا جا رہا تھا اور ریڈی میڈ تھا۔ یعنی سکے ہوئے توس اور ابلے اور تلے ہوئے انڈے تھے۔ دودھ میں سیریل تھا۔ موسم کی مناسبت سے اورنج جوس بھی تھا۔ مونا پھولے منہ کے ساتھ کام میں لگی تھی اور سادھنا یقیناً آرام کر رہی تھی۔ ان دونوں نے کام بانٹ لیا تھا۔ چند منٹ بعد سفیر اور وسیم بھی آ گئے۔ سفیر نے غور سے مونا کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا اور بولا۔
"وسیم اسلحے کے ساتھ ایک گاڑی کا بندوبست تم کرو گے۔"
"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" سفیر نے پوچھا۔
"تم اسلام آباد میں ایک کرائے کا مکان لو گے بے شک غیر فرنش ہو لیکن فرنش مل جائے تو اچھا ہے اور دوسرے ایک گاڑی کا بندوبست تم کرو گے۔"
"ٹھیک ہے اور تم کیا کرو گے؟"
"میں راولپنڈی میں مکان دیکھوں گا اور ایک بائیک لوں گا۔" میں نے اپنا پروگرام بتایا۔ سفیر نے ایک بار پھر مونا کی طرف دیکھا۔
"لیڈیز کو ان کا پروگرام بتا دیا ہے؟"
"لیڈیز کا آج گپ شپ کا موڈ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں بتایا۔ "ان کے حصے کا کام بھی ہمیں کرنا ہوگا۔"
"میں نے کام سے کب منع کیا ہے؟" مونا خفگی سے بولی
"تم نے منع نہیں کیا ہے میں منع کر رہا ہوں تم دونوں گھر میں رہو تو زیادہ اچھا ہے۔ ہاں ہم تینوں کو تین الگ الگ بینکوں میں اکاؤنٹ بھی کھلوانا ہوگا۔ ایاز ابھی رقم لا رہا ہے۔ ضرورت کی الگ کر کے باقی رقم سے اکاؤنٹ کھلوانا ہوگا۔" میں نے کہا۔ مونا روہانسی نظر آنے لگی تھی لیکن میں نے سوچ لیا تھا اپنے رویے میں نرمی نہیں لاؤں گا۔ سفیر دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا شاید وہ مجھ سے متفق نہیں تھا۔ موبائل کی بیل بجی۔ یہ لینڈ لائن نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف ایاز تھا۔
"شہباز صاحب میں باہر سے بات کر رہا ہوں مجھے کہاں آنا ہے۔"
میں نے سفیر سے پوچھ کر اس کوٹھی کا پتا بتایا اور اس سے کہا۔ "آتے ہوئے اپنے تعاقب کا خاص خیال رکھنا اگر ذرا بھی شبہ ہو تو واپس چلے جانا..... سمجھ گئے؟"
"جی جناب۔" اس نے کہا۔ "مجھے آنے میں آدھا گھنٹہ لگ جائے گا اگر اس سے دیر ہوا در میری طرف سے رابطہ نہ ہو تو آپ سمجھ جائے گا۔"

ایاز کا مطلب تھا کہ وہ کسی خطرے میں ہوگا اور اس کی وجہ سے ہمیں بھی خطرہ لاحق ہو چکا ہوگا۔ میں نے فون بند کیا تو مونا جا چکی تھی میں نے سفیر کی طرف دیکھا تو اس نے گہری سانس لی۔ ''یار میں شادی کرکے مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ یہ چاہتی ہے کہ میں اس کی اسی طرح مانوں جیسے عام شوہر بیویوں کی مانتے ہیں اور اکثر یہ سمجھتی نہیں ہے کہ ہم کن حالات سے دوچار ہیں۔''

''یہ مسئلہ تو ہونا ہی تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن گزشتہ رات سے اب تک میں نے جو دیکھا ہے اس نے مجھے ایک فیصلے تک پہنچنے میں مدد دی ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟'' سفیر نے میری طرف دیکھا تو میں نے انہیں سویرا کے بارے میں بتایا۔

''بابا چاہتے ہیں کہ ہمارا نکاح کر دیا جائے تا کہ سویرا کے نام نہاد رشتے داروں کا منہ بند ہو جائے۔ اگر میں نے اس سے نکاح کر لیا تو اس کے بعد میں اس سے اس طرح بے فکر نہیں ہو سکتا جیسا کہ اب ہوں۔ میری یکسوئی متاثر ہوگی۔''

''یعنی اب تم نکاح نہیں کرو گے؟''

''میں فی الحال بابا کو ٹال دوں گا۔ ویسے بھی شمی اور آپا کے اغوا کی ناکام کوشش کے بعد ہمارا خاندان ایک ہنگامی صورت حال سے گزر رہا ہے میں اس کی آڑ لے کر نکاح کو کچھ عرصے کے لیے ٹال سکتا ہوں۔''

''لیکن آپ اسے غیر معینہ مدت کے لیے نہیں ٹال سکتے۔'' وسیم نے کہا اور درست کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن جب تک میرے بس میں ہے میں ٹالتا رہوں گا اور اس کے بعد واضح بات کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ضروری نہیں ہے اس کی نوبت آئے۔''

جب تک ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ایاز آ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی چہیتی جیپ بھی لایا تھا۔ اس نے یقیناً راستے میں تعاقب کا پورا خیال رکھا ہوگا ورنہ وہ یہاں نہیں آتا۔ وہ جیپ سے اتر کر مجھ سے گلے ملا۔ ''آپ کو ٹھیک دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔''

''اور مجھے تم کو دیکھ کر۔'' میں نے کہا۔

ایاز نے جیپ سے میرا بیگ اور ایک بریف کیس اٹھایا۔ ہم اندر لاؤنج میں آ گئے۔ سفیر نے اس سے ناشتے کا پوچھا لیکن وہ کر کے آیا تھا۔ ''ہاں چائے یا کافی مل جائے تو ٹھیک ہے۔''

بیتو ہماری آوازیں سن کر اٹھ گیا تھا وہ ایاز کو دیکھ کر خوش ہوا۔ ''اچھا ہوا ایاز بھائی تم بھی ادھر آ گیا۔''

سادھنا جاگ کر نیچے آئی اور ایاز کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ میں نے ایاز کا تعارف کرایا اور اسے چائے بنانے کو کہا وہ بولی۔ ''میں لاتی ہوں، مونا کہاں ہے؟''

''اوپر ہوگی۔'' سفیر نے جواب دیا۔ سادھنا چند منٹ میں سب کے لیے چائے بنا لائی۔ وسیم چہکا۔ ''اسے کہتے ہیں کوئیک سروس۔''

سادھنا مسکرائی۔ ''چائے تو مونا نے پہلے ہی رکھ دی تھی میں تو صرف نکال کر لائی ہوں۔''

سفیر ہنسا۔ ''اب بول بیٹے کوئیک سروس۔''

''تو کیا ہوا کوئی اور اتنی جلدی نکال کر لا سکتا ہے۔''

''میری بیوی لا سکتی ہے۔''سفیر نے سینہ تان کر کہا۔

میں نے ایاز کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ میں نے کہا۔''یار ان کا بیوی نامہ جاری رہے گا ہم ذرا کام کی باتیں کر لیں۔''

''باتیں چھوڑیں آپ بس حکم دیں۔''وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''حکم نہیں دوست...... مجھے معلوم ہے تم عبداللہ کے ساتھ کام کرتے ہو یعنی اب راجا عمر دراز کے ملازم ہو......''

''شہباز صاحب قطع کلامی کی معافی دینا۔''اس نے میری بات کاٹی۔''میں کسی عبداللہ یا راجا عمر دراز کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی میں نے کسی کی نوکری کرنے کا سوچا۔ سرگودھا کا ایک شوقین مزاج رئیس مجھے منہ مانگی تنخواہ پر ڈرائیور رکھنا چاہتا تھا لیکن میں نے انکار کیا۔ اب بھی میں کسی کا ملازم نہیں ہوں۔ صرف آپ کی وجہ سے یہاں رکا تھا۔''

''ٹھیک ہے دوست...... اب بات واضح کرتا ہوں۔ عبداللہ میرا بہت اچھا ساتھی ہے اور راجا صاحب مہربانوں میں سے ہیں لیکن میں اپنی لڑائی خود لڑنا چاہتا ہوں۔ یہ سب میرے ساتھی ہیں۔ بے غرض اور مخلص، میں چاہتا ہوں ان میں تمہارا اضافہ بھی ہو لیکن میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھوں گا میرے دشمن کون ہیں تم ان سے اچھی طرح واقف ہو اور وہ کتنے طاقتور ہیں یہ بھی تم جانتے ہو۔ اگر تم چاہو تو واپس جا سکتے ہو اور چاہو تو میرا ساتھ دو کیونکہ مجھے ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت ہے۔''

''شہباز صاحب میں کہہ چکا ہوں میں شروع سے آپ کے ساتھ ہوں اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کہہ دوں تو جب تک آپ کے یہ دشمن باقی ہیں میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''بس تو آج سے تم ہمارے ساتھ ہو۔''میں نے خوش ہو کر کہا۔

''عبداللہ صاحب نے یہ رقم بھیجی ہے۔''اس نے بریف کیس میری طرف کر دیا اور پھر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔''اس میں آپ کا سامان ہے۔''

دو عدد گاڑیاں اور کرائے کے مکانوں کا ایڈوانس ادا کرنے کے لیے ہمیں خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ وسیم اور سفیر کے ساتھ مل کر اس بارے میں اندازہ لگایا۔ پھر چار چار لاکھ وسیم اور سفیر نے لیے کیونکہ ان کو گاڑیاں بھی لینی تھیں اور دو لاکھ میں نے لیے۔ کیونکہ اس میں سفیر نے اپنی رقم بھی ملا دی تھی۔ اس لیے باقی بچ جانے والے سات لاکھ کو دو مختلف بینک اکاؤنٹس میں جمع کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کے پاس بس یہی لینڈ کروزر تھی جو انہوں نے کوئٹہ سے لی تھی اور اسلام آباد تک سفر اسی میں کیا تھا۔ طے ہوا کہ سفیر اور وسیم ساتھ جائیں گے جب کہ میں ایاز کے ساتھ نکلوں گا۔ بیتو گھر میں رہے گا۔ ہم سب تیار تھے میں نے کپڑے بدلے اور اپنا لباس پہن لیا کیونکہ وسیم کا لباس مجھے کسی قدر بڑا تھا۔

''کہاں جانا ہے شہباز صاحب؟''ایاز نے باہر نکلنے کے بعد کہا۔

''راولپنڈی جانا ہے ایک مکان کرائے پر لینا ہے اور ایک بائیک خریدنی ہے۔''میں نے اسے اپنا پروگرام بتایا اور پھر موبائل پر عبداللہ سے رابطہ کیا۔ مجھے اصل میں رفیق بھائی سے بات کرنی تھی۔ عبداللہ نے

میری ان سے بات کرادی۔ سلام دعا کے بعد میں نے ان سے عتیق کی حالت کے بارے میں پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے بہت بہتر ہے۔'' وہ بولے۔ ''دو دن سے وہ چل پھر رہا ہے اور حکیم صاحب کا کہنا ہے اب اسے مزید ان کے علاج کی ضرورت نہیں رہی ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ ایک بار عتیق کا اسپتال میں مکمل معائنہ کرانے کے بعد اسے واپس حویلی لے جاؤں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ میرے دشمن اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں اور میں چاہتا ہوں آپ سب محتاط رہیں۔ آپ عبداللہ سے کہہ کر گارڈز منگوالیں اور حویلی تک ان کی سیکورٹی میں جائیں۔''

کچھ دیر رفیق بھائی سے بات کر کے میں نے عبداللہ سے بات کی اور اسے رفیق بھائی سے تعاون کرنے کو کہا۔ اس نے مستعدی سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔'' پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''شہباز صاحب ایک بات پوچھوں اگر اجازت ہو۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہا تھا میں نے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں عبداللہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ میں صرف احتیاطی تدبیر کے طور پر تم سے الگ ہوا ہوں ورنہ تم میرے اسی طرح ساتھی رہو گے۔''

''اگر آپ کو راجا صاحب کی طرف سے خطرہ ہے کہ وہ مجھے کسی وقت آپ کے کسی کام سے منع کر دیں گے تو میں ابھی ان کی ملازمت چھوڑ کر آپ کے پاس آنے کے لیے تیار ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ہمیں راجا صاحب کی مدد کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے ایسے میں تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے اور کئی کام ایسے ہیں جو صرف تم کر کے دے سکتے ہو۔ یوں سمجھ لو کہ راجا صاحب کی یہ کوٹھی ہماری آخری پناہ گاہ بھی ہو سکتی ہے اور ہم اسے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔''

بڑی مشکل سے میں نے عبداللہ کو سمجھایا ورنہ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کال ختم کی تو ایاز مسکرایا۔ ''عبداللہ صاحب سچ مچ آپ سے بہت مخلص ہیں۔''

''تب ہی میں چاہتا ہوں وہ بیک اَپ میں موجود رہے۔ ہر آدمی عبداللہ کی طرح نہیں ہو سکتا ہے ممکن ہے وہ راجا صاحب کی ملازمت چھوڑ کر میرے پاس آجائے تو اس کے بعد آنے والا میری اس طرح سے کھل کر مدد نہ کرے جیسے عبداللہ کرتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ان کا بیک اَپ میں ہونا ضروری ہے۔'' ایاز نے میری تائید کی۔ ''میں نے دیکھا ہے جب آپ کا معاملہ ہو تو وہ اس طرح کام کرتے ہیں جیسے ان کا ذاتی معاملہ ہے۔''

اتنی صبح صرف بینک کھلے تھے اس لیے میں نے پہلے بینک والا کام نمٹانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مقامی نجی بینک کی اسلام آباد والی ایک برانچ میں پہنچے۔ اس میں، میں نے اپنے نام سے اکاؤنٹ کھولا۔ میرے پاس میرا پرانا شناختی کارڈ تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت پرانا شناختی کارڈ بھی چلتا تھا اس لیے بینک والوں نے اسے قبول کر لیا۔ یہ نجی بینک تھا اس لیے عملہ مستعد اور تعاون کرنے والا تھا۔ صرف دس منٹ میں میرا اکاؤنٹ کھل گیا تھا اور میں نے اس میں ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کرا دیئے۔ منیجر نے یقین دلایا کہ ایک ہفتے کے اندر چیک بک اور

اے ٹی ایم کارڈ بن کر آجائے گا۔ اس لیے مجھے ایک فارم فل کرنا پڑا۔ تصویر نہیں تھی اس کے لیے ہم پاس ہی ایک چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی فوٹو شاپ تک گئے اور دس منٹ میں ڈیجیٹل تصویریں بنوا کر لے آئے۔ گیارہ بجے یہاں سے فارغ ہو کر ہم نے دوسرے بینک کا رخ کیا۔ یہ بھی نجی شعبے کا ایک بینک تھا میں نے اس کا خیال رکھا تھا کہ کسی ایسے بینک کا رخ نہ کروں جو کبھی سرکاری رہا ہو کیونکہ صرف بینک نجی ہوئے ہیں ان میں اکثر عملہ سرکاری دور کا ہے اور اس کا گاہکوں سے سرکاری انداز میں پیش آنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔

ہم اس بینک میں داخل ہوئے تو وہاں کام کا ماحول تھا اور خوشگوار فضا میں بینک کا عملہ آنے والے لوگوں کو نمٹا رہا تھا۔ اس بار میں سیدھا منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا میرا پُر اعتماد انداز دیکھ کر کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ منیجر ایک شیشے کے کیبن میں موجود تھا اور مجھے دیکھ کر اس نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پہلے بینک میں ایاز اندر نہیں آیا تھا اور اس بار بھی وہ باہر جیپ میں موجود رہا تھا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' منیجر نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''مجھے اکاؤنٹ کھلوانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ایسا اکاؤنٹ جس میں مجھے کبھی اور کسی مقدار میں رقم نکالنے میں دشواری نہ ہو۔''

''اس صورت میں آپ کے لیے کرنٹ اکاؤنٹ موزوں رہے گا۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے لیے آپ کو......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ باہر کچھ شور اٹھا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو ایک مسلح شخص تیزی سے بینک منیجر کے کیبن کی طرف آرہا تھا۔ منیجر گھبرا کر بولا۔ ''میرے خدا......''

''یہ ڈاکو ہیں۔'' میں نے کہا اور پاؤں سے کرسی کے پاس رکھا بریف کیس میز کے نیچے کر دیا۔ اسی لمحے مسلح شخص اندر گھس آیا اور میں کسی بھی صورتِ حال کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میری جیکٹ کی جیب میں پستول تھا۔ مگر اسے نکالنے کا موقع نہیں تھا۔ اندر آنے والے نے چلا کر کہا۔

''ہاتھ اوپر کرو......جلدی۔''

میں نے اور منیجر نے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ مسلح نوجوان نے دوسرا حکم دیا۔ ''باہر نکلو یہاں سے .... جلدی۔''

ہم اٹھ کر باہر آئے جہاں ڈاکو کے دو ساتھی باقی افراد کو وسطی کھلے حصے میں منہ کے بل لٹا رہے تھے اور جو مزاحمت کر رہا تھا اسے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ایک کاؤنٹر پر کھڑی پیاری سی لڑکی کو کھینچ کر لا رہا تھا اور وہ خوف سے چلا رہی تھی۔ میں اور منیجر بھی دوسروں کے ساتھ فرش پر لیٹ گئے تھے۔ سوائے کیشئر کے سب یہاں آچکے تھے۔ اس لیے دو افراد ہماری نگرانی کر رہے تھے اور ایک کیشئر سے رقم جمع کر رہا تھا اس کام کے لیے وہ کینوس کے بیگ لائے تھے۔ نگرانی کرنے والے پوری طرح چوکس تھے اور ذرا سی حرکت ہوتے ہی وہ چلانے لگتے تھے۔ ان کا کوئی ساتھی یقیناً باہر بھی ہوگا میں نے سوچا۔ مجھے ایاز کا خیال آیا وہ باہر تھا اور مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کر جائے کہ ڈاکو تو نکل جائیں اور ہم پھنس جائیں۔ ہمیں بالکل غیر جانبدار رہنا تھا۔ اب مجھے ایک خطرہ اور ستانے لگا تھا کہ یہاں کیمرے تھے۔ عام حالات میں مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ڈاکے کے بعد جب پولیس

تفتیش کرتی اور ریکارڈنگ چیک کرتی تو میری صورت کسی کو متوجہ کر سکتی تھی اور ایک بار میں شہباز ملک کی حیثیت سے شناخت ہو جاتا تو اس ڈاکے کا ملبہ مجھ پر بھی ڈالا جا سکتا تھا۔ تینوں ڈاکو نوجوان اور نچلے طبقے سے لگ رہے تھے ان کی زبان اور حلیہ چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا۔ اگر ان کے پاس اسلحہ نہ ہوتا تو گارڈز ان کو بینک میں گھسنے بھی نہ دیتے۔

ڈاکو کیشئر سے رقم حاصل کر چکے تھے اور اب وہ سیف روم میں موجود رقم کے چکر میں تھے۔ انہوں نے منیجر کو اٹھایا اور اسے سیف روم کی طرف لے گئے۔ اب ہال میں ایک ڈاکو رہ گیا تھا۔ جو ایک درجن افراد کی نگرانی کر رہا تھا اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ سر بھی اٹھائے کیونکہ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ بینک کے باہر دو عدد گارڈز موجود تھے لیکن سب سے پہلے ان کو ہینڈز اَپ کرایا گیا تھا اور ان کا اسلحہ چھین کر ان کو بھی اندر لے آئے تھے ویسے بھی کمپنیوں کے دیئے یہ گارڈز بس نمائشی ہوتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں یہاں تک سنا ہے کہ ان کو فائر نہ کرنے کا حکم ہے اور یہ اپنے ہتھیار لوڈ حالت میں نہیں رکھ سکتے ہیں۔ اچانک مجھے اپنے برابر سے نسوانی سسکی سنائی دی اور لڑکی نے کہا۔ ''پلیز نہیں۔''

میں نے آہستہ سے سر گھمایا۔ یہ وہی پیاری سی کاؤنٹر والی لڑکی تھی وہ اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے رونے اور التجا کرنے کی وجہ ہمارے سروں پر موجود مسلح نوجوان تھا۔ وہ اپنا بھاری جوتا اس کے کولہے پر رکھے ہوئے تھا اور اس کے چہرے سے خباثت جھلک رہی تھی۔ شاید لڑکی اور ہم سب کو بے بس دیکھ کر اس کے اندر کا شیطان باہر آ گیا تھا۔ وہ یہاں کچھ اور تو کر نہیں سکتا تھا اس لیے اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے یہ حرکت کر رہا تھا۔ وہ جوتے کو یوں ہلا رہا تھا جیسے سگریٹ نوش حضرات سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے جوتے سے بجھاتے ہیں۔ نوجوان کا پاؤں ہی کم وزنی نہیں تھا اوپر سے اس نے بہت بھاری اور کھردرے تلے والا جوتا پہن رکھا تھا۔ لڑکی کا نرم و نازک جسم اس سلوک کی تاب نہیں لا پا رہا تھا اور وہ کراہ رہی تھی۔ اس کی کراہیں سب سن رہے تھے اور سب دم سادھے لیٹے تھے کسی نے مسلح ڈاکو کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں بھی شاید مداخلت نہ کرتا اگر ڈاکو ایک نہایت نازیبا حرکت نہ کرتا۔ لڑکی اچانک ہی بلند آواز سے چلائی تھی اور اس نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن جوتے تلے دبا اس کا جسم اٹھ نہیں سکا تھا۔

''ذلیل...... کمینے۔''

''بکواس بند کر۔'' نوجوان نے جھک کر اس کی گدی پر گھونسہ مارا۔ اس ضرب سے لڑکی کا سر فرش سے ٹکرایا اور اس دوہرے تصادم نے اسے وقتی طور پر بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر نوجوان نے ناقابلِ بیان زبان میں بتایا کہ وہ لڑکی کو ساتھ لے جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ میرا پستول جیکٹ میں بائیں طرف موجود تھا اور میں آہستہ سے اپنا ہاتھ اس طرف لے جا رہا تھا۔ نوجوان بے ہوش لڑکی کی طرف متوجہ تھا اور اب اسے یوں ٹٹول رہا تھا جیسے قصائی جانور ٹٹولتا ہے۔ نوجوان کی رائفل کا رخ بھی اوپر کی طرف تھا اور وہ ہماری طرف سے مطمئن تھا کہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ پوری بے فکری سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں کو اندر گئے ہوئے پانچ منٹ ہونے کو آئے تھے۔

بالآخر میرا ہاتھ پستول تک پہنچ گیا۔ ڈاکوؤں نے ہمیں اوندھے منہ لٹایا تھا لیکن ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم نہیں

دیا تھا اس لیے ہاتھ سب نے اپنی مرضی سے رکھے ہوئے تھے۔ نوجوان اب پوری طرح غافل تھا۔ میں نے اچانک پستول نکال کر اس کے پاؤں پر فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ اس نے کرب ناک آواز نکالی اور نیچے گرا اس دوران میں، میں کھڑا ہو چکا تھا اور اس کی رائفل چھین لی۔ رائفل لیتے ہی میں نے اس کے دوسرے گھٹنے پر فائر کیا۔ پہلی گولی نے پہلے گھٹنے کا حشر نشر کر دیا تھا اس بار رہی سہی کسر پوری ہو گئی تھی۔ اور وہ زخمی کتے کی طرح رونے چلانے لگا۔ دوسرے فائر کی ضرورت نہیں تھی یہ میں نے اسے سزا دینے کے لیے کیا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''سب دیوار کے ساتھ ہو جائیں کاؤنٹر کے پیچھے جاؤ جلدی۔''

میں خود سیف روم کے پاس ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ فائر کی آواز اندر تک گئی ہو گی اور اب وہ باہر آ رہے ہوں گے۔ اصولاً مجھے یہاں سے نکل بھاگنا چاہیے تھا لیکن میں ایک وجہ سے رکا تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے سیف روم کا دروازہ کھلا اور دونوں ڈاکو منیجر کو آگے کر کے نکلے تھے۔ ان میں سے ایک چلایا۔ ''کون کس نے فائر کیا...... اوئے تجھے کیا ہوا؟'' اس نے یقیناً نے زخمی ساتھی کو دیکھ لیا تھا۔ اب وہ دبی آواز میں رو رہا تھا اور اس میں جرأت نہیں تھی کہ میری نشاندہی کر سکتا کیونکہ میرے پستول کا رخ اس کی طرف تھا۔ اس نے جھوٹ بولا۔

''ایک آدمی مسلح تھا...... اچانک مجھے گولی...... مار کر بھاگ گیا۔''

آنے والے نے حیرت انگیز رفتار سے زخمی کے خاندان کی عورتوں سے اپنی ناجائز رشتے داری قائم کی اور آگے آیا تھا اسی لمحے اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے رائفل میری طرف گھمانے کی کوشش کی لیکن میں نے پہلے ہی گولی چلا دی جو اس کے بازو میں اتر گئی جھٹکے سے رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ''بس اب ہلنا مت ورنہ اس بار سر اُڑا دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم بھی سامنے آ جاؤ۔''

تیسرا منیجر کے ساتھ تھا اس نے فوراً منیجر کو یرغمال بنا لیا۔ ''میں اسے گولی مار دوں گا۔''

''شوق سے مار دو میرا کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد تم یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکو گے اور یہ تمہارے ساتھی ان کو میں ابھی شوٹ کر دوں گا۔'' میں نے کہا اور نمونے کے طور پر دوسرے زخمی کے پاؤں میں گولی ماری تو وہ بھی فرش پر گر کر چیخم دھاڑ کرنے لگا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''سنا تم نے اپنے سور ما ساتھیوں کا واویلا۔''

''ٹھیک ہے میں اسے چھوڑ رہا ہوں لیکن ہمیں یہاں سے نکلنے دو۔'' اس نے کہا۔ میں نے سوچا اور راضی ہو گیا کیونکہ جتنی دیر ہوتی میرے پھنسنے کا بھی اتنا ہی امکان ہوتا۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو لیکن رقم لے جانے کی کوشش مت کرنا۔''

''ہم رقم نہیں چھوڑ سکتے۔'' اس نے صاف انکار کر دیا اور اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ رقم چھوڑنا بھی نہیں چاہتا ہے۔

''او کے رقم بھی لے جا سکتے ہو۔'' میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ مگر وہ بہت چالاک نکلا تھا اس نے منیجر کو سامنے ہی رکھا تھا میں نے پستول رکھ کر اس کے ساتھی کی رائفل تان لی تھی۔ میں ستون کی آڑ میں رہا اور جیسے جیسے وہ سامنے آ رہا تھا میں آڑ میں ہوتا جا رہا تھا اس کا کیا بھروسہ گولی چلا دیتا۔ میں نے اس کے زخمی

ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''انہیں کیسے لے کر جاؤ گے؟''

''ان کو لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ خودغرضی سے بولا۔

''اوئے کیا بکواس کر رہا ہے۔'' دوسرا زخمی چلایا اور اس نے اپنے اس ساتھی سے بھی ناجائز رشتے داریاں قائم کرنا شروع کی تھیں کہ اس نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا اور اسے گولی مار دی۔ مجھ سمیت سب دنگ رہ گئے تھے۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' میں چلایا۔ تو اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر کے ایک پورا برسٹ چلا دیا۔ میں ستون کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا تھا لیکن اس بند جگہ قیامت خیز شور نے سب کو خوف سے پاگل کر دیا تھا اور ہال میں کونے کھدروں میں دبکے لوگ دیوانہ وار چلانے لگے تھے۔ مجھ پر برسٹ چلا کر وہ رقم کے بیگ سمیت باہر کی طرف لپکا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے ستون سے جھانک کر دیکھا اور اونچی آواز میں بولا۔ ''سب اپنی جگہ لیٹے رہو کوئی نہ ہلے۔''

پہلا زخمی بینچ کے ساتھ دبکا ہوا تھا اور اس کے دوسرا ساتھی تیسرے کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ میں جھکا جھکا دوڑ کر شیشے کے دروازے تک پہنچا تو تیسرا مجھے سڑک پر اوندھے منہ پڑا نظر آیا اس کے پاؤں سے خون ابل رہا تھا اور ایاز اس کے سر پر کھڑا تھا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ صورتِ حال اب قابو میں ہے۔ میں واپس آیا اور زمین پر پڑے منیجر کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے کیبن کی طرف لایا۔ ''سنو مجھے کیمروں کی ٹیپ درکار ہیں۔''

''ٹیپ...... کیوں؟''

''بحث مت کرو۔'' میں نے غرا کر کہا۔

''ٹیپ تو وہ رقم والے بیگ میں ڈال کر لے گیا ہے۔'' منیجر نے میری غراہٹ سن کر جلدی سے جواب دیا۔ میں نے اس کے کیبن میں میز تلے رکھا اپنا بریف کیس اٹھایا اور منیجر سے کہا۔

''تیسرا پکڑا گیا ہے۔ باہر میرے ساتھی کے قابو میں ہے تمہاری رقم اور جان سب بچ گئی ہیں اب میں تم سے صرف ایک فیور چاہتا ہوں اس ساری کہانی میں میرا ذکر نہ آئے۔ ڈاکوؤں کے مارے جانے اور زخمی ہونے کو تم ان کے کسی چوتھے ساتھی کی کارروائی بھی قرار دے سکتے ہو اور سب سے بہتر تو یہ ہے کہ انجان بن جاؤ تمہیں کچھ نہیں معلوم۔''

''لیکن تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''میں بعض وجوہات کی بنا پر پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

ہم بینک سے باہر نکلے۔ ایاز نے تیسرے کو گولی مار کر زخمی کر دیا تھا اس نے یقیناً بینک میں ہونے والی کارروائی دیکھ لی تھی اور تب ہی مداخلت کی تھی۔ تیسرا بے ہوش ہو چکا تھا اور ان کا کوئی چوتھا ساتھی نہیں تھا۔ سڑک کے دوسری طرف ایک سفید کار کھڑی تھی یہ اسی میں آئے تھے۔ میں نے رقم والے بیگ سے کیمروں کی کیسٹس نکالیں اور منیجر سے کہا۔ ''اب تم جیسے چاہو اس معاملے کو ہینڈل کر سکتے ہو بس خیال رہے کہ ہمارا ذکر نہ آئے یا

آئے تو بہت کم آئے۔ تم سمجھ رہے ہونا میری بات؟''

''جی جناب۔'' اس نے تابعداری سے کہا۔

''یہ بھی یاد رکھنا جو لوگ تین مسلح ڈاکوؤں کو اتنی آسانی سے قابو کر سکتے ہیں ان کے لیے تمہارے گھر کا پتا چلانا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے دھمکانا مناسب سمجھا اور اس کے چہرے کا رہا سہا رنگ بھی اُڑ گیا تھا۔ میں اور ایاز جیپ میں بیٹھے اور فوری طور پر روانہ ہو گئے اگرچہ راولپنڈی پولیس کا دور دور تک پتا نہیں تھا لیکن اس کا بھروسہ بھی نہیں تھا کہ کب کہاں سے نکل آئے۔ ذرا دور نکل ہمیں اطمینان ہوا اور میں نے ایاز سے جیپ رکوا کر کیسٹس اس کے ٹائروں تلے رکھ دیں جب جیپ ان سے گزری تو ان حشر ہو گیا تھا اس کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے اور میں نے سرد آہ بھری۔

''کیا قسمت ہے اپنی جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی ہنگامہ منتظر ہوتا ہے۔ اب یہاں دشمن نہیں ملے تو ڈاکو مل گئے۔''

''یہ بینک والوں کے لیے اچھا ہوا جناب۔'' ایاز نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ان کی رقم لٹنے سے بچ گئی۔''

''لیکن ایک آدمی جان سے گیا اور دو زخمی ہو گئے۔ ایک لڑکی کو بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا جسے وہ شاید ساری عمر فراموش نہیں کر سکے گی۔''

''انسانوں کے ساتھ حادثات پیش آتے ہیں جناب اسی کا نام زندگی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب کہاں جانا ہے؟''

''جانا تو کسی دوسرے بینک ہے لیکن آج کے لیے ایک تجربہ کافی ہے اب کسی ایسی جگہ کا رخ کرو جہاں سے ہم بائیک لے سکیں۔''

ایاز ایک موٹر سائیکلوں کے ڈیلر سے واقف تھا وہ مجھے اسی کے پاس لے گیا۔ اس کے شوروم میں نئی اور پرانی ہر طرح کی ہلکی اور ہیوی بائیک موجود تھیں۔ تقریباً چالیس بیالیس برس کا اشرف بٹ ایاز کو دیکھ کر گرم جوشی سے اس کے گلے لگ گیا۔

''ایازے تُو کہاں مر گیا ہے؟''

''یہیں تھا یار۔'' اس نے جواب دیا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ شہباز صاحب ہیں آج کل ان کے لیے کام کر رہا ہوں۔''

''تُو اور نوکری؟'' اشرف بٹ حیران ہوا تھا۔

''نوکر نہیں میرا ساتھی ہے۔'' میں نے تردید کی۔

اشرف بٹ نے خاطر تواضع شروع کر دی پہلے کشمیری چائے اور کلچے آئے اور پھر اس نے سری پائے منگوانے چاہے لیکن میں نے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''جیسی مرضی سرکار اب حکم کرو۔''

''ایک اچھی اور طاقتور بائیک چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''نئی یا پرانی؟''

''پرانی بھی ہو تو انجن نئے جیسا ہونا چاہیے۔''

''میرے پاس ایک تھوڑی سی چلی یاماہاون سیونٹی فائیو آئی ہے۔ بہترین بائیک ہے آپ دیکھو۔ قیمت نئی سے تیس فیصد کم ہوگی۔''

''تُو بائیک دکھا قیمت پر بات کرلیں گے۔'' ایاز نے اسے ٹوکا تو وہ ہمیں شوروم میں ایک طرف لے آیا یہاں ساری طاقتور بائیک تھیں۔ اس نے سیاہ رنگ والی یاماہا دکھائی بالکل نئی لگ رہی تھی صرف تین مہینے چلی تھی۔ اشرف بٹ نے ستر مانگے تھے لیکن پھر پچاس میں سودا ہوگیا۔ ایاز نے پچاس سے زیادہ دینے سے انکار کردیا اور اشرف نے بھی ظاہر کیا کہ وہ دوستی میں مان گیا ہے۔ اس نے دو گھنٹے میں ایاز کے نام کے کاغذات بنا کردینے کا وعدہ کیا ایاز نے کہا۔ ''کاغذات کی جلدی نہیں ہے میں کل آکر لے جاؤں گا۔''

بائیک کے ساتھ اس کا اصل ہیلمٹ بھی تھا اس لیے میں بائیک پر نکل آیا ایاز جیپ چلا رہا تھا۔ تین بجے تک ہم اسٹیٹ ایجنٹس کے چکر میں رہے اور پھر ایک نے ایک چھوٹے بنگلے کے بارے میں بتایا جو فوراً مل بھی سکتا تھا۔ دوسرے اسٹیٹ ایجنٹس کے پاس بھی مکانات تھے لیکن وہ ابھی نہیں دکھا سکتے تھے۔ یہ پنڈی سے نکلتے ہی جی ٹی روڈ پر ایک نئی آبادی میں تھا اور اچھی بات تھی کہ تمام سہولیات کے ساتھ اس کے آس پاس کوئی مکان نہیں تھا۔ یعنی بہ وقت ضرورت ہم پرائیویسی بھی برقرار رکھ سکتے تھے۔ اس میں تین بیڈ روم تھے اور ایک ڈرائنگ روم تھا۔ کچن کے ساتھ ہی لاؤنج تھا جسے ڈائننگ روم بھی بنایا جا سکتا تھا۔

مکان خالی تھا البتہ پورے گھر میں سوائے لاؤنج کو چھوڑ کر وال ٹو وال کارپٹ تھے۔ مالک باہر تھا اور سال میں ایک چکر لگاتا تھا۔ مکان حال میں خالی ہوا تھا اور معمولی مرمت اور رنگ وروغن کی وجہ سے بالکل نیا لگ رہا تھا۔ ایڈوانس کوئی نہیں تھا البتہ کرایہ پورے سال کا ایڈوانس مانگ رہا تھا۔ یہ کوئی لاکھ روپے بنتا تھا۔ کسی قدر بحث کے بعد اسٹیٹ ایجنٹ چھ مہینے کے کرائے پر مان گیا لیکن ساتھ ہی اس نے خبردار کیا

''پانچویں مہینے آپ کو اگلے چھ مہینے کا کرایہ ایڈوانس دینا ہوگا۔''

''دیکھ لیں گے یار ابھی ہمیں یہاں آنے تو دو۔'' میں نے کہا۔ وہ ہمیں اپنی دکان پر لایا۔ معاہدے کی کارروائی کے بعد میں نے اسے پچاس ہزار روپے اور اس نے مجھے مکان کی چابیاں دیں۔ یہاں سے ہم ایک موبائل مارکیٹ گئے اور وہاں سے چند سادہ لیکن اچھی قسم کے موبائل لیے جن کی بیٹری کئی دن تک چلتی اس کے ساتھ ہی تمام کمپنیوں کی سمز لیں۔ پری پیڈ کارڈز لیے۔ گھر پہنچے تو پانچ بج رہے تھے۔ بھوک سے برا حال تھا اور یہ بھی امید نہیں تھی کہ گھر میں کچھ کھانے کو ملے گا اس لیے ایاز نے ایک جگہ سے روٹی اور سیخ بوٹی پیک کرالی تھی۔ سفیر اور وسیم ابھی تک نہیں آئے تھے لیکن مونا اور سادھنا کا ان سے رابطہ تھا۔ میں لاؤنج میں لیٹ گیا۔

ہمارے آنے کے بعد بھی مونا اور سادھنا اُن کے لیے ہی فکرمند تھیں۔

''ہاں بس تم ان کی ہی والی وارث ہو اس غریب سے کوئی تعلق نہیں بنتا کہ جھوٹے منہ ہی پوچھ لیا جاتا۔'' میں نے انہیں چھیڑا۔ ''اپنوں کو کال پہ کال اور ہمیں ایک مس کال بھی نہیں۔''

''بندہ کوئی اتا پتا دے کر جاتا ہے اور جو موبائل لے گئے تھے وہ بند جا رہا تھا۔'' مونا نے خفگی سے کہا اس کا مُنہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے موبائل نکالا تو وہ بند تھا اس کی بیٹری جواب دے گئی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق کھانے کو کچھ نہیں تھا انہوں نے پکانے کی زحمت نہیں کی تھی اور خود کل رات کے بچے ہوئے کھانے

سے کام چلایا تھا ہمارے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ باہر سے کھا کر آئیں گے۔ شکر ہے ایاز نے کھانے کے لیے بیخ بوٹی لے لی۔ جب تک مونا کھانا گرم کر کے لائی ہم نے موبائلز کا معائنہ کیا۔ میں نے تین موبائل اور پانچ سمز لی تھیں۔ ان چاروں کے پاس موبائل تھا۔ بیتو، ایاز اور میرے پاس نہیں تھا۔ بلکہ ایاز کے پاس بھی تھا لیکن وہ پرانا ہو گیا تھا۔ اس کے لیے بھی لے لیا تھا۔ میں نے ایک سم منتخب کی اور اپنے موبائل میں ڈال لی۔ ایک بیتو نے لے لی تھی۔ ایاز کے پاس اپنی سم تھی اس لیے باقی بہ وقتِ ضرورت کے لیے رکھ دی گئیں سب کے نمبر سب موبائلوں میں فیڈ کر دیئے تھے۔

مونا کھانا لائی تو ہم ٹوٹ پڑے۔ بیتو بھی رو رہا تھا کیونکہ کل کا بچا ہوا اتنا نہیں تھا کہ اس کا پیٹ بھر جاتا اس لیے وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہاں کوئی ملازم نہیں تھا اس لیے مونا اور سادھنا ہی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔ مونا ایک مڈل کلاس خاتون تھی لیکن مجھے سادھنا کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی اس نے زندگی میں شاید ہل کر پانی بھی بہت کم پیا ہو گا لیکن اس وقت وہ ایک مکمل گھر گرہستن کا روپ دھار چکی تھی۔ کھانے کے دوران میں ایاز کو اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے ابھی بینک میں ہونے والی واردات کا ذکر نہیں کیا تھا میرا ارادہ تھا کہ سفیر اور وسیم بھی آ جائیں اس لیے سب کو ایک ساتھ ہی بتا دوں لیکن کھانے کے بعد کچن کے سینک میں ہاتھ دھو رہا تھا کہ مونا نے میری پشت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ تمہاری جیکٹ کو کیا ہوا ہے؟''

مجھے نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے اتار کر دیکھا۔ ایک جگہ سے جیکٹ ادھڑ گئی تھی اور اس کی اندر کی روئی نظر آ رہی تھی۔ شاید گولی چھوتی ہوئی گزری تھی یا ستون سے ٹوٹ کر کوئی ٹکڑا لگا تھا۔ اس وقت مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ مجبوراً مجھے مونا کو بتانا پڑا بینک میں واردات کا سن کر وہ چلائی۔ ''کیا؟ تمہارے ساتھ اتنا بڑا حادثہ گزر گیا اور تم نے بتایا بھی نہیں۔''

''آہستہ بی بی...... اتنا بڑا نہیں تھا دیکھو میں زندہ سلامت ہوں بالکل بھی فوت نہیں ہوا۔''

''ہاں ہم عورتوں کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے طنز کیا اسے موقع مل گیا تھا۔ ''ہماری اوقات ہی کیا ہے؟''

''تم ہی لوگوں کی تو اوقات ہے۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔ ''اچھے بھلے آدمی کی اوقات ایک منٹ دو کوڑی کی کر دیتی ہو۔''

ظاہر ہے اس بچ کو سن کر مونا مزید خفا ہو گئی تھی اور مجھے اس کو منانا پڑا۔ کان پکڑ کر اور ہاتھ جوڑ کر۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سین کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن بیتو دروازے کے پاس موجود تھا وہ ہنسا تو میں جھینپ گیا اور جلدی سے کان چھوڑ دیئے۔ بیتو اندر آ گیا۔ ''شوبی بھائی کیا اپنا کان چیک کر رہا تھا۔''

میں بھنا گیا تھا۔ ''ہاں منے دیکھ رہا تھا میرے سر کے ساتھ لگے ہیں کہیں گر تو نہیں گئے۔''

مونا خوش تھی اس لیے اس نے بیتو کو ڈانٹا۔ ''شرم نہیں آتی تم سے اتنے بڑے ہیں۔''

''پہلے آتی تھی پر اب نہیں آتی...... یہ ہمارا بڑا بھائی ہے۔''

''تم بھی اتنے منے نہیں رہے ہو ابھی ان سب کو کامی کے بارے میں بتایا نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو بیتو

نے فرار میں عافیت سمجھی۔ مونا نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہ کامی کون ہے؟''

''ایک چینی لڑکی ہے جو ہمیں راستے میں ملی تھی۔ کامی اور بیتو ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے تھے۔''

''واقعی۔'' مونا نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تو بچہ ہی لگتا ہے۔''

''بچہ نہیں ہے بی بی اور اتنی محنت کا کچھ تو صلہ دو۔'' میں نے فریاد کی تو مونا مسکرائی وہ سمجھ گئی۔

''جی ابھی کافی لاتی ہوں۔''

جب میں اور ایاز کافی پی رہے تھے تو سفیر اور وسیم آگئے۔ سفیر نے کافی دیکھ کر شور مچایا۔ ''دیکھا یہ مزے ہو رہے ہیں اور ایک ہم ہیں دھکے کھا کر آرہے ہیں۔''

''جس کا جو نصیب ہو اسے وہی ملتا ہے۔'' میں نے حقیقت پسندانہ انداز میں کہا تو سفیر نے مجھ سے مگ چھین لیا۔

''ایسی کم تیسی۔''

میں نے مونا سے کہا۔ ''تمہارا مجازی خدا سخت بدتمیز ہوگیا ہے اسے کچھ سکھایا نہیں ہے۔''

''نہیں یہ مجھے ایسے ہی ملے ہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی۔ ''کچھ سکھانے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔''

وسیم ایک طرف پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔ ''اس طرح مکان تلاش کرنا اور گاڑی خریدنا بڑا مشکل کام ہے۔''

''کام کام ہوتا ہے چاہے مشکل ہو یا آسان۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ کام ہوا یا نہیں؟''

''کام کیسے نہیں ہوتا جناب۔'' وسیم نے جواب دیا۔ ''میں ڈائی ہاٹسو کا سفاری ماڈل لایا ہوں۔ صرف پانچ سال پرانی ہے اور ساڑھے تین میں مل گئی۔''

''میں کیا لایا ہوں یہ دیکھنے کے لیے آپ سب کو باہر چلنا ہوگا۔'' سفیر نے کہا اور ہمیں باہر لے آیا۔ سردی یں شام جلدی ہو جاتی ہے اور اس وقت تو رات ہو چکی تھی حالانکہ ساڑھے چھ بجے تھے۔ سفیر منی پجارو لایا تھا۔ یہ ھی دو سال چلی ہوئی تھی اور اچھی کنڈیشن میں تھی۔ سفیر نے بتایا کہ اس میں الٹریشن کی گئی تھی اور اس کا پرانا انجن کال کر اس میں گیارہ سو سی سی کا دوسرا انجن لگایا گیا تھا جس کے بعد اس کی رفتار کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ یہ اسے تین کھ بیس ہزار کی پڑی تھی۔ دوسرے اس نے مری ہائی وے پر ایک عمارت میں تین کمروں کا فلیٹ کرائے پر لیا تھا ں نے بھی چھ مہینے کا ایڈوانس کرایہ دیا تھا۔ بیتو نے بائیک میں زیادہ دلچسپی لی اس نے مطالبہ کیا کہ بائیک اس ے حوالے کر دی جائے لیکن وہ چہرے اور جسم سے کم عمر نظر آتا تھا اس لیے جب تک اس کا شناختی کارڈ نہ بن جاتا ں کے لیے بائیک چلانا خطرناک تھا۔ شناختی کارڈ بن جاتا تو ڈرائیونگ لائسنس مسئلہ نہیں تھا۔ بیتو کے شناختی رڈ کے لیے سفیر نے اپنے ایک دوست سے بات کرنے کو کہا تھا جو پہلے اس کے ساتھ وزارت خارجہ میں کام تا تھا پھر داخلہ میں چلا گیا۔ وہ بیتو کا شناختی کارڈ بنوا سکتا تھا۔

اب ہمارے پاس ایاز کی جیپ سمیت چار گاڑیاں اور ایک بائیک تھی۔ وسیم اسلحہ بھی لے آیا تھا جو جیپ پچھلے حصے میں لکڑی کے بکسوں میں موجود تھا۔ یہ دو بکس تھے جو خاصے وزنی تھے۔ ہم پانچ مل کر بمشکل ان کو

اندر لائے تھے۔ وسیم بار بار احتیاط کرنے کو کہہ رہا تھا کیونکہ اس میں دھماکہ خیز اشیا بھی تھیں۔ انہیں لاؤنج میں لائے۔ وسیم نے پہلے ایک بکس کھولا۔ اس میں ہر قسم کا آتشیں اسلحہ تھا۔ اعشاریہ اڑتیس کے پستول تھے۔ سیمی آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔ فل آٹو میٹک مشین گن اور دو طرح کی اسنائپر رائفل تھیں ایک سنگل موڈ پر کام کرتی تھی اور دوسری سنگل موڈ کے ساتھ برسٹ موڈ پر بھی کام کرتی تھی۔ ان کے علاوہ شاٹ گن تھیں۔ ہر طرح کے ہتھیار کے ساتھ اس کا ایمونیشن بھی تھا اور یہ سارا جدید ترین اسلحہ تھا۔ جو جرمنی اور چیکوسلواکیہ کا بنا ہوا تھا۔ یہ سب بہت مہنگا تھا میرے اندازے کے مطابق جرمن ساختہ رائفل اور مشین گن کی قیمت دس لاکھ روپے تو تھی۔ میں نے وسیم سے پوچھا۔

''یہ سب بہت مہنگا ہے کہاں سے لیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''کہیں سے نہیں لیا...... یہ کئی سال سے میرے پاس موجود تھا اور میں نے اسے کسی آڑے وقت کے لیے زمین میں دبا رکھا تھا آج نکال لیا۔''

''پھر بھی کہیں سے تو لیا ہوگا۔'' سفیر نے پوچھا۔ ''آسمان سے تو نہیں ٹپکا ہوگا یہ اسلحہ؟''

''افغان جنگ کے زمانے میں ایک اسمگلر سے جان پہچان ہوئی تھی ایک بار اس نے امانتاً رکھوایا تھا لیکن اس کے چند دن بعد خود مارا گیا تھا۔ اس اسلحے کا کوئی دعوے دار نہیں تھا اس لیے یہ میری ملکیت بن گیا۔''

سفیر نے ہتھیاروں کا معائنہ کیا۔ ''اس سارے اسلحے کی مالیت کم سے کم ایک کروڑ روپے ہوگی۔''

وسیم نے سر ہلایا۔ ''شاید اس سے بھی زیادہ لیکن یہ سب مل کر ہم میں سے کسی کی ایک انگلی جتنی قیمت بھی نہیں رکھتے ہیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے ہم سب اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔'' مونا بولی اس بار وہ سب کے لیے کافی بنا لائی تھی۔ یہاں جو چائے کی پتی تھی وہ کسی کو پسند نہیں آئی تھی اس لیے چائے کے شوقین بھی کافی پینے پر مجبور ہو رہے تھے۔ آج کھانا بنانے کی باری مونا کی تھی اور اس نے کل والا اہتمام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں شوربے والا چکن بنا رہی ہوں جس نے کھانا ہے کھائے ورنہ باہر ہوٹل بہت کھلے ہیں۔''

''ہم ہوٹل جائے گا۔'' بیتو نے اعلان کیا۔

''کوئی باہر نہیں جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''گھر میں جو پکا ہے وہ صبر شکر کر کے کھانا ہوگا۔''

''یہ ظلم ہے شوبی بھائی۔'' بیتو نے احتجاج کیا۔ ''جب دشمن کا قید میں ہو تو اس کا مرضی کا کھاؤ اور جب ادھر آؤ تو دیدی کی مرضی کا کھاؤ۔''

''کل تمہاری مرضی کا پک گیا تھا۔'' مونا نے اسے یاد دلایا۔ ''اس لیے آج ہماری مرضی کا کھاؤ۔''

شام کو دیر سے اور شدید بھوک میں کھایا تھا اور پھر بیتو بھی شامل ہو گیا تھا اس لیے سب کا بس پیٹ ہی بھرا تھا جو چند گھنٹوں میں دوبارہ خالی ہو گیا تھا۔ سفیر پاس سے جا کر روغنی نان لے آیا اور سب نے سالن سے کھانا جو مونا نے مزے کا بنایا تھا لیکن بیتو اور وسیم کے ساتھ ایاز نے بھی مشکل سے کھایا تھا وہ سب بھنا گوشت کھانے کے شوقین تھے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر سب لاؤنج میں بیٹھے اور پھر سفیر تھکن کا کہہ کر اٹھ گیا جاتے جاتے وہ مونا کو بھی اشارہ کر گیا تھا لیکن وہ بیٹھی رہی۔ سادھنا اور بیتو اسٹار پلس پر ''ساس بھی کبھی بہو تھی'' دیکھ رہے تھے۔ میں

نے مونا سے کہا۔

''تم تھک گئی ہو جا کر آرام کرو۔''

''نہیں ابھی تم سب کو چائے کافی بنا کر دینی ہے۔''

''چائے کافی اتنی ضروری نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''اگر طلب ہوگی تو ہم بھی بنا سکتے ہیں۔''

مونا اٹھی اور اوپر چلی گئی۔ ایاز اگرچہ اب ہمارا ساتھی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مونا اور سادھنا کی موجودگی میں خاموش رہتا تھا اور بولنے سے گریز کرتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یہ جھجک ختم ہو جائے گی۔ وسیم مجھ سے ذرا دور تکیے سے ٹکا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

''شہباز صاحب کرنے والے سارے کام کر لیے اب ہمارے پاس ٹھکانے بھی ہیں اور اسلحہ بھی۔ اب کیا کرنا ہے۔''

میرے ذہن میں تھا کہ ہمیں سب سے پہلے بینک میں موجود لاکر کی چیزیں حاصل کرنی تھیں جن میں سب سے اہم وہ بریف کیس تھا جو چین کی حکومت کا تھا۔ مجھے یہ امانت بہت صورت ان کو واپس کرنی تھی۔ لاکر کے بارے میں فتح خان مجھے بتا چکا تھا لیکن اس لاکر تک رسائی کس طرح حاصل کرنی تھی یہ بات صرف شہلا جانتی تھی اس کے لیے اس کے پاس ایک مکمل پلان تھا۔ اس کی وہ تصاویر جن کے بل بوتے پر پہلے پروفیسر نفیس اور پھر فتح خان اسے بلیک میل کرتے رہے تھے ان کے نیگٹیوز بھی ممکنہ طور پر اسی لاکر میں تھے۔ دونیا سے فتح خان نے صرف تصاویر حاصل کی تھیں۔ اصل چیز ان تصویروں کے نیگٹیوز تھے۔ اگر میں نے شہلا کو دھمکی نہ دی ہوتی تو وہ اب تک لاکر پر چھاپہ مار چکی ہوتی۔ وہ صرف اس خوف سے رکی ہوئی تھی کہ فتح خان میرے قبضے میں تھا تو اس کی تصویریں بھی میرے قبضے میں ہوں گی۔ بہرحال یہ بات پرانی ہو چکی تھی اور اب یقیناً شہلا سے فتح خان نے رابطہ کر لیا ہوگا۔ تاکہ اسے دوبارہ سے بلیک میل کر سکے بشرطیکہ اسے مرشد علی نے چھوڑ دیا ہو۔ مرشد اس کے لیے جس طرح سے بے تاب ہوا تھا مجھے امید نہیں تھی اس نے فتح خان کو چھوڑا ہوگا۔ مگر دیکھا جائے تو فتح خان کم نہیں تھا۔ کم سے کم چالاکی اور عیاری میں مرشد کسی طرح اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے وسیم کو شہلا کے بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''عبداللہ کا آدمی اس کی نگرانی کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ پرانی بات ہے ابھی کیا ہو رہا ہے مجھے اس بارے میں پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔''

''آپ عبداللہ سے معلوم کر سکتے۔'' وسیم نے کہا میں نے سفیر والا موبائل نکالا وہ ابھی میرے پاس تھا۔ اس سے میں نے عبداللہ کو کال کی۔

''عبداللہ میں بات کر رہا ہوں۔''

''کیا حال ہیں جناب۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں ابھی آپ سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا۔''

''خیریت؟''

''جی سب خیریت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''عتیق کو آج چیک اپ کے لیے اسپتال لے جایا گیا تھا اور پھر وہیں سے وہ اپنی حویلی چلا گیا۔ رفیق بھائی ساتھ تھے میں نے چھ افراد ان کے ساتھ کر دیئے تھے۔ وہ بحفاظت

حویلی پہنچ گئے ہیں۔''

''یہ تم نے اچھا کیا عبداللہ۔'' میں نے عتیق کے ٹھیک ہونے اور حویلی پہنچ جانے کا سن کر سکون کا سانس لیا تھا۔

''راجا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم میرا یہ نمبر ان کو دے دو۔''

''نہیں وہاں موبائل سروس کام نہیں کرتی ہے اور لینڈ لائن خراب ہے آپ کو سیٹلائیٹ فون سے بات کرنا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کب تمہارے پاس آسکوں گا۔''

''اگر آپ نہیں آسکتے تو میں آجاتا ہوں آپ کے پاس۔''

''یہاں انٹرنیٹ کی سہولت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا میں کچھ کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا آدمی اب شہلا کی کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے؟''

''نہیں جناب جب عتیق والا مسئلہ ہوا تو میں نے اسے بلا لیا تھا اس کے بعد دوبارہ نہیں بھیجا آپ کہیں تو پھر سے نگرانی پر لگا دوں۔''

''بالکل اسے کل ہی وہاں بھیج دو اور اس سے کہو کہ پل پل کی رپورٹ دے۔''

کچھ دیر عبداللہ سے بات کر کے میں نے کال کاٹی اور پھر رفیق بھائی کی حویلی کا نمبر ملایا کیونکہ آپا کے موبائل کا نمبر یاد نہیں تھا۔ کسی نوکر نے کال ریسیو کی اور کچھ دیر بعد شمی لائن پر تھی اس کی پھولی سانس بتا رہی تھی کہ وہ دوڑتی ہوئی آئی ہے۔ ''اللہ...... شیبی آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔''

''عتیق کی واپسی مبارک ہو اب خوش ہے نا میری گڑیا۔''

''جی۔'' وہ شرما کر بولی۔ ''آپ کو بھی مبارک ہو۔ کل نانا اور نانی جان کا فون آیا تھا وہ کہہ رہے تھے اب ہم واپس آجائیں۔''

''نہیں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی تم کچھ دن یہاں رکو اور جب میں کہوں تب حویلی جانا۔''

''جی اچھا۔'' وہ خوش ہوگئی شاید وہ بھی کچھ دن یہاں رکنا چاہ رہی تھی۔ کچھ دیر میں آپا بھی آگئی تھیں۔ ان سے بات کرنے کے بعد میں نے وسیم سے کہا۔

''راجا عمر دراز مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''عبداللہ نے کوئی وجہ بتائی ہے۔''

''نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ شاید مجھ سے اپنے معاملے میں بات کرے گا۔''

''اس کا واحد معاملہ جس میں اسے آپ کی مدد درکار ہے وہ پُراسرار وادی والا ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''ابھی جب ہم انڈیا میں تھے اور راجا پُراسرار طور پر غائب ہوگیا تھا وہ اصل میں وادی کی طرف گیا تھا اور اس کا ٹکراؤ ڈیوڈ شا کی پارٹی سے ہوا تھا۔ وہ بھی وادی کے چکر میں تھا لیکن دونوں ناکام رہے اور مرتے مرتے

بچے تھے۔ برف والے نے ان کو بچالیا تھا لیکن وادی میں اترنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ہاتھ والے کو لاؤ تو نیچے جانے دوں گا۔ ڈیوڈ شا اور راجا عمر دراز دونوں ہاتھ والے سے مراد مجھے لیتے ہیں۔''

''اور آپ کا کیا خیال ہے؟''

''اگر میں اس کا مفروضہ ہاتھ والا ہوں تب بھی مجھے اس وادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ ڈیوڈ شا نے اس بار ایک نئی بات کی اس نے مجھ سے معاہدہ کیا کہ اگر میں وادی تک اس کے ساتھ چلوں تو وہ مجھے مرشد سے محفوظ رکھے گا یعنی مرشد مجھے نہیں چھیڑے گا۔''

''اگر ڈیوڈ شا پاگل کتے کے بارے میں یہ ضمانت دے میں مان بھی سکتا ہوں۔'' وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مرشد کے معاملے میں بالکل نہیں مان سکتا۔''

''یہی خیال میرا بھی ہے اور مرشد نے فوراً اسے درست بھی ثابت کر دیا۔ اب میں ڈیوڈ شا سے کیے زبانی معاہدے کا پابند نہیں رہا ہوں جو اس نے میرے ہاتھ میں قرآن کریم دے کر کیا۔''

''آپ نے قرآن پر معاہدہ کر لیا۔'' وسیم چونکا۔

''مجبوری تھی یار دوسری صورت میں وہ مجھے مرشد کے حوالے کر دیتا اور مرشد اس وقت میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے وہ مجھے کسی صورت نہیں چھوڑے گا۔''

''کیا ڈیوڈ شا کو علم ہو گیا ہو گا کہ اس کے آدمی نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آپ کو مرشد کے حوالے کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''میرا خیال ہے اسے کچھ اور ہی بتایا گیا ہوگا۔ مارشل نے خود کو بھی بچانا ہے اور مرشد بھی بہرحال ڈیوڈ شا سے دبتا ہے۔''

''کیا آپ ڈیوڈ شا سے رابطہ نہیں کر سکتے ہیں؟''

''میرے پاس اس کا کوئی نمبر نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور نہ ہی مجھے اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے اگر اس نے کسی طریقے سے خود رابطہ کیا تو دیکھا جائے گا۔''

''راجا عمر دراز سے رابطے کی کیا صورت ہوگی؟''

''اس کے لیے شاید مجھے عبداللہ والی کوٹھی پر جانا پڑے گا کیونکہ انٹرنیٹ کی مدد سے کام کرنے والا سیٹلائیٹ فون اور اس کا کمپیوٹر وہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ اتنا ضروری کام نہیں ہے اسے کسی وقت فرصت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ابھی مسئلہ ہے شہلا کا۔''

''اسے اٹھا لے آتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''اس خالی مکان میں رکھیں گے جو آپ نے لیا ہے۔''

''ہاں میں نے بھی یہی سوچ کر لیا ہے اگر کسی کو بند رکھنے کی ضرورت پیش آئی تو یہ مکان بہت موزوں ہے اور اگر بعد میں دشمن کی نظر میں بھی آ گیا تو ہماری بلا سے۔''

بیتو حسبِ معمول لاؤنج میں سو گیا تھا آج سادھنا نے اس پر کمبل لا کر ڈال دیا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ بیٹھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سادھنا تم خوش ہو؟''

''بہت زیادہ۔'' اس نے کہا۔ ''میں ان چند مہینوں میں تمام تر مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود جتنا

خوش رہی ہوں میں الفاظ میں نہیں بتا سکتی اور انہوں نے بتایا نہیں کہ میرا نام اب سادھنا نہیں سعدیہ ہے۔''

''نہیں یہ تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' میں نے وسیم کو گھورا۔

''میں سمجھا کہ کسی اور نے بتا دیا ہوگا'' اس نے خفت سے کہا۔

''سب یہی سمجھ رہے ہوں گے لیکن اصل میں تو تمہیں خود بتانا چاہیے تھا۔'' میں نے سعدیہ سے کہا۔'' مجھے بہت اچھا لگا ہے یہ نام، تمہیں اب بھی سادی کہہ سکتے ہیں۔''

''حالانکہ یہ اتنی سادی نہیں ہے۔'' وسیم معنی خیز انداز میں بولا۔''بہت عقل آ گئی ہے۔''

''جی نہیں میں بدھو ہی ٹھیک ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا

''سادی تمہیں اپنے گھر والے یاد نہیں آتے۔''

''وہ میرے گھر والے کہاں تھے۔'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔''اگر میرے گھر والے ہوتے تو مجھے یوں اپنے مفاد پر قربان کر دیتے۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے میرا گھر اب یہ ہے اور میرا خاندان آپ سب ہیں۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی رہے گا۔ جب ہمیں سکون سے زندگی گزارنے کا موقع ملا تو ہمارا خاندان یہی ہوگا۔ تم، وسیم، بیتو، سفیر، مونا، میں اور......'' میں بولتے بولتے رک گیا۔

''اور کیا جناب؟'' سعدیہ نے پوچھا۔

''اور ہے ایک۔'' میں نے گہری سانس لی۔''کبھی وہ میری تھی لیکن پھر میرے بھائی کا مقدر بن گئی اور اب بھائی کے بعد مجھے مل گئی ہے لیکن ان ہنگاموں سے فرصت ملے تو میں اس کے بارے میں سوچوں۔''

''آپ سویرا کی بات کر رہے ہیں نا۔'' سعدیہ شرارت سے بولی۔''میں ان کے بارے میں سب جانتی ہوں۔''

''ظاہر ہے اب تم کوئی غیر متعلق تو ہو نہیں جو بے خبر رہو۔'' میں نے کہا۔''تمہارا ہم پر مکمل حق ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے بال پیچھے کیے۔

''کیا خیال ہے؟'' میں نے ذرا شرارت سے کہا۔''اب تم دونوں کی رخصتی بھی نہ کر دی جائے۔''

سعدیہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور جاتے ہوئے بولی۔''یہ مجھے نہیں معلوم اور مجھ سے مت پوچھیں۔''

میں نے ہنستے ہوئے وسیم کی طرف دیکھا تو اس نے بھی جلدی سے کہا۔''مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک مشرقی لڑکا ہوں آپ جب چاہیں میری رخصتی کر سکتے ہیں۔''

''اتنی جلدی اور آسانی سے نہیں ہوگی برخوردار۔'' میں نے کہا۔''ویسے میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے؟''

''کون سی بات جناب؟''

''دیکھو یار ہمارا دشمن کمینہ اور گھٹیا شخص ہے جس سے کسی قسم کے ظرف کی توقع فضول ہے۔ ایسے دشمن سے لڑائی میں عورتوں کو ساتھ رکھنا رسک والی بات ہے خدانخواستہ وہ دشمن کے ہاتھ آ جائیں تو وہ ان پر کوئی ناقابلِ برداشت ظلم کر سکتا ہے یا ان کو ہماری کمزوری بنا سکتا ہے۔''

''سچی بات ہے جب سے ہم پاکستان آئے ہیں۔ اس پر تو میں بھی غور کر رہا ہوں۔'' وسیم نے کہا۔''ہمیں

ان کو کسی ایسی جگہ چھوڑنا ہوگا جہاں یہ محفوظ رہ سکیں۔''

''ایسی کئی جگہیں ہوسکتی ہیں۔'' میں نے غور کیا۔ ''میری حویلی ہے، سفیر کا خاندان بھی بہت بڑا اور مضبوط ہے۔ ہم ان کو کسی اور شہر میں بھی رکھ سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ ہمیں چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں ہوں گی۔''

''یہی بات ہے جناب۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''دو دن پہلے میں نے سادی سے اس موضوع پر بات کی تو اس نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا اور بڑی مشکل سے چپ ہوئی تھی اس نے کہیں اور رہنے سے صاف انکار کر دیا۔''

''یہی انکار مونا بھی کر چکی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اب ان کو کیسے مجبور کیا جائے۔''

''ایک طریقہ اور بھی ہوسکتا ہے ہم اس کوٹھی میں اچھے سیکورٹی گارڈ رکھ سکتے ہیں۔''

''اس سے ہم بلا وجہ نظر میں آئیں گے اور ہمارا مسئلہ سیکورٹی نہیں ہے وہ تو ہم بہت بہتر کر سکتے ہیں مسئلہ دشمن کی نظر سے بچنے کا ہے۔ دیکھو پولیس میرے پیچھے ہے۔ بیتو اور سعدیہ یہاں غیر قانونی آئے ہیں اگرچہ سعدیہ کا شناختی کارڈ بن چکا ہے لیکن اگر اس بارے میں چھان بین کی گئی تو حقیقت سامنے آ سکتی ہے۔ دشمن اس چیز کا بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

''تب اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔''

''ایک حل ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر مونا اور سعدیہ کو عبداللہ والی کوٹھی میں چھوڑ دیا جائے تو ہم بڑی حد تک ان کی طرف سے بےفکر ہو سکتے ہیں۔''

''وہ مان جائیں گی؟''

''ہاں کیونکہ انہیں ایک جگہ رہنا ہے اور ہم ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اگر وہ وہاں رہنے پر آمادہ ہو جائیں تو ہم ان کی حفاظت کی طرف سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کر سکتے ہیں اور جب چاہیں حالات دیکھ کر ان سے مل بھی سکتے ہیں۔''

وسیم نے غور کیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں دشمن کے خلاف مستقل حرکت میں رہنا پڑتا ہے اور اس کا امکان ہوتا ہے کہ ہم اس کی نظر میں آ جائیں۔ ایسے کسی موقع پر ہم ان کی وجہ سے بےبس بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کا دور رہنا ہی مناسب ہوگا۔''

''بالکل اور جب موقع ملے گا ہم ان سے جا کر مل سکتے ہیں۔ ہمارا دشمن سے ٹکراؤ ہمیشہ اتفاق سے ہوتا ہے یا جب ہم اس کے خلاف کارروائی کرتے ہیں۔ اس کا امکان کم ہے کہ دشمن ہمارا سراغ لگانے کے بعد جاسوسی کی زحمت کرے اور اس جگہ کا پتا چلا لے جہاں مونا اور سعدیہ ہوں۔''

''میں سعدیہ سے بات کرتا ہوں۔'' وسیم بولا۔

''مونا کو سفیر راضی کرے گا اور جب تم لوگ فیصلے کے لیے مجھ سے رجوع کرو گے تو میں تمہاری تائید کروں گا۔''

اسی لمحے غیر متوقع طور پر سفیر بھی آ گیا۔ وسیم نے پوچھا۔ ''تم سوئے نہیں؟''

''نہیں یار اصل میں تو میں مونا کی وجہ سے چلا گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سو جائے تو میں تم سے بات

کروں۔''

بے ساختہ میں نے وسیم کی طرف دیکھا پھر وسیم نے پوچھا۔''کیا بات کرنا چاہتے ہو؟''

سفیر نے سگریٹ سلگائی اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔''یار اس جنگ میں عورتوں کا ہونا ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے بلکہ کرتا رہا ہے۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جب میں اور مونا مرشد کی قید میں تھے اور مجھے ہر لمحے اس کی عزت و آبرو کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ مرشد کے سارے آدمی شیطان تھے۔ میں کسی صورت وہ دن دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''اتفاق سے ہم اسی موضوع پر بات کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

سفیر چونکا۔''کیا بات کر رہے ہو؟''

''میرا اور وسیم کا خیال ہے کہ مونا اور سعدیہ کو عبداللہ والی کوٹھی میں منتقل کر دیا جائے۔ وہ جگہ محفوظ ہے۔ وہاں سیکورٹی کا مکمل سسٹم ہے اور پھر عبداللہ کے تربیت یافتہ گارڈز بھی موجود ہوتے ہیں۔''

''وہ وہاں محفوظ رہیں گی اور ہم ان کی طرف سے بے فکر ہو کر مرشد کے خلاف کارروائی کر سکتے ہیں۔ اگر دشمن کسی طرح ہم پر قابو بھی پالے تب بھی وہ عورتوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔''

''اچھا پلان ہے میں اس کی منظوری دیتا ہوں۔'' سفیر بولا۔

''بھائی تیری منظوری کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے تُو تو خود کسی کے اشارہ ابرو کا منتظر رہتا ہے۔'' میں ہنسا۔

''لیکن فیصلہ کرنا ہے اور جلدی کرنا ہے کیونکہ اس کے بعد بینک والا معاملہ دیکھنا ہے۔''

''بینک والا معاملہ کیا ہے؟'' سفیر نے پوچھا اور میں نے اسے بینک لاکر کے بارے میں بتایا جس میں مرحوم پروفیسر کا بلیک میلنگ اسٹف تھا اور اس تک رسائی کا راستہ شہلا کے پاس تھا۔

''ہمیں بہر صورت اس لاکر تک پہنچنا ہے اور اس سے وہ بریف کیس حاصل کرنا ہے لیکن یہ سب کرنے سے پہلے خواتین کو عبداللہ والی کوٹھی میں پہنچانا ہے۔''

''میری طرف سے تو معذرت ہے۔'' سفیر نے صاف انکار کر دیا۔''وہ بالکل نہیں مانے گی۔ اس سے صرف شہباز بات کر سکتا ہے۔''

''میں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔''نہیں یار جب سے اسے ڈانٹا ہے تب سے اس کا موڈ خراب ہے اور شوہر تُو ہے۔''

''شوہر ہی تو ہوں۔'' سفیر نے سرد آہ بھری۔''یہ وسیم خوش قسمت ہے ابھی تک صرف زبانی شوہر بنا ہے۔''

وسیم جھینپ گیا پھر مسکرا کر بولا۔''سلوک وہ مجھ سے تقریباً بیوی والا ہی کرتی ہے۔''

کسی قدر بحث کے بعد طے پایا کہ میں صبح ناشتے کی میز پر بات کروں گا اور وہ سب میری تائید کریں گے۔ میں بھنا گیا تھا۔''تم دونوں نے شادیاں کس لیے کی تھیں؟''

''زن مرید بننے کے لیے۔'' سفیر نے دانت نکالے۔''اور ہم بن چکے ہیں لیکن تُو فی الحال مردِ آزاد ہے اس لیے تُو بات کر سکتا ہے۔''

باتیں کرتے کرتے ہم تینوں کو نیند نے جھونکے دینا شروع کر دیئے۔ سفیر واپس اوپر چلا گیا اور وسیم نے

بھی اپنے کمرے کا رخ کیا تھا میں وہیں کمبل لے کر پڑ گیا۔ صبح حسبِ معمول مونا نے اٹھایا تھا۔ اس نے پردے ہٹائے تو پیلی دھوپ لاؤنج میں گھس آئی تھی۔ بیتو سو رہا تھا اور شاید باقی سب بھی سو رہے تھے۔ میں نے کمبل سے سر نکالا۔ ''گڈ مارننگ۔''

''گڈ مارننگ۔'' مونا بولی۔ ''رات کیسی نیند آئی دیر سے سوئے تھا نا تم سب؟''

میں اٹھ بیٹھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

وہ ہنسی۔ ''رات یہ مجھے سونا ہے کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئے تھے اور کوئی ایک گھنٹے بعد آئے تھے۔''

''بڑا اسٹیمنا ہے تمہارا صرف شوہر کی گھر کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے تم اتنی دیر جاگتی رہیں۔'' میں نے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

''نہیں مجھے بھی نیند نہیں آئی تھی۔''

''مونا یہاں آؤ۔'' میں نے سامنے اشارہ کیا۔ ''مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''کہو۔''

''مجھے امید ہے تم میری بات کھلے ذہن سے اور جذباتی ہوئے بغیر سنو گی۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''مونا کل رات ہم نے سوچا ہے کہ تمہیں اور سعدیہ کو کسی محفوظ جگہ رکھیں کیونکہ ہمارے ساتھ خطرات مستقل ہوتے ہیں۔''

''ہم کہیں نہیں جائیں گے۔'' حسبِ توقع اس نے فوراً انکار کر دیا۔

''پہلے میری بات تو سن لو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''یاد ہے جب تمہیں اور سفیر کو مرشد کے آدمی لے گئے تھے اور مجھے پتا چلا تھا کہ تم ان کی قید میں ہو تو مجھ پر کیا گزری تھی۔ مرشد نے مجھے تمہارے حوالے سے کیسی اور کتنی شرمناک دھمکیاں دی تھیں۔''

اس بار وہ ہچکچائی۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

''مونا وہ وقت دوبارہ آئے میں اس کا سوچ کر ہی لرز جاتا ہوں۔ سفیر کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے اس نے تو تمہارے ساتھ رہ کر دیکھا اور سہا ہے۔''

''تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ ہمارے کہیں اور رہنے سے خطرہ ٹل جائے گا؟'' مونا نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

''نہیں ٹلے گا تو نہیں لیکن اس کی شدت کم ہو جائے گی اور سب سے بڑھ کر ہم صرف تم لوگوں کا سوچ کر دشمن کے خلاف ہاتھ ہلکا نہیں رکھیں گے۔''

مونا کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی پھر تلخ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے تم سب فیصلہ کر چکے ہو پھر مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے بس یہ بتا دو کہ ہمیں کہاں بھیجا جا رہا ہے۔ دبئی یا دنیا کے کسی اور ملک میں؟''

''تمہیں کسی ملک یا شہر بھیجنے کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی صرف تجویز ہے اور سب کچھ تم دونوں کی منظوری سے مشروط ہے لیکن میں تم سے توقع کرتا ہوں کہ تم ہماری بات بھی کھلے ذہن سے سنو گی۔''

''ہمارے پاس ذہن ہے ہی نہیں اپنوں کے لیے صرف دل ہے اور اس میں صرف جذبات ہیں۔'' مونا نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ''اگر تم لوگوں نے ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہے تو بہتر ہے اس میں ہمیں شامل مت کرو۔''

''مونا......میری بات سنو۔'' میں نے کہا لیکن وہ چلی گئی۔

''مشکل ہے شوبی بھائی۔'' بیتو نے کمبل میں سے کہا۔ ''یہ نہیں مانے گا۔''

''ان کو احساس ہونا چاہیے۔'' میرے لہجے میں برہمی تھی۔

''ڈیڈی نے بتا تو دیا وہ دماغ سے سوچتا نہیں ہے دل سے سوچتا ہے۔''

''یہ اچھا طریقہ ہے ناپسندیدہ فیصلوں کا سارا بار دوسرے پر ڈال دو۔'' میں نے کہا۔ میں واش روم کے لیے اٹھ گیا۔ ایاز جاگ گیا تھا اور باہر گاڑیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا میں واش ر سے نکل کر اس کے پاس آیا تو وہ منی پجارو کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے کہا۔

''یہ گاڑی ذرا مسئلہ کرتی ہے۔''

''کیا مسئلہ کرتی ہے کوئی خرابی ہے؟''

''مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ آٹو میٹک سسٹم کا چکر ہے۔''

''ویسے تو مسئلہ نہیں ہے؟''

''نہیں دونوں گاڑیاں اے ون کنڈیشن میں ہیں اور بائیک تو بہت اچھی حالت میں ہے۔ میں نے اس کا ٹیسٹ بھی کر لیا ہے۔ ایک سو بیس میل تک بہت آرام سے جاتی ہے۔''

''تم نے کب ٹیسٹ کیا؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج اس کے کاغذات لینے جانا ہے اس لیے میں نے سوچا ہر طرح سے تسلی کر لوں۔''

ایاز گاڑیوں کا ماہر بھی تھا اس لیے وہ ہر چیز کو چیک کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن ایک کام کرنا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''گاڑیوں کا تیل رکھنا ہے۔ بعض اوقات ضرورت پڑتی ہے اور وقت نہیں ہوتا ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا ابھی تم کاغذات لینے جاؤ گے تو بیس بیس لیٹرز والے کین لے لینا اور کہیں سے ان کو بھروا کر لے آنا۔''

''آپ فکر مت کریں اب گاڑیوں کا سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ان کی نمبر پلیٹس بھی بنوانی ہیں میں یہ کام بھی کروا کر آؤں گا۔ ممکن ہے مجھے دیر ہو جائے۔''

''اس صورت میں تم فون کر کے اطلاع کرو گے اب جو باہر جائے گا اگر وہ متوقع وقت سے زیادہ رکے تو لازمی یہاں اطلاع کرے۔''

''یہ اچھی احتیاط ہے۔'' اس نے سر ہلایا پھر ہچکچا کر بولا۔ ''شہباز صاحب ایک بات کہوں۔''

''تم ہر بات کہہ سکتے ہو تمہیں کوئی بات کہنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ عورتوں کا ساتھ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ ان کو ہمارے ساتھ نہیں بلکہ کسی محفوظ جگہ ہونا چاہیے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کل رات ہم بھی یہی بات کر رہے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ خواتین نہیں مان رہی ہیں سعدیہ تو شاید مان جائے لیکن مونا بالکل تیار نہیں مانے گی۔''

''وہ مانیں گی نہیں کیونکہ وہ دل سے سوچتی ہیں یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا۔'' ایاز نے وہی بات کی جو مونا نے کی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''یہ فیصلہ شاید مجھے ہی کرنا ہوگا۔''

ہم اندر آئے تو مونا نے ناشتہ بنا لیا تھا۔ باقی سب بھی آ گئے تھے۔ سعدیہ مونا کا ہاتھ بٹانے لگی۔ جب سب نے ناشتہ کر لیا تو میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''مونا اور سعدیہ میں نے تم دونوں کے لیے ایک فیصلہ کیا ہے مجھے امید ہے تم دونوں انکار کر کے مجھے اپنی ہی نظر میں بے عزت نہیں کرو گی؟''

مونا جانتی تھی مگر سعدیہ بے خبر تھی اس نے حیرت سے کہا۔ ''آپ کیسی بات کرتے ہیں ہم آپ کو بے عزت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔''

''میں نے سوچا ہے کہ تم دونوں کو عبداللہ والی کوٹھی بھیج دیا جائے کیونکہ وہ جگہ یہاں کے مقابلے میں محفوظ ہے۔''

''یہاں کیا ہوا ہے؟'' سعدیہ بے چین ہو گئی تھی۔

''ہوا نہیں ہے لیکن جب ہم دشمن کے خلاف حرکت میں آئیں گے تو اس کا امکان ہے کہ ہم اس کی نظر میں آ جائیں اور وہ یہاں تک آ جائیں۔''

''تو کیا ہوا کیا میں اور مونا دشمن کے خلاف اس سے پہلے نہیں لڑے ہم نے کوئی کمزوری دکھائی؟''

''وہ مجبوری تھی اور تم لوگوں نے کبھی کوئی کمزوری نہیں دکھائی بلکہ ہمیشہ اپنی ہمت سے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا۔ اب بھی تم اس طرح ہمارا ہی ساتھ دو گی۔''

''تم لوگوں سے دور جا کر؟'' مونا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں کیونکہ دوری صرف تمہارے لیے نہیں ہو گی ہمارے لیے بھی ہو گی۔ اگر تمہارے لیے ہم سے دور رہنا مشکل ہے تو یہ فیصلہ ہمارے لیے بھی آسان نہیں ہے لیکن ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ تم دونوں دشمن کی نظر سے دور رہو۔''

مونا اور سعدیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سعدیہ بولی۔ ''تو آپ فیصلہ کر چکے ہیں؟''

''میں فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہوں اگر تم لوگوں نے مجھے یہ اختیار نہ دیا ہوتا لیکن اگر تمہیں اعتراض ہے تو میں اس اختیار سے دست بردار ہوتا ہوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''تم بالکل آزاد ہو میرا فیصلہ رد کرنے میں۔''

''میں...... میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' سعدیہ بولی۔ ''آپ کا فیصلہ میرے لیے حرف آخر ہے۔''

''پھر بھی تم لوگ سوچ لو۔'' میں نے کہا اور میز سے اٹھ گیا۔ ''ایاز میرے ساتھ آؤ۔''

میں ایاز کے ساتھ گیسٹ روم والے کمرے میں آیا۔ میں نے بینک میں جمع ہو جانے سے رہ جانے والے ساڑھے تین لاکھ روپے الماری میں رکھ دیئے تھے۔ میں نے ایاز کو رقم دکھائی۔ ''تمہیں اس میں سے جتنی ضرورت ہو لے لیا کرو۔''

ایاز نے ایک گڈی سے ہزار کے چند نوٹ نکالے۔ ''میرے خیال میں اتنی رقم کافی ہوگی۔''

''جتنی کافی ہوگی اس سے زیادہ ہی رکھا کرو نہ جانے کب کہاں کون سی ضرورت پیش آجائے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''جگہ تم نے دیکھ لی جب ضرورت پڑے یہاں سے لے سکتے ہو۔''

ایاز نے نوٹ پرس میں رکھے۔ ''اب میں جاتا ہوں اگر دیر ہوئی تو کال کر دوں گا۔''

یاز کے جانے کے بعد میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ فی الحال میرا موڈ نہیں ہو رہا تھا کسی سے بات کرنے یا سامنا کرنے کا۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''آجاؤ۔''

سعدیہ اندر آئی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر یک دم دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ ''سعدیہ کیا ہوا ہے۔ میری بات بری لگی۔''

''نہیں۔'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے افسوس ہو رہا ہے میں نے آپ سے بحث کیوں کی۔''

''کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور جس بات پر تمہارا دل آمادہ نہیں ہو وہ تم کس طرح مان سکتی ہو۔''

''لیکن یہ بات آپ نے کی تھی۔ میں وسیم کی بات ماننے سے انکار کر سکتی ہوں لیکن آپ کی بات سے انکار نہیں کر سکتی۔'' وہ بولی۔ ''میں کیسے بھول سکتی ہوں جب میں اکیلی اور دشمنوں کے رحم و کرم پر تھی تو یہ آپ تھے جنہوں نے مجھے سہارا دیا۔ حالانکہ میں آپ کے دشمنوں کی بہن ہوں جنہوں نے آپ کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

میں نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''پاگل اب تم میری بہن ہو اور بھائیوں کا فرض ہوتا ہے احسان نہیں ہوتا۔''

''میں یہ کہنے آئی ہوں کہ آپ جہاں کہیں میں خوشی سے رہ لوں گی اور وہاں رہ کر اللہ سے دعا کروں گی کہ آپ کامیاب ہوں اور آپ کے دشمن ناکام ہوں۔''

''اللہ سے دعا کرو گی؟'' میں چونکا تھا۔

وہ پہلی بار مسکرائی۔ ''میں نے کہا تھا آپ کو سرپرائز دوں گی کہ میں اب مسلمان ہوں۔''

''ارے......اور تم نے بتایا ہی نہیں۔''

''صرف اس لیے بتانے سے ہچکچاتی رہی کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے مسلمان ہوئی ہوں۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ میں کیسے مسلمان ہوئی ہوں۔''

''ہماری یہ سوچ بھی نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور وجہ سے مسلمان ہو تو یہ ہمیں بھی قبول نہیں ہے۔ تمہیں مبارک ہو۔''

''آپ کو بھی۔'' وہ مسکرائی۔ ''آپ نے دیکھا میری اردو کتنی اچھی ہوگئی ہے۔''

''وہ تو پہلے بھی اچھی ہی تھی۔'' میں نے کہا۔

''وہ مونا بھی باہر موجود ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔ ''مجھ سے بھی زیادہ شرمندہ ہے۔''

میں نے باہر جھانکا اور مونا کو دیکھ کر ہنسا۔ ''خاتون اتنی بزدل کب سے ہوگئی۔''

''بزدل نہیں ہوں سچ مچ شرمندہ ہوں۔'' مونا بولی اور اندر آ گئی۔ ''میری تو ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی یہ سعدیہ مجھے لے آئی۔ شوبی آئی ایم رئیلی سوری۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''مونا تم میرے لیے چھوٹی بہن کی طرح تھیں اور اب سفیر کی بیوی کی حیثیت سے رشتہ دوہرا ہوگیا۔ تم دونوں نے صبر سے میری بات مان لی یہی بہت ہے اب کوئی سوری نہ کرے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سعدیہ بولی۔

''دیکھو تم لوگوں سے دور تو ہم بھی نہیں رہ سکتے کم سے کم دو کاٹھ کے اُلو تو بالکل نہیں رہ سکتے۔ اس لیے تمہیں اپنے پاس ہی رکھ رہے ہیں۔ وہاں تم محفوظ بھی رہو گی اور جب موقع ملے گا ہم تم سے ملنے آسکیں گے۔''

وہ اگر اندر سے ناخوش بھی تھیں تب بھی انہوں نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ سعدیہ کو البتہ فکر لگ گئی تھی۔ ''آپ کھائیں گے کیسے؟''

''تم فکر مت کرو۔ یہاں فریج ہے باہر سے لا کر رکھ لیں گے اسی طرح بہت ساری ریڈی میڈ چیزیں مل جاتی ہیں۔ ٹن بند کھانے ملتے ہیں۔ تھوڑا بہت پکانا تو ہمیں بھی آتا ہے۔''

''میں نے بیتو کو چائے اور کافی بنانا سکھا دی ہے۔'' مونا نے انکشاف کیا۔ ''وہ بہت اچھی بنانے لگا ہے۔''

''وہ تو میں بھی بہت اچھی بناتا ہوں لیکن تم لوگوں سے دوری ہم کھانے پینے کے لیے نہیں اختیار کر رہے ہیں اس دوران میں اپنے مسئلے نمٹانے ہیں تاکہ ہمارا آنے والا کل محفوظ ہو اور ہم اپنے اپنے گھروں میں عام لوگوں کی طرح رہ سکیں۔''

ہم ہنستے مسکراتے باہر لاؤنج میں آئے تو ٹینشن میں بیٹھے سفیر اور وسیم نے سکھ کا سانس لیا۔ بیتو ہنس رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''وسیم بھائی اور سفیر بھائی بہت پریشان تھا۔''

''تو بیٹے پریشانی انہوں نے مول بھی تو خود لی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ان سے عبرت پکڑو۔''

''اس کی ضرورت تجھے ہے۔'' سفیر نے بھنا کر کہا۔ ''یہ تو ابھی بچہ ہے۔''

''اتنا بھی بچہ نہیں ہے۔'' وسیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیوں منے کیا خیال ہے؟''

بیتو گھبرا گیا تھا کہ ابھی کامی کا نام لیا جائے گا لیکن اُسے سعدیہ نے بچا لیا۔ اس نے ڈانٹ کر وسیم سے کہا۔ ''جی نہیں میرا بھائی بہت سیدھا اور معصوم ہے۔''

میں نے مونا کی طرف دیکھا۔ ''آج تمہاری خواہش پوری ہوگئی ہے ہم سب گھر پر ہیں اور ایاز بھی آجائے گا۔''

''ہاں نادیدی اس خوشی میں کچھ اچھا سا بناؤ۔'' بیتو نے فرمائش کی۔

''دال چاول بنا لیتے ہیں۔'' مونا نے کہا تو بیتو کا منہ اتر گیا تھا۔

''دال چاول۔''

''ہاں بہت مزے کے ہوتے ہیں۔'' مونا اس کی حالت سے لطف اندوز ہونے لگی۔

''ہم نہیں کھائے گا۔''

''تو کیا بھوکے رہو گے؟'' سعدیہ نے اسے گھورا۔

''بھوکا کیوں رہے گا باہر سے کھالے گا۔'' بیتو نے منہ پھلا کر کہا اور جانے لگا تو مونا اور سعدیہ نے اسے پکڑ لیا۔ مونا پچکار کر بولی۔

''کہاں جاتے ہو پیارے سے منے؟''

''آؤ تمہیں کچھ اچھا بنا کر کھلاتے ہیں۔'' سعدیہ نے کہا اور وہ اسے اپنے ساتھ کچن کی طرف لے گئیں۔ میں نے کہا۔

''شکر ہے معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ ان کو آج ہی عبداللہ والی کوٹھی میں منتقل کر دینا ہے۔''

''یہ کام رات کو کیا جائے تو بہتر ہوگا۔'' وسیم نے تجویز پیش کی۔ ''لے کر کون جائے گا؟''

''میں جاؤں گا کیونکہ کوٹھی میں نے دیکھی ہے اور دوسرے مجھے وہاں سے راجا عمر دراز سے بات بھی کرنی ہے۔''

''فرض کر اس نے تجھے اپنے پاس بلوایا یا کوئی فرمائش کر دی۔''

''تو اپنے حالات کے مطابق فیصلہ کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی میری ترجیحات مختلف ہیں۔''

اس تذکرے سے مجھے یاد آیا کہ میں نے عبداللہ کو ایک کام کہا تھا میں نے اسے کال کی۔ اس بار میں نے اپنا نمبر استعمال کیا تھا سفیر کا موبائل میرے پاس ہی تھا۔ عبداللہ نے کچھ دیر سے کال ریسیو کی۔

''میں بات کر رہا ہوں۔'' میں نے نام لیے بغیر کہا۔

''آپ۔'' عبداللہ نے پہچان لیا۔ ''حکم کریں جناب؟''

''تم نے اپنا آدمی شہلا کی کوٹھی پر بھیجا؟''

''جی جناب وہ وہاں مورچہ سنبھال چکا ہے اور اس نے رپورٹ کی ہے کہ شہلا اپنے گھر میں ہے اور اکیلی ہی نظر آتی ہے بس ایک خادمہ اور گیٹ پر چوکیدار ہے لیکن یہ وہ شخص نہیں ہے جو پہلے تھا۔''

''وہ فتح خان کا ساتھی تھا۔ یہ شہلا کا اصلی چوکیدار ہوگا۔ اس کے گھر کا نمبر کام کر رہا ہے؟''

''یہ تو نہیں معلوم جناب۔''

''میرے پاس اس کا نمبر تھا جو موبائل کے ساتھ ہی مس ہو گیا ہے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں ابھی ڈائریکٹری میں دیکھ کر آپ کو ایس ایم ایس کر دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے فون بند کیا تو سفیر نے پوچھا۔ ''کیا ارادہ ہے؟''

''میں سوچ رہا ہوں آج شہلا پر ہاتھ صاف کر دیا جائے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''لیکن وہ بہت مضبوط اعصاب کی عورت ہے اتنی شرافت سے زبان نہیں کھولے گی۔''

''زبان کھلوانا آتی ہے جناب۔'' وسیم بولا۔

''نہیں اس کے لیے پلان کرنا پڑے گا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے میں اس پر یا کسی اور عورت پر تشدد نہیں کر سکتا ہوں اس لیے اسے ایسے اٹھانا کہ وہ اسے کسی اور کی کارروائی سمجھے اور گھبرا کر زبان کھول دے۔''

''فتح خان کے آدمی بن کر کیوں نہ اٹھالیں۔'' سفیر نے تجویز پیش کی جو مجھے اور وسیم دونوں کو پسند آئی۔

''یہ ٹھیک رہے گا اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ فتح خان کتنا سفاک آدمی ہے اور بینک لاکر سے اسے بھی دلچسپی ہے۔''

''بس تو میں اور سفیر یہ کام کریں گے۔'' وسیم نے کہا۔

''وہ ہمیں نہیں جانتی ہے۔''

''ہاں اس نے مجھے اور بیتو کو دیکھا ہوا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''لیکن پہلے اسے گھر سے نکالنا ہوگا۔''

''یہ کام آپ کر سکتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''آپ اس کی تصویروں کا ذکر کریں گے تو وہ سر کے بل چلی آئے گی۔''

اسی لمحے ایس ایم ایس سے شہلا کی کوٹھی میں لگے فکس فون کا نمبر آ گیا بلکہ یہ دو فون تھے۔ میں نے ایک نئی سم سے یہ نمبر ملایا۔ ملازمہ نے کال ریسیو کی اور میرا نام سن کر شہلا کو بتانے چلی گئی۔ وہ ایک منٹ بعد لائن پر آ گئی تھی۔ ''شہباز کیا بات ہے کیوں کال کی ہے؟''

''میں نے سوچا تمہاری ایک امانت تو تمہیں دے دوں۔''

''کون سی امانت؟'' وہ بولی۔

''تمہاری تصویریں جو فتح خان کے پاس تھیں۔''

''اچھا۔'' اس نے بغیر ردِعمل کے کہا۔ ''تم کیوں واپس کرنا چاہتے ہو جب کہ تم ان کی مدد سے مجھے بلیک میل بھی کر سکتے ہو؟''

''شہلا بات یہ ہے کہ میں بلیک میلر نہیں ہوں اور خاص طور سے کسی کو اتنے گھٹیا انداز میں بلیک میل نہیں کر سکتا۔ اس لیے میرا دل نہیں مان رہا ہے کہ تمہیں مجبور کر کے اپنا کام نکلواؤں۔ میں تم سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسا معاہدہ؟''

''ہم پروفیسر کے لاکر تک مل کر رسائی حاصل کریں گے اور میں اس میں سے صرف بریف کیس لوں گا جو میری چیز ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب تمہاری ملکیت ہوگا میں اس میں سے ایک معمولی سی چیز بھی نہیں لوں گا بولو اب کیا کہتی ہو؟''

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے کہا۔ ''میں کس طرح یقین کر لوں کہ تمہاری نیت نیک ہے؟''

''اپنی نیک نیتی کا ثبوت دینے کے لیے تو میں نے تصویریں واپس کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم آ جاؤ میری کوٹھی تو دیکھی ہوئی ہے۔''

''سوری مس شہلا...... ہاں سنا ہے تم پھر سے غیر شادی شدہ ہو گئی ہو۔ مغرب میں دس بار شادیاں اور بیس

بار بوائے فرینڈ کرنے والی پچاس سال کی خاتون بھی مس کہلاتی ہے تو تم ان کے مقابلے میں بہت بہتر ہو۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہوں اور انہوں نے تمہارا گھر دیکھا ہوا ہے اس لیے میں وہاں نہیں آ سکتا۔''

''تب کیا صورت ہو سکتی ہے؟''

''تم کہیں باہر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''کسی ایسی جگہ جہاں تمہیں کوئی خطرہ نہ ہو اور میں بھی اپنا اطمینان کر لوں کہ کوئی تمہارا پیچھا کرتا ہوا تو نہیں آیا ہے۔ اس کے بعد ہم مل کر بات کر سکتے ہیں۔''

''میں باہر......'' وہ ہچکچائی۔ ''اچھا میں سوچ کر بتاتی ہوں ایسا کرو تم مجھے ایک گھنٹے بعد رِنگ کر لینا۔''

''ویسے تو فیصلہ تم نے خود کرنا ہے لیکن اگر تم سوچنا چاہتی ہو تو میں ایک گھنٹے بعد کال کر لوں گا۔'' میں نے موبائل بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' سفیر نے پوچھا۔ ''بہت تعریفیں ہو رہی تھیں۔''

''مطلقہ بھی ہو گئی ہے۔'' وسیم ہنسا۔

''مجھے معاف رکھو یار!...... بڑی خطرناک چیز ہے اس کے ساتھ تو آدمی مذاق میں ابھی ایسا رشتہ نہ جوڑے۔ وہ باہر آنے کے لیے تیار نہیں ہے ایک گھنٹے بعد بتائے گی۔''

''کوئی چکر نہ ہو۔'' سفیر نے سوچ کر کہا۔ ''ورنہ تجھ سے اسے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

''دیکھ لیتے ہیں۔ اسے گھر سے نکالنا ضروری ہے کیونکہ وہ جس جگہ رہتی ہے وہاں سیکورٹی بہت سخت ہے۔ پولیس بھی برابر گشت کرتی ہے۔''

''اس کا خطرہ بھی ہے کہ وہ زیرِ نگرانی نہ ہو۔'' وسیم بولا۔ ''اگر فتح خان مرشد کی قید سے نکل گیا ہے وہ لازمی شہلا کی تاک میں ہوگا ورنہ اس نے مرشد کو شہلا کے بارے میں بتا دیا تو وہ بھی اس کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔''

''ویسے تو مرشد کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے لیکن وہ کسی اور طرح سے شہلا کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔'' میں ہنسا۔ ''وہ عورت کا دیوانہ ہے اور شہلا خطرناک حد تک حسین ہے۔''

''بھائی یہ گیا کام سے۔'' سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب مجھے لگ رہا ہے۔ شہلا سے بینک لاکر کے بارے معلوم کرنے کا تو صرف بہانہ ہے ورنہ اصل میں یہ شہلا تک پہنچنا چاہتا ہے۔''

''بکواس مت کر۔'' میں نے سفیر کی گردن دبوچی تو چلانے لگا۔

''مونا بچاؤ......تمہارے سہاگ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔''

مونا اس کا شور سن کر دوڑی آئی تھی لیکن پھر صورتِ حال دیکھ کر جاتے جاتے مشورہ دے گئی۔ ''ذرا صحیح سے دبانا شوبی۔''

''اب بولو بیٹے۔'' میں نے سفیر سے کہا اور اسے چھوڑ دیا۔

''میں نے ٹھیک کہا تھا۔'' سفیر نے کہا اور دور سرک گیا۔ ''یہ اس عورت کے چکر میں بالکل پاگل ہو گیا ہے۔''

''چل تُو پاگل سمجھتا ہے تو پاگل ہی سہی۔'' میں نے کہا اور عبداللہ کا نمبر ملایا۔ ''عبداللہ اپنے آدمی کو میرا نمبر

دو جو شہلا کی کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے وہ مجھ سے بات کر لے۔''

''میں ابھی دیتا ہوں جناب۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

ایک منٹ بعد میرے موبائل کی بیل بجی۔ یہ عبداللہ کا آدمی تھا۔''جی سر حکم کریں۔''

''کیا پوزیشن ہے؟''

''وہ اندر ہی ہے اور چار گھنٹے سے نہ کوئی آیا ہے اور نہ کوئی کوٹھی سے نکلا ہے۔''

''اندر کتنے آدمی دکھائی دیئے ہیں؟''

''ایک چوکیدار ہے۔ ایک خادمہ جو کبھی کسی کام سے باہر آتی ہے اور خود شہلا ہے۔''

''تم اسی پوزیشن میں ہو جہاں سے پہلے کوٹھی کی نگرانی کرتے تھے؟''

''جی میں اسی درخت پر ہوں۔'' اس نے تصدیق کی۔

''ٹھیک ہے میرا یہ نمبر نوٹ کر لو۔ جیسے ہی کوئی آئے یا نکلے یا شہلا خود نکلے تو مجھے اطلاع کرنا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' اس نے کہا۔

میں نے کال کاٹ کر شہلا کی کوٹھی کا نمبر ملایا۔ ایک گھنٹہ پورا ہو گیا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔''میں بات کر رہا ہوں۔''

''آج شام...... چھ بجے جناح سپر مارکیٹ میں جو کھانے پینے کے لیے مخصوص کھلی جگہ ہے میں وہاں آؤں گی اور صرف دس منٹ تک رکوں گی اگر تم نہیں آئے تو میں واپس چلی جاؤں گی۔''

''لگتا ہے تمہیں کوئی خطرہ ہے ورنہ تم ان تصویروں کے پیچھے اتنی مجبور رہی ہو کہ فتح خان جیسے شخص کو بھی برداشت کر لیا۔''

''یہ میں زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے وسیم اور سفیر کو آگاہ کیا۔

''جناح سپر مارکیٹ میں شام چھ بجے بلایا ہے۔''

''جناح سپر۔'' سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔''وہاں کا ہجوم دیکھا ہے اگر اس کے پیچھے کوئی لگ کر آیا تو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''تو ہم نے کون سا ملنا ہے۔ وہ آئے گی تو اس کے پیچھے لگ جانا ہے اور پھر موقع دیکھ کر اسے چھاپ لینا ہے۔''

''اس کی گاڑی میں بھی ٹریپ لگایا جا سکتا ہے۔'' وسیم نے تجویز پیش کی۔''ہم میں سے کوئی اس میں چھپ کر بیٹھ سکتا ہے۔''

''نہیں آج کل کی گاڑیوں میں یہ آسان نہیں ہے اس میں کوئی الارم ہوگا جو گاڑی کو چھیڑتے ہی چلانے لگے گا۔'' میں نے کہا۔''اسے راستے میں کہیں روکنا ہوگا۔''

''تب پوری تیاری سے نکلنا ہوگا۔'' وسیم نے کہا۔

''ابھی بہت وقت ہے تیاری کا۔'' سفیر بولا اسی لمحے سعدیہ اندر آئی تھی۔ اس نے سن لیا۔

''کس چیز کی تیاری میں بہت وقت ہے۔''

''تم دونوں کو عبداللہ والی کوٹھی میں چھوڑ کر آنے کی تیاری۔'' میں نے کہا تو سعدیہ کا چہرہ بجھ گیا تھا۔

''اس میں تیاری کی کیا ضرورت ہے آپ جب کہیں ہم تیار ملیں گے۔''

''یہ ایسے ہی کہہ رہا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ہم کسی اور بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

لیکن سعدیہ کا چہرہ دکھی رہا تھا وہ ہم سے چائے کافی کا پوچھنے آئی تھی۔ سب نے کافی کی فرمائش کی تو وہ چلی گئی۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''یار یہ دونوں راضی خوشی نہیں جا رہی ہیں اس لیے خیال رکھا کرو۔''

''سوری بس منہ سے نکل گیا تھا۔'' سفیر بھی پچھتا رہا تھا۔

ابھی کھانے میں وقت تھا اس لیے ہم نے شام کی مہم کے لیے اسلحہ دیکھا۔ بکس کھول کر اس میں سے دو خود کار رائفلیں اور دو عدد پستول نکالے۔ ان پستولوں پر لگانے کے لیے سائلنسر بھی تھے۔ کیونکہ کوئی بڑی مہم جوئی نہیں تھی اس لیے کوئی اور چیز جیسے بم وغیرہ نہیں لیے تھے۔ وسیم نے دوسرا بکس بھی کھول کر دکھایا اس میں سارا دھماکہ خیز مواد تھا۔ جیسے دستی بم، گرینیڈ لانچر اور راکٹ لانچر وغیرہ۔ بارودی سرنگیں اور ٹائم بم بھی تھے۔ میں نے کہا۔ ''یار یہ خطرناک چیزیں ہیں اور ان کو یہاں رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ انہیں اسی مکان میں رکھ دیتے ہیں جو الگ تھلگ ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ ابھی شہلا والی مہم نمٹا لیتے ہیں تو اسے بھی لیتے جائیں گے شہلا کی وجہ سے کسی کو وہاں رکنا ہوگا۔'' وسیم نے جواب دیا۔

''گاڑیاں کون کون سی جائیں گی؟''

''میں بائیک پر ہوں گا کیونکہ میرا رخ روشن صرف ہیلمٹ میں بدنظروں سے چھپا رہ سکتا ہے۔ کم سے کم ایک گاڑی اور ہونی چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''ہم اس کے جناح سپر تک پہنچنے کا انتظار کیوں کریں اس سے پہلے ہی گھر سے نکلتے ہوئے اسے کیوں نہ چھاپ لیں؟'' سفیر نے کہا۔

''نہیں ہمیں پہلے جائزہ لینا ہوگا کہ وہ کوئی جال تو نہیں بچھا رہی ہے ایسا نہ ہو جلد بازی کر کے ہم اس کے جال میں پھنس جائیں۔ ہاں یہ آئیڈیا اچھا ہے کہ اس کا تعاقب گھر سے کیا جائے۔''

کچھ بحث کے بعد طے پایا کہ میں بائیک پر جناح سپر پہنچوں گا اور سفیر اور وسیم الگ الگ گاڑیوں میں شہلا کا تعاقب کر کے حالات کا جائزہ لیں گے۔ شہلا کی واپسی پر کسی ویران جگہ روک کر اسے اٹھا لیا جائے گا اور پھر ہم اسے الگ تھلگ مکان پر لے جائیں گے۔ اس دوران میں کھانا لگ گیا تھا اور ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایاز آ گیا۔ وہ بھی شامل ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''کام ہو گیا ہے جناب ابھی کھانے کے بعد آپ کو دکھاتا ہوں۔''

مجھے خیال آیا کہ جس گاڑی میں شہلا کو لے جانا ہو اس کی ڈرائیونگ ایاز کو کرنی چاہیے۔ تاکہ کوئی پیچھے لگے تو وہ اس سے پیچھا چھڑا سکے۔ ہم سب عام قسم کے ڈرائیور تھے جب کہ وہ ماہر ڈرائیور تھا۔ کھانے کے بعد اس نے مجھے بائیک کے کاغذات دیئے اور پھر بائیک اور تمام گاڑیوں کی جعلی نمبر پلیٹس دکھائیں۔ ہر گاڑی کی دو جعلی نمبر پلیٹس تھیں اور بہ وقتِ ضرورت ان کو صرف ایک اسکرو کھول کر تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایاز کو شہلا کے

بارے میں اپنے پلان سے آگاہ کیا۔
''تمہیں وہ گاڑی چلانی ہوگی جس میں شہلا کو لے جایا جائے گا۔''
''ٹھیک ہے گاڑی کون سی ہوگی؟''
''یہ تو تم بتاؤ کہ اس قسم کی مہم کے لیے کون سی گاڑی زیادہ مناسب رہے گی؟''
ایاز نے سوچا اور بولا۔''ویسے تو میری جیپ بھی ہے لیکن اس کا سائز بڑا ہے اور کہیں ٹریفک زیادہ ہو تو یہ پھنس سکتی ہے۔ میرا خیال ہے سفاری بہتر رہے گی اس کا انجن بہت طاقتور اور رفتار بہترین ہے۔''
''ٹھیک پھر اس کے پیچھے جگہ بھی ہے جہاں شہلا کو باندھ کر ڈالا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔''سفیر اور وسیم دوسری گاڑی میں ہوں گے۔''
کیونکہ پروگرام میں ایاز کا اضافہ ہوا تھا اس لیے سب دوبارہ سے طے ہوا۔ سفیر اور وسیم چار بجے گھر سے نکل جاتے۔ میں نے سفیر کو شہلا کی کوٹھی کا پتا سمجھا دیا تھا اور اسے عبداللہ کے آدمی کا نمبر بھی دے دیا تھا وہ اس سے بھی مدد لے سکتا تھا۔ جیسے ہی شہلا کوٹھی سے نکلتی وہ ہمیں اطلاع کرتے اور اس کے پیچھے لگ جاتے۔ ہم سب کے پاس موبائل اور ہینڈ فری تھے۔ طے ہوا کہ ایک سب کو کانفرنس کال میں لے گا اس طرح سب ایک دوسرے سے رابطے میں ہوں گے اور اگر اس کا بیلنس ختم ہوگیا تو دوسرا کال ملائے گا۔ احتیاطاً سب کے موبائلز میں بڑی مالیت کے کارڈز لوڈ کر لیے گئے۔ چار بجنے والے تھے اس لیے سفیر اور وسیم تیاری کرنے چلے گئے۔ ہم نے ہتھیار نکال لیے تھے۔ ایاز کے پاس اس کا اپنا پستول تھا اس لیے اس نے پستول لینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے اصرار کیا۔
''لے لو یار یہ جدید ترین پستول ہے۔''
''یہ میرا آزمودہ ہتھیار ہے جناب۔'' اس نے اپنا پستول دکھایا۔
''جیسی تمہاری مرضی۔''
وسیم اور سفیر کے جاتے ہی ہم نے بھی تیاری شروع کر دی۔ ایاز گاڑی چیک کرنے چلا گیا اور میں نے کپڑے بدلے کیونکہ باہر غضب کی سردی تھی اور مجھے بائیک پر جانا تھا اس لیے میں نے موٹے گرم کپڑوں کے ساتھ جیکٹ، جوتے اور دستانے بھی پہن لیے تھے۔ پھر میں نے عبداللہ کے آدمی سے رابطہ کیا۔''کوئی سرگرمی؟''
''نہیں سر۔'' اس نے جواب دیا۔''کوٹھی میں سب معمول کے مطابق لگ رہا ہے۔''
''دیکھتے رہنا اگر شہلا نکلنے لگے تو مجھے فوراً اطلاع کرنا۔''
''ٹھیک ہے جناب۔''
ایاز کے لیے طے ہوا تھا کہ وہ جناح سپر کے باہر شہلا کے گھر کی طرف سے آنے والی سڑک کے پاس رہے گا۔ لازمی بات ہے شہلا واپس بھی اسی راستے سے جائے گی۔ پانچ بجے ہم بھی نکل گئے تھے۔ باہر آتے ہی میں نے سفیر اور ایاز کو کال ملا لی تھی۔ اب کانفرنس کال سے ہم تینوں آپس میں بات کر سکتے تھے۔ وہ دونوں شہلا کے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے اور انہوں نے گھر بھی تلاش کر لیا تھا۔ سفیر نے کہا۔
''ابھی تک وہ باہر نہیں نکلی ہے۔''

''اس کے گھر سے جناح سپر مشکل سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے اس لیے وہ اتنی جلدی نکل کر کیا کرے گی۔ یہ بتاؤ کہ آس پاس کوئی مشکوک چیز نظر آ رہی ہے؟''

''ہاں ایک کتا ہے جو ہمیں بڑی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے۔''

''اسے چھوڑ میں دو پایوں کی بات کر رہا ہوں۔''

''سب سے زیادہ مشکوک ہم خود ہیں۔''

''اگر تُو سیدھی طرح بات نہیں کر سکتا ہے تو موبائل وسیم کو دیدے۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

''یار اگر کوئی مشکوک آدمی یا چیز ہوتی تو میں تجھ سے کیوں چھپاتا۔'' سفیر بدستور شرارت پر آمادہ تھا۔ شادی کے بعد اس میں ایک قسم کی شوخی اور چلبلا پن آ گیا تھا اس سے پہلے بھی سفیر مجھ سے بے تکلف ہی تھا لیکن اتنی جملے بازی اور شرارت نہیں کرتا تھا۔ اسی لمحے میرے دوسرے موبائل پر کال آنے لگی۔ یہ نمبر عبداللہ کے آدمی کے علم میں تھا اور وہی کال کر رہا تھا۔ میں نے بائیک روک کر کال ریسیو کی۔ ''ہیلو کیا ہوا؟''

''شہلا گھر سے نکل رہی ہے۔''

''اکیلی یا کوئی اور بھی ہے؟''

''اکیلی نظر آ رہی ہے گاڑی میں بیٹھ گئی ہے اور چوکیدار گیٹ کھول رہا ہے۔ سرخ رنگ کی چھوٹی کار ہے۔''

''وہ کوٹھی سے نکل کر کس طرف جا رہی ہے یہ بتاؤ۔''

چند لمحے بعد اس نے بتایا۔ ''وہ شمال کی طرف مڑ گئی ہے۔''

''لعنت ہو۔'' میں نے کہا۔ ''سفیر وہ شمال کی طرف مڑ گئی ہے تم لوگ پیچھے جاؤ جلدی۔ سرخ چھوٹی کار ہے۔ میرا خیال ہے شیوی ہے۔''

''ہم روانہ ہو رہے ہیں۔'' سفیر نے کہا۔

ایاز ہماری گفتگو سن رہا تھا اور وہ آگے جا چکا تھا۔ میں نے بھی بائیک آگے بڑھا دی۔ دو منٹ بعد سفیر نے کہا۔ ''ہم نے اسے جا لیا ہے وہ جناح سپر کی طرف ہی جا رہی ہے۔''

''گڈ ہم بھی بس پہنچنے والے ہیں۔'' میں نے کہا اور ایاز کو واپس جانے والی سڑک پر مڑتے دیکھ لیا تھا کیونکہ اس سڑک پر بہت دور جا کر کٹ آتا تھا اگر ایاز پہلے سے واپس جانے والے راستے پر نہیں ہوتا تو وہ اسے کھو سکتا تھا۔ میں جناح سپر میں داخل ہو گیا۔ درمیانی پارک جہاں اب کھانے پینے کی دکان والوں نے قبضہ کر لیا تھا وہاں کرسیاں اور میزیں رکھ کر آنے جانے والوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں مہیا کر رہے تھے۔ میں ایک طرف بائیک کی پارکنگ میں رک گیا لیکن بائیک سے اترنے یا ہیلمٹ اتارنے کی کوشش نہیں کی تھی میں یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے کسی سے فون پر بات کر رہا ہوں۔ درحقیقت میں فون پر ہی بات کر رہا تھا۔ سفیر نے کہا۔

''ہم جناح سپر سے کچھ ہی دور ہیں۔''

''اس کے پیچھے تم لوگوں کے علاوہ کوئی اور تو نہیں ہے؟''

''نہیں رہائشی علاقے سے تو سوائے ہمارے کوئی پیچھے نہیں آیا تھا لیکن اگر سڑک پر آنے کے بعد کوئی پیچھے

لگا ہو تو کہنا مشکل ہے کیونکہ یہاں ٹریفک بہت ہے۔''

مارکیٹ میں تو کسی نگرانی کرنے والا کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ سردی کے باوجود وہاں لوگوں کا رش تھا۔ اگر شہلا نے کوئی جال بچھایا تھا تو ہم صرف محتاط رہ کر اس کا توڑ کر سکتے تھے۔ جب وہ مجھ سے تصاویر کے بارے میں بات کر رہی تھی تو اس کا لہجہ بہت لاتعلقانہ تھا جیسے اسے ان تصاویر کی خاص پروا نہ ہو۔ جب کہ وہ ان تصویروں کے لیے پہلے پروفیسر اور پھر فتح خان کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اس کی یہ بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ چند منٹ بعد سفیر نے کہا۔ ''اس کی گاڑی مارکیٹ میں داخل ہوگئی ہے اور پارکنگ کے لیے جگہ تلاش کر رہی ہے۔''

''تم اس کے پیچھے رہو۔ مستقل اس پر نظر رکھو۔ اگر یہاں اس کا کوئی آدمی موجود ہوا تو وہ لازی اس سے رابطہ کرے گی۔''

''ممکن ہے اس نے بھی ہماری طرح رابطے کا کوئی بندوبست کر رکھا ہو۔ آج کل وائرلیس ہیڈ سیٹ بھی عام ملتے ہیں جو اس کے بالوں میں اس طرح چھپ سکتا ہے کہ کسی کو نظر ہی نہیں آئے گا۔''

''ممکن ہے...... پھر بھی اس پر مکمل نظر رکھنی ہے۔'' میں نے کہا میری نظر سرخ کار کی تلاش میں بھٹک رہی تھی لیکن وہ نظر نہیں آئی شاید وہ کار کو کہیں اور چھوڑ کر آرہی تھی۔ مجھے شہلا بھی نظر نہیں آئی تھی لیکن میں نے سفیر کو دیکھ لیا۔ اس نے بھی بائیک کی وجہ سے مجھے پہچان لیا تھا اس نے اشارے سے بتایا کہ شہلا میرے پیچھے آگئی ہے۔ میں نے غیر محسوس انداز میں مڑ کر دیکھا تو وہ ایک نمایاں جگہ میز کے پاس کھڑی تھی۔ چند لمحے بعد وہ بیٹھ گئی تھی اور اس نے کلائی میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ یعنی اس کے دس منٹ شروع ہو گئے تھے اور دس منٹ بعد وہ یہاں سے اٹھ جاتی۔ سفیر کے ساتھ وسیم بھی آ گیا تھا اور وہ اس جگہ گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے کہ کوئی مشکوک فرد تو نہیں ہے۔ سفیر نے کہا۔

''اس نے نہ تو کسی سے بات کی ہے اور نہ کسی کو اشارہ کیا ہے۔''

''یہ بہت چالاک عورت ہے۔ یہ دو بار جس طرح میرے ہاتھ سے نکلی ہے یہ بات میں بھول نہیں سکتا۔''

شہلا وقفے وقفے سے گھڑی دیکھ رہی تھی اور یہ اشارہ تھا کہ مجھ سے رابطہ کرو ورنہ میں یہاں سے جارہی ہوں۔ پانچ منٹ گزر گئے تو اس نے اپنے پرس میں سے موبائل نکال لیا اور کوئی نمبر ملانے لگی اچانک میری جیب میں رکھے دوسرے موبائل کی بیل بجی تو میں اچھل پڑا تھا۔ وہ مجھے کال کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے موبائل نکال کر کال کاٹ دی اور پھر موبائل ہی آف کر دیا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ اس موبائل کا نمبر اس کے فون کے سی ایل آئی میں آ گیا ہوگا اور وہ مجھے کال کر سکتی تھی۔ میری نظر شہلا پر تھی اور میں اس سے زیادہ دور نہیں تھا شکر ہے اس نے مجھے موبائل نکالتے اور اسے آف کرتے نہیں دیکھا۔ ایک ناکام کوشش کے بعد اس نے دوبارہ نمبر ملایا اور اس بار یقیناً مطلوبہ نمبر بند ہونے کی نوید سنائی گئی ہو۔ جھنجھلا کر اس نے موبائل واپس پرس میں رکھ لیا۔

''موبائل تو بند کر لیتا۔'' سفیر نے کہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا۔ ''ابھی دیکھ لیتی تو تیرا بھانڈا یہیں پھوٹ جاتا۔''

''بکواس کرنے کے بجائے اسے دیکھ وہ جارہی ہے۔''

میرا نمبر بند جانے سے شہلا کو شاید خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور وہ دس منٹ پورے ہونے سے پہلے اٹھ رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس طرف جانے لگی جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔ اس سردی میں بھی اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی اور اوپر شال لی تھی۔ قدرت نے اسے بڑا متناسب جسم دے رکھا تھا اور وہ اس کی نمائش میں کسی بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔ ممکن ہے اس نے شال نہ لے رکھی ہوتی تو اس وقت وہاں موجود ہر مرد اسے ہی دیکھ رہا ہوتا۔ اس کے باوجود کچھ قیامت کی نظر رکھنے والے حضرات اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ اس گلی میں داخل ہوئی جس میں اس نے کار پارک کر رکھی تھی میں نے ایاز سے کہا۔

''ایاز وہ نکلنے والی ہے۔ تم اس کے پیچھے رہو گے۔ سفیر اور وسیم تم آگے رہو گے اور کسی مناسب جگہ دیکھتے ہی راستہ بلاک کر کے اسے روک لینا۔ کوشش کرنا کوئی ہنگامہ نہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں جناب۔'' ایاز نے کہا۔ ''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔''

''ہم بھی نکل رہے ہیں۔'' سفیر بولا۔ ''وہ ابھی اپنی کار میں بیٹھ رہی ہے۔ ہمارے پیچھے ہی آئے گی۔''

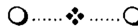
''گڈ میں چاہتا ہوں وہ درمیان میں رہے۔''

''لیکن اگر کہیں اور نکل گئی تو؟''

''تب بھی ایاز اس کے پیچھے ہو گا وہ گائیڈ کرے گا اور میں بھی آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور بائیک کو اسٹارٹ کرنے کے لیے کک پر پاؤں مارا۔ انجن اسٹارٹ ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں بائیک آگے بڑھاتا کوئی تیزی سے میرے پیچھے آ کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی کوئی چیز میری کمر میں چبھی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا بیٹھنے والے نے کالر سے نکلا ہیڈ سیٹ کا تار کھینچ لیا اور وہ یقیناً ٹوٹ گیا تھا۔ یعنی اب میں کچھ بولتا تب بھی سفیر اور ایاز کو میری آواز نہ جاتی۔ میں نے جان لیا تھا کہ میں ٹریپ ہو گیا ہوں اور میری کمر میں چبھنے والی چیز یقیناً کسی آتشیں ہتھیار کی نال تھی۔ اس کا مطلب تھا مجھے پہچان لیا گیا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''میں کون ہے تم جانتا ہے اور میں تم کو جانتا ہے۔'' اس نے کہا تو میں سن رہ گیا تھا اس نے نال سے ٹہوکا دیا۔ ''اب ادھر سے چلو اس سے پہلے کہ یہ چل جائے۔''



بائیک اسٹارٹ تھی اور میرا جسم سن تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ عین اس وقت جب میں کامیابی کے قریب تھا مجھے فتح خان کی منحوس آواز سننے کو ملے گی اور وہ مجھ پر یوں حاوی ہو جائے گا۔ پستول کی نال میرے عین گردے پر تھی اور ایک فائر مجھے ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے کافی ہوتا عین ممکن تھا کہ پستول پر سائلنسر بھی ہوتا اور اس ہجوم اور شور میں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور میرے گرنے سے پہلے فتح خان یہاں سے جا چکا ہوتا۔ میں نے جب اس کی آواز سنی تو ایک لمحے کو میں مرنے کو تیار بھی ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے فتح خان مجھے مارنے آیا ہے کیونکہ میں نے اسے مرشد جیسے آدمی کے حوالے کر دیا تھا لیکن جب اس نے یہاں سے نکلنے کو کہا تو میں پُرسکون ہو گیا تھا۔ میں نے بائیک کا انجن بند کر دیا۔

''فتح خان اس حرکت کا مقصد؟''

''میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔''

''اس کے لیے تمہیں یہ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تم مجھ سے دوسرے طریقے سے بھی رابطہ کر سکتے تھے۔''

''ہم بہتر سمجھتا ہے کہ کیا ضرورت ہے اور کیا نہیں ہے۔'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا اور پستول دبایا۔ ''اب تم ادھر سے چلتا ہے یا تمہارا لاش یہاں چھوڑ جائے۔''

''تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''کسی جگہ نہیں لے جا رہا بس کچھ بات کرنا ہے اور اس کے لیے سکون اور تنہائی کا ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے تو پاس ہی پارک ہے وہاں چلتے ہیں۔''

خلافِ توقع وہ مان گیا۔ ''ٹھیک ہے ادھر ہی چلو۔''

میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ میں فتح خان کے سامنے کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ بہت تیز تھا اور یقیناً مجھے شوٹ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا۔ ''تم مرشد کی قید سے کس طرح نکلے؟''

وہ ہنسا۔ ''کوئی مائی کا لال فتح خان کو اس کا مرضی کے بغیر قید نہیں کر سکتا ہے۔''

''تم میرے پاس بھی کئی ہفتے رہے ہو۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں نے کہا نا میری مرضی سے۔'' وہ بولا۔ ''کیا تم مجھ کو مرنے سے روک سکتا ہے۔''

''اچھا تو تم قید حیات سے بھاگ جانے کی بات کر رہے ہو۔ ویسے تم مجھے خودکشی کرنے والے نظر تو نہیں آتے۔''

''اگر مجھے کوئی راستہ نظر نہ آئے تو میں خودکشی بھی کرسکتا ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور مجھے لگا کہ اگر کبھی ایسا موقع آیا تو وہ واقعی خودکشی کرلے گا۔ میں نے بائیک جناح سپر مارکیٹ سے نکال لی تھی اور اب ہم اس کے نزدیک واقع ایک چھوٹے سے پارک کی طرف جارہے تھے۔ میں نے پارک کے دروازے پر بائیک روکی تو اس نے پیچھے سے ہاتھ مار کر میری تلاشی لی اور بہت آرام سے میرا پستول نکال لیا لیکن اس نے اسی پر اطمینان محسوس نہیں کیا تھا بلکہ اس نے میری پوری تلاشی لی۔ پھر مطمئن ہوکر بائیک سے اتر آیا۔ میں نے اتر کر بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کی اور اس سے پوچھا۔

''فتح خان تم نے بہت غلط موقع پر مداخلت کی ہے۔''

وہ سردی کی مناسبت سے گرم پینٹ شرٹ اور بھاری جیکٹ میں تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کے بر خلاف میرا خیال ہے میں نے بالکل ٹھیک موقع پر مداخلت کیا ہے اندر چلو۔''

وہ مجھے پارک میں لے جارہا تھا اس کا مطلب تھا اس کا ارادہ سچ مچ کچھ گفتگو کرنے کا تھا۔ ہم ایک ایسے گوشے میں آئے جہاں دور تک کوئی نہیں تھا ویسے بھی پارک میں صرف دو موٹی خواتین واک وے پر تیز تیز چل رہی تھیں اور اپنا وزن گھٹانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ ناکام کوشش یوں تھی کہ ان کے ہاتھ میں چپس کے بڑے پیک اور انرجی ڈرنک کے ٹن تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ شہلا کا کوئی چکر تھا یا فتح خان نے مجھے یوں اتفاقاً دریافت کرلیا تھا جیسے انڈیا کی دریافت کے ارادے سے نکلنے والے کولمبس نے امریکہ دریافت کرلیا تھا۔ اگر اس نے مجھے اتفاقاً دریافت کیا تھا تو میں اسے شہلا کے بارے میں اپنے عزائم کی بھنک بھی نہیں لگنے دیتا۔ ہم جہاں آئے وہاں دو بنچیں آمنے سامنے تھیں۔ فتح خان نے مجھے ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری پر خود بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے اطمینان سے انکشاف کیا۔

''میرے کو معلوم تھا تم شہلا کے پیچھے ضرور آئے گا۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تو یہ وجہ تھی کہ شہلا نے تصاویر کا سن کر بھی بے تابی نہیں دکھائی تھی۔ کیونکہ فتح خان اس سے رابطے میں تھا اور اس نے شہلا کو جتا دیا تھا کہ تصاویر اس کے پاس ہیں۔ وہ جان گئی کہ میں اسے بے وقوف بنا رہا ہوں میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ''پھر وہ میرے بلاوے پر کیوں آئی؟''

فتح خان نے اپنے چوڑے دانتوں کی نمائش کی۔ ''اسے میں نے کہا تھا وہ میرا حکم نہیں ٹال سکتا ہے۔''

''یعنی وہ تمہارے کہنے پر یہاں چلی آئی جب کہ اسے معلوم تھا کہ میں اسے دھوکا دے کر بلا رہا ہوں اور لازمی بات ہے میرے عزائم بھی درست نہیں ہوں گے۔''

''وہ تیار نہیں تھا لیکن میں نے اسے حکم دیا۔ دوسری صورت میں اس کا تصویر میرے پاس ہے وہ جانتا ہے میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''فتح خان کسی عورت کو بلیک میل کرنے کا یہ نہایت گھٹیا طریقہ ہے اور مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔'' میں نے پُرملامت لہجے میں کہا۔

''ہونی بھی نہیں چاہیے۔'' اس نے آرام سے کہا۔ ''تم ہمارا والد صاحب نہیں ہے جو ہم کو اچھی بری سکھائے۔''

''میرے خیال میں تو خود ان میں بھی اچھی بری بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی ورنہ تم کچھ تو سدھرے ہوتے۔''

خلاف توقع فتح خان برا مانے بغیر مسکرایا۔ ''تم نے ٹھیک کہا میں نے تمام برا کام والد صاحب سے سیکھا ہے۔''

''یقیناً سیکھا ہوگا لیکن میں تمہارے خاندانی معاملات پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیا بات کرنے کے لیے اغوا کر کے لائے ہو۔''

''شہباز خان میں تم سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہے؟''

''کیسا معاہدہ؟......اس بینک لاکر کے بارے میں جس میں پروفیسر کا بلیک میلنگ اسٹف ہے۔''

''اس پر لعنت ہو۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''یہ عورت ہم کو پہلے بھی پاگل بنانے کا کوشش کیا لیکن فتح خان ان چکروں میں نہیں آتا ہے۔''

''یعنی تمہیں لاکر یا اس کے سامان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لاکر تک رسائی میں۔''

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھی اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''پر ادھر بینک میں گھسنا اتنا آسان بھی نہیں ہے اگر بینک والوں کو پتا چل گیا تو ممکن ہے وہ پولیس کی مدد حاصل کر لے اور ممکن ہے پولیس آ کر لاکر کھلوا لے۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

''اگر یہ دھمکی ہے تب بھی تم کو غور کرنا چاہیے اس پر۔'' اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

ظاہر ہے وہ دشمن تھا اور دشمن سے آدمی اچھی توقع نہیں کر سکتا ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میں بھی لاکر کے چکر میں ہوں اور اپنے بریف کیس کا صرف بہانہ کر رہا ہوں۔ اگر وہ ایسا سمجھ رہا تھا تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں تھا اس طرح اس کی توجہ بریف کیس کی اہمیت کی طرف نہیں جاتی۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا اب بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں وہ ہیرے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جو برٹ شا نے کہیں پہاڑوں میں چھپا رکھے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ہیرے حاصل کرنے میں، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''تم برٹ شا کو آمادہ کر سکتے ہو کہ وہ مجھے اس جگہ تک لے جائے۔''

''برٹ شا تمہارے قبضے میں ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اب اس کا ہوش و حواس کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے تو وہ کس طرح ان ہیروں تک رہنمائی کر سکتا ہے؟''

''مجھے شبہ ہے وہ مکاری کر رہا ہے۔''

''شبہ ہے یعنی تم نے اس کی مکاری جاننے کے لیے ہر ممکن حربہ آزما کر دیکھ لیا ہے؟''

''تقریباً۔'' فتح خان کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''ایک بار تو وہ مر ہی گیا ہوتا لیکن زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔''

''فتح خان اگر وہ تمہاری کوشش کے باوجود نہیں بتانے کو تیار ہے تو میں کس طرح اس سے یہ بات معلوم سکتا ہوں۔''

''تم نہیں کر سکتے ہو لیکن برٹ شا کی بیٹی تو کر سکتی ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ایمن شا۔'' میں چونکا۔ ''تم اس کے بارے میں جانتے ہو وہ کہاں ہے؟''

اس گفتگو کے دوران فتح خان کا ایک ہاتھ مستقل اپنی جیکٹ کی جیب میں تھا اور اس کا ابھار میری طرف اشارہ کر رہا تھا۔ فتح خان میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا وہ پھر سکرایا۔ ''تم اس سے اتنا انجان نہیں ہے جتنا بنتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارا اس سے رابطہ ہے اور وہ لڑکی تم کو چاہتا بھی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کئی برسوں سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے اور دوسرے چاہنے والی بات فضول ہے۔ میں نے تم سے بچا کر اس کی مدد کی تھی اور وہ شکر گزار تھی۔''

اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ ''اگر تم اسے بتائے گا کہ تم اس کے باپ کے بارے میں جانتا ہے تو وہ دوڑا دوڑا آئے گا۔ پھر اس کے باپ کو جب اس کا صورت دکھائی دے گا تو اس خنزیر کا دماغ ٹھکانے پر آ جائے گا اور وہ ہم کو فنا فٹ ہیروں کا پتا بتا دے گا۔''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے برٹ شا کو پاس سے دیکھا ہوا ہے۔ ہیرے اس کے لیے دولت نہیں ہیں بلکہ یہ اس کے پاس کسی کی امانت ہیں اور وہ ہر قیمت پر اس امانت کو اس کے مالکوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تم نے اسے سمجھا ہی نہیں ہوا۔ وہ اَنا کا مارا انگریز ہے جس کے لیے اپنی زبان اور عہد ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو بہت پہلے تمہارے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔''

''ابھی تک وہ اپنے اوپر برداشت کر رہا ہے جب معاملہ اس کی بیٹی کا آئے گا تو وہ ضرور بتائے گا۔''

''میرے خیال میں تو یہ ممکن نہیں ہے اور اگر تم مجھ سے توقع کر رہے ہو کہ میں ایمن کو بلاؤں گا اور وہ چلی آئے گی تو تمہاری دونوں توقعات احمقانہ ہیں۔''

''ہم احمقانہ بات اور کام کرتا ہے۔'' وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ ''شہباز خان ایک بات تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر تم بینک لاکر کا چیز لینا چاہتا ہے تو تمہیں میرا مدد کرنا ہوگا ورنہ تم بھی اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے گا۔ تم جانتا ہے میں کیا کر سکتا ہے۔''

''کیا کرو گے تم؟...... اس بارے میں پولیس کو بتا دو گے؟'' میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہم کیا کرے گا یہ تم جلد دیکھ لے گا۔''

''یہ بتاؤ تمہیں شہلا کی پروا نہیں ہے۔ وہ اب تک میرے ساتھیوں کے قبضے میں جا چکی ہو گی۔''

''بے شک جائے اب اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا اور الٹے قدموں پارک کے دوسرے دروازے کی طرف جانے لگا۔ ''شہباز خان اپنی جگہ سے اس وقت تک مت ہلنا جب تک ہم یہاں سے نکل نہ جائے۔''

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ ''میں تمہارے قابو میں ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''شہباز خان یہ میری طرف سے دشمنی ختم ہونے کا ثبوت ہے۔'' وہ رک گیا۔ ''پر یاد رکھنا اب معاملہ تم پر ہے۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو پرانے حساب دوبارہ کھل سکتے ہیں۔''

''میں ہنسا۔'' تم گن پوائنٹ پر دشمنی ختم کر رہے ہو۔''

''تم چاہو تو ایسا ہی سمجھو وہ ہیرے میرے لیے بہت اہم ہیں اور اب میں ان سب چکروں سے نکل جانا چاہتا ہوں جب تک یہاں رہوں گا میرا اور تمہارا سامنا ہوتا رہے گا۔'' اس نے کہتے ہوئے اپنی جیکٹ سے میرا پستول نکال کر اس میں سے میگزین نکال کر جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا اور پستول اس سے مخالف سمت میں اچھال دیا۔ شکر ہے اس کی یہ کارروائی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ دونوں موٹی خواتین دور تھیں اور شاید اب پارک سے جا رہی تھیں۔ یہ کام کرتے ہی فتح خان پھرتی سے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا اور جب تک میں پستول میں میگزین ڈال کر دروازے تک پہنچتا ایک گاڑی دور جا چکی تھی اور صرف اس کی بریک لائٹس نظر آ رہی تھیں۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر واپس آیا۔ فتح خان نے مجھے یہیں لانے کا سوچا تھا لیکن میں نے خود تجویز پیش کر کے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اب میں بائیک لے کر اس کے پیچھے جاتا تو مجھے بہت طویل چکر کاٹ کر جانا پڑتا اور پارک سے نکلنا ممکن نہیں تھا یہاں بائیکس روکنے کے لیے مخصوص رکاوٹیں بنائی گئی تھیں۔ میں نے نکلنے سے پہلے موبائل پر سفیر کا نمبر ملایا اور وہ میری آواز سنتے ہی چلایا۔

''شوبی کہاں ہے یار؟''

''پھنس گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کام ہو گیا؟''

''بہت آسانی سے ہم نے اسے روکا اور گاڑی میں ڈال لیا کسی نے نہیں دیکھا۔ ایاز اور وسیم اسے لے گئے ہیں۔ میں تجھے تلاش کر رہا ہوں۔''

''تُو اب گھر روانہ ہو جا میں پیچھے آ رہا ہوں اور دیکھ تعاقب کا بہت خیال رکھنا۔ دشمن بھی ہوشیار ہے۔''

''مرشد؟'' وہ فکرمند ہو گیا۔

''نہیں فتح خان۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ کر ایاز کا نمبر ملایا۔

''آپ کہاں رہ گئے تھے جناب؟'' اس نے بھی میری آواز سنتے ہی سوال کیا۔

''پھنس گیا تھا۔'' میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔ ''اب ٹھیک ہوں تم سناؤ؟''

''ہم اسے لے جا رہے ہیں۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''تعاقب کا مکمل خیال رکھنا اگر ضرورت پڑے تو اِدھر اُدھر چکراتے رہو اس کے پیچھے فتح خان تھا۔''

''اوہ۔'' وہ تشویش سے بولا۔ ''پھر تو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''شاید اب کوئی پیچھے نہ ہو لیکن تم لوگ یہ سوچ کر اطمینان کرو کہ کوئی تعاقب کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' اس نے کہا تھا۔ میں نے وسیم کو اس مکان کا پتا سمجھا دیا تھا اور پھر وہ علاقہ اس کا دیکھا ہوا تھا اس لیے امید تھی کہ اسے مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ایاز مکان کی

چابیوں کے دو سیٹ اور بنوالایا تھا اس لیے کوئی بھی آسانی سے جا سکتا تھا۔ ایاز سے بات کر کے میں کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں، میں نے عبداللہ کو کال کر کے اس سے کہا کہ وہ شہلا کی کوٹھی سے اپنا آدمی واپس بلوا لے۔ میں پہنچا تو سفیر پہلے ہی موجود تھا اور گیٹ پر بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی لپکا۔

''سواری آ گئی جناب کی......؟''

''بس یار میں نے کوئی پنگا نہیں لیا تھا۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ضرور پنگا آپ کو لینے آیا ہوگا۔'' وہ سخت طیش میں تھا۔

''ہاں تُو یہ کہہ سکتا ہے میں نے نکلنے کے لیے بائیک اسٹارٹ کی تھی کہ فتح خان پیچھے آ کر بیٹھ گیا نہ جانے کب اور کیسے اس نے مجھے تاڑ لیا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا اور اس کے بعد کی کہانی میں نے اسے وہیں کھڑے کھڑے سنا دی میں نہیں چاہتا تھا کہ خواتین کو اس کا علم ہو اور وہ بلا وجہ کے اندیشوں میں دبلی ہوں۔

''اندر اب اس کا ذکر مت کرنا۔''

ہم اندر آئے تو وہ سب لاؤنج میں موجود تھے۔ ہمیں ہنستے مسکراتے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔

سعدیہ نے بے تابی سے کہا۔ ''وسیم کہاں ہیں؟''

''تمہارے حکم کا غلام فی الحال کام کر رہا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

''توبہ ہے شوبی بھائی کیسی باتیں کر رہے ہیں وہ میرے شوہر ہیں۔''

''بس یہی کہہ کر تم لڑکیاں ان کو سر پر چڑھا لیتی ہو اور آخر میں پاؤں کی جوتی بن کر روتی ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔ ''یاد رکھو شوہر قابو میں رکھو اور اپنی اوقات میں رکھو کیوں مونا میں نے ٹھیک کہا نا۔''

''جی شوبی۔'' اس نے مستعدی سے تائید کی۔

سفیر نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''بکواس نہ کر کل کو تیری بھی شادی ہوگی اور میں یہ پٹی تیری بیوی کو بھی پڑھا سکتا ہوں۔''

''شوق سے پڑھانا۔'' میں نے قالین پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ تیری بیوی کی طرح نہیں ہے بہت سادہ سی لڑکی ہے۔''

''شوبی۔'' مونا نے احتجاج کیا۔ ''میں بھی گھریلو لڑکی ہوں۔''

''تم ابھی تک بیٹھی ہوئی ہو نہ چائے نہ پانی اور اس پر یہ دعویٰ کہ گھریلو لڑکی ہو۔'' میں نے کہا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

''سوری شوبی ابھی لائی۔''

لیکن سعدیہ اس سے پہلے جا چکی تھی۔ بیتو جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کیا ہوا ہے کیونکہ اس مہم میں میرا کوئی کردار نہیں تھا اس لیے میں نے سفیر کی طرف اشارہ کر دیا۔ ''اس سے پوچھو۔''

''کیا بتاؤں کیا خاتون نکلیں۔'' سفیر نے سرد آہ بھرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا کیونکہ مونا لاؤنج سے جا چکی تھی۔ ''ہم نے آگے سے گاڑی روکی اور ایاز نے پیچھے سے راستہ بند کر دیا اس کے بعد اسے ہینڈز اَپ کر کے ایاز والی گاڑی کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اسی کی شال سے باندھنے پڑے تھے کیونکہ کسی بقراط

کورتی لے جانے کا خیال نہیں آیا۔"

"اور اسی وجہ سے تجھ پر اس کی خوبیاں آشکارا ہوئیں۔" میں ہنسا۔"میں جانتا ہوں شال تلے اس نے حشر ساماں قسم کا لباس پہن رکھا ہوگا۔"

"ایسا ویسا حشر ساماں۔" سفیر نے دوسری سرد آہ بھری۔"ہم تینوں ہی ساکت رہ گئے تھے۔"

اسی لمحے مونا پانی لے کر اندر آئی اور اس نے آخری جملہ سن لیا تھا۔"کیوں ساکت رہ گئے؟" اس نے مجھے گلاس تھمایا۔

"یہ اپنے میاں سے پوچھو۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم بتاتا ہے۔" بیتو نے نادان دوست کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔"سفیر بھائی، وسیم بھائی اور ایاز بھائی شہلا کو دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔"

اس پر مونا نے کاٹ دار انداز میں سفیر کی طرف دیکھا اور ایسے ہی کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔"کیوں ساکت کیوں رہ گئے تھے کیا پہلے کوئی عورت نہیں دیکھی۔"

سفیر بوکھلا گیا تھا۔"یہ بات نہیں ہے یہ بیتو بکواس کر رہا ہے۔"

"ہم بکواس نہیں کرتا ہے۔" وہ برا مان کر بولا۔"ابھی آپ شوبی بھائی کو کیا بتا رہا تھا کہ آپ نے ایسا خاتون نہیں دیکھا ہے۔"

مونا برہمی سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے رخصت ہوئی اور بیتو نے بھی ہوشیاری دکھائی اور اس کے ساتھ ہی نکل گیا اسے معلوم تھا کہ اب سفیر کا عتاب اس پر آئے گا۔ بیتو کے ہاتھ سے نکلنے پر اس نے بھنا کر میری طرف دیکھا۔"انڈیا سے لانے کے لیے یہی ایک نمونہ ملا تھا سالا بن کر بھی دشمنی سے باز نہیں آیا۔"

"نہیں سعد یہ بھی تو آئی ہے۔" میں نے کہا۔"اور اس بے چارے کا کیا قصور ہے آپ نے یہی سب تو فرمایا تھا۔"

"اب کئی دن تک اس کا منہ سیدھا نہیں ہوگا۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔"یار تُو کیسا شوہر ہے آدمی تو آدم خور شیرنی کو قابو کر لیتا ہے اور تُو ایک ایسی عورت سے ڈر ڈر کر جی رہا ہے جو تجھ سے محبت کرتی ہے۔"

سفیر سوچ میں پڑ گیا۔"کہہ تو ٹھیک رہا ہے اور میں کون سا اس سے بے وفائی کرنے جا رہا ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں بس اسے گاڑی میں ڈالا اور لے گئے اس کی گاڑی کو کسی نے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی پولیس کو اس پر ہمارا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"

"لیکن یار ہمارا تو پلان تھا کہ ہم فتح خان کے آدمی بن کر اسے دھمکائیں گے لیکن فتح خان تو خود اس کے پیچھے تھا۔"

"اب اس سے کھل کر بات کریں گے۔" سفیر بولا۔

میرے موبائل کی بیل بجی تو میں بولتے ہوئے رک گیا۔ وسیم کی کال تھی اس نے کہا۔"ہم پہنچ گئے ہیں اور

اسے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے لیکن ایک مسئلہ ہے یہاں سردی سے بچنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''ایاز کو واپس بھیجو ہم بھی اس کے ساتھ آرہے ہیں اور چیزیں بھی لیتے ہوئے آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

''وہ والا سامان بھی؟'' وسیم کا اشارہ گولہ بارود کی طرف تھا۔

''وہ بھی لے آئیں گے۔''

''میں ایاز کو بھیجتا ہوں لیکن کھانے کو بھی لیتے آیئے گا۔''

ان لوگوں نے کھانا بنالیا تھا۔ وہ انہوں نے پیک کر دیا۔ اس کے علاوہ کمبل، تکیے، پانی کی بوتلیں اور بعض ضروری اشیا ساتھ رکھ لیں۔ گولہ بارود والا بکس بہت بھاری تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اسے ایاز والی جیپ کے پچھلے حصے میں سوار کر دیا گیا۔ جب تک ایاز آیا ہم کھانا تقریباً کھا چکے تھے۔ وہ بھی شریک ہو گیا کیونکہ لے جاتے ہوئے کھانا ٹھنڈا ہی ہو جاتا۔ کھانے کے دوران مجھے ایک خیال آیا تھا۔ جب وہ دونوں برتن اٹھا کر لے جانے لگیں تو میں نے سفیر اور ایاز سے کہا۔

''ابھی ہم چلے جائیں گے تو یہ دونوں اکیلی ہو جائیں گی؟''

''اکیلی کیوں۔'' سفیر نے کہا۔ ''بیتو ہو گا اور ایاز بھی رک جائے گا۔''

''میرا خیال ہے آپ رک جائیں۔'' ایاز نے جلدی سے سفیر سے کہا۔ ''میں شہباز صاحب کے ساتھ جاتا ہوں۔''

مجھے یہ خیال اس لیے آیا کہ آج ہی میر فتح خان جیسے عیار سے ٹکراؤ ہوا تھا اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا وہ اس جگہ تک رسائی بھی حاصل کر سکتا تھا۔ اسے ہر قیمت پر وہ ہیرے درکار تھے جن کے بارے میں صرف برٹ شا جانتا تھا اور وہ اذیت سے بچنے کے لیے پاگل بن گیا تھا۔ اب فتح خان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ ایمن کی مدد سے اس کے باپ کو مجبور کرے۔ وہ پہلے بھی یہ کام کر چکا تھا اور اسے امید تھی کہ اس بار بھی وہ اپنا کام نکلوا لے گا لیکن ایمن کو یہاں بلانے میں اسے میری مدد درکار تھی اور مجھے اس کام پر مجبور کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ میرے کسی ساتھی کو قابو کر لیتا اور اس کی مدد سے مجھے مجبور کرتا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ فتح خان کا اصل مقصد یہی تھا۔ وہ میرا ٹھکانہ جاننا چاہتا تھا لیکن آتے ہوئے میں نے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا۔ میں کئی ویران سڑکوں سے گزرا تھا جہاں دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ غور و فکر کرتے ہوئے اچانک ہی ایک خیال الہام کی طرح ذہن میں آیا اور میں نے کہا۔

''سب ہوشیار ہو جاؤ...... ہتھیار نکال لو شاید دشمن یہاں آچکا ہے۔''

انہوں نے سوال جواب میں وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ مجھے کیوں اور کیسے پتا چلا انہوں نے اسلحہ نکال لیا تھا۔ مونا اور سعدیہ کے پاس بھی پستول تھے۔ میں نے بیتو سے کہا وہ چھت پر جائے اور آس پاس دیکھ کر موبائل فون پر اطلاع کرے وہ چھت پر ہی رک کر نگرانی کرے۔ ایاز اور سفیر کو آگے اور پیچھے کے لان کی نگرانی پر مامور کر کے میں ایک چھوٹی لیکن تیز روشنی والی ٹارچ کے ساتھ پورچ میں آیا جہاں بائیک کھڑی تھی اور میں نے ٹارچ کی روشنی میں اس کے ان حصوں کا معائنہ شروع کر دیا جو عام طور سے نظر نہیں آتے ہیں۔ جہاں تک نظر کی رسائی ممکن نہیں تھی وہاں میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔

آخر پچھلے مڈ گارڈ کے اندر والے مڑے حصے میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے ایک ہلکا سا ابھار محسوس ہوا اور اسے ہلانے کی کوشش کی تو وہ دھات سے سختی سے چپکا ہوا۔ میں نے جھک کر دیکھا اور پھر انگلیوں سے گرفت کر کے اسے بڑی مشکل سے مڈ گارڈ سے الگ کیا۔ یہ بہت طاقتور مقناطیس تھا۔ سامنے آتے ہی میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ یہ سگنل دینے والا آلہ تھا جو سگنل کی مدد سے کسی کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ میں نے اسے مٹھی میں دبائے اندر آیا جہاں مونا موبائل پر بیتو سے رپورٹ لے رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''بیتو بتا رہا ہے کچھ چکر ہے۔''

میں نے موبائل لیا۔ ''کیا ہوا بیتو؟''

''شوبی بھائی......ادھر گلی کے کونے پر ایک گاڑی کھڑی ہے اس میں دو افراد موجود ہیں۔''

''اس کے علاوہ؟''

''پچھلی گلی میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی موجود ہے کبھی کبھی سایا حرکت کرتا نظر آتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ہم دونوں طرف سے گھر چکے تھے۔ ''بیتو پوری طرح ہوشیار رہو اور اوپر کی ساری روشنیاں بجھا دو۔ میں ایاز کو بھی اوپر بھیج رہا ہوں۔''

ایاز کو اوپر بھیج کر میں نے سفر کو اندر بلایا اور اسے سگنل دینے والی ڈیوائس دکھائی۔ ''یہ اس حرامزادے نے اس وقت لگائی جب بائیک پر میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے آدمی باہر آ چکے ہیں۔''

خلاف توقع سفیر ہراساں نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا ہوا ہمیں پہلے پتا چل گیا۔ اب ہم دشمن کی چال اس پر الٹ دیں گے۔''

''وہ کیسے؟''

''پہلے ہم پچھلی گلی والوں کو چھاپ سکتے ہیں اور اس کے بعد آرام سے نکل جائیں گے۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''اس سے بہتر نہیں ہے ہم سامنے والوں کو قابو کریں۔''

''لیکن کیسے وہ گاڑی میں موجود ہیں جب کہ پچھلی گلی والے پیدل ہیں۔''

''مونا کا مسٹر براؤن کس دن کام آئے گا۔'' میں نے کہا تو سفیر اچھل پڑا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے۔''

میں نے سوچا اور فوری ایک پلان تشکیل دے دیا۔ میں نے مونا سے کہا۔ ''ہمیں براؤن کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''آپ جو کہیں گے میں اسے سمجھا دوں گی۔'' وہ بولی۔

''میں تو بغیر کہے سمجھ جاتا ہوں۔'' سفیر نے کہا تو مونا غرائی۔

''آپ مجھ سے بات نہ کریں۔''

''پلیز بعد میں لڑنا۔'' میں نے کہا اور ان کو اپنی بات سمجھائی۔ مونا سمجھ گئی اس نے ایک ایسی سم سے پولیس ہیلپ لائن کو کال کی جو ہمارے عام استعمال میں نہیں آتی تھی۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے اور کوٹھی کے سامنے ایک مشکوک کار میں دو ڈاکو نظر آنے والے افراد موجود ہیں۔ مونا نے پتا کونے والی

کوٹھی کا دے دیا تھا جس کے ساتھ کار موجود تھی۔ یہ اسلام آباد کا علاقہ تھا اس لیے پورا امکان تھا کہ جلد یا بدیر پولیس آئے گی۔ میں اور بیتو حرکت میں آنے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ مونا باہر براؤن کو سمجھا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا تھا۔ براؤن تربیت یافتہ کتا تھا اور بات سمجھ لیتا تھا۔ بیتو بولا۔

''مونا دیدی بہت ہوشیار ہے براؤن کو کیسے سمجھا تا ہے۔''

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ''میری بہن تو بڑے بڑوں کو سمجھا چکی ہے یہ تو معمولی کتا ہے۔''

سفیر نے گھورا لیکن کچھ کہا نہیں تھا۔ اب تک میں اکیلا ہی جدوجہد کر رہا تھا۔ اپنے پیاروں سے دور اور ہمدردوں سے زیادہ دشمنوں کی منحوس صورتیں دیکھنے کو ملا کرتی تھیں۔ ایک مسلسل ٹیشن میں زندگی تھی لیکن جب یہ لوگ آئے اور مجھے ملے تو مجھے لگا جیسے میری زندگی مکمل ہوگئی ہو۔ اب میں ہنستا بھی تھا اور مذاق بھی کرتا تھا۔ مذاق کا کوئی برا نہیں مانتا تھا اور اس معاملے میں ہونے والی ساری لڑائیاں نورا کشتی ہوتی تھیں۔ مونا براؤن کو سمجھا کر اندر آئی۔ اس نے پوچھا۔

''تمہارا کا کیا ارادہ ہے؟''

''جیسے ہی براؤن ان پر چڑھائی کرے گا ہم پیچھے سے نکل آئیں گے اور کوشش کریں گے کہ کوئی زندہ ہاتھ آ جائے۔''

مونا فکرمند ہوگئی تھی۔ ''گولیاں چلنے کا امکان ہے؟''

''وہ کب نہیں ہوتا بی بی اب تو دو تین دن فائرنگ کی آواز نہ سنوں تو زندگی پھیکی اور بے رونق لگنے لگتی ہے۔''

''تم کو عادت ہوگئی ہے۔''

''بس یہی سمجھ لو۔'' میں نے پستول پر سائلنسر چڑھایا اور بیتو کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایاز اوپر تھا اور سامنے والی کار کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے اس سے موبائل پر رابطہ کیا۔ ''کوئی سرگرمی؟''

''نہیں جناب خاموشی ہے۔''

''جیسے ہی پولیس کی آمد ہو خبردار کرنا۔''

''آپ بےفکر رہیں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ سفیر کو میں نے مکان کے اندر رہنے کو کہا تھا کہ اگر کسی طرح دشمن اندر آنے میں کامیاب ہو جائے تو عورتوں کی حفاظت کے لیے کوئی نہ کوئی ہو۔ میں اور بیتو عقبی دروازے کے ساتھ تھے اور براؤن ہمارے ساتھ تشریف فرما تھا۔ اگرچہ اس کا رویہ نہایت دوستانہ تھا اور اس نے مجھے دیکھ کر دُم ہلا کر خیرسگالی کے جذبے کا اظہار کیا تھا یعنی وہ میری فرینڈلی لات اسی طرح فراموش کر چکا تھا جیسے ہم امریکہ کی دی ہوئی چوٹیں اور عزت افزائی فراموش کر دیتے ہیں۔ بہرحال میرا اب اس سے وہ سلوک کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا جو امریکہ آئے دن ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ سیاست ایک بڑا دکھی موضوع ہے اور پاکستانی آج تک فیصلہ نہیں کر سکے کہ ان کو زیادہ دکھ اندرونی سیاست نے دیئے ہیں یا بیرونی سیاست نے۔ شاید دونوں طرف سے دکھوں کا تناسب برابر ہے۔ بیتو نے میرے غور و فکر میں خلل ڈالا۔

''شوبی یہ لوگ کب آئے گا؟''

''کون لوگ؟''میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

''پولیس اور کون؟''

''یار ہماری پولیس تو قتل کی اطلاع پا کر بھی پورے سکون سے آتی ہے یہاں تو صرف دو مبینہ ڈاکوؤں کی اطلاع ہے اور ممکن ہے وہ چیک کر رہے ہوں کہ ان کے حصے دار ہیں یا کوئی اور ان سے بالا بالا کارروائی کر رہا ہے۔''

بیتو حیران ہوا تھا۔''پولیس بھی ڈاکو سے ملا ہوتا ہے۔فلموں میں تو دونوں دشمن ہوتا ہے۔''

''برخوردار سوائے فلموں کے ہر جگہ پولیس اور ڈاکو ساتھی ہوتے ہیں۔''میں نے حقیقت حال بیان کی۔''ایک حالیہ اخباری رپورٹ کے مطابق پڑنے والے ستر فی صد ڈاکے پولیس کے غائبانہ اور بعض اوقات عملی تعاون سے پڑتے ہیں۔اور کچھ وارداتوں میں تو خود پولیس اہلکار ڈاکوؤں کے گیٹ اَپ میں کام کر جاتے ہیں۔ بنا کر ڈاکوؤں کا ہم بھیس......

ہم اتنی آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے کہ ہمیں خود بھی مشکل سے سنائی دے رہی تھیں آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ابھی تک پولیس کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔مجھے خیال آیا کہ شہلا کے اغوا کی کارروائی کی طرح کیوں نہ ہم آپس میں موبائل اور ہینڈ فری کی مدد سے منسلک ہو جائیں اس طرح ہم دشمن سے بہت مؤثر طریقے سے نمٹ سکتے تھے۔میں نے بیتو کو اس مشن کے لیے روانہ کیا۔موبائل سب کے پاس تھے اس نے ہینڈ فری پہنچائے اور مجھے بھی ایک ہینڈ فری لا دیا کیونکہ میرے موبائل کا ہینڈ فری فتح خان نے کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ہینڈ فری لگا کر میں نے سب کو کانفرنس میں لیا۔فوراً ہی ایاز نے کہا۔

''پچھلی گلی سے پولیس کار کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔''

''ہوشیار ہو جاؤ۔''میں نے بیتو سے کہا اور اس نے براؤن کو تھپکی دی تو وہ ہوشیار ہو گیا تھا۔جیسے ہی ایاز نے بتایا کہ پولیس کار گلی میں داخل ہو کر مشکوک کار کے پاس رکی ہے۔میں نے عقبی دروازہ کھولا اور براؤن باہر نکل گیا۔فوراً ہی اس کے غرانے اور کسی کے چلانے کی آواز آئی۔میں اور بیتو ایک ساتھ نکلے۔میرا پستول پوری طرح تیار تھا۔پچھلی گلی زیادہ روشن نہیں تھی اور مجھے وہ شخص فوراً نظر آ گیا جس پر براؤن غرا رہا تھا۔وہ دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ براؤن کی طرف تھا۔

وہ فائر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ آواز پورے محلے کو متوجہ کر لیتی اور وہ یہاں صرف نگرانی کر رہا تھا۔ تب اس نے مجھے دیکھا تو سمجھ گیا کہ پکڑا گیا ہے اس نے پستول کا رخ میری طرف کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ں سے پہلے میرے پستول سے بے آواز شعلہ لپکا اور اس کے پستول والے بازو میں اتر گیا۔اس نے کراہ کر زو تھاما۔پستول چھوٹ گیا تھا۔عین اسی لمحے گلی کے سرے سے کوئی بھاگا اور بیتو اس کے پیچھے لپکا۔میں نے تب سے پکار کر کہا۔''ہوشیاری سے وہ بھی مسلح ہو گا۔''

زخمی ہونے والا نوجوان تھا اور شاید فتح خان کی طرح پٹھان تھا۔گورا چٹا اور تیکھے نقوش والا۔مجھے افسوس اتھا۔میں نے اس کا پستول اٹھا لیا اسے براؤن نے گھیر رکھا تھا۔میں نے نوجوان سے کہا۔''ہاتھ اوپر کرو اس ے پہلے میں تمہارے دوسرے بازو پر بھی گولی مار دوں۔''

میرے لہجے سے اس نے جان لیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور ایک عدد گراری والا چاقو برآمد کیا۔ پستول اس کے پاس ایک ہی تھا۔ میں نے ایاز سے پوچھا۔ ''آگے کی کیا صورتِ حال ہے؟''

اس نے رپورٹ دی۔ ''پولیس نے ان دونوں کو گاڑی سے اتار لیا ہے اور پوچھ گچھ کر رہی ہے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ انہیں گرفتار کر کے لے جائے گی۔''

''یہاں ایک پکڑا گیا ہے اور دوسرا بھاگ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بیتو اس کے پیچھے گیا ہے۔''

اسی لمحے بیتو آ گیا۔ ''وہ بھاگ گیا ہے۔ اس نے ایک گاڑی کھڑی کی تھی اس میں نکل گیا ہے۔''

اس پر زخمی نوجوان کے منہ سے مادری زبان میں ناگفتنی نکل گئی تھی اور یہ یقیناً خاص گالیاں تھیں کیونکہ پشتو مجھے بھی آتی ہے۔ میں اور بیتو اسے گھیر کر اندر لے آئے۔ وہ زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا گولی بس گوشت پھاڑتی نکل گئی اور ہڈی بچ گئی تھی۔ سفیر نے اس کے زخم کا معائنہ کیا اور پھر مدر ٹنکچر کی مدد سے صاف کر کے اوپر سے مرہم لگی پٹی رکھ کر کپڑا لپیٹ دیا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کر رہے ہیں۔ اچانک ایاز نے کہا۔ ''پولیس واپس جا رہی ہے جناب۔''

''تم نیچے آ جاؤ۔'' میں نے کہا اور اچانک زخمی کی کنپٹی پر گھونسہ مارا اور وہ لڑھک گیا۔ سعدیہ اور مونا اور اچھل پڑے تھے۔

''یہ کیا کیا؟''

''وہی جو دشمن کے ساتھ کرنا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔''

''نکلیں گے کیسے سامنے تو دشمن موجود ہے۔''

''نکل سکتے ہیں۔'' میں نے کہا اور سگنل دینے والے آلے کو زمین پر گرا کر جوتے سے کچل دیا۔ اب وہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ ''سب تیار ہو جاؤ۔ اپنا سامان گاڑیوں میں رکھو۔''

ان لوگوں کا ذاتی سامان تھوڑا ہی تھا۔ وہ ایاز کی جیپ کے پچھلے حصے میں قیدی کے ساتھ آ گیا۔ میں نے اسے بھی مکان پر لے جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے ہمیں سعدیہ اور مونا کو عبداللہ والی کوٹھی پر چھوڑنا تھا۔ گاڑیاں چار تھیں۔ ایک بائیک سمیت ان سب کو لے جانا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ ڈرائیو کرنے والے چار افراد تھے یعنی سفیر، ایاز، مونا اور میں۔ میں بائیک نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اس سے مجھے ابھی کام لینا تھا اس لیے سفیر کی منی پجارو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ دس منٹ میں سارا سامان بار کیا گیا اور اس دوران میں کوٹھی کی تمام بیرونی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ میں نے بائیک پر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک گاڑی سفیر اور ایک ایاز چلاتا۔ تیسری کے لیے مونا کا انتخاب کیا گیا وہ اسلام آباد میں ڈرائیونگ کا تجربہ رکھتی تھی۔ سفیر نے کوٹھی کے تمام دروازوں کو تالے لگا دیئے۔ چابیاں اس کے پاس تھیں۔ اب وہ سب روانگی کے لیے تیار تھے۔

میں نے گیٹ کھولا اور یکے بعد دیگرے تینوں گاڑیاں نکلیں ان کے نکلتے ہی میں نے بائیک باہر کی اور گیٹ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اس وقت تک گاڑیاں گلی کے کونے پر پہنچ گئی تھیں۔ مشکوک گاڑی موجود تھی۔ امکان یہی تھا کہ پولیس مک مکا کر کے واپس چلی گئی تھی۔ جب میں باہر آیا تو اس گاڑی میں موجود افراد بھی روانگی کی

تیاری میں دکھائی دیئے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں اور وہ گھوم کران کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ جیسے ہی وہ گلی سے نکلی میں نے بائیک اسٹارٹ کی۔ بائیک اور میں ابھی تک کیاری کی بیلوں کی آڑ میں تھے۔ یہ سارا علاقہ سیدھی سیدھی گلیوں والا ہے۔ یہاں ہر گلی دو طرف سڑک پر نکلتی ہے اور کوئی راستہ بند نہیں ہے۔ میں مخالف سمت میں روانہ ہوا اور اندازے سے گھوم کران کے پیچھے نکلا۔ اس وقت تک تمام گاڑیاں خاصی آگے جا چکی تھیں۔ سفیر نے اضطراب سے کہا۔ ''شوبی کہاں ہے یار؟''

''پیچھے ہوں......تم لوگوں نے نظر رکھی ہے کوئی اور تو نہیں ہے؟''

''نہیں بس یہی پیچھے آرہے ہیں۔''

میں نے بائیک کو ریس دی اور ایک منٹ سے بھی پہلے اس نے فتح خان کے آدمیوں کی گاڑی کو جا لیا تھا جو سب سے پیچھے تھی۔ میں نے اس طرح پستول نکالا کہ اگر وہ عقبی آئینے میں دیکھ رہے ہوں تب بھی ان کو نظر نہ آئے۔ میں نے ہیڈ لائٹ آف رکھی تھی۔ سڑک پر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی تھی لیکن ہیڈ لائٹ روشن نہ ہونے سے ان کی توجہ عقب کی طرف نہیں جاتی اور اس وقت تو وہ آگے جانے والی گاڑیوں کو اپنی نظر میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چاروں گاڑیاں خاصی رفتار سے جا رہی تھی۔

میں نے بائیک کو ایکسلریٹر دیا اور گاڑی کے قریب جانے لگا۔ یہاں سڑک پر ٹریفک کم تھا اور مجھے امید تھی کہ کسی حادثے کی صورت میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ گاڑی کے نزدیک آتے ہی میں نے پستول سامنے کیا اور اس کے دائیں عقبی ٹائر کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلائیں، شاید پہلی ہی کارگر رہی تھی لیکن باقی بھی نشانے پر لگیں اور ٹائر کا حشر نشر ہوگیا تھا۔ گاڑی کچھ دیر تو سیدھی دوڑتی رہی پھر یک دم گھومی اور کنارے کے ساتھ فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ میں بائیک لہرا کر اس کے برابر سے نکل گیا تھا اور بیک مرر میں مجھے گاڑی الٹتی نظر آئی۔ اس کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ سے زیادہ تھی اور یہ ذرا زیادہ ہوتی ہے اسی وجہ سے ٹائر پھٹنے کے بعد گاڑی ڈرائیور کے قابو میں نہیں آئی تھی۔

''کام ہوگیا۔'' میں نے ایاز اور سفیر کو بتایا۔ ''اور تو کوئی نظر نہیں آرہا ہے؟''

''نہیں اور کوئی نہیں ہے۔'' ایاز نے جواب دیا۔ وہ سب سے آگے تھا کیونکہ عبداللہ کی کوٹھی کا علم اسے تھا۔ میں نے موبائل نکال کران لوگوں سے کال منقطع کی اور وسیم کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ میں نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے؟''

''ہاں......سب ٹھیک ہے وہ چلانے لگی تھی مجبوراً اس کا منہ بھی بند کرنا پڑا۔ آپ ابھی تک آئے نہیں؟''

''یہاں یار چکر ہوگیا تھا۔ فتح خان نے میری بائیک میں سگنل ڈیوائس لگا دی تھی اور اس کے آدمی کوٹھی تک آگئے تھے۔ ان کو چکر دے کر نکلے ہیں ان کو عبداللہ کی کوٹھی پر چھوڑ کر پھر تمہارے پاس آتے ہیں۔''

''ٹھیک آپ پوری تسلی سے آئیں یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''تمہارے اور شہلا کے لیے کھانا لانا ہے اور سوائے لڑکیوں کے باقی سب وہیں آئیں گے۔''

''سامان سارا لے لیا ہے؟''

''ہاں فکر مت کرو سامان سارا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ اب ہم عبداللہ کی کوٹھی سے

کچھ دور تھے۔ اس لیے میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ''عبداللہ تیار ہو جاؤ پورا لشکر آ رہا ہے تمہاری طرف۔''
وہ خوش وہ گیا تھا۔ ''سچ میں جناب؟''
''ہاں یار سچ مچ آ رہے ہیں۔ آ کر ساری بات بتاتا ہوں بس کچھ ہی دور ہیں۔''
جب ہم عبداللہ کی کوٹھی پر پہنچے تو اس کا گیٹ پہلے ہی کھول دیا گیا تھا اور عبداللہ خود دروازے پر موجود تھا۔ ہم بنار کے اندر گھستے چلے گئے اور جیسے ہی میری بائیک اندر آئی عقب سے گیٹ بند ہو گیا۔ جب تک میں ہیلمٹ اتار کر آگے آتا عبداللہ اور ایاز گلے مل رہے تھے۔ پھر سفیر اور بیتو گلے ملے۔ آخر میں وہ میرے گلے لگا اور اس نے شکوہ کیا۔ ''جناب میں تو سمجھا کہ آپ میری کسی خطا پر ناراض ہو گئے ہیں۔''
''ایسا ہو سکتا ہے یار۔'' میں نے کہا۔ ''میں صرف اس لیے یہاں سے دور ہوا تھا کہ یہ جگہ ہماری بنیادی پناہ گاہ رہے اور دیکھو آج میری احتیاط کام آ گئی۔ دشمن نے ہماری عارضی پناہ گاہ تلاش کر لی اور ہم بلا تکلف وہاں سے نکل آئے۔ اگر دشمن یہاں آ جائے تو ہماری مشکلات بڑھ سکتی ہیں۔''
''اوہ۔'' عبداللہ بولا پھر سعدیہ اور مونا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آپ دونوں یقیناً مونا اور سعدیہ بی بی ہیں۔''
''اور آپ عبداللہ بھائی ہیں۔'' مونا بولی۔
''مونا اور سعدیہ عبداللہ ہمارا نہایت مخلص ساتھی ہے۔ یہ تو ہمارے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا کیونکہ یہ یہاں سے ہماری زیادہ مدد کر سکتا ہے۔''
''باتیں ہوتی رہیں گی آپ اندر آئیں۔'' عبداللہ نے کہا اور ہمیں اندر لے آیا۔ وسیع نشست گاہ میں خوش گوار حرارت تھی۔ عبداللہ نے کھانے کا پوچھا لیکن ہم کھا کر آئے تھے اس لیے اس نے چائے اور کافی کا کہہ دیا۔ میں نے عبداللہ کو فتح خان سے ٹکراؤ اور پھر اس کی چالاکی کا بتایا۔ عبداللہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔
''ممکن ہے اس نے ایسی مزید کوئی ڈیوائس پلانٹ کی ہو۔''
میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے۔''
''میں ابھی چیک کرتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔ وہ کہیں گیا اور ایک منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ ایک لمبا اور گول بڑی ٹارچ نما آلہ تھا۔ ''آئیں میرے ساتھ۔''
میں، سفیر اور ایاز اس کے ساتھ پورچ میں آئے جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے آلے سے باری باری تینوں گاڑیوں اور بائیک کو چیک کیا لیکن آلے نے کوئی سگنل نہیں دیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔
''شکر ہے مزید کوئی ڈیوائس نہیں ہے۔''
''یہ درست کام کر رہا ہے؟''
''بالکل جناب یہ دیکھیے۔'' اس نے جیب سے ایک چھوٹا سی ڈیوائس نکال کر اسے ایاز کی جیب کے اندرونی حصے میں لگا دیا اور جب آلہ آن کر کے اس سے چیک کیا تو وہ سگنل دینے لگا تھا۔ میں نے اس سے آلہ لے کر دیکھا۔
''یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔''

''یہ صرف فکس سگنل ڈیوائس کا پتا نہیں چلاتا ہے بلکہ اگر کوئی مائیکروفون بگ کر دے تو یہ اس کا پتا بھی چلا سکتا ہے یوں سمجھ لیں کہ یہ دس میٹر کے دائرے میں تمام ریڈیائی مواصلات کا پتا چلا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسلحے کا سراغ بھی لگا سکتا ہے۔''

''عبداللہ ہمیں اس کی ضرورت ہے یہ کہاں سے ملے گا؟''

''میرے پاس ایسا ایک اور ہے وہ آپ لے جائیں یہ ضروری ہے۔ آج کل جنگ اصل میں آلات سے لڑی جاتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب آپ نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو آپ کو اس قسم کے مزید آلات سے لیس ہونا پڑے گا۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

''سوچیں مت جناب...... میرے پاس ایسے آلات کا ایک سیٹ موجود ہے اور باقی کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔''

عبداللہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس قسم کے آلات جو ہمیں باخبر رکھتے ہیں ان کی موجودگی میں ہم مشکل معرکہ بھی آسانی سے سر کر سکتے تھے جیسے صرف موبائل فون کی مدد سے ہم نے فتح خان کے آدمیوں پر کتنی آسانی سے قابو پا لیا کیونکہ ہمارا آپس میں رابطہ تھا اور ہم بہترین طریقے سے حرکت میں آئے تھے۔ اس طرح کے مزید آلات کی مدد سے ہم خود کو خطرات سے محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر آسانی سے قابو پا سکتے تھے۔ فتح خان کا ساتھی ایاز کی جیپ کے عقبی حصے میں بے ہوش اور بندھا پڑا تھا۔ میں نے پہلے سوچا تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن پھر میں نے اسے فی الحال عبداللہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ عبداللہ کے دو آدمی اسے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر اندر تہہ خانے میں لے گئے جہاں قیدیوں کو رکھنے کا معقول انتظام تھا۔ عبداللہ نے اس کے زخم کی مرہم پٹی کرنے کو بھی کہا تھا۔ ہم اندر آئے تو چائے اور کافی آ چکی تھی۔ عبداللہ نے پوچھا نہیں تھا کہ کون کیا پینا پسند کرے گا اس نے منیر سے سب کے لیے دونوں چیزیں منگوالی تھیں اور اب مونا اور سعدیہ سرو کر رہی تھیں اگرچہ منیر نے سرو کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے اسے چلتا کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''پہلے تمہیں ایک باس ملی تھی اب یہ دو باس ہیں۔''

منیر مسکرایا۔ ''ہمارا تو کام حکم کی تعمیل کرنا ہے جناب ایک دو باس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

مونا نے مجھے گھورا۔ ''ہم کہاں سے باس ہو گئے۔''

''آپ باس ہی ہیں۔'' عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''شہباز صاحب نے بتایا ہے اب آپ یہاں رہیں گی اور آپ جب تک یہاں ہیں یہاں کے تمام معاملات آپ کی مرضی سے چلیں گے۔ اس کوٹھی کے دو حصے ہیں ایک حصہ ہم ملازموں والا ہے وہاں ہمارے کمرے ہیں اور دوسرا حصہ مالکوں کے لیے مخصوص ہے۔''

''ہم میں کوئی مالک اور ملازم نہیں ہے۔'' میں نے اختلاف کیا۔ ''ہاں عورت ہونے کے ناطے یہ یہاں کی باس ہو سکتی ہیں۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔'' عبداللہ مسکرایا۔ ''ورنہ جب آپ آئے تھے تو کیا میں نے آپ سے یہ بات کی تھی۔''

''کوٹھی کے حفاظتی انتظامات کی نوعیت کیا ہے؟''

''یہاں ہمہ وقت آٹھ گارڈز ہیں ان میں سے چار ہر وقت ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ ایک گیٹ پر اور دو کوٹھی کے اوپر اور پچھلے حصے میں ہوتے ہیں ایک کنٹرول روم میں کیمروں کی نگرانی کرتا ہے اگر اسے کسی ضرورت سے ہٹنا پڑے تو وہ منیر کو بلا لیتا ہے۔ تمام گارڈز کا ریڈیو سے آپس میں مستقل رابطہ رہتا ہے۔ دیواروں پر کرنٹ وائرز ہیں اور ان کے ساتھ الارمنگ وائر بھی ہے جو کٹ جائے تو الارم بجنے لگتا ہے۔''

''گڈ تم نے حفاظتی انتظامات پہلے سے بہتر کر لیے ہیں۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

''آدمی کم ہیں لیکن بہترین تربیت یافتہ اور اعتماد کے ہیں۔''

''میرے خیال میں اتنے آدمی بہت ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں سعدیہ اور مونا کے ساتھ بیتو رہے گا۔''

''ہم آپ کے ساتھ جائے گا۔'' بیتو نے فوراً کہا۔

''یار تم ان کے منے بھائی ہو۔'' سفیر بولا۔ ''ان کا دل بہلانا اور ان سے کھانے بنوا کر کھانا۔''

''نہیں......''

''یار بات تو سن لیا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا شناختی کارڈ نہیں ہے۔ عبداللہ تمہارا آئی ڈی بنوائے گا اور پھر ہم سب کے پاسپورٹ بھی بنوانے ہیں۔''

''یہ کام تو بہت آسان ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''چار دن میں آپ سب کے پاسپورٹ بن سکتے ہیں۔''

''ہمارے پاس صرف سفیر اور مونا کا پاسپورٹ ہے۔ وسیم کا غائب ہے میرے پاس ہے لیکن اس پر سفر کرنے کا مطلب جیل جانا بھی ہو سکتا ہے اس لیے مجھے بھی دوسرا پاسپورٹ درکار ہے۔ سعدیہ اور بیتو کا بنوانا ہے لیکن شناختی کارڈ صرف بیتو کا بنوانا ہے۔''

عبداللہ نے ایک کاغذ لیا اور اس پر یہ ساری تفصیلات درج کر لیں۔ اس نے سب کے پاس موجود کارڈز اور معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔ وسیم کا کارڈ اس کے پاس تھا۔ میں نے فون کر کے اس کا نمبر بھی عبداللہ کو لکھوا دیا۔ رات کے بارہ بجنے کے قریب تھے۔ عبداللہ نے مونا اور سعدیہ کے لیے کمرے کھلوا دیئے تھے۔ وہ اپنا سامان رکھنے چلی گئیں۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''ایسا کر تو بھی آج رات یہاں رک جا۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''نیا ماحول ہے مونا گھبرائے نہیں۔''

''تب ایسا کر وسیم کو بھی کال کر کے بلا لے اور چند دن رک جا ہم خود جا کر تیرا نکاح پڑھا کر رخصتی کر کے لے آتے ہیں سب یہاں ہنسی خوشی رہیں گے راجا صاحب کے خرچ پر۔'' سفیر بھنا گیا تھا۔

میں ہنس دیا۔ ''تپتا کیوں ہے یار؟''

''جناب نے بات ہی ایسی کی ہے۔''

بیتو رکنے کے لیے تیار نہیں تھا اسے بڑی مشکل سے روکا۔ میں چاہتا تھا کہ آئی ڈی کارڈ بننے تک وہ عملی میدان سے ذرا دور رہے کیونکہ اگر وہ پولیس کے چکر میں آتا تو کوئی شناختی چیز نہ ہونے کی وجہ سے وہ مشکل میں بھی پڑ سکتا تھا۔ ایک بجے ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو اسلام آباد کی سڑکیں مکمل ویران ہو چکی تھیں۔ شکر ہے

دھند نہیں تھی ورنہ رورو کر ڈرائیونگ کرنا پڑتی۔ ہم آدھے گھنٹے میں مکان پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے وسیم کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ سفیر کی لینڈ کروزر، سفاری اور میری بائیک وہیں چھوڑ دی تھی۔ ایاز کی جیپ میں ہم وہاں سے نکلے تھے۔ منی پجیرو کوٹھی میں تھی۔ اسے ہم بعد میں بھی لا سکتے تھے۔

وسیم دروازے پر منتظر تھا۔ اندر صرف ایک گاڑی کی گنجائش تھی اسی وجہ سے صرف ایک گاڑی لائے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ مکان غیر آباد ہونے کا تاثر برقرار رہے تاکہ کم سے کم لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ وسیم کا بھوک سے برا حال تھا اس لیے اس نے سب سے پہلے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے ٹفن تھما دیا اور وہ باورچی خانے کی طرف لپکا جہاں چولہے موجود تھے۔ میں، سفیر اور ایاز سامان اتار کر اندر لانے لگے۔ پہلے صرف کمبل اور تکیے لانے کا ارادہ تھا لیکن اب ہم بہت کچھ لے آئے تھے۔ مکان میں قالینوں کے نیچے دبیز انڈر لے تھا اس کی وجہ سے بستر اور سٹنگ کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہم نے سارا سامان ایک کمرے میں سیٹ کیا۔ سفیر نے عقل مندی کی تھی اور ایک گیس ہیٹر بھی لے آیا تھا۔ مکان مکمل طور پر سرد تھا۔ رات گزارنے کے لیے گیس ہیٹر ضروری تھا۔ ایاز نے جا کر شہلا والے کمرے میں جھانکا۔ اس کے دروازے کے باہر کنڈی تھی اسے بند کر کے شہلا کو قید کیا جا سکتا تھا ورنہ باقی کمروں میں جدید لاک تھے جو اندر سے بغیر چابی کے بھی بند کیے جا سکتے ہیں۔ ایاز آیا تو کسی قدر فکر مند تھا۔

''کیا ہوا کچھ مسئلہ ہوا ہے؟'' سفیر نے پوچھا۔

''نہیں جناب لیکن اس عورت کو دیکھ کر مجھے ایک خیال آیا ہے کہ فتح خان نے کچھ زیادہ ہی آسانی سے اسے ہمارے حوالے نہیں کر دیا ہے؟''

میں چونکا تھا۔ شاید یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے اس میں بھی اس کی کوئی چال ہو سکتی ہے؟''

''بالکل ہو سکتی ہے کیا ویسا ہی آلہ اس کے لباس میں کہیں چھپایا نہیں جا سکتا ہے؟''

''میرے خدا یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا بالکل ہو سکتا ہے اور وہ اتنا چھوٹا سا آلہ ہے کہ لباس میں بہت آسانی سے چھپایا جا سکتا ہے تم لوگوں نے اس کی تلاشی نہیں لی۔''

''نہیں سرسری سی لی تھی۔'' ایاز نے کہا۔ ''کوئی ہتھیار دیکھنے کے لیے لیکن اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلا۔''

میں نے ہاتھ پر مکا مارا۔ ''اس سے ثابت ہوتا ہے یہ چال ہے۔ ہمیں اس کی تلاشی لینی ہوگی۔''

سفیر نے سوال کیا۔ ''یہ کارِ خیر کون انجام دے گا۔''

''ایاز۔'' میں نے ایاز کی طرف دیکھا تو وہ بدک گیا۔

''مجھے معاف رکھیں جناب میں نے آج تک کسی عورت کو اس طرح ہاتھ نہیں لگایا ہے۔''

''تم نے صرف تلاشی لینی ہے۔''

''تو آپ خود لے لیں۔''

سفیر نے بھی صاف انکار کر دیا اور جب وسیم کھانا گرم کر کے لایا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔ میں بھنا گیا۔

''کیا میں تم لوگوں کو کوئی غلط حرکت کرنے کو کہہ رہا ہوں۔''

وسیم نے کھاتے ہوئے کہا۔''شہباز صاحب سچی بات ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے وہ بڑی خطرناک عورت ہے ابھی جب میں اس کا منہ بند کرنے گیا تھا تو اس نے ایسی گالیاں دیں اور ایسی باتیں کیں کہ اس موسم میں مجھے پسینہ آ گیا۔''

''میں شادی شدہ ہوں۔''سفیر بولا۔''ایسے آدمیوں کو عورتوں سے دور رہنا چاہیے۔''

ایاز پہلے ہی صاف انکار کر چکا تھا۔ مجھے لگا ہم فضول کی بحث کر کے وقت ضائع کر رہے تھے۔ اس قسم کی ڈیوائس کے سگنل کی حد محدود ہوتی ہے اور جب اس کا ریسیور ایک کلومیٹر دور ہوتا ہے تب ہی وہ اس کا سگنل پکڑ سکتا ہے لیکن یہ میرا اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ میں عبداللہ سے سگنل پکڑنے والا آلہ لانا بھی بھول گیا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔''

''صحیح سے دیکھنا یار۔''سفیر نے شرارت سے کہا۔''دیکھنے کی چیز ہے۔''

میں نے اسے گھورا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جب زرین ملی تو یہ سب یہاں نہیں تھے ورنہ میرا صحیح سے ریکارڈ لگتا۔ میں شہلا والے کمرے میں آیا۔ یہاں بھی سردی تھی اگرچہ باہر جیسی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی۔ اس میں بھی وہ بنا شال کے بیٹھی تھی۔ اس کی شال سے ایاز اور وسیم نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے اور منہ بھی بند کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شعلے سے بھڑکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ میں نے اس کا منہ کھولا تو اس سے کیا نکلے گا اس لیے میں نے اس کا منہ کھولنے سے گریز کیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری تلاشی لینے جا رہا ہوں اس لیے کچھ غلط مت سمجھنا۔''

اس نے ناک سے آواز نکالی۔ شاید وہ منہ کھولنے کو کہہ رہی تھی میں نے سوچا اور اسے خبردار کیا۔''ٹھیک ہے میں تمہارا منہ کھول رہا ہوں لیکن اگر تم نے ایک بھی فضول بات کی تو میں منہ دوبارہ بند کر دوں گا۔''

اس نے سر ہلا کر یقین دلایا کہ وہ کوئی غلط بات نہیں کرے گی۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا اتار دیا اس نے چند گہری سانسیں لیں اور بولی۔''شہباز مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی؟''

میں چونکا۔''کیسی امید؟''

''یہی تم اتنی آسانی سے فتح خان کی چال میں آ جاؤ گے۔''

''جب میں نے تمہیں کال کی تو وہ تمہارے گھر میں تھا؟''

''ہاں اور میرے سر پر بھی سوار تھا۔ یہ جناح سپر میں ملنے والا پروگرام اسی کا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں تم سے ملنے جاؤں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے چارے کی طرح استعمال کر رہا ہے اور میں ماری جاؤں گی۔''

''تم جانتی ہو اس نے میری بائیک میں ایک سگنل دینے والا آلہ لگا دیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔''ہاں جانتی ہوں۔''

''مجھے شبہ ہے ایسا ہی آلہ تمہارے لباس میں ہے۔''

''تو تلاش کر لو۔''اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔''چاہو تو لباس اتار کر تلاش کر لو مجھے کوئی فرق

نہیں پڑے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "عزت اور حرمت کا مفہوم تم بہت پہلے بھول چکی ہو۔"

ساڑھی پہننے کے لحاظ سے مشکل لباس ہے لیکن تلاشی کے لحاظ سے یہ مشکل ترین ہے اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا تھا۔ اس کے جسم کی مکمل تلاشی ایک کٹھن ترین مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ وہ مسکراتی رہی اور میں اس سے نظریں چراتا رہا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ مکمل ہوا تھا۔ مجھے بھی وسیم کی طرح پسینہ آ گیا تھا۔ جب میں پیچھے ہٹا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بس تلاشی کر لیا؟"

"سوری۔" میں نے معذرت کی۔

"ذرا میرے ہاتھ کھولنا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں صرف تمہیں دکھانا چاہتی ہوں کہ تم احمق انسان ہو۔"

میں نے سوچا اور اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ اس نے اپنے مختصر سے بلاؤز میں ہاتھ ڈالا اور ویسی ہی ایک سگنل ڈیوائس نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی جو اس کے جسم کی گرمی سے گرم ہو رہی تھی۔ میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔

"یہ تمہارے پاس تھی؟"

"ہاں فتح خان نے مجھے دی تھی۔"

میں نے خود کو سخت احمق محسوس کیا تھا۔ مارے جھجک کے میں نے اس کے جسم کے مخصوص حصوں کی ٹھیک سے تلاشی نہیں لی تھی۔ وہ مسکرائی۔ "اب بولو ہونا احمق۔"

میں نے ڈیوائس کو دیوار پر دے مارا کیونکہ فرش پر دبیز قالین تھا، دیوار پر لگا کر اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اب یہ یقیناً ناکارہ ہو گئی تھی۔ "تم نے ٹھیک کہا میں واقعی احمق ہوں۔"

"لیکن تم فکر مت کرو میں نے اسے تمہارے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوتے ہی ناکارہ کر دیا تھا۔"

میں چونکا۔ "وہ کیسے؟"

"میں نے اسے گریبان سے نکال کر منہ میں رکھ لیا اور اس وقت تک رکھا جب تک تھوک اس کے سرکٹ کے اندر نہیں چلا گیا۔ مجھے ہلکا سا کرنٹ لگا اور یہ ناکارہ ہو گئی۔ یقین کرنے کے لیے تم چیک کر سکتے ہو۔"

میں نے ٹکڑے ہو جانے والی ڈیوائس دیکھی وہ واقعی اندر سے نم ہو رہی تھی۔ "جب اسے ناکارہ بنا دیا تھا تو پھر اپنے پاس کیوں رکھا؟"

"صرف تمہیں یقین دلانے کے لیے کہ میں فتح خان کے ساتھ نہیں ہوں اس کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ پہلے بھی تم نے مجھے اس کے چنگل سے نکالا تھا۔"

ممکن ہے وہ سچ کہہ رہی ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ کوئی چکر ہو۔ "جب تک تمہاری تصویریں فتح خان کے پاس ہیں تم اس سے کس طرح بغاوت کر سکتی ہو؟...... اگر اسے معلوم ہو جائے کہ تم نے اسے دھوکا دیا ہے تو وہ ان تصویروں کی ہزاروں کاپیاں بنا کر شہر بھر میں بانٹ دے گا۔"

''میں مجبور ہوں یہ رسک لینے پر، مجھے یقین ہے وہ کبھی میری جان نہیں چھوڑے گا۔''

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''تم مجھے اس سے بچاؤ میں لاکر تک رسائی میں تمہاری مدد کروں گی۔'' اس کا لہجہ سرگوشی آمیز ہو گیا تھا۔

''یقین کرو میں نے سارا پلان بنالیا ہے اور فتح خان کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی ہے۔ وہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں ڈاکوؤں کی طرح بینک میں گھس کر لاکر کھولوں گی۔''

''میں چونکا۔ ''تب تمہارا کیا پلان ہے؟''

''یہ میں تمہیں اسی صورت میں بتا سکتی ہوں جب تم فتح خان سے میری جان چھڑا دو گے۔''

''فتح خان سے تمہاری جان صرف ایک صورت میں چھوٹ سکتی ہے کہ تمہاری تصویریں تمہیں واپس مل جائیں۔ میں اس سے تصویریں کیسے نکلوا سکتا ہوں۔''

''وہ اس وقت تم سے کوئی بات منوانے کے لیے مرا جا رہا ہے اگر تم اسے سے کہو کہ وہ میری تصویریں واپس کر دے تو وہ کر دے گا۔ ویسے بھی اسے مجھ سے یا اس بینک لاکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا لیکن اس سے پوچھا۔ ''یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اس نے لاکر کے بارے میں کبھی زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی بلکہ وہ اس کے بارے میں بات بھی نہیں کرتا ہے اگر میں بات کروں تو جواب دیتا ہے اور بس۔''

''تب وہ تمہاری کوٹھی میں کس لیے براجمان ہے؟''

شہلا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو وہ کس لیے میرے پاس رکا ہوا ہے۔''

''کیا اس وقت بھی وہ تمہاری کوٹھی میں ہے؟''

''نہیں، جب اس نے مجھے تمہاری طرف بھیجا تھا تو اس کے فوراً بعد وہ کوٹھی سے چلا گیا تھا۔''

''کیسے چلا گیا کیونکہ میرا آدمی تمہاری کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا اور اس نے سوائے تمہارے چوکیدار، ملازمہ اور تمہارے کسی کو نہیں دیکھا۔''

''فتح خان بہت چالاک ہے اس نے جان لیا تھا کہ تمہارا آدمی کہاں سے کوٹھی کی نگرانی کرتا ہے اس نے آنے جانے کے لیے کوٹھی کے پیچھے والا حصہ چن لیا۔ وہیں سے دیوار پھلانگ کر وہ اور اس کے ساتھی آتے جاتے تھے۔''

میں نے خود کو ایک بار پھر احمق محسوس کیا تھا۔ فتح خان جیسے چالاک آدمی کے سامنے میں نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا تھا میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''کیا یہ بھی فتح خان کی چال نہیں ہو سکتی ہے؟''

''کون سی چال؟''

''یہی کہ تم اس کی ہدایت کے مطابق میرا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟''

''ہو بھی سکتا ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔ ''میں تمہیں کسی طرح یقین نہیں دلا سکتی ہوں ہاں تم اپنے طور پر جس طرح چاہے اطمینان کر لو۔''

''ممکن ہے فتح خان نے تمہیں بھی ڈبل کراس کیا ہو وہ اپنے سائے پر بھی بھروسہ کرنے والا شخص نہیں ہے۔اس نے ڈیوائس دینے کے بعد بھی تعاقب کے لیے اپنے آدمی بھیجے ہوں۔''

''وہ ایسا کر سکتا ہے اس کے پاس کئی خطرناک لوگ ہیں۔''اس نے تسلیم کیا۔''لیکن یہ دیکھنا تمہارے آدمی کا کام تھا۔''

ایاز اور وسیم کو یقین تھا کہ کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا ہے۔ میں نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ابھی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں اگر تم نے سچ بولا ہے تو تم اس کے فائدے سے محروم نہیں رہو گی لیکن اگر تم نے ذرا بھی جھوٹ بولا ہے تو یقین کرو تمہیں اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑے گا۔''

''میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ اور منہ کھول دیا تھا۔ اس دوران میں اس نے پاؤں بھی کھول لیے۔ ''دوسرے تم جس جگہ ہو یہاں دور دور تک کوئی تمہاری آواز وفریاد سننے والا نہیں ہے اس لیے مہربانی کر کے چپ کر کے بیٹھنا ورنہ بلاوجہ تمہارا منہ پھر بند کرنا پڑے گا۔''

''میں نہیں آواز نکالوں گی۔''اس نے یقین دلایا۔''لیکن پلیز سردی بہت ہے مجھے کچھ اوڑھنے کو دو اور مجھے بھوک بھی لگی ہے۔''

''تمہیں سب ملے گا بشرطیکہ تم بھی تعاون کرو۔''میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ تینوں میرے منتظر تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں ان کو شہلا کی کہانی سے آگاہ کیا۔سفیر نے سنتے ہی کہا۔

''فراڈ کر رہی ہے یہ عورت۔''

''لیکن ہو سکتا ہے سچ کہہ رہی ہو۔'' وسیم بولا۔''شہباز صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ سگنل ڈیوائس اندر سے بھی گیلی ہے۔''

''ممکن ہے یہ کام اس نے ابھی کیا ہو اور اب ہمیں بے وقوف بنا رہی ہو۔''سفیر نے دلیل دی۔

''تیری بات قابلِ غور ہے۔اب ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا اگر فتح خان کے آدمی یہاں تک آ چکے ہیں تو ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔''

''مجھے یقین ہے کوئی پیچھے نہیں آیا تھا۔'' ایاز نے کہا۔''لیکن اگر ڈیوائس نے کام کیا ہے تو وہ لوگ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔''

''تم اور وسیم جا کر اوپر سے آس پاس کا معائنہ کرو۔'' میں نے ایاز سے کہا۔''ہمارے پاس ایک عدد نائٹ ویژن گلاس بھی ہے۔''

''ہاں ہے۔''وسیم بولا۔''میں ساتھ لے آیا تھا۔''

''اس کی مدد سے دیکھو کیونکہ باہر اس وقت مکمل تاریکی ہے۔''

اس علاقے میں ابھی نئی نئی آبادی ہوئی تھی۔ سڑکیں بن گئی تھیں لیکن ابھی ان پر اسٹریٹ لائٹس نہیں لگی تھیں۔ مکان کے آس پاس تو مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے جا کر کچن میں بچا ہوا کھانا نکالا۔ اس دوران میں سفیر دودھ گرم کر رہا تھا۔ یہ سامان کے ساتھ آیا تھا۔ ہم کھانے پینے کا پورا سامان لائے تھے اور عجلت میں وہاں سے نکلنا

پڑا تو یہ سارا سامان بھی ساتھ لے آئے تھے۔ میں نے منرل واٹر کی ایک چھوٹی بوتل بھی لے لی تھی۔ یہ چیزیں لے کر شہلا والے کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ بھی باتھ روم اٹیچ تھا اور وہ باتھ روم میں تھی۔ میں نے دروازہ بجایا تو اس نے اندر سے کہا۔

''ایک منٹ بس آ رہی ہوں۔'' وہ جلد نکل آئی۔ ''کب سے بند تھی اس سردی میں...... شکر ہے تم نے کھول دیا۔''

''یہ کھانا کھاؤ جب تک میں کمبل لاتا ہوں۔'' میں نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بہت بھوکی تھی اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔ میں اسے کھاتا چھوڑ کر باہر آیا تو وسیم اور ایاز آ چکے تھے۔

''آس پاس دور دور تک سوائے چند آوارہ کتوں کے اور کوئی نہیں ہے۔'' وسیم نے بتایا۔

''مجھے تو آس پاس کے گھر بھی آباد نہیں لگ رہے ہیں چند ایک میں روشنیاں ہیں بس۔'' ایاز نے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے جتنی کم آبادی ہوگی ہمارے لیے اور بھی آسانی ہوگی۔ اسٹیٹ والے نے چالاکی سے کام لیا اور تیار گھروں کو بھی آباد کہہ دیا اس طرح اس نے مکان کی ویلیو بڑھا لی۔''

''لیکن اس کرائے میں برا نہیں ہے۔'' وسیم نے دودھ نوشی کرتے ہوئے کہا۔ اسے بچپن سے سونے سے پہلے دودھ پینے کی عادت تھی اکثر میں اور مونا مل کر اس کا مذاق اُڑاتے تھے کہ بابا کے سونے کا ٹائم ہو گیا ہے اب اس کا فیڈر لایا جائے۔

''ہمارے لحاظ سے تو بہت اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ سفیر نے کمرے میں ہیٹر لگا کر آن کر دیا تھا۔ گیس کا کنکشن موجود تھا۔ دس منٹ میں کمرہ معقول حد تک گرم ہو گیا تھا۔ سب نے اپنے اپنے سونے کی جگہیں منتخب کر لی تھیں اور طے پایا کہ باری باری سب جاگ کر پہرہ دیں گے۔ پہلا نام سفیر کا نکلا تھا۔ کمبل خاصے تھے ان میں سے ایک بھاری کمبل اور تکیہ لے کر میں شہلا والے کمرے میں آیا۔ وہ کھا پی کر خود میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی لیکن اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ کمبل دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ میں نے تکیہ اور کمبل اس کی طرف اچھال دیا اور برتن اٹھا لیے البتہ پانی کی بوتل وہیں چھوڑ دی تھی۔

''شکریہ میں سردی سے مر رہی ہوں۔''

''لیکن ایسا لباس پہننے سے باز نہیں آؤ گی۔''

''مجھے عادت ہے اور اگر میری شال ہوتی تو اتنی سردی نہیں لگتی۔'' اس نے جواب دیا اور کمبل لے لیا۔

''گڈ نائٹ۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ سفیر کو جاگنا تھا اس لیے اب وہ کافی بنا رہا تھا۔ تین گھنٹے بعد وہ ایاز کو جگا دیتا اور اس کے تین گھنٹے بعد میری باری تھی۔ میں کمبل میں گھسا اور فوراً ہی سو گیا تھا۔ بھاگ دوڑ اور اعصابی کشیدگی نے تھکا دیا تھا۔ خلاف توقع کسی نے مجھے نہیں جگایا اور میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ ہیٹر نے ایسی گرمی کر دی تھی کہ رات کو سردی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر سفیر یا کسی اور نے ایک بالٹی میں پانی بھی لا کر رکھ دیا تھا تاکہ کمرے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ جمع نہ ہو۔ ہیٹر جلنے سے کمرے کی آکسیجن کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بدل جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کمرے میں پانی سے بھری کوئی چیز رکھنا پڑتی ہے۔ پانی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر لیتا ہے۔ یوں دم گھٹنے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ سفیر ناشتہ بنا رہا تھا اسے اور ایاز کو

کھانے بنانے کا تجربہ تھا۔ واش روم سے آ کر میں نے سب سے پہلے عبداللہ کو کال کی۔

''شہباز صاحب کیسے ہیں؟''

''فائن۔'' میں نے کہا۔ ''رات سب ٹھیک رہا تھا؟''

''ایک دم جناب، میں نے اپنے آدمیوں کو چوکنا کر دیا تھا اور سڑک والا کیمرہ خاص طور سے دیکھا تھا لیکن نہ تو کوئی مشکوک فرد نظر آیا اور نہ ہی کوئی گاڑی یہاں سے گزری۔''

''یہ اچھا ہوا۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''ممکن ہے آج میں کسی وقت چکر لگاؤں تو راجا صاحب سے بات کروں گا۔''

''کل رات ہو چکی تھی اور راجا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آرام کر رہے تھے۔''

''کیا ہوا انہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''بیگ صاحب نے بتایا نہیں لیکن انہوں نے عجلت میں حکیم صاحب کو واپس بلا لیا ہے۔ میں نے کل ہی ان کو ہیلی کاپٹر سے بھیجا ہے۔''

مجھے تشویش ہوئی تھی حکیم قادس کے جانے کا مطلب تھا کہ راجا کی بیماری عام نوعیت کی نہیں ہے۔ ''ٹھیک میں نے آنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اس نوجوان سے پوچھ گچھ بھی کرنا ہے۔''

''میں اسے تیار رکھوں گا۔'' عبداللہ نے کہا جب آپ آئیں گے تو وہ فرفر آپ کے سوالوں کا جواب دے گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر سفیر کو ناشتے کی ٹرے لاتے دیکھ کر فون بند کر دیا۔ ناشتے میں سنکے ہوئے توس اور تلے اور ابلے ہوئے انڈے تھے۔ ایاز حلوہ پوری بھی لے آیا تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ وسیم اور سفیر کر چکے تھے۔ ایاز نہا رہا تھا وہ آ کر میرے ساتھ شامل ہو گیا۔ سردی سے اس کا برا حال تھا کیونکہ یہاں گیزر نہیں تھا اور اسے روز نہانے کی عادت تھی۔ سب ختم کرنے کے بعد مجھے شہلا کا خیال آیا۔

''اس کے کچھ بچایا ہے یا سب ختم کر دیا ہے۔''

''ہے تھوڑا بہت۔'' سفیر نے بتایا۔ ''لیکن میرا خیال ہے وہ ناشتہ ہلکا کرتی ہو گی اس لیے گزارا ہو جائے گا۔''

دو کپ چائے پی کر میں نے شہلا کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ بدستور کمبل میں لپٹی سو رہی تھی اور میں نے آس پاس دیکھا تو لاحول پڑھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ساڑھی اتار کر سو رہی تھی اور بکھری ساڑھی تلے دوسرے لوازمات موجود تھے یا نہیں۔ میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی اور ناشتے کی ٹرے قالین پر رکھ کر اسے آواز دی۔

''اٹھ کر ناشتہ کر لو دو منٹ کی دیر کی تو چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

گرم چائے کا سنتے ہی کمبل سے اس کا بازو نمودار ہوا۔ شانے تک اس پر بلاؤز کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ''پلیز پہلے چائے دے دو۔''

''بہتر ہو گا خود لے لو اور جامے میں آ جاؤ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے اس پر تمہاری زندگی اور آزادی کا دار و مدار ہو گا۔'' میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ میں مرشد کے

خلاف حرکت میں آنا چاہتا تھا اور فتح خان ایک بار پھر راہ کا روڑا بن کر آ گیا تھا۔ شہلا میرے پاس بے کار میں تھی کیونکہ اب میں اس سے کچھ اگلوا نہیں سکتا تھا وہ پہلے ہی تعاون کر رہی تھی اور اس میں کوئی چال بھی تھی تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ایاز، سفیر اور وسیم گولہ بارود والا بکس اندر لا رہے تھے۔ یہ خاصا وزنی تھا اسے تیسرے بیڈروم میں رکھا گیا تھا۔ اسلحے والا بکس فی الحال عبداللہ کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا لیکن ہمارے پاس ہر طرح کا اسلحہ اور ایمونیشن وافر مقدار میں موجود تھا اور ضرورت پڑنے پر ہم کسی فوج کا بھی مقابلہ کر سکتے تھے۔ یہ کام نمٹانے کے بعد میں نے ان کو اپنا خیال بتایا۔

''میں شہلا سے بات کرنے جا رہا ہوں اس کے پاس لاکر تک رسائی کا کوئی ایسا پلان ہے جس میں شاید زبردستی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''کیا فتح خان کو اس پلان کا علم نہیں ہوگا؟'' وسیم نے پوچھا۔

''شہلا کا کہنا ہے کہ اس نے فتح خان کو اس بارے میں مس گائیڈ کیا ہے۔''

''اور وہ ہو گیا؟'' سفیر نے طنز کیا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ وہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''ابھی اس سے سب انٹرویو کریں گے تو حقیقت سامنے آ جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ اس سے جارحانہ رویہ رکھو گے اور میں نرمی سے بات کروں گا۔''

سفیر نے برا سا منہ بنایا۔ ''یعنی تم ہمیں ولن بنا کر خود ہیرو بن جاؤ گے؟''

میں بھنا گیا۔ ''تو جب کہہ رہا تھا کہ اس سے بات کرو تو اس وقت کیوں نہیں گئے تھے؟''

''بس بعض اوقات عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔''

''شادی کے بعد عقل کو ایسی ہی ہری ہری سوجھتی ہے۔'' وسیم نے جملہ کسا تو سفیر نے اسے گھورا۔

''جناب بھول رہے ہیں آپ بھی شادی شدہ ہیں۔''

''نکاح شدہ۔'' وسیم نے سرد آہ بھر کر تصحیح کی۔

''میرا خیال ہے تم دونوں رہنے دو میں اور ایاز جاتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ایاز تمہیں خواتین کو ڈرانے دھمکانے کا کوئی تجربہ ہے؟''

''بالکل بھی نہیں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''میں کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تم بھی بیٹھو یار لگتا ہے اس کام کے لیے مجھے فتح خان کے کسی آدمی کی خدمات حاصل کرنا پڑے گی۔''

میں شہلا کے کمرے میں آیا تو وہ ناشتہ کر چکی تھی اور ساڑھی بھی پہن لی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

''مجھے رات کو کپڑے اتار کر سونے کی عادت ہے۔''

''یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''بہر حال یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے اب ذرا کام کی بات ہو جائے۔''

اس نے ہاتھ سے اپنے شولڈر کٹ ریشمی بال سنوارے۔ ''کہو میں سن رہی ہوں۔''

''تم نے لاکر تک رسائی کا کیا پلان بنایا ہے؟''

''میں نے کہا نا میں تمہیں اس وقت بتاؤں گی جب تم فتح خان سے وہ تصویریں مجھے واپس دلا دو گے۔''

''فتح خان میری پہنچ سے باہر ہے۔''

''تب میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''شہلا...... میرا اصل نشانہ مرشد ہے اور میں اس کے لیے بہت سنجیدہ ہو چکا ہوں لیکن تم اور فتح خان بار بار میرے راستے میں آجاتے ہو۔''

''میں نے کبھی تمہارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔''

''تم اس لاکر کے چکر میں ہو جس میں میرا بریف کیس موجود ہے۔''

''اسی لاکر میں میری تصویروں کے نیگیٹو بھی ہیں۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں تم فتح خان کے بارے میں کہہ سکتے ہو کہ وہ مستقل تمہاری راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔''

''اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو تو یہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ فتح خان سے تمہاری تصویریں واپس دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔ حالانکہ اب فتح خان مجھ سے دشمنی ختم کرنے پر بھی آمادہ ہے۔ ایک بار قبضے میں آنے کے باوجود اس نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''یہ اس کی چالاکی ہے وہ تمہارے تمام ساتھیوں تک رسائی چاہتا ہے میں نے خود سنا ہے وہ تمہاری ساتھی عورتیں قبضے میں لینا چاہتا ہے تا کہ تم سے اپنی بات منوا سکے۔''

میں جانتا تھا وہ درست کہہ رہی تھی لیکن میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ ''تم فتح خان کو چھوڑو اپنی بات کرو۔''

''میں کیا بات کروں؟''

''تم مجھے بینک لاکر تک رسائی کا پلان بتاؤ۔''

''تا کہ تم لاکر خالی کر دو اور میرے ہاتھ کچھ نہ آئے؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''کیا صورت سے میں تم کو اتنی احمق نظر آتی ہوں؟''

''نہیں تمہاری چالاکی اور مکاری میں مجھے کبھی شبہ نہیں رہا ہے۔ اگر تم نے ایک اچھا پلان بنا لیا ہے تو مجھے بتا دینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس پر عمل درآمد کے لیے تمہارا سامنے ہونا ضروری ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں تم نے ٹھیک کہا۔'' اس نے سر ہلایا۔

''اس لیے تم اگر مجھے مطمئن کرنے کے لیے اپنا پلان بتا بھی دو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم اسی انداز میں کام کر کے خود کامیابی حاصل کر سکتے ہو۔''

''جب مجھے ایک تیار پلان مل رہا ہے تو میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس پر عمل کیوں نہیں کروں گا۔''

''سچی بات ہے مجھے تم پر یا کسی پر اعتماد نہیں ہے۔'' اس نے صاف گوئی

''حالانکہ اعتماد تو مجھے نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہر حال یہ

ماضی کی بات ہو چکی ہے اب مجھے ہر صورت اس معاملے کو حل کرنا ہے اور اگر تم فتح خان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں میری مدد چاہتی ہو تو تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا۔"

"کس بات پر مجبور ہو جاؤ گے؟"

"تمہیں فتح خان کے حوالے کرنے پر۔"

وہ چونکی۔ "تم مجھے اس کے حوالے کر دو گے؟"

"مجبوری ہے میں یہاں رکھ کر تمہارا اچار ڈالنے سے تو رہا۔ میرے ساتھیوں کی ایک تجویز اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ تمہیں گولی مار کر اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔ لاکر والا کام ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ "تم مذاق کر رہے ہو تم لوگ اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے ہو؟"

"یہ تمہارا خیال ہے۔" میں کھڑا ہو گیا۔ "تمہارے پاس سوچنے کے لیے آج کا دن ہے۔"

میں باہر آیا ایاز کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"کچھ سامان لانا ہے۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے مجھے عبداللہ کی کوٹھی کے پاس اتار دینا۔"

"وہاں کیوں جا رہے ہو؟" سفیر نے پوچھا۔

"فتح خان کے آدمی سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔" میں نے کہا۔ "شہلا تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہے میں نے اسے آج تک سوچنے کی مہلت دی ہے۔ آج اسے کھانے پینے کو کچھ مت دینا اور اگر شور کرے تو باندھ کر ڈال دینا۔"

ایاز کی جیپ سے سارا اسامان اتار دیا گیا تھا۔ ہم روانہ ہوئے تو میں نے اس سے راستے میں پوچھا۔ "بائیک کی دوسری نمبر پلیٹس کہاں ہیں؟"

"بائیک کے اوزاروں والے خانے میں...... دوسری گاڑیوں کی نمبر پلیٹس بھی ان میں موجود ہیں۔ کسی وقت بھی تبدیل کی جا سکتی ہیں۔"

ایاز نے مجھے ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے میں عبداللہ کی کوٹھی تک جانے کے لیے ٹیکسی لے سکتا تھا لیکن وہاں جانے سے پہلے میں نے ایک سیلون سے اپنے بے ہنگم ہو جانے والے بال بنوانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے باربر سے کہا کہ وہ سر پر موٹی مشین پھیر دے۔ پھر میں نے بڑھی شیو پر بھی مشین پھروالی۔ باربر نے استرے سے قلموں کے آس پاس کے بالوں کو ایک مخصوص شکل دی اور جب میں نے آئینے میں دیکھا تو خود کو خاصا مختلف پایا تھا۔ میرے دشمن جس سرگرمی سے میری تلاش میں تھے تو ضروری ہو گیا تھا کہ میں بار بار حلیہ بدلتا رہوں۔ ٹیکسی کر کے میں عبداللہ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہنچنے سے پہلے موبائل پر اطلاع کر دی تھی کہ میں آ رہا ہوں۔

مونا اور سعدیہ کو بھی پتا چل گیا تھا اور وہ باہر لان میں میری منتظر تھیں اور بیتو ابھی سو رہا تھا۔ وہ میرا حلیہ دیکھ کر محظوظ ہوئی تھیں۔ کچھ دیر ان کے ساتھ گپ شپ کر کے میں اندر عبداللہ کے پاس آیا۔ "زخمی نوجوان کیسا ہے؟"

''زخم تو ٹھیک ہے لیکن کچھ دوسری ٹریٹ منٹ کی ہے۔'' عبداللہ مسکرایا۔ ''اس نے زبان کھولی ہے۔ اپنا نام حماد بتا تا ہے اور اس کا تعلق فتح خان کے علاقے سے ہے۔ یہاں مجرمانہ سرگرمیوں میں اس کا ساتھ دے رہا ہے۔''

''آؤ ذرا اس سے ملاقات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور ہم کچن والے راستے سے اتر کر تہہ خانے میں آئے جہاں حماد پنجرے میں قید نہیں تھا بلکہ عبداللہ نے اسے ایک طرف دیوار کے ساتھ دونوں ہاتھ فولادی زنجیروں میں جکڑ کر یوں کھڑا کیا ہوا تھا کہ جب وہ تھک جاتا تو ہاتھوں کے بل جھول جاتا اور جب ہاتھوں پر ناقابلِ برداشت دباؤ آتا تو مجبوراً کھڑا ہو جاتا۔ خاص طور سے زخم والے ہاتھ پر۔ اس کی کلائیوں سے کھال چھل گئی تھی اور وہ کھڑا ہوا جھول رہا تھا۔ عبداللہ کو دیکھتے ہی وہ بلبلایا تھا۔

''خدا کے لیے ہم کو کھول دو۔''

''بکومت۔'' عبداللہ نے غرا کر کہا۔ ''کیا تم خدا کے لیے یہ سب کرتے ہو۔''

میں اس کے پاس آیا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ ''اگر تم شرافت سے کچھ سوالوں کے جواب دو تو تم کو کھولا جا سکتا ہے۔''

''پوچھو ہم کو جو معلوم ہے وہ بتائے گا۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''پانی ملے گا۔''

ایسا لگ رہا تھا جیسے عبداللہ نے اس کا کھانا پانی بھی بند کر رکھا تھا۔ یہ بہت مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس آدمی کی مزاحمت کو بہت جلد ختم کر دیتی ہیں۔ میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''فتح خان کہاں ہے؟''

''ہم کو نہیں معلوم...... ہم کہیں اور رہتا ہے جب ہم سے کام ہو تو ہم کو بلواتا ہے۔''

''کیسے بلواتا ہے؟''

''فون کر کے...... موبائل پر فون کرتا ہے۔''

''تمہارے پاس سے کوئی موبائل فون نہیں نکلا۔''

''جب ہم کسی کام سے جاتا ہے تو موبائل چھوڑ کر جاتا ہے۔''

''تم فتح خان کے لیے کیا کام کرتے ہو؟''

''جو وہ کہتا ہے۔ کسی کو اٹھانا، مارنا پیٹنا اور جو وہ کہے۔''

''اس کوٹھی کے باہر تم کیا کر رہے تھے؟''

''ہم کو کہا تھا کہ ادھر نگرانی کرنا ہے اور جو شاہ نواز کہے وہ کرنا ہے۔''

''شاہ نواز کون ہے؟''

''وہ فتح خان کا قریبی آدمی ہے آگے والی سڑک پر گاڑی میں بیٹھا تھا۔''

میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''تم نے ہمیں کوئی کام کی بات نہیں بتائی ہے اس لیے نہ تو تمہیں کھولا جائے گا اور نہ کھانا پانی ملے گا۔ تم یہیں کھڑے رہو گے اور اسی طرح مر جاؤ گے۔''

میں اور عبداللہ جانے کے لیے مڑے تو اس نے چلا کر کہا۔ ''رکو...... میں ایک چیز بتا سکتا ہوں مجھے فتح

خان کا موبائل نمبر یاد ہے۔''

عبداللہ نے موبائل نکالا اور کہا۔ ''بتاؤ۔''

اس نے نمبر بتایا جو عبداللہ نے اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ابھی تمہیں کھول دیا جائے گا اور پانی بھی مل جائے گا لیکن اگر یہ نمبر غلط نکلا تو......''

''یہ اسی کا نمبر ہے مجھے اسی نمبر سے کال آتا ہے۔''

میں اور عبداللہ باہر آئے۔ اپنے آدمیوں کو حماد کے بارے میں ہدایات دے کر عبداللہ میرے ساتھ کنٹرول روم میں آیا جہاں منیر بیٹھا مانیٹرز کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''کیسے ہیں شہباز صاحب؟''

''فائن تم سناؤ۔''

''ٹھیک ہوں کوئی خدمت سر؟''

''یار کافی لے آؤ۔'' عبداللہ نے کہا تو وہ چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عبداللہ کچھ فکر مند تھا اور بہ ظاہر معمول پر رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہمارے جانے کے بعد کوئی اہم بات سامنے آئی؟''

''نہیں ہر چیز معمول پر رہی ہے جناب۔'' اس نے کہا۔ ''آج میں نے بیتو کے آئی ڈی کارڈ کے لیے بات کر لی ہے۔ امید ہے آنے والے دس پندرہ دن میں بن جائے گا۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

عبداللہ چونکا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ کوئی مسئلہ ہے۔''

''یار آدمی اتنے عرصے دشمن کے ساتھ رہے تو اسے بھی جان جاتا ہے تم تو دوست اور ساتھی ہو۔''

اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں سر ہلایا۔ ''مجھے کچھ پریشانی ہے کل بیگ صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے راجا صاحب کے محل تک آنے کا بندوبست کیا جائے۔''

میں چونکا۔ ''مجھ سے پوچھے بغیر؟''

''میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن بیگ صاحب نے حکم دیا ہے کہ میں انتظام کرواؤں آپ سے راجا صاحب خود بات کر لیں گے۔''

''تو تو تم نے انتظام کر لیا ہے؟''

''ملازم آدمی کو حکم تو ماننا پڑتا ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''وہی ہیلی کاپٹر ہائر کیا ہے جو حکیم صاحب کو لے کر گیا تھا۔''

''اب راجا صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میرا خیال ہے بہتر ہے حکیم صاحب نے ان کا علاج شروع کر دیا ہوگا۔ پہلے میں ان حکیموں کا قائل نہیں تھا لیکن پہلے آپ کا ہاتھ اور پھر عتیق کو جس طرح موت کے منہ سے واپس کھینچ لیا اس سے میں قائل ہو گیا ہوں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا راجا عمر دراز مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ اس وقت میں یہاں کئی معاملات میں پھنسا ہوا تھا۔ ابھی مجھے مرشد سے پہلے فتح خان اور پھر شہلا والے معاملے سے بھی نمٹنا تھا۔ لاکر سے بریف کیس حاصل کرنا تھا میں یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ مگر دوسری طرف راجا عمر دراز کو صاف جواب دینا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ آخر میں نے گہری سانس لی۔

''عبداللہ راجا صاحب سے کال ملاؤ۔''

اس نے انٹرنیٹ سے منسلک سیٹلائیٹ فون اٹھایا اور راجا عمر دراز کے محل کال کرنے لگا۔ کال ظاہر ہے بیگ نے ریسیو کی تھی۔ عبداللہ نے کہا۔ ''شہباز صاحب یہاں موجود ہیں راجا صاحب سے بات کرنا چاہیں گے۔''

دوسری طرف سے سن کر عبداللہ نے کال کاٹ دی اور میری طرف دیکھا۔ ''راجا صاحب دس منٹ بعد ملیں گے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''عبداللہ کیا بات ہے کیا بیگ صاحب نے ہمارے بارے میں اور کچھ بھی کہا ہے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے آپ سے یہ کہنا بھی عجیب لگ رہا ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ راجا صاحب میرے محسن بھی ہیں ان کی پشت پناہی ہمیشہ میرے کام آئی ہے۔ میرا ہاتھ ان کی وجہ سے بچا اور سب سے بڑھ عتیق کی جان بچ گئی۔ عبداللہ میں احسان فراموش انسان نہیں ہوں اور یہ سب نہ ہوتا تب بھی راجا صاحب میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ اس لیے تم اس بات کو بالکل بھی دل پر مت لو۔ میں راجا صاحب کی بات سن سکتا ہوں لیکن مجھے کیا کرنا ہے اس کا فیصلہ میں اپنے حالات دیکھ کر ہی کروں گا۔''

عبداللہ نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ''یہی میں بھی چاہتا ہوں آپ جو چاہیں وہی کریں۔''

دس منٹ بعد فون کی بیل بجی اور عبداللہ نے کال ریسیو کی اور پھر ریسیو میری طرف بڑھا دیا دوسری طرف راجا عمر دراز تھا میرے سلام کا جواب دے کر اس نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔ ''شہباز میرے بیٹے کیسے ہو؟''

اس سے پہلے راجا عمر دراز نے کبھی مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ ''اللہ کا شکر ہے راجا صاحب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اب بہتر ہے۔ شہباز میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''راجا صاحب میں یہاں کچھ اہم معاملات میں الجھا ہوا ہوں ان سے فارغ ہوتے ہی آپ کے پاس حاضری دیتا ہوں۔''

''نہیں بیٹے میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''راجا صاحب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ دشمن مجھے ایک لمحے کو سانس لینے کی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں ہے وہ

میرے ساتھیوں اور پیاروں کے درپے ہے۔اس کے باوجود اگر آپ حکم دیتے ہیں تو میں ابھی آنے کے لیے تیار ہوں۔''

''بیٹے یہ راجا عمر دراز کا حکم نہیں ایک بوڑھے باپ کی التجا ہے جب وہ کمزور ہوتا ہے تو اسے اپنے بیٹے کے بازوؤں کی ضرورت ہوتی ہے تو یوں سمجھ لو کہ مجھے تمہارے مضبوط بازوؤں کی ضرورت ہے۔''

''اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے۔'' وہ خوش ہو گیا۔''میں چاہتا ہوں تم جلد از جلد آجاؤ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تیار ہوں اب یہ عبداللہ پر ہے کہ مجھے کب روانہ کرتا ہے۔''

''اس نے انتظامات کر لیے ہیں۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔''اگر تم ابھی آسکتے ہو تو آجاؤ ورنہ کل آجاؤ۔''

''یہ تو آپ کو عبداللہ بتا سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور فون اس کی طرف بڑھا اس نے فون لے کر کہا راجا عمر دراز سے بات کی اور پھر فون رکھ کر میری طرف متوجہ ہوا۔

''ابھی دن ہے اور بہ ظاہر موسم بھی صاف ہے۔آپ اگلے دو گھنٹے میں راجا صاحب کے پاس موجود ہوں گے۔آپ کو لے جانے والا ہیلی کاپٹر وہیں رہے گا اور صبح آپ کو واپس لا سکتا ہے۔''

''تب میں ابھی جانا پسند کروں گا۔'' میں نے کہا۔

یہ سنتے ہی عبداللہ نے موبائل اٹھا کر پائلٹ سے رابطہ کیا۔''میں عبداللہ بات کر رہا ہوں اس وقت پرواز کے لیے حالات کیسے ہیں...... ہاں روٹ اور منزل وہی ہے.....ٹھیک ہے۔'' اس نے کال کاٹ کر مجھ سے کہا۔

''وہ ابھی دس منٹ میں کنفرم کر دے گا۔''

میں نے اس سے فتح خان کا مبینہ نمبر مانگا اور اسے اپنے موبائل سے ملایا۔اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے کال کاٹ دی تو میں دوبارہ نمبر ملایا۔اس بار اس نے کال ریسیو کر لی۔''کون بول رہا ہے؟''

''وہ جس کے پیچھے تم بلاوجہ پڑے ہو۔''

''شہباز خان۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔''تمہیں میرا نمبر حماد نے دیا ہوگا۔''

''تم نے ٹھیک جانا......اس نے صرف نمبر ہی نہیں اور بھی بہت کچھ بتایا ہے اور وہ سب ہم نے ریکارڈ کر لیا ہے۔''

''شوق سے ریکارڈ کر لو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔''

''نہیں فتح خان فرق تو پڑے گا اگر میں نے ریکارڈ شدہ باتوں کے ساتھ تمہارے آدمی کو مرشد کے حوالے کر دیا تو۔''

اس بار وہ چپ ہو گیا تھا پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔''تم کیا چاہتا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھیوں سے دور رہو اور اپنے معاملات جس طرح چاہے نمٹاتے رہو اب تمہاری طرف سے کسی کارروائی کا مطلب کھلی دشمنی ہوگا۔''

''شہباز خان میں نے تم سے صرف مدد مانگی تھی۔''

''تم اگر کہتے کہ میں تمہارے ساتھ چل کر اس وادی میں ہیرے تلاش کروں تو خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ چلتا اگر فوری نہیں تو اپنے معاملات نمٹا کر ضرور چلتا لیکن تم نے مجھ سے جو چاہا تھا وہ میں کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ فتح خان عورتوں کے سہارے آگے بڑھنے سے بہتر ہے آدمی واپس چلا جائے۔ یہ ناممکن ہے۔''

''ٹھیک ہے میں اب تمہارے کسی آدمی کو نہیں چھیڑے گا تم حماد کو چھوڑ دو۔''

''وہ میرے پاس بالکل ٹھیک ہے اور میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہوں اگر تم شہلا کی تصاویر میرے حوالے کر دو تمہارے پاس کل شام تک کی مہلت ہے اس کے بعد میں حماد کو اس کی گفتگو کی ریکارڈنگ سمیت مرشد کے حوالے کر دوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

عبداللہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ ''جناب یہ آپ کا مستقل نمبر ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

''تب بہتر ہوگا آپ اسے دوبارہ استعمال نہ کریں بلکہ سم بدل لیں۔ آپ بھول رہے ہیں کچھ عرصے پہلے ڈیوڈ شا نے آپ لوگوں کو موبائل فون کی مدد سے ٹریس کیا تھا اور اس وقت فتح خان اس کے ساتھ تھا تو ممکن ہے وہ ڈیوائس اب بھی اس کے پاس ہو۔''

عبداللہ کی بات قابلِ غور تھی۔ میں نے فوری سم تبدیل کر لی اور یہ کرنے کے بعد سفیر، وسیم اور ایاز کے نمبروں پر باری باری مس کال بھی دے دی۔ یہ طے تھا کہ کوئی اگر کسی وجہ سے سم تبدیل کرے گا تو وہ تبدیل کی جانے والی سم سے سب کو مس کال دے گا۔ ساری سموں کی نمبرز سب کے موبائلز میں محفوظ تھے۔ اس دوران میں پائلٹ عبداللہ کو او کے کی رپورٹ دے چکا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''جناب ہمارے پاس تین گھنٹے ہیں شمالی علاقے میں موسم صاف ہے۔''

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے راجا کی بات ماننے میں کچھ زیادہ ہی جلدی کی تھی مجھے سفیر اور وسیم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ میں نے عبداللہ کو رکنے کو کہا اور وسیم کا نمبر ملایا۔ اسے راجا سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔

''تمہارا کیا خیال ہے اگر میں ابھی جا کر کل واپس آجاؤں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''آنے والے وقت کے بارے میں تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا یہاں کے معاملات دیکھنے کے لیے ہم ہیں۔''

میں نے سفیر سے بھی بات کی اور اس نے بھی مخالفت نہیں کی تھی۔ کچھ عرصے سے اکیلے رہ رہ کر مجھے خود فیصلے کرنے کی عادت پڑ گئی تھی اور اسی وجہ سے میں بے اختیار بھی فیصلہ کر جاتا تھا حالانکہ اب میں ساتھیوں کے ہمراہ تھا اور کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے ان کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ شکر ہے مجھے بروقت خیال آگیا۔ فون بند کر کے میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''بس تو ہم نکلتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن بہتر ہوگا آپ مزید کوئی گرم چیز اور دستانے لے لیں۔ وہاں سردی بہت زیادہ ہے اور درجہ حرارت منفی میں چل رہا ہے۔''

عبداللہ کے پاس ایک ہائی آلٹی چیوڈ جیکٹ، جوتے اور دستانے تھے۔ وہ اس نے مجھے دیئے۔ میں تیار ہو کر مونا اور سعدیہ کے پاس آیا۔ وہ اپنے کمرے میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''باتیں۔'' مونا نے منہ بسور کر کہا۔ ''اور کیا ہے یہاں کرنے کو؟''
''کرنے کو تم بہت کچھ کر سکتی ہے یوں سمجھ لو یہ کوٹھی تمہارے ہینڈ اوور ہے اگر تم اس کا فرنیچر اور آرائش بدلنے کا کہو گی تو یہ بھی ہو جائے گا۔''
سعدیہ نے میرے لباس سے بھانپ لیا تھا اس نے کہا۔ ''شوبی بھائی آپ کہیں جا رہے ہیں؟''
''ہاں راجا عمر دراز سے ملنے اس کے محل جا رہا ہوں۔''
مونا پریشان ہو گئی تھی۔ ''وہ تو بہت دور ہے اور راستے بھی اس موسم میں خراب ہو جاتے ہیں۔''
''میں بائی ایئر جا رہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر چارٹرڈ کرایا ہے اور وہ مجھے کل صبح واپس بھی لے آئے گا۔'' میں نے کہا لیکن مونا کی فکر کم نہیں ہوئی۔
''اس موسم میں ہیلی کاپٹر کی پرواز ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔''
''اب تو جدید ہیلی کاپٹر آ گئے ہیں جو ہر موسم میں پرواز کر سکتے ہیں اسی ہیلی کاپٹر سے حکیم قادس آیا اور گیا ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔
''تب ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے؟'' مونا نے مطالبہ کیا۔
''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے انکار کر دیا۔ ''میں بھی صرف ایک رات وہاں رکوں گا اور کل مجھے واپس آ جانا ہے دوسرے وقت بالکل نہیں ہے مجھے سورج غروب ہونے سے پہلے راجا عمر دراز کے محل میں پہنچنا ہے۔''
''راجا بہت متاثر کن شخصیت کا مالک ہے۔'' سعدیہ نے کہا تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''اتنی گاڑھی اردو......''
وہ شرما کر ہنسی۔ ''میں نے کوشش کر کے سیکھی ہے اب مونا سے لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ رہی ہوں۔''
''یہ تو اچھی بات ہے۔ اوکے گرلز اجازت ہے۔''
وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔ عبداللہ ایک سیاہ شیشوں والی چھوٹے سائز کی جیپ میں منتظر تھا اس نے دو مسلح گارڈز بھی لے لیے تھے وہ پچھلے حصے میں بیٹھے تھے۔ میں نے راستے میں ایاز سے رابطہ کیا۔ اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''تم کسی کے ساتھ جا کر سفاری لے آؤ لیکن پوری ہوشیاری سے جانا ممکن ہے وہ جیپ میں کوئی ٹریپ لگا گئے ہوں۔''
''آپ بے فکر رہیں میں عبداللہ صاحب سے چیک کرنے والے آلات لے جاؤں گا۔''
میں نے عبداللہ کو کوٹھی میں کھڑی جیپ کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''میں ایاز کو روک لیتا ہوں آپ کو چھوڑ کر میں خود جاؤں گا میرے پاس چیک کرنے والے آلات بھی ہیں۔''
''یہ ٹھیک رہے گا۔''
دوپہر کا وقت ہو گیا تھا اور ایک بج رہا تھا۔ سردیوں کی وجہ سے دن چھوٹے ہوتے ہیں پائلٹ نے آنے اور جانے کے وقت کا حساب کر کے کہا تھا تاکہ اگر راستے میں کہیں خراب موسم سے واسطہ پڑے تو ہم دن کی روشنی میں واپس آ سکیں۔ پائلٹ اپنے ہیلی کاپٹر کے ساتھ تیار تھا یہ کسی قدر بھاری جسم کا اور ادھیڑ عمر شخص تھا۔ یقیناً

اس کے پاس فلائنگ کا تجربہ تھا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے کیپٹن فراز کہتے ہیں سر۔''

''شہباز ملک۔'' میں نے کہا۔ ''تم پرواز کے لیے تیار ہو؟''

''بالکل جناب۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔''

عبداللہ سے ہاتھ ملا کر میں ہیلی کاپٹر میں سوار ہوا۔ فراز نے ایک ہیڈ فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ پہن لیں کیونکہ انجن کا شور دماغ خراب کر دیتا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہیلی کاپٹر اتنا شور کیوں کرتا ہے؟''

''اس کا انجن باڈی کے اندر ہوتا ہے سر۔'' اس نے بتایا اور بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ ''اس لیے کتنی ہی کوشش کر لی جائے اندر شور ضرور ہوتا ہے۔''

اس نے اسٹارٹر دبایا تو پنکھے گردش میں آ گئے تھے۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے جوابی ہاتھ ہلایا اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پنکھوں کی گردش میں تیزی آئی تھی۔ پھر ایک ہلکے سے دھچکے سے ہیلی کاپٹر اوپر اٹھ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم خاصی بلندی پر تھے۔ کیپٹن فراز ریڈیو پر ائیر ٹریفک کنٹرولر کو اپنی منزل کے بارے میں بتا رہا تھا اور ان سے ہدایات لے رہا تھا۔ میں بھی سن رہا تھا لیکن یہ تکنیکی گفتگو میرے سر پر سے گزر رہی تھی۔ اپنا کام کر کے فراز نے مائیک بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔

''سر میں نے لنچ لے لیا تھا اگر آپ کو بھوک لگے تو پیچھے بکس میں سب کچھ موجود ہے۔''

مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن اتنی خاص نہیں تھی۔ ''شکریہ کیپٹن فی الحال ضرورت نہیں ہے۔''

''تب آپ کافی لے لیں۔''

بکس میں ایک چھوٹے تھرمس میں کافی اور ساتھ میں کاغذی کپ بھی تھے۔ میں نے اپنے اور فراز کے لیے کافی نکالی۔ اس وقت ہم مارگلہ عبور کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ دور مری کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور ان سے پرے شاید ایبٹ آباد کی پہاڑیاں تھیں۔ شمال کی پُر پیچ پہاڑیوں میں ہیلی کاپٹر کی سیدھی پرواز ممکن نہیں تھی اس لیے ہم پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے گزر رہے تھے یہاں بلندی پر موسم کسی وقت بھی خراب ہو سکتا تھا اس لیے پہاڑوں کے درمیان پرواز محفوظ تھی لیکن اس وجہ سے سفر طویل ہو جاتا ہے۔ جو فاصلہ ہیلی کاپٹر ایک گھنٹے میں طے کر سکتا تھا اسے طے کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا۔ اب کشمیر کی برف پوش چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

''سر ایک گھنٹے کے سفر کے بعد آپ کو نانگا پربت کی جھلک نظر آئے گی لیکن ہم اس سے بہت دور سے گزریں گے۔''

''میں نے اس چوٹی کو پاس سے دیکھا ہے اور اس کے راک فیس پر ہائی کنگ بھی کی ہے لیکن بس چودہ ہزار فٹ تک گیا تھا۔''

''اوہ آپ ہائکر بھی ہیں۔'' اس نے جوش سے کہا۔

''میں کچھ عرصے پہلے تک اپنی ٹورزم فرم چلاتا رہا ہوں جو زیادہ تر شمالی علاقے کے لیے ٹور پیکج تیار کرتی تھی۔''

کیپٹن فراز خوش ہو گیا تھا کیونکہ میں اس کا ہم پیشہ نکل آیا تھا۔ وہ بھی سیاحوں کو لے کر شمالی علاقے جاتا

تھا۔ وہ بتانے لگا کہ اب تک کہاں کہاں گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بہت دور نانگا پربت کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اگر پاکستان کے شمال میں ایک بھی چوٹی نہ ہوتی سوائے نانگا پربت کے تب بھی ہم اس پر فخر کر سکتے تھے۔ کہنے کو یہ دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ہے لیکن جب کسی کوہ پیما سے پوچھا جائے تو وہ نانگا پربت کو سب سے بلند اور سب سے مشکل چوٹی قرار دیتا ہے۔ کم سے کم ایک درجن مشہور ترین کوہ پیما اس کی برف میں دفن ہیں۔ جیسے ہی نانگا پربت نظروں سے اوجھل ہوئی کیپٹن فراز نے کہا۔

''ہم منزل پر پہنچنے والے ہیں سر۔''

میں نے نیچے دیکھا اور اس وادی کو پہچان لیا جہاں میں برسوں پہلے آیا تھا اور اس کے ایل کی طرح گھومتے دوسرے سرے پر راجا عمر دراز کا محل تھا۔ اب ہیلی کاپٹر اس کی پہاڑیوں سے لگ کر اڑ رہا تھا۔ کیپٹن فراز یہاں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا کیونکہ وہ دو بار پہلے بھی آیا تھا اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد ہم راجا عمر دراز کے محل کے ہیلی پیڈ کے اوپر تھے۔ نیچے سیکرٹری بیگ خود استقبال کے لیے موجود تھا اور اس نے ہاتھ سے لینڈ کرنے کا اشارہ کیا۔ جب ہیلی کاپٹر نیچے آیا تو اس کے پنکھوں کی ہوا سے بیگ کا لبادہ پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہوا کا بے پناہ زور اس کے ہلکے پھلکے جسم کو اٹھا کر پھینک بھی سکتا تھا۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر زمین سے ٹکا میں نیچے اتر آیا۔ یہاں بے پناہ سردی تھی اور محل میں ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی تھی شاید چوبیس گھنٹے پہلے ہی برف باری ہوئی تھی۔

''کیا حال ہیں بیگ صاحب۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ حسبِ معمول سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''آیئے میرے ساتھ۔''

''پائلٹ بھی یہیں رکے گا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے معلوم ہے آپ اس کی فکر نہ کریں۔'' اس نے جواب دیا تو مجبوراً میں اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ باہر بے پناہ سردی تھی لیکن اندر موسم کسی قدر بہتر تھا۔ میں نے راستے میں راجا عمر دراز کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں پوچھا تو وہ ہمیشہ کی طرح ٹال گیا۔ وہ مجھے مہمان خانے میں لایا تھا۔ ''ابھی راجا صاحب قیلولہ کر رہے ہیں وہ شام کو آپ سے ملاقات کریں گے۔''

میں پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا اس لیے مجھے غصہ نہیں آیا تھا۔ بیگ کا راجا عمر دراز کے معاملات میں وہی کردار تھا جو بیوروکریسی کا اس ملک کے بارے میں ہے یعنی وہ ہر چیز کو ایک مخصوص نظر سے دیکھتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں یہ اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں لاتے ہیں۔ شکر ہے اس نے جانے سے پہلے کھانے کا پوچھ لیا۔

''اگر جلد مل سکے۔''

''تب آپ تازہ دم ہو کر طعام گاہ میں آ جائیں۔''

مجھے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا اس کے ساتھ ایک شاندار واش روم بھی تھا اور اس میں پہاڑی چشموں کی خوشبو لیے گرم پانی آ رہا تھا میں منہ ہاتھ دھو کر سچ مچ تازہ دم ہو گیا اور جب مہمان خانے کے کھانے کے کمرے میں پہنچا تو وہاں کھانا لگایا جا رہا تھا۔ کئی طرح کی ڈشز تھیں اور سب بہترین تھیں اس لیے میں نے سب

کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ کھانے کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ بیگ نے کیا عبداللہ کو اطلاع کر دی ہو گی کہ میں خیر و عافیت سے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ اس کا امکان کم ہی تھا کہ بیگ عبداللہ کو اطلاع کرنے کی زحمت کرے کیونکہ اس کے خیال میں وہ ایک معمولی ملازم ہی تو ہے۔ میں نے خدمت پر موجود خادم سے کہا۔

''بیگ صاحب کو اطلاع دو میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''جی جناب۔'' اس نے ادب سے کہا اور وہاں سے چلا گیا جب میں کھانا ختم کر چکا تھا تب اس کی واپسی ہوئی۔ ''وہ کہہ رہے ہیں آپ کھانا کھا کر میرے پاس آ سکتے ہیں۔''

ہاتھ دھو کر میں اسی خادم کے ساتھ روانہ ہوا میں نے دیکھا کہ اب یہاں زیادہ تر مرد تھے اور عورتیں خال خال نظر آ رہی تھیں شاید گونگی ملازمہ والے واقعے کے بعد راجا عمر دراز نے جوان اور حسین عورتوں کو محل میں خدمت سے فارغ کر دیا تھا۔ فتح خان نے ایک ایسی ہی ملازمہ کے ذریعے مجھے محل سے نکال لیا تھا۔ بیگ اپنے لیے مخصوص حصے میں تھا یہ شاید اس کا دفتر بھی تھا۔ مجھے اس کے پاس ایک چھوٹا لیکن جدید کمپیوٹر دیکھ کر حیرت ہوئی وہ اس پر کچھ کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''شہباز صاحب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''مجھے اسلام آباد میں عبداللہ سے بات کرنی ہے۔''

''ضرور جناب۔'' اس نے کہا اور میرے ساتھ آنے والے خادم کو اپنی زبان میں کوئی حکم دیا۔ ''آپ اس کے ساتھ چلے جائیں۔''

میں خادم کے ساتھ اسی دفتر کے ایک حصے میں آیا جہاں ویسا ہی کنٹرول روم تھا جیسا کہ میں نے عبداللہ کی کوٹھی میں دیکھا تھا فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کوئی ایک درجن مانیٹرز تھے اور ان کے سامنے دو نوجوان بیٹھے نگرانی کر رہے تھے یہ مانیٹر محل کے اندر اور باہر کے مختلف مناظر دکھا رہے تھے یقیناً کیمروں کی تعداد ان مانیٹرز کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی کیونکہ ان پر خود بہ خود دوسرے کیمروں کے مناظر بھی آ رہے تھے۔ خادم نے ایک نوجوان سے کچھ کہا اور وہ چونک کر جلدی سے اٹھا اور اس نے ادب سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''میں آپ کا کیا خدمت کر سکتا ہوں سر؟'' وہ لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

''مجھے اسلام آباد عبداللہ سے بات کرنی ہے۔''

یہاں بھی سیٹلائیٹ فون کا مکمل سسٹم موجود تھا۔ اگرچہ وہ چاہتے تو انٹرنیٹ کی مدد سے کہیں سستا رابطہ کر سکتے تھے لیکن رازداری کے نکتہ نظر سے انہوں نے نہایت مہنگا سیٹلائیٹ فون لے رکھا تھا۔ نوجوان نے مجھے کال ملا کر دی اور دوسری طرف عبداللہ نے ریسیو کی۔ ''میں شہباز بات کر رہا ہوں۔''

''جی جناب مجھے پتا چل گیا تھا کہ آپ پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہاں سب ٹھیک ہے؟''

''جی جناب...... میں ایاز کے ساتھ جا کر کوٹھی سے گاڑی لے آیا ہوں۔''

''یہ اچھا کیا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں خادم کے ساتھ ہی واپس آیا کیونکہ وہ مجھے جن راستوں سے گزار کر لایا تھا وہ مجھے یاد بھی نہیں تھے اگر اکیلا آتا تو شاید بھٹک جاتا۔ اب جب تک راجا عمر دراز کی طرف

سے طلبی کا پروانہ نہیں آتا میرے پاس سوائے آرام کرنے کے اور کچھ نہیں تھا اس لیے میں لیٹ گیا اور کچھ دیر میں سو بھی گیا تھا۔ میں دو گھنٹے سویا تھا کہ اچانک میری نیند اچاٹ ہو گئی کوئی دروازے پر ہلکی سی لیکن مستقل دستک دے رہا تھا۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔

''آ جاؤ۔''

دروازہ کھلا بیگ اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''آپ کو راجا صاحب یاد کر رہے ہیں۔''

''مجھے ایک منٹ دیں۔'' میں نے واش روم کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ میں بیگ کے ساتھ روانہ ہوا۔ اب مہمان خانہ باقی محل سے الگ کر دیا گیا تھا اور ہم ایک چھوٹی سی سرنگ سے گزر کر اصل محل میں داخل ہوئے اس کے داخلی دروازے پر ایک مقامی مسلح شخص موجود تھا اور اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا لیکن بیگ کے ساتھ کی وجہ سے کچھ کہا نہیں تھا۔ میں نے ذرا آگے نکل کر کہا۔ ''کیا یہ ہر شخص کو آپ کے ساتھ دیکھ کر اسی طرح جانے کی اجازت دے دیتا ہے؟''

''نہیں میں اسے چند مخصوص اشارے کرتا ہوں جن سے یہ جان لیتا ہے کہ آنے والے شخص پر اچانک قابو پانا ہے، اس کی تلاشی لینی ہے یا اسے بغیر روکے جانے دینا ہے۔''

''یہ اچھا انتظام ہے۔''

چند منٹ بعد ہم راجا عمر دراز کے اس مخصوص کمرے میں تھے جو اس نے غور و فکر کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور اس میں سوائے ایک کرسی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ شمال کی طرف بڑی سی کھڑکی کھلی رہتی تھی اور راجا عمر دراز آتش دان کے سامنے بیٹھ کر بیک وقت گرم اور سرد ہوا کی لہروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچ بچار کرتا تھا لیکن اس وقت کمرے کی حالت مختلف تھی۔ شمال کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ بند تھے اور ایک کرسی کے بجائے یہاں بیڈ روم کا مکمل فرنیچر تھا۔ راجا عمر دراز ایک بیڈ پر نیم دراز ایک کتاب ہاتھ میں لیے موجود تھا۔ بیگ نے اندر جانے سے پہلے مخصوص انداز میں دستک دی تھی اور جواب میں راجا نے اسے اندر آنے کی اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ خاصا شاہانہ قسم کا ماحول تھا بالکل با ادب باملاحظہ قسم کا۔ مجھے دیکھ کر راجا عمر دراز نے کتاب سرہانے رکھ دی اور آہستہ سے سیدھا ہونے لگا لیکن اس سے پہلے وہ کھڑا ہوتا میں نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ ''نہیں آپ لیٹے رہیں۔''

''میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بیٹے کہ تم میرے کہنے سے چلے آئے۔''

''راجا صاحب مجھے شرمندہ مت کریں آپ دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو مجھے جب پکاریں میں ضرور آؤں گا۔''

''بیٹھو۔'' راجا عمر دراز نے بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم کیا لینا پسند کرو گے؟''

''کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر آپ اصرار کریں گے تو آپ کے محل کی مخصوص گرین ٹی لے لوں گا۔''

راجا عمر دراز نے بیگ کی طرف دیکھا تو وہ نظر آشنا فوراً کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد راجا میری طرف متوجہ ہوا۔ ''میں تمہارے بعد واپس آیا تھا۔''

''جی مجھے علم ہے اور میں آتے ہی مختلف چکروں میں اس طرح الجھ گیا کہ آپ کی خیر خیریت بھی نہیں معلوم کر سکا تھا۔''

''تم نے درست فیصلہ کیا تھا۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''میں عمر رسیدہ ہونے کے باوجود جذباتی ہو گیا تھا۔''

''آپ کا اشارہ وادی کی طرف نہ جانے والے فیصلے کی طرف ہے؟''

''ہاں کیونکہ میں جانتا تھا اگر میں تمہارے بغیر گیا تو ناکامی میرا مقدر بنے گی اس کے باوجود مجھے وہاں کی کشش نے کھینچ لیا۔''

''راجا صاحب اگر میں اکیلا ہوتا تو آپ کے ساتھ ضرور جاتا لیکن میں اپنے ساتھیوں کو انڈیا میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا سمیت بے شمار دشمن وہاں ہمارے تعاقب میں تھے۔''

''میں تمہاری مجبوری سمجھ گیا ہوں اور میں تمہیں اس کے لیے الزام بھی نہیں دے رہا تم نے حالات کے لحاظ سے بالکل درست فیصلہ کیا تھا۔''

''خدا کا شکر ہے میں اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت لانے میں کامیاب رہا۔''

جب تک گرین ٹی آتی میں نے راجا عمر دراز کو اپنے سفر کی مختصر رُوداد سنائی۔ وہ غور سے سنتا رہا یہ سارے وہ حالات تھے جو اس کے پُر اسرار طور پر غائب ہو جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ جب میں نے نیپال کے سفر اور چین کی سرحد پر گرفتاری کا ذکر کیا تو وہ چونک گیا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں پھر چینی ہیلی کاپٹر پر انڈیا کی طرف سے میزائل حملہ اور اس کی تباہی کے بعد ہمارا بھارتی کشمیر میں سفر تھا۔ ابھی میں اس سفر کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ایک نوعمر اور حسین لڑکی گرین ٹی چاندی کی تھالی میں سجا کر لے آئی۔ گویا اپنے حصے کی حد تک راجا عمر دراز کی حسین ملازماؤں والی پالیسی جاری تھی۔ جب تک اس نے ہمیں گرین ٹی سرو کی میں رکا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بقیہ حصہ سنایا۔

''پاکستان آنے کے بعد تم پر کیا گزری؟''

میں نے اس کو یہاں کے حالات بھی سنائے اور جب ڈاکٹر توفیق کے چنگل میں ڈیوڈ شا کا ذکر آیا تو راجا عمر دراز چونک گیا تھا۔ ''اس نے تم سے بھی رابطہ کیا تھا؟''

اس کی بات پر غور کرتے ہوئے میں نے سوال کیا۔ ''تو کیا اس نے آپ سے بھی رابطہ کیا تھا؟''

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ''ہاں اس نے رابطہ کیا تھا اور مجھے ایک پیش کش بھی کی تھی۔''

''وادی کی طرف ایک مشترکہ مہم لے جانے کی پیش کش؟''

''ہاں کیونکہ تمہارے بغیر وادی میں داخلہ ممکن نہیں ہے اور اس کے خیال میں تم میرے قابو میں ہو اس لیے اس نے مجھے پیش کش کی کہ اگر تم ساتھ ہو تو وہ وادی تک جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا بلکہ اس نے کہا ہے کہ وہ بھارتی حکومت سے تمام ضروری اجازت بھی حاصل کر لے گا۔''

''میرا خیال ہے اس کی ضرورت تو آپ کو بھی نہیں ہے۔''

''ہاں مجھے اس کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے اسے انکار نہیں کیا ہے میں نے اس سے کہا

ہے کہ میں اس بارے میں سوچوں گا۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔" میں نے کہا اور اپنی داستان کا بقیہ حصہ سنانے لگا۔ راجا عمر دراز کو یہ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی کہ جان لیوا اور یقینی موت سمجھے جانے والے ایبولا وائرس نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"حکیم قادس نے تم پر جو دوائیں آزمائی ہیں ان کا تعلق صرف تمہارے ہاتھ کی صحت سے نہیں ہے بلکہ ان میں اور بھی خصوصیات ہیں۔"

"میں محسوس کرتا ہوں۔ کتنی ہی شدید چوٹ کیوں نہ ہو میرا زخم حیرت انگیز طور پر بہت جلدی ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ یہ صرف دواؤں کی کرامات ہے بلکہ تمہاری اپنی قوت مدافعت بھی بہت مضبوط ہے۔ حکیم قادس کا کہنا ہے کہ تمہارا ہاتھ تقریباً مردہ ہو چکا تھا اور وہ بھی شاید اسے بچا نہیں سکتا تھا لیکن دوران علاج تم نے اپنی قوتِ ارادی کو پوری طرح استعمال کیا اور اپنا ہاتھ بچانے میں کامیاب ہو گئے۔"

"یہ صرف اللہ کا کرم ہے۔" میں نے کہا اور موضوع بدل دیا۔" ڈیوڈ شا کا کہنا ہے کہ اس سفر کے دوران وہ اور آپ ایک موقع پر آمنے سامنے آ گئے تھے؟"

"یہ درست ہے اور ہماری پارٹیوں کا ٹکراؤ بھی ہوا تھا۔ جس میں ہمارے سارے ساتھی مارے گئے تھے۔ صرف میں اور ڈیوڈ شا زندہ بچے تھے۔ ہماری خوراک بھی تباہ ہو گئی تھی۔ اس وقت ہم وادی کے قریب تھے۔ اگر وادی میں اترنے کا راستہ نہیں ملتا تو ہم مارے جاتے اور سچ مچ ایک موقع آیا تھا جب ہمیں مرنے کا یقین بھی ہو گیا تھا۔"

"کیا رانا ویاس کو علم تھا کہ آپ وادی کی طرف جا رہے ہیں؟"

راجا عمر دراز مسکرایا۔"اسی نے تو سارا بندوبست کرا کر دیا تھا اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ میری گاڑی کسی جگہ خالی حالت میں ملی ہے؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی بتایا تھا۔"

"اس نے آدمیوں کا بندوبست بھی کیا تھا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ دونوں عمر رسیدہ دوستوں نے بچوں والی حرکت کی تھی۔ اول تو راجا عمر دراز کو اس طرح جانا تھا تو ہم سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اسے روکنے کے مجاز نہیں تھے۔ دوسرے جب راجا عمر دراز نے جانا تھا تو ہماری واپسی کا بندوبست کر جاتا۔ رانا ویاس کے لیے نہایت آسان ہوتا کہ ہمیں قانونی طریقے سے واپس پاکستان پہنچا دیتا۔ ہم اس طرح دشواریوں میں پڑ کر واپس نہ آتے اور نہ ہمیں ہر قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑتا۔ راجا عمر دراز نے میرے تاثرات سے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو لیکن اس وقت مجھے یہ سب ٹھیک لگ رہا تھا اور میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں تم لوگوں کو مشکل میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

میں نے گہری سانس لی۔" راجا صاحب میری مشکلات اب بھی کم نہیں ہوئی ہیں۔ مجھے بیک وقت دو

دشمنوں کا سامنا ہے۔ ایک مرشد اور اس کے ساتھی اور دوسرا فتح خان اور ڈیوڈ شا کا مشترکہ گروپ ہے۔ فتح خان اگر چہ انکار کرتا ہے لیکن مجھے خاصی حد تک یقین ہے کہ اصل میں وہ ڈیوڈ شا کا ایجنٹ ہے۔''

''یہ بات سو فی صد درست ہے۔''

''اب فتح خان میرے پیچھے ہے اور میں نے آپ کی اسلام آباد والی کوٹھی سے دور ہونے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو یہ جگہ فتح خان اور اس کے ذریعے ڈیوڈ شا کی نظر میں آجاتی۔''

فتح خان کا نام آتے ہی راجا عمر دراز کی بھنویں تن گئی تھیں۔ وہ اس کا مجرم تھا اور اب اس کے دشمن کا ساتھی بن کر مزید مجرم بن گیا تھا۔ ''وہ دو ٹکے کا آدمی ہے جسے ڈیوڈ شا نے سر چڑھا دیا ہے۔''

مجھے اس کی بات سے اختلاف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فتح خان ایک نچلے درجے کا مجرم تھا اور وہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا مگر اس کی ذہانت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے جرائم پیشہ افراد کے برخلاف اس نے موقع ملنے پر کچھ سیکھنے سے گریز نہیں کیا۔ اس نے زبانیں بھی سیکھیں اور جدید ہتھیاروں اور آلات کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ شہر میں رہ کر اس کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آئیں۔ ڈیوڈ شا نے اسے بلا وجہ منتخب نہیں کیا تھا۔ اس نے خود کو اس قابل ثابت کیا تھا۔ پھر اس کے بعض معاملات ایسے تھے جن میں اس کی ثابت قدمی حیرت انگیز تھی۔ اس بات کو ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جب برٹ شا اس کے قبضے میں آیا اور صرف برٹ شا جانتا تھا کہ اس نے ہیرے کہاں چھپائے۔ فتح خان ابھی تک اسے قید میں رکھ کر اس امید میں تھا کہ یہ ہیرے بالآخر اس کے قبضے میں آجائیں گے جن کی بین الاقوامی منڈی میں قیمت کوئی پچیس کروڑ ڈالرز بنتی تھی۔ یہ بات راجا عمر دراز کے علم میں نہیں تھی۔ میں نے اسے یا کسی اور کو ان ہیروں یا برٹ شا کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اگر چہ دوسروں سے اس بات کو چھپانے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن میرے خیال میں بتانا بھی ضروری نہیں تھا۔

حد یہ کہ ایمن کو بھی نہیں بتایا تھا اگر اسے پتا چل جاتا کہ اس کا باپ زندہ اور فتح خان کی قید میں ہے تو وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر یہاں آجاتی اور مجھے پھر اپنے دشمنوں کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دینا پڑتا جو موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے برٹ شا سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اس نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہا تھا۔ اسے ہیرے افغانستان سے ملے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ان ہیروں کی مدد سے اسلحے کی کوئی بہت بڑی کھیپ حاصل کی گئی تھی۔ یہ اسلحہ یقیناً اس تباہ حال ملک کی مزید بربادی میں استعمال ہو رہا تھا گویا برٹ شا استعماری طاقتوں کا ایجنٹ بن کر یہاں آیا تھا اور اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا تھا۔ البتہ ایمن سے مجھے ہمدردی تھی اس کا اس معاملے میں کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ اپنے باپ کی میراث سے بھی محروم کر دی گئی تھی۔ ڈیوڈ شا کو یقیناً اس کے کزن کا کردار دیا گیا تھا اور اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے اعزاز اور جاگیر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ شاید شا خاندان نسل در نسل استعماری طاقتوں کا ایجنٹ چلا آرہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' راجا عمر دراز نے پوچھا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر چہ اس کی صحت ٹھیک لگ رہی تھی۔ چہرہ ویسا ہی سرخی مائل اور بھرا ہوا تھا۔ جسم میں بھی مضبوطی نظر آرہی تھی لیکن اس کے باوجود مجھے لگا وہ بیمار ہے یا اسے کوئی مسئلہ ہے۔

''کچھ نہیں آپ بتائیے آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

''میں ویسے تو ٹھیک ہوں۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹرز نے مجھے کینسر بتایا ہے۔''

اس کے الفاظ دھماکے کی طرح مجھے لگے تھے میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''آپ...... آپ نے کینسر ہی کہا ہے نا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرے سینے میں کینسر کی رسولی پرورش پا رہی ہے۔''

''میرے خدا۔'' میں نے کہا۔ ''کب پتا چلا۔''

''ابھی ایک ہفتہ پہلے...... میرا ٹیسٹ گیا تھا اسلام آباد اور رپورٹ آئی ہے ایک ڈاکٹر یہاں میری دیکھ بھال کر رہا ہے۔''

''تو آپ نے اسی وجہ سے حکیم قادس کو فوراً واپس بلایا ہے؟''

''ہاں میرا علاج وہی کر سکتا ہے۔ ویسے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ رسولی دوسرے اسٹیج پر ہے اور اپنی جڑیں بھی پھیلا رہی ہے اگر میں برطانیہ یا سنگاپور جا کر آپریٹ کروالوں تو نوے فی صد امکان ہے کہ مجھے اس سے نجات مل جائے گی۔''

''تب آپ کو فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسی سال کی عمر میں، میں صرف اس لیے اپنے جسم کی کاٹ پیٹ کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ابھی میں چند سال مزید جی سکتا ہوں۔''

''یہ فیصلہ خطرناک ہو سکتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ حکیم قادس بہت اچھا حکیم ہے اور اس کے پاس دوائیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ وہ شاید مجھے کچھ عرصے زندہ رکھنے میں کامیاب ہو جائے لیکن وہ مجھے کینسر سے نہیں بچا سکتا ہے۔''

''پھر اس فیصلے کی وجہ؟...... میں جانتا ہوں آپ کوئی فیصلہ بنا سوچے سمجھے نہیں کرتے ہیں۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''شہباز نہ جانے کیوں میرے اندر سے کوئی کہہ رہا ہے کہ میرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ایسی بیماری کا سن کر اس قسم کے خیالات کا آنا فطری بات ہے۔''

''نہیں بیماری کا تو مجھے ابھی پتا چلا ہے یہ خیال تو مجھے واپسی کے بعد رہ رہ کر آ رہا ہے۔''

''ڈاکٹر نے ابھی ڈائی گنوس کیا ہے آپ کے جسم نے پہلے جان لیا تھا اس نے آپ کو خیال کی صورت میں خبردار کر دیا۔''

''شاید ایسا ہی ہو لیکن اس کے باوجود میں کینسر سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپریشن کرانے کے لیے تیار نہیں ہوں مجھے یقین ہے اس طرح سے بھی میں کینسر سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔''

''پھر کیا صورت رہ جاتی ہے؟''

راجا عمر دراز اس بار جواب دینے سے پہلے خاصی دیر تک سوچتا رہا تھا اور میں اپنی گرین ٹی ختم کر رہا تھا۔ یہ بہت نفیس قسم کا کپ تھا جس میں ڈالی جانے والی گرم چیز دیر تک گرم رہتی تھی اور باہر اس کا اثر نہیں آتا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ ''شہباز مجھے لگتا ہے میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں اگر میں وادی تک

پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔''
جب وہ سوچ رہا تھا تو میرے دل میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ وادی کی بات کرے گا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا۔ ''یہ صرف ایک خیال ہے وادی تک پہنچ کر آپ کس طرح بچ سکتے ہیں؟''
''یہ خیال ہی ہے۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''لیکن میرے اندر کی آواز کہتی ہے کہ اگر میں وادی کی طرف گیا تو بچ جاؤں گا۔''
''راجا صاحب آپ کمزور ہو رہے ہیں اور آپ کے جسم میں ایک خوفناک مرض بھی جگہ بنا چکا ہے کیا آپ اس حالت میں وادی تک کا مشکل سفر کر سکیں گے؟''
''کیوں نہیں کر سکوں گا۔ یہ کینسر کوئی نیا تھوڑی ہے ڈاکٹر کا کہنا ہے میرے جسم میں ایک سال سے پرورش پا رہا ہے یعنی میں اس کے ساتھ ہی وادی تک گیا تھا۔''
''فرق جاننے اور نہ جاننے کا ہے اس وقت آپ کو علم ہی نہیں تھا کہ آپ کے جسم میں کینسر ہے لیکن اب آپ جان گئے ہیں۔''
''جان بچانے کے لیے آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' ان کا لہجہ کمزور ہو گیا تھا۔
میں نے سوچا اور بولا۔ ''راجا صاحب زندگی کی پروا آپ نے کبھی نہیں کی ہے اس لیے میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ آپ صرف جان بچانے کے لیے اس وادی تک جانا چاہتے ہیں۔''
''شاید یہ بات درست ہے یا شاید نہیں ہے۔'' انہوں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ ''شاید درست یہ ہے کہ میں بہر حال ایک بار اس وادی میں اترنا چاہتا ہوں چاہے اس کی قیمت مجھے جان کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔''
''ڈیوڈ شا نے بتایا کہ آپ دونوں کو برف والا آدمی وادی میں لے گیا تھا اور اگر وہ اوپر نہ آتا تو آپ دونوں کا بچنا محال تھا؟''
''یہ بالکل درست ہے ہم سردی اور بھوک سے مرنے والے تھے۔''
''آپ نے مجھے اس سفر کے بارے میں نہیں بتایا؟''
اس سے پہلے راجا عمر دراز مزید کچھ کہتا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ مخصوص دستک تھی جو بیگ دیتا تھا۔ راجا عمر دراز نے بلند آواز سے کہا۔ ''آجاؤ۔''
بیگ اندر آیا اور اس نے دھیمے لہجے میں اور مقامی زبان میں کچھ کہا راجا عمر دراز نے سر ہلایا اور جواب میں کچھ کہا بیگ ذرا جھکا اور باہر چلا گیا اس کے جانے کے بعد راجا عمر دراز نے کہا۔ ''کھانے کا وقت قریب ہے اور اس سے پہلے حکیم قادس میرا علاج کرتا ہے۔''
میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''کیا کھانے کی میز پر آپ سے ملاقات ہو گی۔''
''بالکل میں کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا اور اس کے بعد میں تم کو اپنے سفر کے بارے میں بتاؤں گا۔''
درحقیقت مجھے راجا عمر دراز کے سفر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے صرف اس کا دل رکھنے کے لیے

''میں ویسے تو ٹھیک ہوں۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''لیکن ڈاکٹرز نے مجھے کینسر بتایا ہے۔''

اس کے الفاظ دھماکے کی طرح مجھے لگے تھے میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''آپ...... آپ نے کینسر ہی کہا ہے نا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرے سینے میں کینسر کی رسولی پرورش پا رہی ہے۔''

''میرے خدا۔'' میں نے کہا۔ ''کب پتا چلا۔''

''ابھی ایک ہفتہ پہلے...... میرا ٹیسٹ گیا تھا اسلام آباد اور رپورٹ آئی ہے ایک ڈاکٹر یہاں میری دیکھ بھال کر رہا ہے۔''

''تو آپ نے اسی وجہ سے حکیم قادس کو فوراً واپس بلایا ہے؟''

''ہاں میرا علاج وہی کر سکتا ہے۔ ویسے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ رسولی دوسرے اسٹیج پر ہے اور اپنی جڑیں بھی پھیلا رہی ہے اگر میں برطانیہ یا سنگاپور جا کر آپریٹ کروالوں تو نوے فی صد امکان ہے کہ مجھے اس سے نجات مل جائے گی۔''

''تب آپ کو فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسّی سال کی عمر میں، میں صرف اس لیے اپنے جسم کی کاٹ پیٹ کے لیے تیار نہیں ہوں کہ ابھی میں چند سال مزید جی سکتا ہوں۔''

''یہ فیصلہ خطرناک ہو سکتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ حکیم قادس بہت اچھا حکیم ہے اور اس کے پاس دوائیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ وہ شاید مجھے کچھ عرصے زندہ رکھنے میں کامیاب ہو جائے لیکن وہ مجھے کینسر سے نہیں بچا سکتا ہے۔''

''پھر اس فیصلے کی وجہ؟...... میں جانتا ہوں آپ کوئی فیصلہ بنا سوچے سمجھے نہیں کرتے ہیں۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''شہباز نہ جانے کیوں میرے اندر سے کوئی کہہ رہا ہے کہ میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ایسی بیماری کا سن کر اس قسم کے خیالات کا آنا فطری بات ہے۔''

''نہیں بیماری کا تو مجھے ابھی پتا چلا ہے یہ خیال تو مجھے واپسی کے بعد رہ رہ کر آ رہا ہے۔''

''ڈاکٹر نے ابھی ڈائی گنوس کیا ہے آپ کے جسم نے پہلے جان لیا تھا اس نے آپ کو خیال کی صورت میں خبردار کر دیا۔''

''شاید ایسا ہی ہو لیکن اس کے باوجود میں کینسر سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپریشن کرانے کے لیے تیار نہیں ہوں مجھے یقین ہے اس طرح سے بھی میں کینسر سے نجات حاصل نہیں کر سکوں گا۔''

''پھر کیا صورت رہ جاتی ہے؟''

راجا عمر دراز اس بار جواب دینے سے پہلے خاصی دیر تک سوچتا رہا تھا اور میں اپنی گرین ٹی ختم کر رہا تھا۔ یہ بہت نفیس قسم کا کپ تھا جس میں ڈالی جانے والی گرم چیز دیر تک گرم رہتی تھی اور باہر اس کا اثر نہیں آتا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔ ''شہباز مجھے لگتا ہے میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں اگر میں وادی تک

پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔"
جب وہ سوچ رہا تھا تو میرے دل میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ وہ وادی کی بات کرے گا اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا۔" یہ صرف ایک خیال ہے وادی تک پہنچ کر آپ کس طرح بچ سکتے ہیں؟"
" یہ خیال ہی ہے۔" راجا عمر دراز نے کہا۔" لیکن میرے اندر کی آواز کہتی ہے کہ اگر میں وادی کی طرف گیا تو بچ جاؤں گا۔"
" راجا صاحب آپ کمزور ہو رہے ہیں اور آپ کے جسم میں ایک خوفناک مرض بھی جگہ بنا چکا ہے کیا آپ اس حالت میں وادی تک کا مشکل سفر کر سکیں گے؟"
" کیوں نہیں کر سکوں گا۔ یہ کینسر کوئی نیا تھوڑی ہے ڈاکٹر کا کہنا ہے میرے جسم میں ایک سال سے پرورش پا رہا ہے یعنی میں اس کے ساتھ ہی وادی تک گیا تھا۔"
" فرق جاننے اور نہ جاننے کا ہے اس وقت آپ کو علم ہی نہیں تھا کہ آپ کے جسم میں کینسر ہے لیکن اب آپ جان گئے ہیں۔"
" جان بچانے کے لیے آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔" ان کا لہجہ کمزور ہو گیا تھا۔
میں نے سوچا اور بولا۔" راجا صاحب زندگی کی پروا آپ نے کبھی نہیں کی ہے اس لیے میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ آپ صرف جان بچانے کے لیے اس وادی تک جانا چاہتے ہیں۔"
" شاید یہ بات درست ہے یا شاید نہیں ہے۔" انہوں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔" شاید درست یہ ہے کہ میں بہر حال ایک بار اس وادی میں اترنا چاہتا ہوں چاہے اس کی قیمت مجھے جان کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔"
" ڈیوڈ شا نے بتایا کہ آپ دونوں کو برف والا آدمی وادی میں لے گیا تھا اور اگر وہ اوپر نہ آتا تو آپ دونوں کا بچنا محال تھا؟"
" یہ بالکل درست ہے ہم سردی اور بھوک سے مرنے والے تھے۔"
" آپ نے مجھے اس سفر کے بارے میں نہیں بتایا؟"
اس سے پہلے راجا عمر دراز مزید کچھ کہتا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ مخصوص دستک تھی جو بیگ دیتا تھا۔ راجا عمر دراز نے بلند آواز سے کہا۔" آ جاؤ۔"
بیگ اندر آیا اور اس نے دھیمے لہجے میں اور مقامی زبان میں کچھ کہا راجا عمر دراز نے سر ہلایا اور جواب میں کچھ کہا بیگ ذرا جھکا اور باہر چلا گیا اس کے جانے کے بعد راجا عمر دراز نے کہا۔" کھانے کا وقت قریب ہے اور اس سے پہلے حکیم قادس میرا علاج کرتا ہے۔"
میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔" کیا کھانے کی میز پر آپ سے ملاقات ہو گی۔"
" بالکل میں کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا اور اس کے بعد میں تم کو اپنے سفر کے بارے میں بتاؤں گا۔"
درحقیقت مجھے راجا عمر دراز کے سفر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے صرف اس کا دل رکھنے کے لیے

پوچھ لیا تھا اور وہ بیماری کی حالت میں بھی مجھے اپنے سفر کی داستان سنانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا مقصد مجھے وادی کے سفر پر آمادہ کرنے کی کوشش تھی۔ مگر فی الحال میں بالکل بھی دستیاب نہیں تھا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات کس طرح مناسب پیرائے میں راجا عمر دراز سے کہہ دوں۔ بہر حال میں اسے صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں باہر آیا تو بیگ راہداری میں موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے راجا صاحب کی بیماری کا جان کر افسوس ہوا ہے۔''

''ہاں مرض ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے لیکن وہ اس کا علاج کرانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' بیگ نے دبے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اور ان کے خاندان والوں نے زور دیا ہے۔''

میں چونکا۔ ''راجا صاحب کے خاندان والے؟''

''آپ نہیں جانتے، ان کے دو بیٹے ہیں، ایک جرمنی میں ہوتے ہیں اور دوسرے صاحبزادے فرانس میں ہوتے ہیں۔ ان کی ایک شادی شدہ صاحبزادی ہیں۔ یہ تمام خود بچوں اور بچوں کے بچوں والے ہیں۔''

''یہاں محل میں کوئی نہیں ہے؟''

''صرف راجا صاحب کی ایک بیوہ بھتیجی ہیں۔ ان کی بیوی کا تیس سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔''

''کیا راجا صاحب کی بیماری کا سن کر کوئی نہیں آ رہا ہے؟''

''ان کے تینوں بچے آ رہے ہیں اور شاید وہ ان کو علاج کے لیے باہر جانے پر مجبور کر دیں۔''

بیگ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی راجا عمر دراز کے وادی تک سفر کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ وہ امریکہ یا سنگاپور جا کر اپنے کینسر کا علاج کرا لے۔ میں نے کہا۔ ''میری راجا صاحب سے جو بات ہوئی ہے اس سے لگ رہا ہے کہ ان کو اپنے کینسر کے مروجہ علاج سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

بیگ نے سر ہلایا۔ ''وہ حکیم سے علاج کرا رہے ہیں جب کہ حکیم کے پاس وہ مخصوص پتھر بھی باقی نہیں رہا ہے جسے وہ دواؤں میں ڈالتا ہے تو ان کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔''

یہ انکشاف تھا۔ ''اس کا مطلب ہے حکیم قادس اب عمومی دواؤں سے راجا صاحب کا علاج کر رہا ہے۔''

بیگ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''ان سے بہتری تو آ سکتی ہے لیکن مرض کا علاج ممکن نہیں ہے۔''

کیونکہ بیگ نے وادی تک سفر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ راجا نے اسے اعتماد میں نہیں لیا تھا اور اس صورت میں اسے بتانا مناسب نہیں لگا تھا۔ بیگ مجھے محل کے ایک حصے میں لایا۔ یہاں بڑی خوب صورت نشست گاہ تھی جس کے ایک طرف کی پوری دیوار شیشے کی تھی اور نیم دائرے کی صورت میں شیشے لکڑی کے فریم میں جڑے ہوئے تھے۔ سامنے برف پوش پہاڑوں کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بیگ مجھے یہاں بیٹھنے کے لیے لایا تھا اور شاید ڈنر لگنے تک مجھے یہیں رہنا پڑتا لیکن وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''شہباز صاحب میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں جس کا علم ابھی راجا صاحب کو نہیں ہے۔ یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان میں رہے گی۔''

''اگر آپ کو افشائے راز کا خوف ہے تو آپ بلا جھجک اسے خود تک محدود رکھ سکتے ہیں۔''

''افشائے راز کا خوف نہیں ہے لیکن راجا صاحب کے علم میں نہیں آنی چاہیے۔'' اس نے کہا اور پھر ذرا

توقف کے بعد بولا۔ ''درحقیقت ڈاکٹر نے ان کو جواب دے دیا ہے۔ کینسر ابتدائی اسٹیج پر ہے لیکن جسم کے ان حصوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے جہاں سے اسے نکالنا ممکن نہیں ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

مجھے ایک بار پھر دھچکا لگا تھا۔ راجا عمر دراز کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے تصویر کے اس رخ کا علم نہیں ہے اور ڈاکٹر نے اسے پوری بات نہیں بتائی ہے۔ ممکن ہے اس کام میں بیگ کے ساتھ راجا عمر دراز کے بچے بھی شامل ہوں۔ میں نے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے ڈاکٹر نے وقت دے دیا ہے؟''

''بالکل ڈاکٹر کے مطابق اگر علاج پر توجہ دی جائے تو راجا صاحب ایک سال تک مزید زندہ رہ سکتے ہیں۔''

''یہ بات راجا صاحب کو کیوں نہیں بتائی گئی؟''

''درحقیقت مجھے بھی آج ہی پتا چلا ہے۔ ابتدائی رپورٹ میں نتیجہ حوصلہ افزا تھا اور علاج ممکن دکھائی دے رہا تھا لیکن حتمی رپورٹ میں واضح ہو گیا ہے۔''

''کیا اس خبر کو چھپا کر رکھنا ہے؟''

بیگ نے سر ہلایا۔ ''جب تک راجا صاحب کی اولاد یہاں نہیں آ جاتی ہے وہی فیصلہ کریں گے کہ انہیں اپنے باپ کو بتانا چاہیے یا نہیں۔''

''اگر آپ چھپانا چاہتے ہیں تو آپ نے مجھے کیوں بتایا ہے؟''

''تاکہ آپ راجا صاحب کی خواہش پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے جان لیں۔'' بیگ کا لہجہ حسبِ معمول سپاٹ ہو گیا تھا۔

میں چونکا۔ ''کیسی خواہش اور اس پر کیسا فیصلہ؟''

''شہباز صاحب آپ جانتے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ راجا صاحب اپنی عمر اور بیماری سے قطع نظر اب بھی اس وادی کی طرف جانے کی خواہش رکھتے ہیں اور وہ آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ درحقیقت آپ کو ساتھ چلنے پر آمادہ کرنا ہی اصل مسئلہ ہے ورنہ عین ممکن ہے اب تک راجا صاحب اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنا چکے ہوتے۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو ان کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔''

''یہ انکار میں نے انڈیا میں بھی کیا تھا اس کے باوجود راجا صاحب چلے گئے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''اس وقت ان کے ذہن میں ہوگا کہ شاید آپ کے بغیر بھی وادی میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن اس تجربے نے ثابت کر دیا کہ برف والے بوڑھے کی بات درست تھی اور وہ آپ کے بغیر گئے اور وادی کے کنارے پہنچ کر بھی اس میں داخل نہیں ہو سکے تھے۔ اب انہیں معلوم ہے کہ آپ کے بغیر یہ کام ناممکن ہے اور اگر آپ نے انکار کیا تو پھر ان کا ارادہ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔''

میں بیگ کی باتوں کو تول رہا تھا اور مجھے ان میں سچائی محسوس ہوئی تھی۔ ''بیگ صاحب! سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود اس وادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور دوسرے میں ایسے مسائل میں الجھا ہوا ہوں جن کے بارے میں آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں کسی صورت ان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا مجھے مرشد سے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کرنا ہے۔''

بیگ نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے اگر راجا صاحب نے آپ سے ساتھ چلنے کو کہا تو آپ کا جواب انکار میں ہوگا۔''

''اگر چہ مجھے شرم آئے گی کیونکہ راجا صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لیکن میں ان کی اور اپنی خاطر انکار کردوں گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' بیگ نے کہا۔ ''راجا صاحب کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور ان کو یہ وقت سکون سے اپنے گھر میں گزارنا چاہیے۔''

دیکھنے میں تو سیکرٹری بیگ بھی جیسے کچھ پل کا مہمان نظر آتا تھا لیکن اس کے استخوانی جسم میں بہت پھرتی اور طاقت تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ چاک و چوبند پایا تھا۔ اس کے مقابلے میں صحت منداور توانا نظر آنے والا راجا عمر دراز ایک ایسی موذی بیماری کا شکار ہوگیا تھا جس کا علاج بھی ممکن نہیں تھا اور ڈاکٹر نے اسے ایک سال کا وقت دے دیا تھا۔ بیگ اپنے مطلب کی بات کر کے رخصت ہوگیا تھا اور اس کے جانے کے چند منٹ بعد وہی نوعمر اور حسین خادمہ اندر آئی۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''کھانا...... لاگ گیا...... آپ کو بلاتا۔''

''چلو۔'' میں نے کہا اور اس کی رہنمائی میں محل کے ڈائننگ ہال پہنچا یہ سچ مچ ہال تھا۔ اس بہت بڑے کمرے میں تین میزیں لگی تھیں ایک میز کے گرد کم سے کم پچاس لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ دوسری میز چھوٹی تھی لیکن اس پر بھی تیس پینتیس افراد آرام سے آسکتے تھے۔ تیسری میز نارمل تھی یعنی اس پر ایک درجن افراد ہی کھانا کھا سکتے تھے اور ہمارے لیے اسی پر کھانا لگایا گیا تھا۔ بس دو افراد تھے۔ راجا عمر دراز صدر کرسی پر تھا اور مجھے اس کے دائیں طرف پہلی کرسی ملی تھی۔ آداب کے مطابق یہ کرسی قریبی عزیز کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ مہمان عام طور سے مخالف سمت میں دوسری واحد کرسی پر بیٹھتا ہے۔ میرے بیٹھتے ہی گھنٹی بجی اور ملازمین کھانے کی قابیں لانے لگے۔ سب سے پہلے راجا عمر دراز کے سامنے ایک پیالہ رکھا گیا جس میں سوپ نما چیز تھی اور اس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پھر قابیں میز پر سجائی جانے لگیں۔ یہ نصف درجن قابیں اور ڈشز تھیں۔ پھر ان پر سے ڈھکن ہٹائے گئے تاکہ میں اپنی پسند کی چیز لے سکوں۔ راجا عمر دراز نے کھانے کے آغاز سے پہلے کہا۔

''افسوس کہ میں اس میں سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔ فی الحال حکیم قادس نے مجھے صرف یہ سوپ پینے کو کہا ہے۔''

''یہ پرہیزی غذا ہے۔''

''تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو ویسے یہ خاص طاقتور جڑی بوٹیوں سے بنا سوپ ہے جو بقول اس کے مجھے اندر سے اتنا توانا کردے گا کہ میں اپنی بیماری سے لڑ کر اسے شکست دے سکوں گا۔''

''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے کہا راجا عمر دراز کے ساتھ میں نے بھی کھانے کا آغاز کردیا۔ تمام کھانے اعلیٰ شاہی معیار کے اور نہایت لذیذ تھے۔ خاص بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی میں خاصا کھا گیا تھا جب کہ راجا عمر دراز نے اپنا سوپ کا پیالہ بڑی مشکل سے ختم کیا تھا۔ شاید بیماری نے اس کی بھوک بھی ختم کردی تھی۔ وہ بے دلی سے سوپ پیتا رہا تھا۔ پیالہ ختم کر کے اس نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔ جب میں نے کھانا ختم کیا تو

اس نے بے تابی سے کہا۔

"میرے ساتھ چلو کیونکہ میرے سونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ حکیم آ جائے گا دوا دینے میں سونے سے پہلے تمہیں اپنے سفر کی رُوداد سنا دینا چاہتا ہوں۔"

ہم ایک بار پھر راجا عمر دراز کی خواب گاہ میں آ گئے تھے۔ جب ہم کھانے والے کمرے سے نکلنے لگے تو بیگ نے نظروں میں مجھے یاد دلایا کہ میں نے اس سے کیا وعدہ کیا ہے۔ میں نے اسے نظروں سے تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے۔ راجا عمر دراز نے کافی منگوائی تھی اس نے کہا۔ "اگر چہ مجھے کافی اب منع ہے لیکن آج تمہارے ساتھ بد پرہیزی کر لیتا ہوں۔"

"راجا صاحب میرا خیال ہے آپ آرام کریں۔ آپ کی داستان میں بعد میں بھی سن سکتا ہوں۔"

"نہیں میں نے تمہیں خاص طور سے اسی لیے بلایا ہے۔ کل صبح تم چلے جاؤ گے اور پتا نہیں پھر حالات کب تمہیں آنے کی اجازت دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے ایک وعدہ کر کے جاؤ۔"

"راجا صاحب میں اس وقت کسی وعدے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ سے وعدہ کیا تھا کہ بھائی کی بیوہ سے عدت پوری ہوتے ہی نکاح کر لوں گا لیکن میں وہ وعدہ بھی پورا نہیں کر سکا ہوں۔"

"میرے بیٹے میں تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں لوں گا جو تم پورا نہ کر سکو۔" راجا عمر دراز نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایک بار تم میری بات سن لو اس کے بعد تم جو چاہے فیصلہ کرو۔"

راجا عمر دراز مجھے گھیر گھار کر فیصلے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کہ میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے راجا صاحب میں آپ کی بات سننے کے لیے تیار ہوں۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا اور اس نے کہنا شروع کیا۔ "صرف رانا دیاس اور اس کے چند قریبی ساتھی جانتے تھے کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ سچی بات ہے مجھے رانا دیاس نے بھی روکنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھ پر ایک جنون سوار ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹے طیارے نے مجھے اور میرے چار ملازموں کو اس متروک رن وے پر اتار دیا جو دوسری جنگِ عظیم میں بنایا گیا تھا اور جہاں ایک وقت میرا اور ولیم شا کا طیارہ اترا تھا۔ یہ رن وے اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ یہاں سے ہم پیدل آگے بڑھے۔

سرما کی وجہ سے موسم نہایت خراب تھا۔ رن وے تک برف سے ڈھک گیا تھا کیونکہ یہ بھی کوئی سات ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ شمال کی طرف سے برفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ رانا دیاس نے جن آدمیوں کو میرے ساتھ کیا تھا ان کو شمال کی طرف سفر اور پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ تھا۔ ہم سامان لے جانے کے لیے سلیجز لائے تھے جن کے نیچے برف پر پھسلنے والی اسکیز ہوتے ہیں۔ یہ سلیجز اس وقت تک ہمارے کام آتیں جب تک پہاڑوں کا مرحلہ نہیں شروع ہو جاتا۔ دو دن کے بعد وہ مرحلہ آ گیا جب ہمیں سلیجز چھوڑنا پڑیں اور تمام سامان اپنی پشت پر لاد کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ سامان ان چاروں نے اٹھایا تھا اور مجھے صرف خود کو آگے لے جانا تھا۔ مگر خالی ہاتھ آگے بڑھنا بھی نہایت مشکل کام ثابت ہوا تھا اگر میں ایک جذبے کے ساتھ نہ نکلا ہوتا تو شاید پہاڑوں تک پہنچنے سے پہلے واپس چلا جاتا۔ تین دن تک ہم پہاڑ سر کرتے رہے تھے۔ چھٹے دن ہم اس علاقے میں داخل ہو گئے جہاں وادی موجود تھی۔"

اس دوران میں ملازمہ کافی لے آئی تھی اور ہمیں سرو کرنے لگی اس لیے راجا عمر دراز خاموش ہو گیا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''ڈیوڈ شا سے آپ کا ٹکراؤ کہاں ہوا؟''

''اسی جگہ ہوا تھا۔ جب ہم پہاڑوں سے نیچے اترے وہ اور اس کے آدمی پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ دونوں پارٹیوں کے پاس اسلحہ تھا اور اس سے پہلے کہ میں یا ڈیوڈ شا اپنے آدمیوں کو روکتے کسی غلط فہمی کے نتیجے میں انہوں نے ایک دوسرے پر ہتھیار تان لیے تھے اور پھر کسی نے گولی بھی چلا دی تھی۔ میں نے ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر اپنی جان بچائی تھی کیونکہ وہاں اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں۔ گولیوں کے شور کے ساتھ مارے جانے والوں کی چیخوں کا شور بھی تھا۔ پھر کسی کی چلائی گولی ہمارے سامان میں موجود ڈائنامائٹ سے جا لگی۔ یہ ڈائنامائٹ ہم راستہ بنانے کے لیے لائے۔ دھماکے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور وہاں موجود سب ہی لوگ مارے گئے اور سامان مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا بچے ہوئے سامان کو آگ چاٹ رہی تھی۔ ان دھماکوں اور آگ لگنے میں ڈیوڈ شا کا سامان بھی برباد ہو گیا تھا اور جب خاموشی ہونے پر ہم اپنی کمین گاہوں سے باہر آئے تو کچھ نہیں بچا تھا۔''

''ایک دشمن کو اس ویرانے میں سامنے پا کر آپ نے کیا محسوس کیا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں...... حالانکہ ڈیوڈ شا مسلح تھا اور میں خالی ہاتھ تھا اس کے باوجود مجھے اس سے ڈر محسوس نہیں ہوا تھا۔ البتہ جب ہمیں پتا چلا کہ ہماری ساری خوراک بھی تباہ ہو گئی ہے اور وہ سامان بھی جس کی مدد سے ہم وادی میں اتر سکتے تھے تو ہم دونوں ہی ڈر گئے تھے۔ ان سب چیزوں کے بغیر اس ویرانے میں سسک سسک کر سردی اور بھوک سے مرنا ہمارا مقدر بن گیا تھا۔ اس چیز نے ہمیں عارضی طور پر اتحادی بنا دیا تھا اور ہم زندگی کے لیے مشترکہ طور پر جدوجہد کرنے لگے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے کھانے کی بچی کھچی اشیا تلاش کیں لیکن یہ اتنی کم مقدار میں ملیں کہ ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں تھیں۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کوئی ہتھیار بھی مل جائے تاکہ میں ڈیوڈ شا کے مقابلے میں نہتا نہ رہوں۔ مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کی چیزیں ایک دن چلی تھیں اور اب ضروری ہو گیا تھا کہ ہم کسی طرح بھی وادی میں اترنے کا راستہ تلاش کریں۔ میں اور ڈیوڈ شا وادی کے کنارے کے ساتھ ساتھ بھٹکنے لگے تھے۔''

''ڈیوڈ شا نے بتایا تھا کہ آپ نے راستہ بھی تلاش کر لیا تھا لیکن جب نیچے جانے کی کوشش کی تو اسے بند پایا تھا۔''

''یہ درست ہے میں قسم کھا کر کہنے کو تیار ہوں کہ یہ وہی راستہ تھا جس سے وادی سے نکلتے ہوئے ہم اوپر آئے تھے لیکن جب میں اور ڈیوڈ شا ذرا نیچے گئے تو راستہ یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔''

''ممکن ہے موسمی حالات کا شکار ہو کر دیوار کا یہ حصہ نیچے گر گیا ہو۔ یہاں زلزلے بھی تو آتے ہوں گے۔''

راجا عمر دراز مسکرایا۔ ''ایسا نہیں تھا اور یہیں سے کہانی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو میں تمہیں سنوانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ڈیوڈ شا نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی ہوگی۔''

''اس نے مجھے بس اتنا ہی بتایا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ عرصے پہلے میری ایمن شا سے بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا کہ ڈیوڈ شا انڈیا سے واپسی پر گوشہ نشین ہو گیا ہے کیونکہ اس کا ایک ہاتھ آبلوں سے بھر گیا ہے۔ مگر

جب وہ مجھے یہاں ملا تو اس کا ہاتھ بالکل ٹھیک تھا۔“

”یہ اسے سزا ملی تھی۔“ راجا عمر دراز نے کہا۔ ”جب نیچے اترنے کا راستہ نہیں ملا تو ڈیوڈ شا پر جنون طاری ہو گیا تھا اور اس نے مجھ پر پستول نکال لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں نے نیچے جانے والا درست راستہ نہیں بتایا تو وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔ مجھے لگا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور میں مرنے کے لیے تیار بھی ہو گیا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا اور کسی صورت اس سے بچ نہیں سکتا تھا لیکن پھر اچانک ہی ڈیوڈ شا کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے پستول نیچے کیا اور پھر اسے وادی میں پھینک دیا اور خود بچوں کی طرح منہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا تھا۔ میں حیران ہوا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”پلیز راجا مجھے معاف کر دو پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا میں سچ مچ تمہیں گولی مارنے والا تھا۔“

اس کی گولی مارنے والی بات پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے اچانک مجھے کیوں معاف کر دیا تھا اور پستول نیچے وادی میں پھینک دیا تھا یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ بہر حال مجھے کچھ نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے ڈیوڈ شا کو معاف کر دیا۔ اس رات جب ہم اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس کر سونے کی کوشش کر رہے تھے تو ہمیں کوئی چیز کھائے ستر گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ اچانک مجھے لگا جیسے میرے سلیپنگ بیگ کے نیچے کوئی چیز ہے جو مجھے مسلسل چبھ رہی تھی میں نے ہاتھ باہر نکال کر برف میں اسے ٹٹولا تو میرے ہاتھ میں پستول کا میگزین آ گیا اور تب مجھے پتا چلا کہ ڈیوڈ شا نے وہ مکاری کیوں دکھائی تھی۔ اس کی بے خبری میں پستول کا میگزین کہیں گر گیا تھا اور عین موقع پر یہ انکشاف ہوا تو اس نے پینترا بدلا اور مجھے معاف کرنے کا ڈرامہ کرتے ہوئے پستول وادی میں پھینک دیا۔ ایک تو پستول خالی ہو چکا تھا اور جلد مجھے اس کا پتا چل جاتا دوسرے اسے خوف تھا کہ میگزین مجھے مل گیا اور میں نے کسی طرح اس سے پستول حاصل کر لیا تو الٹا اس کی عافیت خطرے میں پڑ جائے گی۔“

”وہ واقعی بہت شاطر آدمی ہے۔“

”میں نے میگزین اپنے پاس رکھ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن بھوک سے جیسے آنتوں میں بل پڑ رہے تھے اور ذہن پر بار بار اندھیرا اچھا رہا تھا۔ نہ جانے یہ رات کیسے گزری اور جب دن نکلا تو مجھ میں سلیپنگ بیگ سے باہر نکلنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ ڈیوڈ شا البتہ باہر نکل آیا تھا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سگار پی رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”بس خاتمہ لگ رہا ہے لیکن تم ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو؟“

”میں ایسا ہی آدمی ہوں اپنی آخری توانائیوں تک ایسے ہی رہوں گا اور پھر اچانک مر جاؤں گا۔“

میں اس کی لاف گزاف پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا وہ خود کو کوئی مافوق الفطرت انسان بنا کر پیش کرتا ہے لیکن ہے وہ بھی ایک عام فانی انسان۔ کچھ دیر بعد میں بھی ہمت کر کے باہر نکل آیا اور ہم نے ایک بار پھر اس جگہ کا رخ کیا جہاں ہمارا سامان تباہ ہوا تھا لیکن کئی کلومیٹرز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد انکشاف ہوا کہ تازہ برفانی طوفان نے ہر چیز پر برف کی موٹی تہہ جما دی تھی۔ ہم ناکام و نامراد لوٹ آئے تھے۔ ایک دن اور گزرنے والا تھا

اور آنے والی رات یقیناً ہماری آخری رات ہوتی۔ ہم وادی کے کنارے اپنے پڑاؤ میں سلیپنگ بیگز میں گھس کر لیٹ گئے اور موت کا انتظار کرنے لگے۔ دن ڈھل گیا اور رات سر پر آ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزر گیا تھا لیکن جب کسی نے میرے سلیپنگ بیگ کو ہاتھ لگایا تو میں ہوشیار ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ڈیوڈ شا ہو گیا لیکن جب میں نے سر باہر نکالا تو ایک مشعل بردار بوڑھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا اس نے اس قیامت خیز سردی میں بھی ایک معمولی سا کرتہ اور پاجامہ نما لباس پہن رکھا تھا۔ پھر مجھے یاد آ گیا وہ برف والا تھا۔ میں اسے نصف صدی بعد دیکھ رہا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا۔

''عمر دراز اٹھ جاؤ۔''

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں مجھ میں ذرا بھی سکت نہیں تھی لیکن جب اس نے کہا کہ میں اٹھوں تو میں حیرت انگیز طور پر اٹھ گیا۔ مجھے ذرا بھی کمزوری محسوس ہوئی اور نہ چکر آئے۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے ڈیوڈ شا کو کھڑے دیکھ کر ہوئی۔ وہ بالکل ساکت کھڑا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''آپ برف والے بابا ہیں؟''

''میرے ساتھ چلو۔'' اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا اور خود ایک طرف چل پڑا۔ میں اور ڈیوڈ شا روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے چل پڑے جیسے اس کے حکم کے غلام ہوں۔ وہ اسی راستے تک پہنچا جہاں سے ہم نیچے جانے کی کوشش کی تھی اور راستہ غائب پایا تھا لیکن جب برف والے کے ساتھ نیچے اترنے لگے تو راستے کو اپنی جگہ پا کر میں خود کو پاگل محسوس کرنے لگا تھا۔ پہلے یہاں صرف خلا تھا اور اب واضح راستہ نظر آ رہا تھا کیا یہ راستہ ابھی بنا تھا یا پہلے بھی موجود تھا مگر ہمیں نظر نہیں آیا تھا۔ ہمیں سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا لیکن برف والا یوں آرام سے چلا جا رہا تھا جیسے ہم اپنے گھر میں چلتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اوپر کیسے آیا اور ہمیں کیسے تلاش کر لیا اور یہ راستہ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ سب سے بڑھ کر ہمارے اندر اتنی توانائی کہاں سے آ گئی کہ ہم اتنے دشوار راستے پر چلے جا رہے تھے جب کہ رات ہم میں ذرا بھی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے بات کاٹی۔ ''قطع کلامی کی معافی لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی برف والا آدمی تھا جو نصف صدی پہلے آپ سے ملا تھا؟...... کیونکہ اس وقت بھی اس عمر آپ کے مطابق کوئی سو سال سے زیادہ تھی یعنی اب وہ ڈیڑھ سو سال سے اوپر کا ہو چکا ہو گا؟''

''تو وہ اور کون ہو سکتا تھا؟'' راجا عمر دراز نے الٹا سوال کیا۔ ''پھر اس نے بعض باتیں ایسی کیں جن سے لگتا تھا کہ وہ وہی برف والا تھا۔''

''یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔''

''ہاں لیکن یہاں تو کوئی بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''کسی نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ عین ہمالیہ کے وسط میں اتنی بڑی وادی ہے اور انسان بھی آباد ہیں جو تہذیب یافتہ بھی ہیں اور ان کے پاس بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو آج کے ترقی یافتہ انسان کو حیران کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔'' راجا عمر دراز کسی قدر غصے میں آ گیا تھا اسے خود بھی احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ رک کر خود پر قابو پانے لگا پھر اس نے گہری سانس لی۔ ''معاف کرنا برخوردار میں جذباتی ہو گیا تھا۔ اس وادی کے معاملے میں، میں جذباتی ہو جاتا ہوں۔ بہر حال میں داستان مکمل کرتا ہوں۔ برف والا ہمیں کوئی تین ہزار فٹ نیچے لے کر آیا۔ تم سوچ

سکتے ہو ہماری جو حالت ہو رہی تھی ہم اس میں ایک پتلے سے پہاڑی راستے پر کوئی ایک کلومیٹر نیچے آئے ہوں گے اصل میں تو ہم نے تین کلومیٹرز سے زیادہ کا فاصلہ طے کیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک خواب کی کیفیت میں بغیر کسی کوشش کے سفر کر رہا ہوں اور یقیناً ڈیوڈ شا کی حالت بھی مجھ سے الگ نہیں تھی۔

برف والا ہمیں اپنے ان مخصوص غاروں میں لایا۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ رانا ویاس نے بھی اس جگہ کی سیر کی تھی۔ وہاں آگ جل رہی تھی اور درجہ حرارت خوش گوار تھا۔ برف والے نے ہمیں صاف ستھرے بستروں پر لیٹنے کا حکم دیا اور جب ہم لیٹ گئے تو وہ کہیں چلا گیا۔ ہم جاگ رہے تھے اور اپنے اندر توانائی بھی محسوس کر رہے تھے لیکن ہم چاہنے کے باوجود ان بستروں سے نہیں اٹھ پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈیوڈ شا نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''راجا کیا ہم خواب دیکھ رہے ہیں؟''

''ایک خواب دو آدمی بیک وقت کیسے دیکھ سکتے ہیں۔''

''یہ شخص کون ہے؟''

''یہ برف والا ہے وادی کا نگران۔'' میں نے بتایا۔ ''اس کی اجازت کے بغیر نہ کوئی نیچے جا سکتا ہے اور نہ کوئی نیچے سے اوپر آ سکتا ہے۔''

''یہ مدقوق سا بوڑھا۔'' ڈیوڈ شا کو یقین نہیں آیا تھا۔

''یہی مدقوق بوڑھا ہمیں اوپر سے نیچے لایا ہے جب کہ ہم میں ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔''

''یہ کیسے لایا ہے ہم خود آئے ہیں اپنے پیروں پر چل کر۔'' اس نے میری بات کو جھٹلایا۔

''اگر ایسی بات ہے تو اس بستر سے اٹھ کر دکھاؤ۔''

ڈیوڈ شا کچھ دیر ساکت پڑا رہا پھر اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''میں نہیں اٹھ پا رہا ہوں۔''

''کیونکہ وہ ہمیں لٹا کر گیا ہے اور جب تک وہ نہیں کہے گا ہم اس بستر سے نہیں اٹھ سکتے ہیں۔''

ڈیوڈ شا حیران ہوا تھا۔ ''کیا یہ عمل تنویم کا ماہر ہے؟''

''میں نہیں جانتا لیکن جہاں تک اس بوڑھے کے بارے میں جانتا ہوں کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا ہے۔''

''اس میں ایسی کیا بات ہے یہ صرف ایک بوڑھا آدمی ہے۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا تھا۔ ''مجھے یقین ہے یہ میرا ایک ہاتھ بھی برداشت نہیں کر سکے گا۔''

ڈیوڈ شا اپنی قومی عادت سے مجبور تھا اور لاف گزاف پر اتر آیا تھا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ اس کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن میں نے پھر بھی اسے خبردار کر دیا۔ ''ڈیوڈ شا اس بوڑھے کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہو ایسا نہ ہو تمہیں کسی ناخوشگوار نتیجے سے گزرنا پڑے۔''

''تم مجھے اس بوڑھے سے ڈرا رہے ہو؟'' ڈیوڈ شا کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔

''میں تمہیں صرف خبردار کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ چپ ہوا لیکن زیادہ دیر چپ نہیں رہا۔ ''یہ ہمیں چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟''

''میں بھی تمہاری طرح بے خبر ہوں۔''

''کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچائے۔''

''اس نے نقصان کرنا ہوتا تو ہمیں یہاں لانے کی زحمت نہ کرتا کل صبح ہماری اکڑی لاشیں دیکھ کر خوش ہوتا۔''

ڈیوڈ شا مطمئن ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ ''ممکن ہے یہاں لاکر ہمارے ساتھ کچھ کرے۔''

''ڈیوڈ شا تمہارے جیسے آدمی کو اتنی بے چینی زیب نہیں دیتی ہے ذرا صبر سے انتظار کرو ابھی سب تمہارے سامنے آجائے گا۔''

ہم گرم لباس میں تھے اور باہر جیسی سردی بھی نہیں تھی اس لیے ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی بلکہ میں اتنا سکون محسوس کررہا تھا کہ سو گیا۔ پھر مجھے بوڑھے نے اٹھایا۔ ''اٹھ جاؤ نوجوان۔''

میں بے اختیار اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک بڑا سا پیالہ میرے سامنے رکھ دیا جس میں سوپ نما کوئی چیز تھی اس میں سبز اور گلابی رنگ کی سبزیاں تیر رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ جب رانا ویاس کو برفانی عورت نے مرنے کے قریب پہنچا دیا تھا تو برف والے نے اسے اسی قسم کا کوئی سوپ دیا تھا جس سے اس کی توانائی بحال ہوگئی تھی۔ برف والے نے ایسا ہی ایک پیالہ ڈیوڈ شا کے سامنے رکھا تھا لیکن وہ ساکت بیٹھا تھا۔ میں نے لکڑی کے چمچ سے سوپ پینا شروع کردیا۔ بوڑھے نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''تم بھی پیو۔'' اور ڈیوڈ شا نے سوپ پینا شروع کردیا۔

''ایک سوال ہے۔'' میں نے پھر مداخلت کی۔ ''بوڑھا آدمی آپ سے اور ڈیوڈ شا سے کس زبان میں بات کرتا تھا۔''

''میں نے بعد میں اس پر غور کیا تھا کیونکہ میں اس سے بے اختیار اردو میں بات کرتا تھا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ جواب بھی اردو میں دیتا تھا جب کہ ڈیوڈ شا اس سے انگریزی میں بات کرتا تھا۔''

''آپ کو لگتا ہے۔ یعنی آپ کو یاد نہیں ہے کہ وہ آپ سے کس زبان میں بات کرتا تھا۔''

''سچ کہوں تو مجھے بالکل یاد نہیں ہے بس اتنا احساس ہے کہ وہ ہماری بات سمجھ لیتا تھا اور ہمیں اپنی بات سمجھا دیتا تھا۔'' راجا عمر دراز نے کہا۔ ''شاید یہ ٹیلی پیتھی کی کوئی قسم تھی۔ بہرحال وہ ہمیں جو سمجھانا چاہتا تھا وہ ہماری سمجھ میں آجاتا تھا۔ اس کے حکم پر سوپ پی کر ہم سو گئے تھے۔ جب ہم جاگے تو وہ دوبارہ ہمارے لیے سوپ لے آیا تھا اور اس بار بھی سوپ پی کر ہم سو گئے تھے۔ تیسری بار جب اس نے ہمیں جگا کر سوپ دیا تو میں نے اس سے کہا۔ ''تم ہمیں سوپ دے کر سلا کیوں دیتے ہو؟''

''اس سے تمہاری توانائی جلد بحال ہو جائے گی کیونکہ تم نے ابھی بہت طویل سفر کرنا ہے اور اس میں تمہیں توانائی کی بہت ضرورت پڑے گی۔''

''میں ابھی بھی خود کو توانا محسوس کررہا ہوں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''تم ابھی کمزور ہو۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''اپنے حواس پر زیادہ بھروسہ مت کیا کرو یہ تم کو تمہارے بارے میں دھوکا دیتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' میں اس سے بحث پر آمادہ ہوگیا تھا۔

''اوپر جب تم لوگ خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے۔ تب تمہارے حواس دھوکا دے رہے تھے درحقیقت تمہارے اندر اتنی توانائی تھی کہ تم میرے ساتھ چل کر اتنے دشوار راستے سے نیچے آ گئے۔''

''تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا جو ہم اتنی دور چل کر آ گئے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا صرف تمہارے ذہن کو حکم دیا کہ وہ اپنی اضافی اور چھپی ہوئی طاقت استعمال کرے اور یوں تم نیچے آ گئے۔''

''ہم اسی راستے سے نیچے آئے تھے لیکن کچھ نیچے آ کر راستہ بالکل غائب ہو گیا تھا۔''

''تمہیں یاد ہے جب تم اور ولیم شاہ یہاں سے جا رہے تھے تو میں نے کہا تھا اگلی بار ہاتھ والے کو ساتھ لاؤ گے تب تمہیں وادی میں اترنے کی اجازت ملے گی۔''

''میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''خدا کے لیے مجھے وادی میں جانے دو۔ صرف ایک بار جانے دو۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' وہ بدستور نرمی سے کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہیں اجازت دے سکتا ہوں لیکن مجھے تمہیں اجازت دینے کی اجازت نہیں ہے۔''

''کس کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔''

''میں نہیں بتا سکتا۔ تمہارے لیے صرف ایک صورت میں اجازت ہے کہ تم ہاتھ والے کو ساتھ لاؤ۔''

''اور اگر میں اسے نہیں لا سکا تو؟''

''تو تم وادی میں نہیں جا سکو گے، لیکن وہ آئے گا اور تمہارے ساتھ آئے گا۔'' بوڑھے نے اتنے یقین سے کہا کہ مجھے بھی یقین آ گیا۔ پھر اس نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''وادی میں اترنے کی اجازت صرف اسی کو ملے گی جو ہاتھ والے کو لے کر آئے گا۔''

ڈیوڈ شا غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا میں اور بوڑھا اردو میں بات کر رہے تھے لیکن اردو اسے آتی تھی۔ وہ ہماری گفتگو سمجھ رہا تھا۔ بوڑھے کی بات پر اس نے کہا۔ ''اگر میں ہاتھ والے کو لے آؤں تو؟''

''تو تم بھی وادی میں جا سکو گے۔'' بوڑھے نے کہا اور وہاں سے چلا گیا کیونکہ اس بار اس نے ہمیں سونے کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے ہم جاگتے رہے۔ ورنہ وہ جب کہتا سو جاؤ تو ہم فرمانبردار بچوں کی طرف اس کے حکم پر سو جاتے تھے۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔

''تم نے اس کی باتیں سنیں؟''

''ہاں اور سمجھ بھی رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''قدرت نے ہمارے جسم میں توانائی کے پوشیدہ ذخائر رکھے ہیں جو ہنگامی حالات میں کام آتے ہیں ایک بار یہ ذخائر خرچ ہو جائیں تو دوبارہ بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارے اندر کی بیٹری ہے اور ہم جو روزانہ کھاتے پیتے ہیں وہ براہ راست پلگ ہے جو ہمیں توانائی دیتا ہے لیکن کبھی اچانک پلگ نکل جائے یا پاور بند ہو جائے تو ہم بیٹری سے چلتے ہیں۔ بیٹری دیر سے چارج ہوتی ہے۔ اس وقت یہ ہمیں طاقتور غذا دے کر ہماری اندر کی بیٹری چارج کر رہا ہے کیونکہ وہ اوپر سے نیچے آتے آتے خرچ ہو چکی ہے۔ ہم جتنا سوئیں گے اور آرام کریں گے ہماری بیٹری اتنی جلدی چارج ہو جائے گی۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے ہمیں ابھی طویل سفر کرنا ہے۔''

ڈیوڈ شا مسکرایا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے ہم وادی کے اتنے قریب آ کر دوبارہ واپس چلے جائیں گے؟''

''تب تم بتاؤ ہماری پاس اور کون سا راستہ ہے۔ جو شخص صرف حکم دے کر ہمیں میلوں دشوار راستوں پر چلائے جب کہ اس سے پہلے ہم میں ہلنے کی سکت بھی نہ ہو اور پھر ایک بار کہے اور ہم سو جائیں تو اس کے حکم کی سرتابی ہم کس طرح کر سکتے ہیں۔''

''یہ صرف ایک انسان ہے اور ہمیں کسی عمل سے اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔ کیا ہم اس کا توڑ نہیں کر سکتے؟''

''کیسے کر سکتے ہیں؟''

''ہر چیز کا اثر اس کے وجود کے ساتھ ہوتا ہے اگر اس کا وجود ہی نہ رہے ا ثر کیسے باقی رہے گا؟'' ڈیوڈ شا کا لہجہ یہ کہتے کہتے معنی خیز ہو گیا تھا۔

میں اسے شک سے دیکھا۔ ''ڈیوڈ شا تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''دیکھو راجا ہم اتنی دور سے اور اتنی کوشش کر کے یہاں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ ایک ناتواں بوڑھے کے کہنے پر واپس چلے جائیں۔''

''وہ بوڑھا ضرور ہے لیکن ناتواں نہیں ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''وہ اتنا طاقتور ہے کہ ہمیں اپنے حکم پر چلا رہا ہے۔''

''وہ کتنا ہی طاقتور سہی لیکن ہے تو ایک انسان۔'' ڈیوڈ شا نے اصرار کیا۔ ''اور ہر انسان کی طرح اسے بھی موت آئے گی۔ اگر وہ نہ رہے تو اس کا حکم یا وادی میں اترنے کے اجازت نامے کیا حیثیت رہ جائے گی؟''

میں کانپ گیا تھا۔ ڈیوڈ شا برف والے بوڑھے کی زندگی کے خاتمے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ڈیوڈ شا ایسا سوچنا بھی مت...... وہ بوڑھا ہمارا محسن بھی ہے اور اگر وہ ہمیں یہاں نہ لاتا تو اب تک ہم مر چکے ہوتے۔''

''وہ اپنی غرض سے ہمیں یہاں لایا ہے۔ اسے ہاتھ والے یعنی شہباز کی ضرورت ہے۔''

''اگر وہ غرض سے بھی لایا ہے تب بھی ہمارا محسن ہے۔'' میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں اچھی طرح جان گیا ہوں تم خود غرض انسان ہو جو اپنی خواہش پر کسی انسان کو قربان کر سکتے ہو۔''

''ہاں میں ایسا کر سکتا ہوں کیونکہ آج کی دنیا کا اصول یہی ہے جو تمہاری راہ میں رکاوٹ بنے اسے ہٹا دو۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''ڈیوڈ شا اگر تم اپنے ذہن میں کوئی الٹا سیدھا خیال لا چکے ہو تو بہتر ہے اسے نکال دو۔ یہ بوڑھا تمہارے اندازوں سے بہت آگے کی چیز ہے میرا خیال ہے تم صرف نقصان اٹھا سکتے ہو اس سے ٹکرانے کی صورت میں۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''تم تو سنجیدہ ہو گئے میں مذاق کر رہا تھا۔ میں مانتا ہوں یہ ہمارا محسن ہے۔''

اگرچہ ڈیوڈ شا نے اچانک پٹری تبدیل کی تھی لیکن مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا وہ کوئی ایسی حرکت کر سکتا تھا جس سے ہم دونوں ہی مشکل میں پڑ جاتے۔ اس بار ہم جاگتے رہے تھے لیکن بستر سے نہیں اٹھے تھے۔ میں نے اٹھنے کا سوچا لیکن اٹھا ہی نہیں گیا تھا میں سمجھ گیا کہ بوڑھے کی طرف سے ہمیں اجازت نہیں ہے۔ بے بسی سے بستر پر پڑے رہنا اور اپنی مرضی سے ہل نہ پانا کتنا بڑا عذاب ہے یہ میں نے اس دن جانا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ بوڑھا ہمیں پہلے کی طرح سلا جاتا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ہم اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ہم تقریباً سات آٹھ گھنٹے اسی حالت میں پڑے رہے۔ ڈیوڈ شا اب خاموش تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا شاطر ذہن کچھ سوچنے میں مصروف ہے۔

پھر بوڑھا آیا اور پہلے ہمیں غار کے ایک اندرونی حصے میں لے گیا جہاں ایک نالا بہہ رہا تھا۔ یہ جگہ رفع حاجت کے لیے مخصوص تھی۔ ہم فارغ ہو کر آئے تو اس نے پھر سوپ پلایا اور سونے کا حکم دیا اور ہم سو گئے۔ اگلی تین بار ایسا ہی ہوا تھا۔ یعنی ہم نے اس کا تیار کردہ سوپ سات بار پیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ہر آٹھ گھنٹے بعد پیا تھا یعنی ہمیں وہاں آئے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ اس بار بوڑھے نے ہمیں سوپ نہیں دیا بلکہ سوکھا گوشت کھانے کو دیا۔ یہ مزے کا تھا میں نے سوچا ہی نہیں کہ یہ حلال ہے یا حرام لیکن اسے کھاتے ہوئے نہ تو مجھے کراہت ہوئی اور نہ خیال آیا کہ جانور ذبح بھی ہے یا نہیں۔ پھر بوڑھے نے ہمیں دو تھیلے دیئے تھے۔ ”یہ تم دونوں سفر کے لیے ہے اور تم اس کی مدد سے دس دن آرام سے گزار سکتے ہو۔“

”کیا ہمیں واپس جانا ہوگا؟“ میں نے پوچھا وادی کے اتنے نزدیک آ کر واپس جانے کے خیال سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ یہیں وہ ہستی تھی جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی۔ میں اس سے ایک بار ملنے اور ایک بار دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ بوڑھے نے جان لیا تھا اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”تم فکر مت کرو تم واپس آؤ گے اور اس سے ملو گے۔ یہ اوپر والے نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے اور پھر تم یہیں رہ جاؤ گے۔“

”لیکن ہاتھ والا......“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

”اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرو اور اب چلنے کی تیاری کرو۔“ اس نے مخصوص تحکمانہ انداز میں کہا جس کے بعد چوں چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ مجبوراً میں نے گوشت کا تھیلا اپنے شانے پر لادا۔ ڈیوڈ شا نے اپنا تھیلا اٹھا لیا تھا۔ ہم بوڑھے کے ساتھ اس کے غار سے باہر آئے اور اوپر چڑھنے لگے یہی راستہ اب میری نظروں کے سامنے نیچے جا رہا تھا لیکن میں نیچے نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اوپر جانا تھا اور واپس جانا تھا۔ بوڑھا ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے پیچھے ڈیوڈ شا تھا اور سب سے پیچھے میں تھا۔ اترنے کے مقابلے میں چڑھائی زیادہ دشوار ہوتی ہے لیکن مجھے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ یہ شاید بوڑھے کی دی ہوئی خوراک کا کمال تھا کہ اسی سال کی عمر میں بھی میں جوانوں کی طرف ایک دشوار ترین پہاڑی دیوار پر چڑھ رہا تھا۔

اس جگہ حسبِ معمول دھند تھی لیکن یہ راستہ دیکھنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کر رہی تھی۔ بوڑھے کے ہاتھ میں موجود مشعل کی روشنی سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دھند کا مطلب تھا کہ دن کا آغاز ہو گیا ہے۔ ابھی ہم

کچھ اوپر گئے ہوں گے کہ میں نے ڈیوڈ شا کی رفتار تیز ہوتے دیکھی وہ بوڑھے کے پاس جا رہا تھا۔ اگر میرا ذہن رنج میں نہ ڈوبا ہوتا تو مجھے احساس ہو جاتا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اچانک ہی میں نے ڈیوڈ شا کو بوڑھے کے قریب جاتے اور اسے ہاتھ سے دھکا دیتے دیکھا۔ یہ موڑ تھا اور بوڑھا آگے خلا میں گیا تھا جس کے بعد ہزاروں فٹ تک صرف خلا ہی تھا۔ میں دم بخود رہ گیا تھا۔

ایک لمحے کو مجھے لگا کہ ڈیوڈ شا کے ہاتھ نے بوڑھے برف والے کو تنگ راستے سے نیچے لامتناہی خلا میں دھکیل دیا ہے اور وہ نیچے گرتا چلا جا رہا ہے لیکن نہیں...... ایسا نہیں ہوا تھا۔ جو ہوا وہ میری تو کیا ڈیوڈ شا کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ ڈیوڈ شا کا ہاتھ بوڑھے کے وجود سے یوں گزر گیا جیسے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ دھویں سے بنا انسان ہو۔ ڈیوڈ شا نے یقیناً اسے دھکا دینے کے لیے اپنی پوری قوت استعمال کی تھی اور اب یہی قوت اس کے خلاف چلی گئی تھی۔ اس کا جسم غیر متوازن ہوا۔ بوڑھا اس دوران میں ذرا آگے چلا گیا تھا اور ڈیوڈ شا راستے کے بالکل کنارے کھڑا ڈگمگا رہا تھا۔ میں دم بخود کھڑا تھا اور میرا خیال تھا کہ ڈیوڈ شا مکافاتِ عمل کا شکار ہونے والا ہے۔ اس کا توازن مسلسل بگڑ رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا راستے پر اس کی برقرار رہنے کی کوشش ناکام رہے گی۔ نیچے سوائے خلا کے کچھ نہیں تھا اور یہ یقینی موت کا خلا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ڈیوڈ شا اس خلا میں جاتا اچانک بوڑھا مڑا اور اس نے ڈیوڈ شا کا ہاتھ تھام کر اسے آگے کھینچ لیا اور ایک سیکنڈ میں اس کا وجود گرنے کے خطرے سے نکل آیا تھا۔ یہ سب مشکل سے چار یا پانچ سیکنڈ میں ہوا تھا۔

جب ڈیوڈ شا نے بوڑھے کو راستے سے نیچے گرانے کی کوشش کی اور پھر ناکام ہونے کے بعد خود گرنے والا تھا۔ پھر بوڑھے نے اسے بچا لیا اور یہ سب چند سیکنڈ میں ہوا لیکن مجھے لگا جیسے میں نے کتنا طویل اور تفصیلی واقعہ دیکھا ہو۔ مزے کی بات تھی کہ بوڑھے نے ایسا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا جس سے پتا چلے کہ وہ ڈیوڈ شا کی حرکت سے واقف ہو گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ”سنبھل کر...... راستہ خطرناک ہے۔“ یہ کہہ کر بوڑھا دوبارہ چل پڑا۔

میں حیرت کے جھٹکے سے سنبھلا اور ڈیوڈ شا کے پاس سے گزرتا ہوا بوڑھے کے پیچھے جانے لگا۔ بادلِ ناخواستہ ڈیوڈ شا بھی ہمارے پیچھے آیا تھا۔ وہ سہم گیا تھا یا کوئی اور بات تھی اس کے بعد اس نے مجھ سے یا بوڑھے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ ہم میں سے کسی نے بات نہیں کی تھی۔ سفر خاموشی سے طے ہوا اور کوئی دو گھنٹے بعد ہم وادی سے باہر آ چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نے تیزی سے سفر کیا تھا حالانکہ چڑھائی بہت دشوار تھی۔ نصف صدی پہلے جب میں اس راستے سے گزرا تھا تب یہ اتنا دشوار نہیں تھا۔ اس دوران میں اس کی حالت مزید خراب ہو گئی۔ اتنی آسانی سے سفر کرنے کا مطلب تھا کہ ہماری جسمانی حالت بہت بہتر ہوئی تھی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو دن نکل آیا تھا اور ہم نے گرم لباس پہنا ہوا تھا اس کے باوجود سردی سے برا حال تھا۔ درجہ حرارت دس درجے منفی سے نیچے ہی تھا اور اس سردی میں بوڑھا معمولی لباس میں سکون سے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”راستہ تمہیں آتا ہے موسم بھی بہتر ہو گا۔ بس چوتھے اور پانچویں دن معمولی طوفان آئیں گے۔ تم آرام سے واپس پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد تم اسے لے کر واپس آؤ گے۔“

''میں کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ اس کا اشارہ یقیناً تمہاری طرف تھا شہباز ملک۔

''ضرور کرو لیکن جلدی کرو، کیونکہ تمہارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔'' بوڑھے نے کہا اور پھر ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''اس بار تم کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ایک وقت آئے گا جب تم کامیاب رہو گے۔ جب تم اپنی دنیا میں پہنچ جاؤ گے تو تمہیں جسمانی سزا ملے گی۔ اسے ٹھیک کرنے کی کوشش مت کرنا وہ اپنے وقت پر خود ٹھیک ہو جائے گی۔''

ڈیوڈ شا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کر رہ گیا۔ بوڑھا اچانک مڑا اور نیچے جانے والے راستے سے پہلے موجود دراڑ میں غائب ہو گیا۔ ڈیوڈ شا کچھ دیر کھڑا رہا پھر اس کے پیچھے لپکا۔ میں نے عقب سے اسے آواز دی۔ ''ڈیوڈ بے کار ہے راستہ پھر نہیں ملے گا واپس آ جاؤ۔''

اس نے میری بات نظر انداز کی اور دراڑ میں غائب ہو گیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اس نے اپنا تھیلا نیچے پھینکا اور اس پر بیٹھ گیا وہ دبی زبان میں گالیاں دے رہا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے تھیلا کھول کر دیکھا تو اس میں ویسا ہی ابلا ہوا گوشت بھرا ہوا تھا جیسا کہ برف والے بوڑھے نے ہمیں کھلایا تھا۔ یہ ہماری کل رسد تھی۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تمہاری تسلی ہو گئی ہے اس لیے اب چلتے ہیں۔''

ڈیوڈ شا کی ذہنی حالت کسی قدر خراب تھی اس نے بگڑے انداز میں کہا۔ ''تم نے دیکھا میں نے اس بوڑھے کو دھکا دیا لیکن میرا ہاتھ اسے نہیں چھو سکا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں میرا ہاتھ اس کے جسم سے یوں گزر گیا جیسے اس کا جسم شفاف اور ہوا سے بنا ہو۔''

''میں نے دیکھا تھا اور پھر تم نیچے گرنے والے تھے۔ اس نے ایک بار پھر تمہاری زندگی بچالی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہارے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔''

''تبدیلی آئے گی بھی نہیں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''بات فطرت کی ہے ہر آدمی اپنی فطرت پر چلتا ہے۔''

میں نے اور اس نے اپنے تھیلے شانوں پر لاد لیے۔ ان دونوں تھیلوں میں تقریباً دس دس کلو گرام گوشت تھا اور بوڑھے نے ٹھیک کہا تھا یہ ہمارے دس دن کی خوراک کے لیے کافی تھا۔ میری گھڑی میں دن کے گیارہ بجے کا وقت تھا اور سردیوں میں یہاں شاید چار بجے ہی سورج غروب ہو جاتا اس سے پہلے پہلے ہمیں جتنا ممکن ہوتا سفر کر لینا تھا۔ اس لیے ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ کئی گھنٹے چڑھائی کے باوجود ہم تازہ دم تھے۔ اس سارا دن ہم سفر کرتے رہے اور جب آسمان تاریک ہو گیا تو ایک ڈھلان کے ساتھ برف کھود کر ہم نے غار بنایا اور اس میں گھس کر لیٹ گئے۔ تقریباً جما ہوا گوشت چبا کر اپنی بھوک کا مداوا کیا۔ سردی کی شدت سے تھکن کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

''تمہیں اندازہ ہے بوڑھے نے تم سے کیا کہا تھا؟''

''ہاں اس نے کہا تھا کہ میں ابھی اسے قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں لیکن ایک وقت آئے گا جب میں کامیاب رہوں گا۔''

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''بوڑھے نے یہ کہا تھا؟''
''تو اس کی بات کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے۔'' ڈیوڈ شا بولا۔ ''اگر یہ بات درست ہے تو مجھے بہت خوشی ہوگی کہ وہ بوڑھا میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔''
میں ڈیوڈ شا کی لاف گزاف سن رہا تھا اور مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ برف والا بوڑھا جو اتنی طاقتوں کا مالک تھا ڈیوڈ شا کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ ''میرا خیال ہے اس نے وادی میں اترنے کے بارے میں کہا تھا۔''
''نہیں اس نے اس بارے میں نہیں کہا تھا۔'' ڈیوڈ شا کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ''اس نے اپنے مرنے کے بارے میں کہا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں وادی میں نہیں اتر سکوں گا۔''
غار کے سوراخ سے ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی لیکن ہم ایک دوسرے کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟''
''بس لگتا ہے، ہم جیسے لوگوں کی چھٹی حس تیز ہوتی ہے۔''
''جب تمہیں لگتا ہے کہ تم وادی میں نہیں اتر سکو گے تو تم اس کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟''
''کیونکہ میں کوشش کا قائل ہوں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں عملی آدمی ہوں۔''
مجھے وہ عملی سے زیادہ ضدی اور اَنا پرست شخص لگا تھا جو اپنی ضد بہر صورت پوری کر کے رہتا ہے۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی تھی۔ رات کسی وقت ہمیں نیند آ گئی تھی۔ اگلے تین دن ہم آرام سے سفر کرتے رہے تھے۔ سردی کی شدت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ برف جم کر سخت ہو گئی تھی اور اس پر سفر کرنا آسان تھا۔ موسم صاف رہا اور صرف دو دن معمولی سا برفانی طوفان آیا تھا جس کی پیش گوئی برف والے بوڑھے نے پہلے ہی کر دی تھی۔ سفر کے نویں دن ہم ہمالیہ کی برفانی پٹی سے نکل آئے تھے اور مزید ایک دن کے سفر کے بعد ہم پہلی انسانی بستی تک پہنچے تھے اس وقت ہماری خوراک تقریباً ختم ہونے والی تھی اگر ایک دن مزید ہمیں کوئی آبادی نہ ملتی تو ہم فاقہ کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس سفر کے دوران اگرچہ ہم ساتھ ساتھ رہے اور بعض مشکلات سے بھی ایک ساتھ گزرے لیکن یقین کرو ہمارے اندر موجود فاصلے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شا سے ویسی ہی نفرت محسوس ہو رہی تھی اور مجھے یقین ہے کچھ ایسے ہی احساسات اس کے دل میں بھی میرے لیے موجود ہوں گے۔

یہ گاؤں ایک شرپا قبیلے کا تھا اور انہوں نے ہماری بہت خدمت اور مدد کی۔ دو دن ہم ان کے مہمان رہے اور پھر انہوں نے گھوڑوں اور ایک گائیڈ کے ساتھ ہمیں روانہ کیا۔ پہلی شہری آبادی آتے ہی ڈیوڈ شا ہم سے الگ ہو گیا اور میں نے رانا ویاس کو کال کی۔ اس کے آدمی جو ہمالیہ کے پاس میری پارٹی کا انتظار کر رہے تھے وہ آئے اور مجھے رانا ویاس کے پاس لے گئے کیونکہ ہم اس جگہ نہیں آئے تھے جہاں سے روانہ ہوئے تھے اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ رانا ویاس کے پاس پہنچ کر مجھے تم سب کے بارے میں پتا چلا کہ تم چلے گئے ہو۔ رانا ویاس تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ہر بار تمہارے بارے میں ذرا تاخیر سے علم ہوتا اور اس دوران میں یہ بات بھی کھل گئی تھی کہ بھارتی حکومت کو مطلوب تم اور تمہارے ساتھی رانا ویاس کے پاس رہے تھے اس پر انکوائری شروع ہو گئی۔''

''اوہ......'' میں نے کہا۔ ''وہ خاصی مشکل میں پڑ گئے ہوں گے؟''

''نہیں وہ سیاست دان ہے اور پھر حکومت میں شامل بھی ہے اس لیے اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ ویسے بھی بنگال کی حکومت سے دلی والے بھی دبتے ہیں۔ اس لیے جب تک میری واپسی ہوتی رانا دیا س معاملے کو دبا چکا تھا۔ اب یوں سمجھ لو کہ بھارتی حکومت کے پاس تمہاری فائل تو ہے لیکن اوپن نہیں ہے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ ان قبائلیوں کے بارے میں حقائق سامنے آ رہے ہیں جن کو بھارتی سرکار نے صرف ہیروں کی کان پر قبضے کے لیے ان کے علاقے سے نکال دیا اور ان میں سے بہت ساروں کو فوج سے مروا دیا۔ اس لیے معاملے کو دبانے میں عافیت سمجھی گئی۔''

''ان سارے واقعات کا میں چشم دید گواہ ہوں، بھارتی فوج جدید ترین ہتھیاروں اور فضائی قوت کی مدد سے ان نہتے اور معصوم قبائلیوں کے خلاف کارروائی کر رہی تھی۔ مارے جانے والے ہزاروں افراد میں بہت بڑی تعداد عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کی تھی۔''

''مارے جانے والے بے چارے نچلی ذات کے لوگ تھے اس لیے ان کی کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔'' راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔

مجھے خیال آیا۔ برف والے بوڑھے نے ڈیوڈ شا کی حرکت پر اسے عذاب کی نوید سنائی تھی اور ایمن نے مجھے بتایا تھا کہ ڈیوڈ شا کے ہاتھ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ ''راجا صاحب پچھلے دنوں ڈیوڈ شا کا ایک ہاتھ کہنی تک آبلوں سے بھر گیا تھا لیکن جب وہ مجھے ملا تو بالکل ٹھیک تھا کہیں یہ اسی برف والے بوڑھے کو دھکا دینے کی سازش کی سزا تو نہیں ہے؟ اس نے اسی ہاتھ سے بوڑھے کو نیچے دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔''

''شاید۔'' راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔ ''بوڑھے نے کہا تھا کہ سزا کچھ وقت کے بعد خود بہ خود ختم ہو جائے گی ڈیوڈ شا اس کا علاج کرانے کی کوشش نہ کرے۔''

''اس نے ہدایت پر عمل کیا اور اب اس کا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ وقت خاصا ہو گیا تھا اور پھر راجا عمر دراز کی دوائی اور نیند کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''راجا صاحب اب آپ آرام کریں۔''

''شہباز...... تم نے جواب نہیں دیا۔'' وہ پُر امید لہجے میں بولا۔

''راجا صاحب یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی پوچھنا ہو گا۔ مونا، سفیر اور وسیم دبئی سے آ گئے ہیں۔ مرشد ایک بار پھر ہمارے درپے ہے اور میں اسے فری ہینڈ نہیں دے سکتا کہ وہ میرے پیاروں اور میرے گھر والوں کے خلاف جو چاہے کرے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اگر ذرا سی بھی گنجائش نکلی تو میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا لیکن ابھی آپ کو کوئی واضح جواب نہیں دے سکتا ہوں۔ اس کے لیے میں آپ سے معذرت چاہوں گا۔''

راجا عمر دراز نے اپنا سر تکیے پر رکھ لیا۔ ''میں جانتا ہوں بیٹے تم جو کہتے ہو وہ کرتے ہو ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا اور دعا کروں گا کہ خدا تمہارے تمام مسائل حل کرے۔''

''مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت بھی ہے راجا صاحب۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کا عملی تعاون تو

مجھے ویسے ہی میسر ہے۔"

"ریاست سے باہر میرے تمام امور کا نگران اب عبداللہ ہے اور میں نے اسے مکمل آزادی دے رکھی ہے کہ وہ تمہارا ساتھ جس طرح چاہے دے، میں جانتا ہوں وہ تمہارا جاں نثار ہے لیکن میری ملازمت کی وجہ سے کہیں کہیں مجبور ہو جاتا ہے۔ بہر حال اب تم اس سے جس طرح چاہے کام لے سکتے ہو۔"

"میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں اور عبداللہ واقعی میرا مخلص ساتھی ہے۔ میں اسے وسیم یا بیتو سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔ اس وقت بھی میری ساتھی خواتین عبداللہ والی کوٹھی میں ہیں۔"

راجا عمر دراز کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔"مرشد اس وقت جس آمر کے بل پر اکڑ رہا ہے اس کا وقت بھی قریب آ گیا ہے اور نئی حکومت آتے ہی وہ اپنی اوقات پر آ جائے گا۔ میرا مشورہ ہے اس وقت تک اس سے دور رہنے کی کوشش کرو۔"

"میں نے کبھی اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن بات اب میرے گھر والوں اور رشتے داروں تک آ چکی ہے اس لیے میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا ہوں۔"

راجا عمر دراز نے سر ہلایا۔"میں سمجھتا ہوں، وہ گھٹیا قسم کا شخص ہے۔"

"وہ ان دنوں فرعون بنا ہوا ہے آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس نے ڈیوڈ شا کی ضمانت کو بھی جوتے کی نوک پر رکھ دیا۔"

"وہ اسی قسم کا آدمی ہے اور جب اسے ڈیوڈ شا کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ اس کے قدموں میں لوٹنے سے گریز نہیں کرے گا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے ڈیوڈ شا اسے معاف کر دے گا؟"

"اگر ڈیوڈ شا کا مفاد اس میں ہو گا تو وہ اسے ضرور معاف کر دے گا ورنہ اسے دوسروں کے لیے نمونہ عبرت بنا دے گا۔ وہ بھی مرشد سے کچھ خاص مختلف نہیں ہے صرف بنتا ہے۔"

میں راجا عمر دراز کے تجزیئے سے متفق تھا۔ مرشد اور ڈیوڈ شا میں فرق صرف تحمل کا تھا ورنہ ڈیوڈ شا اندر سے مرشد سے کچھ خاص مختلف نہیں تھا۔ میں کچھ دیر راجا عمر دراز سے بات کرتا رہا پھر وہاں سے اٹھ گیا۔ باہر حکیم قادس اور نوعمر خادمہ منتظر تھے۔ حکیم قادس نے اتنی دیر کرنے پر مجھے گھورا اور کمرے میں چلا گیا۔ نوعمر خادمہ مسکرائی اور اشارے سے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ اس کے نقوش کسی قدر چینی تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت دل کش اور تر و تازہ حسن کی مالک تھی۔ قد بوٹا سا تھا اور مخصوص طرز کے مقامی لباس میں بھی اس کی جسمانی دل کشی نمایاں تھی۔ اس کی چال اس دل کشی کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔ وہ یقیناً مجھے مہمان خانے تک لے جا رہی تھی۔ راجا عمر دراز کے محل کا پروٹوکول تبدیل کر دیا تھا اب باہر کا کوئی فرد چاہے وہ میرے جیسا قریبی آدمی کیوں نہ ہوا کیلے محل میں نقل و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور سے اس حصے میں جہاں راجا عمر دراز کی رہائش تھی۔ پہلے یہ جگہ مہمان خانے سے ملی ہوئی تھی لیکن اب اسے بند کر دیا گیا تھا اور محل میں آمد و رفت ایک سرنگ سے ممکن تھی جس پر ہمہ وقت پہرہ رہتا تھا۔ پہریدار نے نوعمر خادمہ کی طرف دیکھا تو اس نے شاید اسے سیکرٹری بیگ کی طرح کوئی اشارہ کیا اور اس نے بنا کسی مزاحمت کے ہمیں جانے دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی صرف خادمہ نہیں تھی

بلکہ اسے اور بھی کچھ اختیارات حاصل تھے اور وہ محرم راز بھی تھی۔ اب مجھے خیال آیا کہ وہ اتنی کم سن بھی نہیں تھی جتنی اپنے نازک ہاتھ پاؤں اور معصومانہ نقوش سے لگتی تھی۔

مہمان خانے میں داخل ہونے کے بعد میں خود اپنے کمرے کی طرف جانے لگا اور میرا خیال تھا کہ وہ واپس چلی جائے گی لیکن وہ میرے ساتھ رہی اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بھی پیچھے ہی آ گئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ نشیلے انداز میں مسکرائی اور صاف اردو میں بولی۔ ''میں آپ کی خادمہ ہوں اور آپ کی خدمت کے لیے آئی ہوں۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ راجا عمر دراز ایک ذرا مختلف قسم کا شخص تھا۔ میرا خیال تھا اس کی جاگیر اس قسم کی لعنتوں سے پاک ہوگی جو ہمارے جاگیر طبقے میں عام پائی جاتی ہیں اور ان میں ایک وہ کنیزیں بھی ہیں جو نہ صرف جاگیرداروں اور ان کے اہلِ خانہ کی جسمانی ضرورتوں کو پوری کرتی ہیں بلکہ ان کے مہمانوں کی دل بستگی کا سامان بھی کرتی ہیں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے محل میں بھی اس قسم کی خادمائیں پائی جاتی ہوں گی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو وہ نہ جانے کیا سمجھی اور اس نے اپنی بھاری چادر اتار دی۔ اس کے نیچے اس نے مقامی طرز کا لیکن بہت ہلکا سا اور چست لباس پہن رکھا تھا جو اس کی بدنی دل کشی کو نمایاں کر رہا تھا۔ خاص طور سے وسیع گریبان دائروں تک پہنچ رہا تھا۔

''تم میری کیا خدمت کر سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں اور چہرے سے شوخی جھلکنے لگی۔ چند لمحے پہلے والی معصومیت کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس نے لوچ دار لہجے میں کہا۔ ''جو آپ چاہیں۔ میں آپ کے پاؤں اور جسم دبا سکتی ہوں مالش کر سکتی ہوں۔ میں مالش بہت اچھی کرتی ہوں اور جو آپ چاہیں۔''

''مجھے ایسی کسی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور بستر کے کنارے بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا تو وہ جلدی سے آگے آئی اور خود فیتے کھولنے لگی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے اب تم جا سکتی ہو۔''

لیکن اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی اس کے بجائے اس نے فیتے کھولے اور پھر جوتے اتارے، موزے اتارے اور اپنی نرم و نازک انگلیوں سے میرے پاؤں سہلانے لگی۔ میں اسے کسی قدر سختی سے منع کرنے جا رہا تھا لیکن اس کی انگلیوں نے ایسا سرور دیا کہ میں رک گیا۔ وہ نہایت مہارت سے انگلیاں اور پاؤں دبا اور سہلا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں سے جیسے خفیف سی برقی رو نکل رہی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ پنڈلیوں کی طرف بڑھے تو میں چونک گیا۔ وہ بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔

''بس اتنا کافی ہے اب تم جاؤ۔'' میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی دکھائی دی تھی۔

''کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگی؟''

''تم اچھی ہو لیکن میں اچھی چیزوں کو دور سے دیکھنے کا قائل ہوں۔'' میں نے پاؤں سمیٹ لیے تو وہ کھڑی ہو گئی۔ ''ایک بات بتاؤ کیا تمہیں راجا صاحب یا بیگ صاحب کی طرف سے کوئی حکم ملا ہے؟''

"نہیں جناب۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ "میں خود آپ سے پاس آئی ہوں۔"

"اس سے پہلے تم محل میں آنے والے کتنے مہمانوں کی خدمت میں اس طرح آچکی ہو؟"

میرے سوال پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور احتجاجی انداز میں کہا۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں میں ایسی لڑکی نہیں ہوں، آپ مجھے اچھے لگے اس لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

مجھے اس کی بات کا بلکل یقین نہیں آیا تھا۔ کوئی بھی شریف لڑکی یا عورت کسی غیر مرد کے کمرے میں رات کے اس وقت آکر ہر طرح کی خدمت کی پیش کش نہیں کرتی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے لگا وہ جنس کے معاملے میں ناتجربہ کار نہیں تھی۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ تجربے کار تھی یا ناتجربے کار۔ میں اسے نظر انداز کر کے بستر پر دراز ہو گیا اور ہلکا کمبل سینے تک اوڑھ لیا۔ باہر شدید سردی تھی لیکن اندر اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا بس یوں سمجھ لیں کہ پتا چل رہا تھا موسم سرد ہے اور رات گزارنے کے لئے یہ کمبل بھی کافی تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنی چادر اٹھائی اور اسے اوڑھتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گئی البتہ دروازہ اس نے بے آواز بند کیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ یہاں ملازم اور دوسرے لوگ بے آواز طریقے سے چلتے تھے اور چیزوں کو بھی اسی طرح استعمال کرتے تھے کہ کوئی غیر ضروری اور نمایاں کرنے والی آواز پیدا نہ ہو۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میں کسی قدر بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا تھا لیکن رات کسی وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوتے ہی میری چھٹی حِس نے بتایا کہ میں کمرے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری آنکھیں بند تھی میں نے خفیف سی جھری کر کے دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ کمرے میں خادمہ موجود تھی اور وہ اس حال میں تھی کہ اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک تار نہیں تھا اور اس کا شفاف چاندنی جیسا جسم جگہ جگہ کھرونچوں اور لہو کی سرخی سے سجا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کی وحشت اور درندگی کا شکار ہو کر میرے کمرے میں آئی ہو۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
دسویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشف زبیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول



ایک الگ انگ، ابھرتا تک، زنجیر آہنگ سلسلہ

- کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔
- خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفۂ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔
- اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا منظور تھا۔
- چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔



علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
E-mail:alimian_publications@yahoo.com